اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
ہمایوں

بیادگارِ علامۂ عصر فضیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

سالگرہ نمبر

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لار
جائنٹ ایڈیٹر۔ حامد علی خاں۔ بی اے + منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵ — نمبر ۱

بابت ماہِ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

تصاویر: ۱-جزیرہ موئت - ۲-خوش حالی کا تعاقب - ۳-احمد بک زوغو - ۴-چڑیا کا سبق - ۵-بقا - ۶-نپولین میدانِ ابوکیر میں - ۷-جون کیٹس -

حمد

کہاں ہے کس لئے ہے کب سے ہے کیونکر ہے کیا ہے تُو؟ — جو حل ہوتا نہیں ہے وہ معمّا اے خدا ہے تُو!

کوئی شے بھی نہیں لیکن ہے مُضمر تُو ہر اک شے میں — سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا نہیں ہے اور کیا ہے تُو؟

تجھی سے آبرو اُس کی اُسی سے ہے تری ہستی — جہاں تیرا صدف ہے اُس کا دُرِّ بے بہا ہے تُو

کوئی دیکھے تو ہر ذرّے میں بجلی بن کے پنہاں ہے — سبھی تاریکیاں روشن ہیں جس سے وہ ضیا ہے تُو

تجھی کو ڈھونڈتا ہے رات دن وہ اپنی گردش میں — تُو وہ دلبر ہے ہر ذرّے کے دل کا مدّعا ہے تُو

لگا کر اپنی لَو عشّاق سے پھر اپنے شرما کر — چھپا جو لاکھ پردوں میں وہ حسنِ پُرحیا ہے تُو

جو میں دیکھوں تو چھُپ جاتا ہے تُو ہر چیز کے پیچھے — مجھے ہر چیز میں چھپ چھپ کے لیکن دیکھتا ہے تُو

تصوّر میں ترے جب رو کے سو جاتا ہوں راتوں کو — مجھے تاروں کی جھلملیوں سے ہنس کر جھانکتا ہے تُو

ابھی ہے ابتدائے عشق کل کیونکر پڑے مجھ کو — مری بے کل تمنّاؤں کا یارب منتہا ہے تُو

رہِ اُلفت کو پالیں مل کے آ صحرائے ہستی میں — مَیں تجھ بن کھو گیا ہوں اور مجھ بن کھو گیا ہے تُو

"کہاں ہے تُو" "کہاں ہے تُو" کی ہر سُو گونج اٹھتی ہے — مَیں تجھ کو ڈھونڈتا ہوں اور مجھ کو ڈھونڈتا ہے تُو

ہوس کے تیر کھا کھا کر ہوا ہے مُضمحل یارب

بشیرِ خستہ جاں کی زندگی کا آسرا ہے تُو

ب ل

بزمِ ہمایوں

ہمایوں کو بزمِ اردو میں آئے آج سات سال کی مدت گذر چکی ہے!

جب ہمایوں جاری کیا گیا تھا تو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ زمانے کی ہوا اردو رسالوں کے لئے ناساز ہے سو اس کا وجود چھ ماہ یا زیادہ سے زیادہ سال بھر تک رہے گا اور پھر اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اردو زبان کی بیشتر چیزوں کا ہوتا رہا ہے۔ یوں بھی وہ وقت سیاسی عدم تعاون کا تھا دلوں میں سیاسی ولولے تھے زبانوں پر سیاسی باتیں تھیں اور دماغ بھی سیاسی تجویزوں سے بھرے پڑے تھے۔ خیال تھا کہ لوگوں کو اس طرف بہت کم توجہ ہوگی لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں کو اول روز ہی سے توقع سے کچھ بڑھ کر ہی کامیابی حاصل ہوئی اور یہ کامیابی برابر جاری رہی یہاں تک آج ہمایوں اردو کے کثیر الاشاعت رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ نہ صرف ہمایوں کو یہ کامیابی نصیب ہوئی بلکہ اور رسالے بھی جو اس وقت یا اس کے بعد نکلے اور جن کے کارکن نہ صرف اُن کے اجرا کے بلکہ اُن کے قیام کے خواہش مند تھے بیشتر کی بہ نسبت بہ طریقِ احسن کامیاب ہوئے۔ دو تین سال سے ہمارے بعض معاصرین کے جو خاص نمبر نکل رہے ہیں اُن سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ باوجود اُس بدمذاق اور غیر ضروری حسد و رقابت کے جو ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کو اردو کے ساتھ ہے ہماری قومی زبان روز بروز ترقی کر رہی ہے کم از کم اُس میں استعداد موجود ہے کہ اگر ہم اُس کی طرف کما حقہ توجہ کریں تو اگر وہ سب سے آگے نہ نکل جائے تو کسی سے پیچھے بھی نہ رہے۔ جامعۂ عثمانیہ کی علمی مساعی اور اردو کی فطری شیرینی اور مقبولیت وہ چیزیں ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہمیں اردو کے مستقبل کا کچھ بھی خطرہ نہیں بشرطیکہ ہندوستان کے مختلف اطراف میں جہاں جہاں اِس پیاری اور میٹھی زبان کے فدا کار موجود ہیں وہ لفظی اعانت کے علاوہ کاروباری حیثیت سے اور علمی طور پر بھی اس کی ترقی و خوش حالی میں شب و روز منہمک رہیں۔

ہم ترقی کر رہے ہیں لیکن دوسری قومیں بھی ترقی کر رہی ہیں اور اُن کی رفتارِ ترقی ہم سے بہت زیادہ تیز اور بہت زیادہ یکساں و مستقل ہے۔ ہمیں شوق ہے لیکن ہم میں مستقل طور پر کام کرنے والے تھوڑے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی مساعی پر زبانی تحسین و آفرین کہتے ہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرے کو مدد دینے سے ہم نہ صرف گریز کرتے ہیں بلکہ جب ہم اپنے میں سے کسی کو زیادہ ترقی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو عموماً اُس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں کہ کہیں یہ سب پر یا ہم پر ہی فوقیت نہ لے جائے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایسا کرنے سے ہم مقابل کی زبانوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم اُن کا کام کرتے ہیں اُن کے لئے ہم اپنے پاؤں میں آپ ہی کلہاڑی مارتے ہیں۔

یہ اسی بے توجہی اور بے جا رقابت کی وجہ ہے کہ آج ہمارے بڑے بڑے شہروں میں اردو کی کوئی ایسی انجمنیں نہیں ہیں جو باقاعدہ طور پر اُس کی فلاح و بہبود اور ترقی کے ذرائع سوچیں، مصنفین کی حوصلہ افزائی کریں، اس بات پر غور کریں کہ اردو میں کن کن موضوع پر تصنیفات کی اشد ضرورت ہے - اردو کی کتابوں کے لئے کیونکر اشاعت و فروخت کی راہیں کھولی جائیں، دوسری ہمسایہ قومیں کیا کر رہی ہیں اور ہم کو کیا کچھ کرنا چاہیئے؟

افسوس ہے کہ روز بروز اردو زیادہ تر مسلمانوں کی زبان بنتی جاتی ہے یہ نہ صرف ہماری زبان کے لئے مفید نہیں بلکہ ہمارے ملک پر اس علیحدگی کا نہایت بُرا اثر پڑ رہا ہے - اسی کی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں وہ تمام نقائص چلے آتے ہیں جن کا قومی حیثیت سے خود مسلمان بھی شکار ہو رہے ہیں - اس علیحدگی کا الزام نہ صرف مسلمانوں کے سر ہے بلکہ غیر مسلم بھائی بھی اس کے ذمہ دار ہیں - ہم سب قوموں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ خاص خاص زبانوں کو خاص خاص قوموں کے لئے مخصوص کرنے کی قومی غلطی نہ کریں - زبان کو سیاست سے آلودہ نہ کریں بلکہ اس بدقسمت ہندوستان میں جس کی قسمت اُن کے ہاتھوں میں ہے کوئی نہ کوئی ایسا کام کر دکھائیں جس سے ربط و اتحاد کی باتیں پیدا ہوں!

جہاں تک ہمایوں کے بس میں ہے ہمایوں حتی المقدور اس قومی تفریق سے علیحدہ رہا ہے اور ہمارے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں کہ ہم سب قوموں کے افراد کو ادب کے اس ننھے سے چشمے کے گرد جمع ہوتے ہوئے دیکھیں۔

ہم اُن اہلِ قلم کے غایت درجہ ممنون ہیں جن کی تمام تر یا بیشتر توجہ سالِ گذشتہ میں ہمایوں کی طرف مبذول رہی ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم کی عدم موجودگی کی تلافی کسی طرح نہ ہو سکے گی - وہ ہمایوں کے خاص کرمفرما تھے۔ میرے عزیز دوست حضرتِ فلک پیما، پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی، مولانا محمد حامد خاں صاحب دہلوی، ضیاء الدین صاحب شمسی عاشق حسین صاحب بٹالوی، صادق ایوبی، اور نوواردوں میں عبد الرحمن صاحب اعجاز اور لطیف الرحمن صاحب کی نثر نگاریوں سے ہماری علمی و ادبی محفل کی رونق قائم رہی - اور حضرات آزاد انصاری، امین حزیں، اثر صہبائی، راز چاند پوری، حامد اللہ افسر، جگر، اکبر، وحشت اور ثاقب کی نظم آرائیوں سے ہماری انجمنِ سخن کی زیب و زینت برقرار رہی۔ نسوانی اہلِ قلم میں ح - ب، ز - ب، ع ب صاحبہ اور تہذیب فاطمہ صاحبہ کے ہم دل سے شکر گذار ہیں اور اُن کے خیالات کے لئے ہمیشہ چشم براہ ہیں۔ اِن سب سے اور نئے مقالہ نگاروں سے ہماری گذارش ہے کہ ہمایوں کو ہمیشہ ایسے خیالات کی گلچینی کی تمنا ہے جو علم و فن کے چمنستان میں حسن و نیکی کے گلزاروں میں شگفتہ ہوں اور جن سے حسنِ خیال و حسنِ عمل کی نکہت پیدا ہو کر اہلِ ذوق کے دل و دماغ میں بس جائے!

ب ل

جہاں نما

۱۹۲۸ء گذر گیا۔ اس کے دوران میں امن و آزادی کے لیئے اُن کوششوں کا کامیاب آغاز ہوا جس کا خدا کرے ۱۹۲۹ء میں انجام بخیر ہو!

حق یہ ہے کہ ۱۹۲۸ء ایک حیرت انگیز سال تھا جس میں شجاعت و آزادی اور امن و مصالحت کی ایسی ایسی خلافِ توقع کارنمایاں دنیا نے دیکھیں جو کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

چین ایک بظاہر نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مغربی طاقتیں دُور بیٹھی مسکرا رہی تھیں کہ چینی ترقی کا مگرمچھ یونہی کاہلی کے کیچڑ میں پھنسا ہوا کبھی ٹس سے مس نہ ہوگا۔ جاپان بھی ایک عقل پسند ہمسائے کی طرح اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ میرے پڑوسی کے گھر میں خدا کے فضل سے یونہی تلوار چلتی رہے گی پھر اُسے میرے مقابلے کی فرصت کہاں اور میری من مانی مداخلت کی تاب کیسے کہ یک لخت قسمت نے ہمت کی یاوری کی آزادی کی تلوار نے فساد و غرض کی بیڑیاں کاٹ کر رکھ دیں۔ نہ ہلنے والے مگرمچھ نے اپنا سر اُٹھایا اور اِدھر اُدھر تاکا جھانکا، مشرقی ہمسایہ اور مغربی "ہمدرد" سب دم دبا کر بھاگ نکلے۔ صدیوں کے سوئے ہوئے چینی جو جاگ اُٹھے تھے برسوں کے جاگے ہوئے چینی جو برسوں سے لڑ رہے تھے یک لخت چُپ چاپ ہو کر مل جل کر اپنے گھر بار کے کام میں لگ گئے!

افغانستان، دنیا جہان سے دُور کا ملک بھولا بسرا ہوا پہاڑوں میں گھرا ہوا، جو کبھی جہل و قدامت کا ٹھکانا تھا کبھی محض روس و انگلستان کا نشانہ تھا اپنے شیردل تاجدار کو لے کر دنیا بھر سے تعارف کرنے، دنیا کے سٹیج پر دنیا کو دیکھنے، دنیا کو اپنے تئیں دکھلانے کے لیئے نکلا جن دنوں امان اللہ یورپ میں گرمِ سفر تھا اک دنیا اس سیر و سفر میں محو تھی!

دولِ یورپ جو صلح میں جنگ کی تیاریاں کرتی معلوم ہوتی تھیں فرانس اطالیہ سے انگلستان روس سے برسرِ پیکار ہونے پر آمادہ نظر آتا تھا ان دل کے ادقیانوس کی وسعتوں سے پرے کی غیر جانبدار قوت نے گرنے سے آ کر سنبھالا لڑنے سے آ کر روکا کہ اب جنگ و جدل کے ذریعہ سے اپنے اختلافات کو مٹانے والی منطق کا زمانہ ہو چکا آؤ اب امن کا ایک نیا فلسفہ قائم کریں اور ہمیشہ کے لیئے جنگ کو ممنوع قرار دے کر انسانیت کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار بن جائیں۔

اِس کیلگی معاہدۂ امن کو نوعِ انسان کی سب سے عظیم الشان اخلاقی و روحانی سعی پکارا گیا ہے! اکثر لوگ اس فقرے پر طنزاً مسکراتے ہیں یہ طنز و تبسم فطری امر ہے۔ دنیا نے لاکھوں بار دائمی امن کے خواب دیکھے اور پھر لاکھوں بار ہی اک دلشکن بیداری سے اُس کا واسطہ پڑا لیکن کیا عجب ہے کہ یہی جنگ کے انجام کا آغاز ہو کیا عجب ہے کہ یہی وہ اصلیت ہو جس کے دنیا

مدتوں خواب دیکھتی رہی۔

واقعہ یہ ہے کہ کبھی یہ خواب صرف پیغمبر اور شاعر اور مصوّر دیکھتے تھے اور اب جنگِ فرنگ کے بعد سیاسی مدبرین بھی اس کے دیکھنے کے تمنائی نظر آتے ہیں، ۱۹۱۸ء میں ولسن نے اپنا زبردست نعرہ بلند کیا تھا جو سب نے سُن کر اُس میں ظاہراً ہاں میں ہاں ملا دی ۱۹۲۸ء میں کیلگ نے اپنی شیریں آواز بلند کی اور چودہ قوموں نے جن میں ضمنی طور پر برطانیہ کے نمائندے نے بیچارے ہندوستان کی طرف سے بھی دستخط ثبت کر دئیے فوراً اِس آواز پر لبیک کہہ دی!

امن کی اس متفقہ آواز کو محض جہل و فریب سے تعبیر کرنا ظلم ہے یقینی طور پر یہ اپنے اندر بہت سی ممکنات لئے ہوئے ہے!

امریکہ جو یوں دس سال کے بعد خود بخود بھرپور یورپ کے کارزار کو امن کی نزہت گاہ بنانے کے لئے آنکلا ہے حقیقت میں اس وقت دنیا کا اولین و چست ترین ملک ہے، سیاسیات میں معاشیات میں علمیّت میں معاشرت میں وہ سب سے پیش پیش ہے اگرچہ اس سبقت کی وجہ سے نئی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُس کے اندر نئی سے نئی برائیوں کی نمائش بھی ہو رہی ہے لیکن کیا یہ اچھا نہیں کہ جن مصیبتوں میں سے اَوروں کو بعد میں ہو کر گذرنا ہے وہ ابھی سے اُن سے نبٹ رہا ہے۔ وہاں اُدھر اگر شراب کی ممانعت ہو رہی ہے تو اِدھر اختیاری اختیاری شادی کا بھی چرچا ہے، سیاسی دنیا میں اُس کا رعب روز بروز بڑھ رہا ہے وہ دنیا بھر کے قرضخواہ کا قرضخواہ وہ دنیا بھر کی سب سے بڑی بحری قوت سے زیادہ بحری قوت پر عبور رکھنے والا ہے، اُس نے بارہا اتحادیوں کی سیاسی دوستوں کو یہ جتا کر متنبہ کر دیا کہ مجھے یورپ کے جھگڑوں جھمیلوں سے غرض نہیں۔ اُس نے جنگ کے ختم ہونے سے ذرا پہلے جس کا خاتمہ اُسی کے ہاتھوں ہوا دنیا کو ولسن کے منہ سے جو باتیں سنائی تھیں اتحادیوں سے جو شرائط منوائی تھیں اُن کے خلاف انہیں اتحادیوں کو عمل کرتے دیکھ کر اُس کا جی کھٹا ہو گیا اور وہ یورپی سیاست کے شطرنج سے دست بردار ہو کر اپنے گھر کو چل دیا۔ اب پھر مناسب موقع دیکھ کر اُس نے کیلگ کے ذریعے سے دنیا کو صلح و آشتی کا پیغام دیا ہے، وہ سب کا دوست ہے لیکن جرمنی سے اب اُس کی ہمدردی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

انگلستان میں مزدور جماعت پھر کچھ طاقت پکڑتی نظر آتی ہے اگرچہ برطانوی انجمن عمال نے حال ہی میں عام ترکِ محاربہ کے خلاف ایک تجویز منظور کی ہے، اِس سے ظاہر ہے کہ انگلستان ابھی شاہنشاہیت کا ماویٰ و ملجا ہے۔ ہاں ہاتھ آئی چیز کون چھوڑتا ہے، پھر انگلستان اور اُس کے مزدور بھی کیونکر اپنی سلطنت کو چھوڑ دیں؟ کیوں غلام قوموں کے سر پر سوار نہ رہیں۔ کیا کریں تہذیب کی خوشبو کو پھیلانا ہے تمدّن کے بیج کو ہر سُو بکھیرنا ہے اُن کی محنت و ریاضت نہ ہو تو غریب انسانیت کی پھلواری کیسے پھولے پھلے؟ یہ بنیا بڑا ہوشیار ہے لین دین کے علاوہ بھی اپنی بستی میں کبھی کسی سے کبھی کسی سے جوڑ توڑ کرتا ہی رہتا ہے۔ مغرور جرمنی کو طاقتور نہ دیکھنا چاہتا تھا سو جنگِ فرنگ میں فرانس کی پشت پناہ بنا۔ اب مخمور فرانس کو طاقتور نہیں دیکھنا چاہتا سو کبھی جرمنی کی پیٹھ ٹھونکتا ہے کبھی اطالیہ کے گھر میں کئی کئی پھیرے کرتا ہے اور اُس کی قدیمی عظمت کی تعریفیں کر کر کے نئی عظمت کے خواب دیکھنے میں اُس کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ ساتھ ہی امریکہ کی بحری ترقی سے ڈر کر فرانس سے بحری سمجھوتا کرتا

ہے جس سے امریکہ چین بہ جبیں سا ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کے بہترین حصوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہے اور ساز باز کرنے والوں کا مرشدِ اعلیٰ بھی یہی ہے۔

فرانس کو جنگ میں کامیاب ہو کر بھی چین نصیب نہیں۔ نہیں معلوم کہ اس کا گنہگار ضمیر اسے یوں مضطرب و پریشان کئے ہوئے ہے یا کیا۔ وہ دوسروں کے گھر پر اپنے عارضی قبضہ کو مستقل بنائے جاتا ہے۔ تاوانِ محافظت کے بھوت اُس کے سر پر سوار رہتے ہیں۔ جرمنی سے اُس کی ہمیشہ دشمنی انگلستان پر اُسے ہمیشہ شبہ اور اطالیہ سے اُس کی روز و شب پرخاش رہتی ہے۔ پھر بھی ہماری ہمدردی اس نازک دل فصیح سورما کے ساتھ ہے جس کے گھرانے کی آبادی روز بروز کم ہو رہی ہے جس کی شجاعت ہوا پر سوار رہتی ہے جس کا احساس فنونِ لطیفہ کا سرچشمہ اور جس کی ذکاوت علم و حرفت کی جلوہ گاہ ہے۔

جرمنی کا دار السلطنت ہر چند امریکیت کی نقل اُتارنا چاہتا ہے لیکن اُس کے دل و دماغ ہنوز طبیعیات اور ما ورا الطبیعیات کے دلدادہ ہیں۔ شکست نے اُس کے غرور کا سر نیچا کر دیا۔ اُس نے ہوش سنبھالا اور وہ کبر و نخوت بھلا دیئے۔ جرمنی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ فوجی قوت کی روک تھام ہوئی تو اُس کے نوجوانوں نے جسمانی ورزش و بدنی ریاضت کو شعارِ زندگی بنا لیا اور یوں اپنے اندوہ و یاس کو ڈھارس دی۔ لڑائی میں جو ہزاروں شاید لاکھوں آدمی اندھے ہو گئے تھے اُن کی ترقی و خوشحالی میں جو ہمت جرمنی نے کر دکھائی وہ بہ غایت سبق آموز ہے۔ وہ جنہوں نے دنیا کو گویا کھو دیا تھا وہ بازاروں کوچوں میں اپنے سمجھدار کتوں کی مدد سے چلنے پھرنے لگے کتب خانوں میں اپنی مخصوص کتابوں سے علم و فن حاصل کرنے لگے اور کارخانوں میں دیکھنے والوں کے ساتھ مل کر بعض مشکل سے مشکل کام سرانجام دینے لگے۔ ہزار حیف کہ جرمنی کے نابینا ہندوستان کے بیناؤں سے زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔

اطالیہ ہنوز مسولینی پرستی میں گرفتار ہے۔ اِدھر ظلم و استبداد کا سکّہ چلتا ہے اُدھر زور آزمائی کا خبط سر پر سوار ہو رہا ہے۔ بحرِ روم ٹھاٹھیں مارتا ہے تو پُرانے رومیوں کی عظمت آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ فرانس بلقان کی ریاستوں میں مداخلت کرتا ہے تو اطالیہ غصّے سے پیچ و تاب کھانے لگتا ہے کہ یہ میرے گھر کا قربِ جوار ہے تجھے اس میں کیا دخل ہے؟

روس کی اشتراکیت کا خمار اتر رہا ہے اور انفرادی و قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں انسانی فطرت دوسرے ملکوں کی طرح ترقی کے موقعے پانے کی امیدوار ہے۔ سپاہیوں اور زمینداروں کی حالت بہتر ہے۔ فن و حرفت میں ترقی ہے۔ ناٹک اور موسیقی میں کمال حاصل کیا جا رہا ہے۔ سیاسی دنیا سے بھی اب وہ بے نیازی نہیں۔ جنیوا میں روس ہی نے قوموں کو غیر مسلح کر دینے کی تجویز پیش کی ہے۔

چین آخر متحد ہو گیا ہے صنعت و حرفت میں ترقی ہو رہی ہے اگرچہ کاروبار میں ناتجربہ کاری کی بنا پر ابھی بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ لیکن آزادی ہزاروں نعمتوں کی ایک نعمت ہے۔ آزاد چین دولِ عظمیٰ سے نئے معاہدوں کا طالب ہے کہ اب وہ دخل در معقولات

جاپان چین کی طاقت دیکھ کر اُس کے ساتھ زبردستی کا رویہ چھوڑ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ اُس کی ترقی ہمسائے کی ترقی اور غیروں سے دُور کی صاحب سلامت میں ہے۔ انگلستان سے اتحاد اب فقط زبانی ہے اور امریکہ کی طرف میلان زیادہ جنوبی امریکہ اور میکسیکو میں جاپان کی زائد آبادی کی کھپت ہوتی ہے۔ بحری قوت بڑھ رہی ہے چنانچہ جاپان کا درجہ بحری طاقتوں میں تیسرا تسلیم کیا گیا ہے۔ حضارت و تمدن کے مختلف شعبوں میں توانائی و زندگی ظاہر ہے جاپان میں اس وقت کئی ہزار روزانہ اخبار ہیں اور ایک ماہوار رسالے کی اشاعت تو پندرہ لاکھ ہے!

ترکی یورپیت میں کمال حاصل کر رہی ہے۔ مغربی پتلون ٹوپی مغربی رقص و سرود مغربی طرزِ عبادت مغربی رسم الخط مغربی طرز! ہما غرض ہر اچھی بُری مغربی شے کی نقل اتر رہی ہے لیکن بھائیو غور کرو کہ کیا مُردہ نام نہاد مشرقی ہونے سے زندہ مغربیوں کی کامیاب نقل اُتارنا بھی اچھا نہیں؟

ترکی و جاپان مشرق کے دائیں اور بائیں بازو جو کل تک بے کار تھے آج مصروفِ کار نظر آتے ہیں چین اُس کا دل پھر دھڑکنے لگ گیا ہے۔ ایران اُس کا جگر بھی اپنے اندر اک جنبش سی محسوس کرتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ ہندوستان اُس کا معدہ بھی دوسرے اعضا سے متاثر ہو کر اپنا کام کرنے لگے۔ گویا شاعر نے سچ کہا ہے کہ "عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا" اِن دق میں عرب افغانستان مصر فلسطین شام عراقِ عرب کا شمار بھی ہے۔ عرب میں امن و امان ہے۔ افغانستان میں ترقی کا ہیجان ہے فلسطین میں یہودی پسند انگلستان عربوں کی جد و جہد سے متاثر ہو رہا ہے۔ مصر میں الازہر تک میں ترقی کی برقی روشنی فروزاں ہے۔ عراقِ عرب میں انگریزوں کے چہیتے ہندوستانی غلام باہر نکال دیئے گئے ہیں۔

پھر ہندوستان بھی ہے! دیکھنے کو برِاعظم کہنے کو ملک لیکن اصل میں ایک قریہ بھی نہیں ایک ذرا سا گھرانہ بھی نہیں جس کے رہنے والے مل جل کر رہتے ہوں۔ سستی اور حسد یہاں کی تفریح لڑنا بھڑنا یہاں کا شغل حضور سلام یہاں کا کام! باقی اللہ اللہ اور رام رام! اگر دنیا کی ترقی کی یہ برق رفتاری نہ ہوتی اگر ساری دنیا کا ایک ہی خدا نہ ہوتا تو ہم ضرور کہتے کہ ہندوستان کے خدا کا نام ہی زوال ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم جو کبھی خدا کو یاد کیا کرتے تھے خدا ہم کو بھی شاید جلد ہی یاد کرنے والا ہے!

یورپ کے مدبرین ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اب امن و امان کا دور دورہ رہے گا۔ معاشی قوتوں کا توازن نوعِ انسان کا بیدار ضمیر لوکارنو کا عہد نامہ روس کی تجاویزِ امن کیلاگ کا معاہدۂ صلح و آشتی وہ کہتے ہیں کہ ان کے ہوتے جنگ ناممکن ہے۔ خدا کرے جنگ ناممکن ہو اور ناممکن ہو جائے۔ ہم کب جنگ ہی کرنا چاہتے ہیں ہم جو اسلحۂ جنگ کے نام تک سے بھی واقف نہیں۔ خدا کرے جنگ ناممکن ہو لیکن خدا کرے کہ اختلافات و مناقشات کے حل کا کوئی اور طریقہ بھی مغرب کے عقلمند اختراع کریں اور مغرب کی قومیں اُس پر عمل کرنا سیکھیں اور ہم غریبوں پر اُسے آزما دیکھیں! ـــــــ لیکن آہ ہم جب تک اپنے تئیں غریب و مسکین ہی سمجھے رہیں گے اِن زبردستوں کے ہاتھ سے رہائی نہ پائیں گے نہ پائیں گے! دنیا میں اُس وقت تک صحیح امن نہ ہوگا جب تک محکوم قومیں زبردست قوموں سے معاشرت کے اسفل طبقے امرا سے عورتیں مردوں سے اور سب سے بڑھ کر انسان کی روح اُس کے جسم و جان کے پست جذبات سے رہائی نہ پا لے گی! اہلِ بصیرت دیکھ رہے ہیں کہ یہ رہائی اور آزادی روز بروز خدا کی درگاہ سے لینے والوں کو برابر مل رہی ہے!

ا۔ب

زمانہ

زمانہ! تُو وہ ہے جس کو داور نے شاہِ دوراں بنا دیا ہے!
ازل سے لے کر ابد تلک سب پہ تیرا سکّہ بٹھا دیا ہے!

زمین کے ذرّے، فلک کے تارے، نظامِ شمسی، قمر کی گردش
غرض جہاں میں جو کچھ بھی ہے سب پہ نقش تیرا اُٹھا دیا ہے!

تجھی سے ہے ابتدائے عالم تجھی سے ہے انتہائے ہستی!
یہ کیسا آغاز و انتہا ہے؟ یہ کیا معمّا بنا دیا ہے!

تُو سب کا سردار ہے جہاں میں، ہے خاکِ پا یہ زمین تیری
فلک سے سرکش نے بھی ترے آگے اپنے سر کو جھکا دیا ہے

خدا کا سایہ ہے تُو... کہ پھیلا ہے نُور تیرا ہر ایک جانب
عجب وہ ناداں ہے جس نے انساں کو ظلِّ یزداں بنا دیا ہے

فلک ہے تیری ہتھیلی اور ماہِ نو ترا ناخنِ بُریدہ
کلیم حیراں ہے کس نے تجھ کو یہ دستِ معجز نما دیا ہے؟

ترے یہ دن اور تری یہ راتیں! زبانِ تغییر کی ہیں باتیں!
یہ تارے ہیں سب ترے اشارے کہ جن میں جادو ملا دیا ہے

دکھائے ہیں تُو نے وہ کرشمے کہ عقل بھی ہے خموش و حیراں
طلسم خانہ میں تُو نے انساں کو لا کے بُت سا بنا دیا ہے

وہ بحر ہے تُو، ہے تیرے ساحل پہ جبرئیلِ امیں صدف چیں
خدا نے گہرائیوں کا تیری کہاں کسی کو پتہ دیا ہے!

کوئی تو ہے جو ہے نیری لہروں کی موج سے سہہ رہا تھپیڑے
وہ کون ہے جس کو عقلِ کُل نے تراشنا در بنا دیا ہے؟
تُوہی تو روحِ بقا ہے، پنہاں ہے تیری ظُلمات ہی میں ہستی
تجھی نے دریائے زیست اقلیمِ بحر و بر میں بہا دیا ہے
کدھر ہے آبِ حیات تیرا کہاں لگی ہے سبیل تیری؟
تجھی نے اے دہر! ہم کو کیا آبِ زندگانی پلا دیا ہے؟
کہاں ہے وہ رشکِ خضر، پیرو ہے جس کا تُو صورتِ سکندر؟
وہ کون ہے جس نے تجھ کو آبِ بقا کا چشمہ دکھا دیا ہے؟
بہارِ جاوید خلد میں بھی نہ ہو گا یہ لطفِ دید، تُو نے
جو رنگ باغِ جہاں میں فصلِ گُل و خزاں کا دکھا دیا ہے!
تری جو نیرنگیاں ہیں کیا خُوب گل کھلاتی ہیں وہ جہاں میں
چمن کو بن اور بَن کو گلشن بنا کے تو نے دکھا دیا ہے
ہزاروں نغمے نکلتے ہیں جب کہ دیتا ہے تُو فلک کو گردش
کُروں کی حرکت میں تان بھر کر یہ کیسا باجا بجا دیا ہے؟
عجیب گائے ہیں راگ تُو نے جہاں کے قفقنس کی رُوح بن کر
جلایا شعلے نے تیرے جس کو پھر اُس کو تو نے جِلا دیا ہے
عجب تماشے دکھاتا بحرِ جہاں میں ہے مدّ و جزر تیرا
اِسے بڑھایا، اُسے گھٹایا، اُٹھایا اور پھر گرا دیا ہے
تری تُرش رُوئی نے کسی کے ہیں سر سے نشّے اُتار ڈالے
کسی کو تیری شرابِ الفت نے مستِ غفلت بنا دیا ہے

کسی کی ہستی کی داستاں تُو نے کی ہے تحریر آبِ زر سے
کسی کا نام و نشان حرفِ غلط کی صُورت مِٹا دیا ہے

ترے اشاروں نے کام تاروں کا ہے دیا بحرِ زندگی پر
تری ہی اُنگلی نے کاروانوں کو سیدھا رستہ دکھا دیا ہے!

بہت سی خفتہ نصیب قوموں کو اُن کے بالیں پہ جاکے تُو نے
ہلا ہلا کر جگا دیا ہے جگا جگا کر اُٹھا دیا ہے

اُٹھا کر اُن کو چلایا تُو نے رہِ ترقی پہ، اور آخر
عروج کی نردباں لگا کر فلک پر اُن کو چڑھا دیا ہے

بہت سی بیدار مغز قوموں کو تُو نے اِک دن سُلا کے چھوڑا
بہت سی اقوامِ مُردہ کو کہہ کے قُم باذنی جِلا دیا ہے

ہمیں پہ کیا اے زمانہ! چلتا نہیں ہے دنیا میں تیرا جادو
ہمیں ہی کیوں تُو نے دل سے اپنے بشکلِ وعدہ بھُلا دیا ہے؟

کہاں ترقی کی وہ حرارت؟ طبیعتیں بُجھ گئی ہیں اپنی!
اُٹھا کے تُو نے برنگِ آتش مثالِ خاک اب بٹھا دیا ہے

ہوئے ہیں سرد ایسے جوش اپنے کہ گرمجوشی ہے وہم باطل
رواں وہ دریا ہو کیسے یخ بستہ جس کو تو نے بنا دیا ہے

چلیں نہ لے شہسوار! جو ہم رکاب تیرے، وہ خاک دوڑیں
کہ تیرے توسن کی تیزیوں نے تو اُن کا خاکہ اڑا دیا ہے

عروج ہم کو دیا نہ ہوتا اگر دکھانا تھا یہ تنزّل
ہمیں چڑھایا تھا کیوں فلک پر جو یوں زمیں پر گرا دیا ہے

ہے تیرا غصہ کہ اک قیامت ہے، اُف رے ظالم یہ تیری بجلی!
ہمارے خرمن کو پھونک کر اُس کا نقشِ ہستی مٹا دیا ہے
خدا کو نازک مزاج تیرا پسندِ خاطر ہُوا ہے کیسے
خدا نے تجھ جیسا بحرِ ہستی میں ہم کو جو ناخدا دیا ہے
عقیدہ اپنا تو بس یہی ہے کوئی اسے مانے یا نہ مانے
خدا نے پردے میں تیرے چھُپ کر حجاب اپنا اُٹھا دیا ہے
جو تجھ کو سمجھا وہ اُس کو سمجھا، مگر نہ سمجھا جو تجھ کو اُس نے
خداشناسی کا سب سے پہلا سبق ہی دل سے بھلا دیا ہے
خیالِ فاسد جو دل میں ہو تو زباں پہ ذکرِ خدا سے حاصل؟
عمل میں فرمانِ حق کو جھٹلا کے حق کو باطل بنا دیا ہے
نہاں ہیں ایزد کے راز تجھ میں عیاں ہے تجھ سے خدا کی قدرت
تری جھلک میں ضیائے اولیٰ نے اپنا جلوہ دکھا دیا ہے
رسولِ حق ہے تُو اور زیبا ہے تجھ کو دعویٰ پیمبری کا
ازل کا پیغام بے کم و کاست تُو نے سب کو سُنا دیا ہے
زمیں کے ذرّے فلک کے تارے بندھے ہیں اک سلسلے میں سارے!
خدا نے ہر ایک شے پہ قانون کا تسلّط بٹھا دیا ہے!
نتیجہ ہر ایک کا مقرر ہے، عالم اسباب کا ہے دنیا
سنو کہ ہوگا وہی جو قدرت نے قاعدہ اِک بنا دیا ہے
چلو بھلائی کی راہ پر تم کہ بچ کے نکلو گے ہر بلا سے
جو غور سے دیکھو تو خدا نے ہر اک کو اک رہنما دیا ہے

ہیں بس مبارک جنہوں نے پیغام تیرا لکھا ہے لوحِ دل پہ
شقی و نا اہل ہیں جنہوں نے اُسے سنا اور بھلا دیا ہے

دکھا دے ہم کو رہِ ہدایت، سکھائے ہم کو وہ گُر جو تجھ کو
بٹھا کے گویا کہ رُوبرو اپنے خود خدا نے سکھا دیا ہے

وہ کیسے ناداں ہیں اے زمانہ جو کرتے رہتے ہیں تیرا شکوہ
کہ نوعِ انساں کو دے کے تادیب تو نے انساں بنا دیا ہے

یہ سچ کہا ہے کہ "جورِ اُستاد بہ زمہرِ پدر" کبھی ہم
سبق نہ بھولیں گے جو تری گوشمالیوں نے سکھا دیا ہے

ترے غضب میں بھی لطف ہے وہ کہ جس نے دیکھا ہے بس وہ جانے
کہاں ملے گا جو تیری چینِ جبیں نے ہم کو مزا دیا ہے

ترے جو ہیں یہ تغیّرات ان سے عیاں ہے اعجازِ دستِ قدرت
بخار سے تو نے پہلے حیواں پھر اُس سے انساں بنا دیا ہے

چلا چل اپنی یہی تو چالیں، تری روش پر فلک ہو قرباں
بنے گا اِک دن فرشتہ انساں کہ تُو نے رستہ دکھا دیا ہے

حجابِ خاک ایک آئینہ ہے کہ دیکھے جیوا ان ملک کی صُورت
وہ دستِ صنعت نے مادّہ کو ترے مجلّیٰ بنا دیا ہے

بجائے جا کوسِ عدل اپنا، سنائے جا حق کے فیصلے تُو
شہِ دو عالم نے ملکِ ہستی کا تجھ کو قاضی بنا دیا ہے

ہمیں زمانے کی حکمرانی پہ شکر واجب ہے اے ہمایوں
کہ ایسا منصف مزاج ہم کو خدا نے فرماں روا دیا ہے

حضرت ہمایوںؒ مرحوم

کنجِ عافیت

کشمیرِ مغرب یعنی سوئستان میں جنیوا جھیل کے جنوب مغربی دامن میں کلاراں کے گاؤں کے قریب ساحل سے کچھ ہی دُور ایک ننھا سا خطۂ زمین ہے جو سیر کرنے والوں کا فردوسِ نگاہ اور غور و فکر کرنے والوں کا عرشِ حسن و تخیل ہے۔ اس کا ایک ظاہری اور ایک باطنی عکس ہدیۂ ناظرین ہے۔

جنتِ مغرب کی اُس سیمین و زرّیں جھیل میں
آسمانوں کی جھلک ہے جس کے گہرے نیل میں

ساحلوں پر جس کے وہ آزاد دل آباد ہیں
کارنامے جن کے دنیا کو ابھی تک یاد ہیں

جس کے نظّاروں سے اک عالم کا دل مسرور ہے
جس کا ہر کنجِ چمن جلوہ گہِ صد طور ہے

اُس کی وسعت میں ہے اِک ننھا جزیرہ خوش نما
اِس طرح جیسے ہو ماں کی گود میں اک مہ لقا

زینت و زیبِ زمیں اک قصرِ عالی شان ہے
یعنی حسنِ اتحادِ فطرت و انسان ہے

اُس میں رہتی ہے جو اک دوشیزۂ شیریں ادا
ہے وہی اس آشیاں کی بلبلِ رنگیں نوا

خلدِ دنیا میں اگر ہے باپ کا گھر اُس سے ہے
تابِ زر اُس سے ہے آبِ رنگِ گوہر اُس سے ہے

وہ نسیمِ باغِ رعنائی وہی بوئے وفا
دیکھتی تھی ایک دن منظر فضائے شام کا

ناگہاں پانی میں اِک بچی اور اِک مردِ جواں
دونوں اپنی ناؤ کو کھیتے ہوئے گذرے وہاں

پُرخموش و گم تھا جیسے گیت اِک گایا ہؤا
سر نگوں وہ جس طرح اِک پھول کملایا ہؤا

آنکھ اُٹھا کر باپ نے دیکھا دریچے کی طرف
اِک نگہ ڈالی دوشیزہ نے بھی پیچے کی طرف

دیکھ کر بچّی کو اپنی باپ نے اک آہ کی
آہ بھر کر ایک گہری سی پھر اپنی راہ لی

صبر کر اور شکر کر اُس نے یہی دل سے کہا
رُک کے موتی بن گیا آنسو دلِ مزدور کا

محوِ غم اُس دن سے لیکن نازنیں رہنے لگی
چپکے چپکے نوعِ انساں کے وہ دکھ سہنے لگی

آخر اک شب اپنے تنہا باپ سے کہنے لگی
آنکھ سے اک آنسوؤں کی آبجو بہنے لگی

میرے اچھے باپ بیٹی ہے اگر تجھ کو عزیز
بندہ و آقا کی بیٹی میں نہ پھر رکھنا تمیز

کھول دینا آہ دراس قصرِ عالی شان کا
بے دھڑک کھیلے یہاں بچہ ہر اک انسان کا

گھر ہو یہ انسانیت کی عافیت کے واسطے
آئنہ وحدت کا ہو اک شش جہت کے واسطے

جس میں راحت ہو سبھی کی آہ راحت ہے وہی
جس سے مالا مال ہوں دل آہ دولت ہے وہی

د ۔ ب

باغوں کے پھول

باغوں کے پھول، سمندروں کے موتی، پہاڑوں کے ہیرے، اے جان! سب تیرے لئے ہیں
اور تو اِن سب سے محروم!

پھولوں میں خوشبو ہوتی جو وہ تیرے بالوں میں پروئے جاتے،
موتیوں میں دمک ہوتی جو وہ تیرے گلے کا ہار ہوتے،
ہیروں میں چمک ہوتی جو وہ تیری انگوٹھی کا نگینہ بن جاتے،

لیکن اب تو
پھول مرجھا رہے ہیں، موتی بے آب ہو رہے ہیں، ہیرے داغ دار ہوئے جاتے ہیں،
کیونکہ
تو آہ! تو اِن کی قسمت میں نہیں!

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اِن پھولوں اور موتیوں اور ہیروں کا اک ناچیز سا ہدیہ تیری خدمت میں پیش کروں کہ رات کی تاریکی میں دُور دُور تاروں کی انجمن سے کسی نے مجھے آواز دی:

چُن لے اپنے یہ پھول، سمیٹ لے اپنے وہ موتی، سنبھال لے اپنے سبھی ہیرے
کہ
اے کم نظر! مدت ہوئی جب میں نے اُس کو
نیکی کے پھولوں کا ہار حُسن کے موتیوں کی مالا اور محبت کے ہیروں کی انگوٹھی
پہنا دی!

باغبان

روبائے محبّت

دوستو مرجاؤں جب مَیں دفن کرنا تم مجھے — دُور دُنیا سے کہیں اِک بیدِ مجنوں کے تلے
بس کہ ہیں مرغوب مجھ کو اُس کی شاخیں اشک ریز — خُوب اُن سے کھیل کھیلے گی ہوائے عطر بیز
پتیاں پنکھا کریں گی تھپکیاں دے کر مجھے — اور سُلائیں گی ہوائیں لوریاں دے کر مجھے

شورشِ بزمِ جہاں میں کھو گیا ہے جی مرا — رونقِ ہستی سے غمگیں ہو گیا ہے جی مرا
کاش ہمدم میرے دل کا کوئی مِل جاتا کبھی — زندگی کا یہ گلِ پژمردہ کھِل جاتا کبھی
باغِ عالم میں اگر پاتا گلِ الفت کو مَیں — زندگی کے دشت میں روتا نہ یوں قسمت کو مَیں
کب تلک تیری جفا اے آرزو کوئی سہے — کب تلک یوں بھید دل کے کوئی دل ہی سے کہے
یہ ہوس کی زندگی ہے جاں کنی میرے لئے — یہ غرض کی دوستی ہے دشمنی میرے لئے
آنکھ آئینہ سا ہے اُس میں مروّت جب نہ ہو — دِل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے محبّت جب نہ ہو
کارزارِ زندگی میں امن ملتا ہی نہیں — گلشنِ دنیا میں دِل کا پھول کھلتا ہی نہیں
کوستی ہے دوستو دنیا کی آبادی مجھے — زہر ہیں بس زہر ہیں اِس کے غم و شادی مجھے

دوستو مرجاؤں جب میں دفن کرنا تم مجھے — دُور دنیا سے کہیں اِک بیدِ مجنوں کے تلے
بس کہ ہیں مرغوب مجھ کو اُس کی شاخیں اشک ریز — خوب اُن سے کھیل کھیلے گی ہوائے عطر بیز
پتیاں پنکھا کریں گی تھپکیاں دے کر مجھے — اور سُلائیں گی ہوائیں لوریاں دے کر مجھے

چھُوٹ جائے جسم و جاں کی قید سے میرا وجود — اِس زمیں اِس آسماں کی قید سے میرا وجود

اِس زیان وسُود کی دنیا سے جب کھو جاؤں مَیں
مجھ کو ہونا ہے مقدّر ہیں جو کچھ ہو جاؤں مَیں

قبر میں سو جاؤں جب مَیں جاگ اُٹھے میرا نصیب
اِک حیاتِ تازہ دے آکر مجھے میرا حبیب

منتشر ہر سُو ہیں جس کے حُسن کی باریکیاں
جس کی آنکھوں سے منوّر ہیں سبھی تاریکیاں

جس کی موتی میں دمک ہے جس کی تاروں میں چمک
جس کی سبزے میں لہک ہے جس کی پھولوں میں مہک

جلوہ گر جو چاند میں ہے دیکھ لوں وہ مہ جبیں
دُور دنیا سے کہیں ہاں دُور دنیا سے کہیں

دُور دنیا سے کہیں اے دوست مِل جائے جو تُو
تیری غمخواری میں پالوں زندگی کی آبرو

پھر چمک اُٹھے مرے سینے میں میری آرزو
میرے مرجھائے ہوئے پھولوں میں پھر پیدا ہو بُو

رازِ فطرت کی رہے مجھ کو نہ تجھ کو جستجو
تجھ میں مَیں ہو جاؤں روشن اور ظاہر مجھ میں تُو

تیری دنیا کے لئے مَیں رنگِ تصویرِ حیات
میرے دل کے واسطے تُو عکسِ تنویرِ حیات

تیری آنکھوں میں نہاں ہو منظرِ حسن وجمال
تیری باتوں سے عیاں ہو شوکتِ علم وکمال

میری تنہائی سے ہے منسوب میری ہر کمی
تجھ میں پوری ہو مرے محبوب میری ہر کمی

مدتوں سے ابرِ ظلمت دِل پہ ہے چھایا ہوُا
غنچۂ امید ظلمت میں ہے کملایا ہوُا

مدتوں سے جوہرِ فطرت سے ناآگاہ ہوں
اپنی راحت کے لئے بے سُود سی اِک آہ ہوں

میری راتوں کا ستارہ ہے مگر اے دوست تُو
مَیں ہوں تاریکی مرا نورِ سحر اے دوست تُو

تو محبت کے چمن کی راہ دکھلائے مجھے
جو سبق بھولا ہوُا ہوں مَیں وہ سکھلائے مجھے

نفس کو میرے جلا ڈالے تری عصمت کی آگ
رُوح کو بیدار کر دے باہمی اُلفت کا راگ

مجھ کو رہ رہ کر جگائیں رس بھری باتیں تری
تیری خلوت میں گذر جائیں یونہی راتیں مری

زندگی کی رات ہو خوابِ محبّت کے لئے
دل اُٹھائے یہ مشقّت اِس مسرّت کے لئے

ا ب

کیفِ موسیقی

کانپتی ہیں انگلیاں مطرب کی جب بے اختیار
راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار

دوڑتا ہے عشق کا جب نبضِ آہن میں لہو
لحن کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے دل کی آرزو

نغمۂ شیریں کا جب گرتا ہے میٹھا آبشار
دل کو چھو لیتی ہے اک مومِ سی باریک دھار

درد سے کھاتی ہیں جب موجیں ہوا کی پیچ و تاب
اُڑنے لگتی ہے رخِ ابلائے ماضی کی نقاب

دن ہی رہتا ہے نظر کے سامنے باقی نہ رات
ساز کے پردے میں چھپ جاتی ہے ساری کائنات

لے میں زلفوں کی طرح جس وقت لہراتا ہے دل
اک فسوں منظر جزیرے میں پہنچ جاتا ہے دل

روح ہوتی ہے جہاں اُس گم شدہ شے سے دوچار
جس کے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار

پھر بھی پانے کی طرح اُس چیز کو پاتا نہیں
شکل سے پہچانتا ہوں نام یاد آتا نہیں

جوشؔ

بندۂ دنیا

خائب ٹھہرا، خاسر نکلا، بندہ ترا دنیا! ——— سفاک ہے غدار ہے تُو دُنیا! اے دنیا!

حرص و ہوا کا پھندا ہے ہر سُو پھیلا ہُوا ——— آخر نادم ہُوا اے دنیا جو تیرا ہُوا

تر دامنی کا سو ساماں ہر ہر قدم پر ہے ——— بحرِ معاصی کا طغیاں ہر ہر قدم پر ہے

انسان غافل، بے خبر، بُھولا بھٹکا ہُوا ——— نادان، جاہل، بے بصر، کس کا شیدا ہُوا

پانی کا بلبلہ سا ہے ہر خواہش نفسانی ——— مرتا ہے ناداں اُس شے پر جو شے ہے خود فانی

یارب! ہے کس تگ و دو میں، مدہوش مستانہ ——— عقل و خرد کو روندتا جاتا ہے دیوانہ

منہ زور ہے پیکِ ہوس، جذبات اُس کی باگیں ——— تیزی اتنی اُس کی رَو میں جتنی ڈھیلی باگیں

حیواں سے بدتر نفس کے ہاتھوں میں انساں ہے ——— انسانیت کے خون سے آلودہ داماں ہے

اے نفس کے بندے! کب تک شورِ ہوس آخر ——— سیلِ فنا میں تو ہو گا خاشاک و خس آخر

ہر آن سایہ موت کا ہے ہم سفر تیرا

یہ زندگی دو دن کی ہے، دو دن کا یہ میلا

حامد علی خاں

البانیہ

ماضیہ قریبہ کے مورخ اور زمانہ حالیہ کے سیاست دان کے لئے یہ امر نہایت درجہ دلچسپ ہے کہ پچھلی جنگِ عظیم کے بعد جن لوگوں نے اپنا نام جریدۂ عالم پر ثبت کیا ہے اُن میں سے اکثر و بیشتر مسلمان ہیں۔ دورانِ جنگ میں جن جن رہبروں اور ہادیوں کے نام سننے میں آئے تھے اُن میں سے اکثر کو یا تو مجبوراً خانہ نشین ہونا پڑا ورنہ اُن کی حیثیت خود اپنے ممالک میں محض ثانوی رہ گئی۔ آج قیصر ولہلم دوم، لائڈ جارج، شہنشاہ کارل، زار نکولس، سینیور جیولیتی، شاہِ فرڈیننڈ، وڈرو ولسن، یہ سب کہاں ہیں؟ بعض ملکِ عدم کو سدھارے، بعض کو آج کے سیاست دانوں میں کوئی پوچھتا نہیں، بعض اب بھی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں لیکن اُن کی اہمیت پہلے کی بہ نسبت عشرِ عشیر بھی باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس جنگ کے بعد جن لوگوں نے دنیا کا بوجھ اپنے کندھوں پر لینا چاہا اُن میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا، رضا شاہ پہلوی، امان اللہ خاں اور عبد العزیز ابن سعود کا پایہ نہایت درجہ ممتاز ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دیکھو، خواہ تم اُس کے طرزِ کار سے متفق ہو یا نہ ہو، تم کم از کم اتنی داد تو ضرور دو گے کہ اُن میں سے ہر ایک نسبتہً گمنامی سے آسمانِ سیاسیاتِ حاضرہ کا ایک نہایت ہی درخشاں ستارہ ہے۔ ممکن ہے کہ عالمگیر اسلامیت کا تخیل کچھ عرصے کے لئے پسِ پردہ ہو گیا ہو، لیکن جن عناصر سے اس کی ترکیب کی جاتی اُن میں پہلے سے بدرجہا زیادہ زور، قوت و سطوت پائی جاتی ہے۔

دنیائے اسلام میں جدید بادشاہِ البانیہ احمد زوغو کی شخصیت بھی نہایت درجہ ممتاز ہے۔ البانیہ دنیا کا اس قدر چھوٹا رقبہ ہے اور ہم سے اس قدر بعید ہے کہ اس جدید تاجدار کی تخت نشینی سے پہلے ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس امر سے بھی واقف نہ تھے کہ البانیہ میں سرے سے مسلمان بھی آباد ہیں یا نہیں اور اس ملک کی زمامِ حکومت دراصل کس کے قبضے میں ہے۔ احمد کی تخت نشینی جمہوریت پسندوں کے لئے کتنی ہی سوہانِ روح کیوں نہ ہو، اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ دنیا کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو، جو پہلے اس ملک کے نام سے بھی بمشکل آشنا تھی، اُس کے ساتھ گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

احمد بک کی شخصیت اور کارناموں کا صحیح اندازہ کرنے سے پہلے ملک کی عام تاریخ اور جغرافیہ پر نظر ڈالنا چاہئے۔ البانیہ، جسے خود البانی لوگ شقی پے نیہ کہتے ہیں، جزیرہ نمائے بلقان کے مغرب میں بحیرۂ اڈریاٹک کے

کنارے ملک اٹلی کے بالکل مقابل میں واقع ہے۔ یوں تو جنگِ بلقان (۱۹۱۳ء) کے بعد صلحنامہ بخارست کے ذریعے سے البانیہ کو نہایت ہی تنگ حدود میں مقید کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحقیقت تقریباً نصف البانی قوم یا تو دوسرے ملکوں میں از خود جا کر آباد ہو گئی ہے ورنہ اسے مجبوراً صلحنامہ سازوں کی مہربانی سے دوسروں کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈالنا پڑا ہے۔ مملکتِ البانیہ کم و بیش عرض البلد ۴۰ و ۴۲½ اور طول البلد ۱۹½ و ۲۰½ کے مابین مقید ہے، چنانچہ اُس کے شمال میں شمالی البانی الپ، مشرق میں شار داغ، جھیل اوخریدہ، جنوب میں آبنائے کورفو اور منبع دریائے دستر تزا اور مغرب میں بحیرۂ اڈریاٹک واقع ہیں لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو البانیوں کا ایک بڑا گروہ ان حدود سے باہر دوسرے ممالک میں آباد ہو گیا ہے۔ خود جزیرہ نمائے بلقان میں البانیہ کے متصل البانی آبادی کا رقبہ معین کرنا ہو تو اُس کے حدود کے لئے ہمیں ایک ایسا خط کھینچنا پڑے گا جو برانہ، متروو تزا، ورانیہ، اسقوبلیہ، مناستر، فلورینہ، قصریہ اور پارگا میں ہو کر گزرے۔ اگر ہم مملکتِ البانیہ اور البانیوں کی مسلسل آبادی کے رقبے کا مقابلہ کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ کم از کم نصف رقبہ مملکتِ البانیہ سے باہر ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ امر ہے جو البانیہ، یوگوسلافیہ اور یونان کے درمیان مابہ النزاع ہے، چنانچہ یہ دونوں موخر الذکر مملکتیں البانیوں کے جائز حقوق تسلیم نہیں کرتیں اور البانی آبادی کو خواہ مخواہ اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتی ہیں

ان یکجا البانی خطوں کے علاوہ البانیوں کی ایک تعدادِ خطیر اُن کے باہر بھی
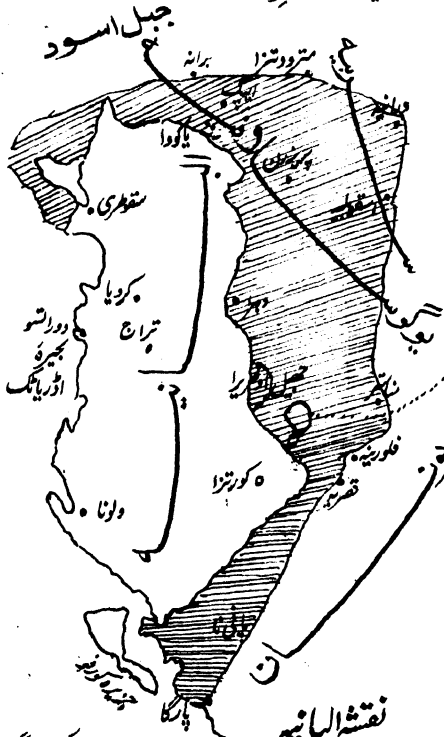
نقشہ البانیہ

مملکتِ البانیہ الگ محدود کر دی گئی ہے اور جن حصوں پر خطوط کھینچ دیئے گئے ہیں اُن میں اکثر آبادی البانی ہے لیکن انہیں یوگوسلافیہ یا یونان کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔

آباد ہے، چنانچہ خاص ارضِ یونان کے حصہ جات اٹیکا، آرگولس، کورنتھ و جزیرۂ ہیدرا میں تقریباً دو لاکھ البانی پائے جاتے ہیں؛ اسی طرح علاقہ جات (اپولیہ) (اٹلی) و سسلی میں دو لاکھ سے زائد البانی آباد ہیں جنہوں نے اپنے نئے وطن میں تقریباً پانچ سو سال رہنے سہنے کے باوجود اپنی علیحدہ شخصیت قائم کر رکھی ہے۔ اس وقت مملکتِ البانیہ کی آبادی ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب ہے، لیکن اگر اس میں دو لاکھ خاص ارضِ یونان کے البانی دو لاکھ اطالوی البانی اور کم از کم پانچ چھ لاکھ یوگوسلافیہ اور شمال و مغربی یونان کے البانی باشندے شامل کرلئے جائیں تو البانی قوم کی مجموعی تعداد کم و بیش اٹھارہ لاکھ ہو جاتی ہے۔

البانیہ خاص کے ساڑھے آٹھ لاکھ باشندوں میں سے پانچ لاکھ چوراسی ہزار مسلمان، ڈیڑھ لاکھ راسخ الاعتقاد عیسائی اور اٹھاسی ہزار رومن کیتھولک ہیں۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد وسطی علاقہ میں آباد ہے جہاں تین لاکھ میں سے ڈھائی لاکھ اسلام کے حلقہ بگوش ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں جہاں اس قدر اختلافِ مذاہب ہو اور جہاں اسلام کے نام لیواؤں کی تعداد غالب ہو، کسی قسم کا جبر و تشدد روا نہیں رکھا جاسکتا، چنانچہ البانیہ میں ہر شخص کو عقائد کی مکمل آزادی حاصل ہے اور حکومت کو رعایا کی تالیفِ قلب اس درجہ ملحوظ ہے کہ اُس نے اپنی رومن کیتھولک رعایا کے مذہبی پیشوا یعنی پاپائے روما کے ساتھ ۱۹۲۸ء میں ایک معاہدہ کرلیا ہے جس کے بموجب فریقین ایک دوسرے کے مستقر پر اپنا اپنا نمائندہ مقرر کریں گے اور البانی کیتھولک گروہ کو عبادت و عقائد دونوں کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ رہا راسخ الاعتقاد فرقہ، تو اُس کا کسی بیرونی مذہبی ادارے سے تعلق نہیں، بلکہ ۱۹۲۲ء سے اُس نے ایک قومی کلیسا کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

اس ملک کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ البانی قوم جنوب و مشرقی یورپ کی قدیم ترین قوم ہے۔ اس لئے کہ ہمیں افسانوں یا تاریخ سے اُن کے جزیرہ نمائے بلقان میں آنے اور آباد ہونے کا مطلق پتہ نہیں ملتا، اور غالباً وہ الیریائی اور ایپا ئیروسی اقوام کی جانشین ہے جنہیں قدیم یونانی "بربری" کے نام سے پکارتے تھے۔

سلطنتِ روما کے زوال کے بعد یہ خطہ سلطنتِ بیزنطہ میں شامل ہوگیا اور شمالی حصہ صوبہ ویراخیوم اور جنوبی صوبہ نکوپولس کہلانے لگا۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں قوطیوں نے اس پر حملہ کیا اور ملک پر حاوی ہوگئے، لیکن ۵۳۵ء میں یوستی نیان نے اسے از سرِ نو فتح کر کے اُس کا الحاق اپنی سلطنت سے کرلیا۔ ۶۴۰ء سے ۱۳۶۶ء تک کا زمانہ اس کی تاریخ کا سب سے تاریک زمانہ ہے، جب اس بدنصیب ملک کو کبھی سربیوں کا، کبھی کروتیوں کا، کبھی صقالبیوں کا طوقِ غلامی اپنی گردن میں ڈالنا پڑا۔ آخر کار ۱۳۶۶ء میں البانیوں نے غیر ملکی جوا اپنی گردن سے

اتارسپینکا اور ملک پر خود البانی سربرآوردہ قبائل یا ایسے قبیلے حکومت کرنے لگے جو یہاں آکر آباد ہوگئے تھے اور یہاں کے باشندوں میں مکمل مل گئے تھے۔ انہی خاندانوں میں سے ایک کاستریوتا خاندان تھا جو شمالی علاقوں مثلاً دوبر اتسوا اور کرویا میں حکومت کرتا تھا۔ اسی خاندان کے افراد میں سے ایک جان کاستریوتا تھا جس نے "سکندربیگ" کے لقب سے البانیہ کی تاریخ میں کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں اور جس کے نام کو آج بھی البانیہ میں بے حد تفوق حاصل ہے۔

۱۴۳۱ء میں یعنی سلطان مرادخاں ثانی کے عہد میں ترکوں نے یانی نا پر قبضہ کرکے گویا البانیہ پر اپنا علم بلند کردیا تھا اور اس طرح اُن البانیوں کو متحد کردیا جن میں صدیوں سے اختلاف چلا آتا تھا، اور جن میں بجائے ملکی وطن پرستی کے قبائل پرستی کا جذبہ زیادہ راسخ تھا، چنانچہ البانیوں کے ایک بڑے گروہ نے متفقہ طور پر جان کاستریوتا کی سرکردگی میں ترکوں کے خلاف نہایت شدومد سے مدافعت کی۔ جان کی ابتدائی زندگی سلطانِ روم کے دربار میں بسر ہوئی تھی اور اسی مناسبت سے اُس نے اب اپنا لقب "سکندربیگ" رکھ لیا۔ جب اسے ترکی نظربندی سے رہائی ہوئی تو اُس نے اپنے معلومات سے فائدہ اٹھاکر اور ترکوں کے کمزور پہلو کا اندازہ کرکے اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور کرویا کے پہاڑی قلعہ کو اپنا مستقر بناکر مسلسل بائیس سال تک اُن سے جنگ آزما رہا، لیکن اُس کی تمام کوششیں بالکل بے سود و رائگاں ثابت ہوئیں، چنانچہ سولھویں صدی کے اختتام سے پہلے ہی البانیہ کا شاذ ہی کوئی حصّہ ایسا تھا جو ہلال و ستارہ کے زیرِ اثر نہ آگیا ہو۔

سلطنتِ عثمانیہ کی عملداری میں البانیوں کی اندرونی آزادی کو بہت کم گزند پہنچا، اور عمالِ حکومت نے قومی ادارات کے نشوونما میں کبھی زائدازضرورت مداخلت نہیں کی۔ دراصل البانیہ اور سلطنتِ عثمانیہ کے مابین صرف ایک وسیلہ تھا، یعنی البانی قوم کا ایک قائم مقام "بلوک باشی" شہر سقوطری میں رہتا تھا اور اسی کی نگرانی میں البانی "بیوہا" یا عمائد مختلف قبیلوں میں قوانینِ عثمانیہ کا نفاذ کرتے تھے۔ جب سلطنتِ عثمانیہ کو زوال ہوا تو بہت سے البانی پاشاؤں نے جگہ جگہ نیم آزاد ریاستیں قائم کرلیں۔ ایسی ممتاز ترین ریاستیں محمد پاشا بوشاطی کی ریاست سقوطری اور علی پاشا تپلینی کی ریاست یانی نا تھیں جن میں سے موخرالذکر ہی وہ شخص ہے جس کا دربار یونانی مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے لئے گویا وقف تھا، اور جہاں کے تربیت یافتہ باغیوں نے آخرکار یونان میں بغاوت کرکے گویا سلطنتِ عثمانیہ کے تابوت میں پہلی کیل ٹھونک دی۔ آخرکار انیسویں صدی کے ابتدا میں سلطنتِ عثمانیہ کو ازسرنو مطیع و منقاد کرنے کا تہیّہ کرلیا اور اسی حکمتِ عملی کے بموجب ۱۸۲۲ء میں یانی نا اور ۱۸۳۱ء

میں سقوطری کے پاشالکوں کا خاتمہ کردیا۔

انیسویں صدی کے نصف ثانی میں البانیہ کی حالت میں مدوجزر کی کیفیت نظر آتی ہے کبھی تو البانی اپنے ترک بھائیوں کے ساتھ مل کر ۱۸۷۶ء میں آسٹریا ہنگری اور جبلِ اسود کے چھوٹے دعاوی کی مخالفت پر تلے نظر آتے ہیں کہیں دو ہی سال بعد وہ خورشید پاشا سپہ سالار عساکرِ عثمانی کے ساتھ دست و گریباں دکھائی دیتے ہیں لیکن حال کے زمانے تک البانیہ کی قبیلہ بندی اور اختلافِ مذاہب و روایات وہاں کے باشندوں کو متحد و متفق نہیں ہونے دیتے اور اُن میں کسی قسم کے اتحاد و یگانگت کا عنصر کم نظر آتا ہے، چنانچہ باوجود اُن کی سیدھی سادی زندگی اُن کی بے مثل شجاعت اور اُن کی انتہائی وفاشعاری کے صفات کے، انہیں یورپی دول مہرۂ شطرنج بنا کر اپنا کام نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں جب سلطان عبدالحمید خاں ثانی نے اپنی رعایا کو پارلیمنٹی دستور عطا کیا تو اس سے نہ صرف البانی بلکہ سلطان المعظم کی تمام مسلم و غیر مسلم رعایا کو بے حد اطمینان ہؤا، اور سب نے خیال کیا کہ اب ایک ایسے عہد کا آغاز ہوا ہے جس میں آزادی ہی آزادی ہوگی اور تمام مصائب سے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن جب اِس دستور کے بعد زمامِ حکومت نوجوان ترکوں کے قبضے میں آئی تو انہوں نے یہ عزم کرلیا کہ تمام سلطنت عثمانیہ کی تمام رعایا کو ترکی سانچے میں ڈھال دے تاکہ آئندہ جہاں تک سلطنتِ عثمانیہ کا تعلق ہے، بلغاری، ارمن، یونانی اور البانی کا مسئلہ بھی باقی نہ رہے۔ اِس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ترکوں نے دوسرے صوبوں کی طرح البانیہ کی زبان اور رسم و رواج کی بھی بیخ کنی کرنی چاہی جس کی وجہ سے البانی رعایا میں سخت بے چینی پیدا ہوگئی۔ ۱۹۱۲ء میں البانیوں نے علمِ بغاوت بلند کیا اور ترکوں کو مجبور کیا کہ وہ البانی ولایات سقوطری، کسوور، یانینا اور مناستر کو سوراج دے دیں۔ البانی قومی مطمحِ نظر کے لئے یہ ایک عظیم الشان کامیابی تھی، اِس لئے کہ اِس دفعہ شاید تاریخ میں پہلی مرتبہ البانیہ کے حدود کا تعین کیا گیا اور یہ طے کردیا گیا کہ البانیہ میں فی الحقیقت یہ چاروں ولایات شامل ہیں۔

جنگِ بلقان کے دوران میں البانیہ کے اکثر حصوں پر سرب اور جبلِ اسود ی قابض ہوگئے، اور البانیہ کی دیرینہ آرزوؤں پر گویا پانی پھر گیا۔ لیکن بمصداق "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" اسمٰعیل کمال بک جو فرید پاشا سابق صدرِ اعظم دولتِ عثمانیہ کے رشتے کے بھائی تھے یکایک نمودار ہوئے اور انہوں نے یہ کوشش شروع کردی کہ کس طرح آسٹریا ہنگری اور اٹلی کو البانیہ کا ہمنوا بنا کر اُسے آزادی دلائیں لیکن روس کے علی الاعلان حلفاءِ بلقان کی ہمنوائی کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں البانیہ کی وجہ سے یورپ میں آتشِ جنگ نہ بھڑک اُٹھے خطرۂ جنگ

اس درجہ بڑھا کہ دولِ یورپ میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لئے، برطانیہ نے معاملاتِ البانیہ میں مداخلت کر دی اور آخر کار یہ قرار پایا کہ سقوطری اور اُس کے ملحق علاقوں کو آزادی دی جائے، لیکن اپیک، پرزرند، دبرا اور یاکووا سربیہ اور جبلِ اسود کے ابین تقسیم کر دیئے جائیں، اور جنوبی البانیہ کا ایک معتد بہ حصہ یونان کے حوالہ کر دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ البانیہ کے تخت پر ولیم شاہزادۂ ویڈ متمکن ہو، چنانچہ ۷ مارچ ۱۹۱۴ء کو اس فرمانروا نے دورانسو آکر حکومت کا جائزہ لے لیا۔ لیکن ولیم کو اپنی راجدھانی میں قدم رکھتے ہی بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ وہ البانی النسل تھا، نہ کسی البانی مذہب کا پیرو، نہ عادتاً اُس میں کسی ملک کا بادشاہ بننے کی اہلیت تھی نہ وہ عزم و استقلال اور صلاحیت پائی جاتی تھی جو البانیہ جیسے جھگڑے بھرے ملک کے حکمران کے لئے لازمی تھی، چنانچہ وہ تین ہی مہینے نہایت دشواری سے حکومت کرنے کے بعد جنگِ عظیم چھڑتے ہی وہ البانیہ سے ہمیشہ کے لئے اپنے وطنِ مالوف یعنی جرمنی چلا گیا۔

جنگِ عظیم کے دوران میں البانیہ کبھی سربیوں کے قبضے میں، کبھی یونانیوں کے چنگل میں اور کبھی اطالویوں کے پنجے میں رہا، اور جنگ کے اختتام پر ملک کے اکثر حصوں پر اطالوی افواج قابض تھیں۔ یوں تو دورانِ جنگ میں ایتلافیوں نے البانیہ کو تقسیم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، لیکن اس بدنصیب ملک کی قطع و برید کی باضابطہ تحریک اختتامِ جنگ پر ہی ہوئی، اور اگر وڈرو ولسن صدرِ جمہوریۂ ممالکِ متحدۂ امریکہ اسے قطعاً مسترد نہ کر دیتا تو شائد آج نقشے میں البانیہ کا کہیں نام بھی نہ ملتا۔ اسی افراتفری کے زمانے میں اطالوی نہایت غیر مقبول ہو گئے تھے، اور جگہ جگہ اُن کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی، چنانچہ فروری ۱۹۲۰ء میں ایک جدید البانی حکومت بمقام ترانا سلیمان بک ولیونیہ کی صدارت میں قائم ہوئی اور آخر کار ۲۔ اگست ۱۹۲۰ء کو اٹلی البانیہ کی مکمل آزادی و خود مختاری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

۲۔ اگست ۱۹۲۰ء سے یکم ستمبر ۱۹۲۸ء تک البانیہ کی حیثیت جمہوریہ کی سی رہی اور ملک نے شاہراہِ ترقی پر بڑے بڑے قدم اٹھائے۔ ملک کا صدر مقام ترانہ قرار پایا جہاں ایک دو ایوانی پارلیمنٹیں قائم کی گئیں۔ حکومت کا ڈھانچا رفتہ رفتہ یہ ہو گیا کہ دارالنائبین میں چار چار سال کے لئے ۵۴۔ ارکان، عام انتخاب کے اصول پر منتخب ہوں اور مجلسِ سنیات کے ۱۸، ارکان میں سے ۱۲ چھ سال کے لئے منتخب ہوں اور چھ صدرِ جمہوریہ نامزد کرے۔ علاوہ اس کے فرانس کے طرز پر دونوں ایوان یکجا ہو کر صدرِ جمہوریہ کو سات سال کے لئے منتخب کرتے تھے، لیکن فرانس کے دستور کے برخلاف یہاں کے صدر کو (ممالکِ متحدۂ امریکہ کے صدر کی طرح) وسیع اختیاراتِ عاملہ حاصل تھے۔ قوانین

ملکی پر بھی نظرِ ثانی کی گئی، چنانچہ یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو ایک جدید قانونِ تعزیرات کا نفاذ ہوا۔ اس سے قبل ہی ملک کے آٹھوں صوبوں میں ایک ایک عدالت ابتدائی اور مستقرِ جمہوریہ میں چھ عادلوں کی ایک عدالت العالیہ قائم ہو چکی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں البانیہ "اتحادِ ڈاکخانہ جات بین الاقوامی" کا رکن ہو گیا اور اسی سال اُس نے اپنے سفیر مختلف دولِ یورپ کے صدر مقاموں کو روانہ کر دیئے۔

۳۔ دسمبر ۱۹۲۲ء سے موجودہ شاہِ البانیہ احمد بک زوغو افق سیاسیات پر پوری تابناکی کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور اُسی روز سے آج تک کی تاریخ دراصل اسی حوصلہ مند اور صاحبِ عزم البانی کے کارناموں کی تاریخ ہے۔ احمد بک کو جون ۱۹۲۳ء سے دسمبر ۱۹۲۳ء تک کے لئے اپنے ملک کو خیرباد کہہ کر بلغراد بھاگ جانا پڑا، اور اس دوران میں ملک کا انتظام رومن کیتھولک پادری فان نولی کے قبضے میں آ گیا۔ لیکن احمد کے جاتے ہی شمال و مشرقِ البانیہ میں بغاوت کے شعلے پھیل گئے اور آخرکار ۲۴۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کو احمد از سرِ نو البانیہ میں داخل ہوا۔ ۱۹۲۴ء ہی سے اُس نے یہ تہیہ کر لیا کہ البانیہ کی بہتری اسی میں ہے کہ ہمسایہ ممالک اور دولِ عظمیٰ سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے جائیں، چنانچہ اسی مقصد کے حصول کے لئے اُس نے خانقاہِ شنت نعوم جو جھیل اوخریدا کے کنارے پر واقع ہے یوگوسلافیہ کے حوالہ کر دی، مٹی کے تیل کے چشموں کا ٹھیکہ ایک برطانوی شرکت کو دے دیا اور البانی قومی بنک کی ترتیب و تنظیم کا کام اٹلی کے سپرد کر دیا۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں جدید پارلیمنٹ نے جو ترانہ میں مجتمع ہوئی، احمد بک کو

آنکھ کا جادو

ڈراما

مصنّف

مصنّف کا دوست

مصنّف کی معشوقہ

معشوقہ کی سہیلی

پہلا پردہ وقت ساڑھے دس بجے دن

(مصنّف ہاتھ میں کاغذ لئے اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ اُس کا دوست دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اُس کے "درآئیے" کہنے پر داخل ہوتا ہے۔)

دوست۔ تم اور کاغذ! وہی دماغ کو چکرا دینے والی پُرانی تصویر! تم تو شاید کفن بھی کاغذ کا بنواؤ گے؟

مصنّف۔ نہیں، ہرگز نہیں! کاغذ، وہ کاغذ جس پر اُس کا نام ہو اُس کے نام کی یاد ہو، زندگی کا بہترین تحفہ ہے۔ کفن چاہے وہ کتان و حریر کا ہو اور اُس پر مقدس ترین الفاظ پاک ترین ہاتھوں سے کشیدہ کئے ہوں دنیا کی بدترین گالی ہے۔ جس کی زندگی بجائے خود ایک شعلہ ہو وہ کفن کا محتاج نہیں ہوتا۔

دوست۔ سبحان اللہ! کیا پرواز ہے؟ (یہ کہہ کر مصنّف کے ہاتھ سے یک لخت کاغذ چھین کر اُسے بلند آواز سے پڑھنے لگتا ہے۔ مصنّف بے بس ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

(کاغذ کی تحریر)

مجھے لفظ چاہئیں۔ دراز قد ریش پوش سیاح لفظ نہیں بلکہ وہ جنہیں گھر سے باہر قدم نکالنے کی عادت کم ہو۔ بھولے بھولے۔ صاف مگر گہرے اور چمکیلے بالکل تیری آنکھوں کی طرح۔ وہ لفظ اگر آ جائیں تو تجھے ایک بات کہوں۔ بالکل چپکے چپکے۔ تو تاروں کو دیکھا کرتی ہے۔ کاش کہ میں آسمان بن جاؤں اور پھر تجھے اتنی آنکھوں سے دیکھوں جتنے تارے ہیں! کس قدر تجھے دیکھ لوں؟

تو باغ میں نکلتی ہے۔ کاش میں باغ کی ہوا بن کر چاروں طرف سے تجھے لپٹ جاؤں، مَیں تجھے دیکھوں تو مجھے نہ دیکھے!
تیرے لئے زندگی ایک معمّا ہے۔ میرے لئے تو ایک پہیلی ہے۔ کاش کہ مَیں تجھے بوجھ لوں اور تیرا معمّا بن جاؤں!

(مصنف کا دوست باقی تحریر نہیں پڑھتا اور کاغذ کو مصنف کی گود میں پھینک کر یوں مصنف سے مخاطب ہوتا ہے)

دوست - بھئی ہو بڑے حضرت۔ ضرور کسی نہ کسی دن ایک نئے فیشن کی بکواس کے موجد قرار دیئے جاؤ گے مگر جس غریب پر یہ بوچھاڑ ہے اُن کا حلیہ تو ذرا بیان کرو اور آخر یہ سچ مچ کا خط ہے یا محض لفظی طبع آزمائی؟

مصنّف - سچ مچ کا خط ہے جسے کبھی کوئی ڈاک والا چھونے نہ پائے گا۔

دوست - یہ تمہاری مرضی مگر بندے کی یادداشت ایسی بری نہیں۔ جو اُن کا پتہ عنایت ہو جائے تو بلاتامل جا کر سنادوں۔

مصنّف - سبحان اللہ کیا پرواز ہے؟

دوست - تو آخر تم پتہ نشان بتانے سے اِس قدر کتراتے کیوں ہو؟

مصنّف - واللہ بالکل گدھے ہو۔ یہ خط میری طرف سے میرے ایک سابق قصّے کی ہیروئن کی طرف ہے۔

دوست - میں ہارا۔ ڈاکٹری کتابوں میں ہر قسم کے خبط کا علاج ہے مگر اس مرض کا ذکر نہیں کہ اگر مصنف خود اپنے تخیل کی زائیدہ ہیروئن پر عاشق ہو جائے تو کیا کیا جائے۔

مصنّف - تسلیم۔ اب تو آپ کو یقین آیا کہ میں بھی نیا میرے مرض بھی نئے۔

دوست - ضرور۔ تم بھی نئے تمہارے جھوٹ بھی نئے مگر جو تمہاری معشوقہ سُن پائیں گی تو انہیں وہ رہا سہا شک جو تمہارے مخبوط الحواس ہونے میں ہے وہ بھی جاتا رہے گا اور مَیں اُن کی طرف سے تمہارے لئے پیغام لایا تھا۔

مصنّف (چونک کر) کیا؟

دوست - یہ کہ آج چار بجے بعد دوپہر تم چاء پر اُن کے ہاں آنکلنا۔

مصنّف - کون کون آرہا ہے؟

دوست - چائے ہے اور پھر ٹینس۔ سنتا ہوں کہ اُن کی ایک سہیلی وارد ہوئی ہے اور چونکہ وہ ٹینس نہیں کھیلتی یا کھیلنا نہیں چاہتی تو تمہاری ضرورت محسوس ہوئی کہ شریف انسان تو ٹینس کھیلیں گے اور باقی باتوں میں لگے رہیں گے۔

مصنّف - تم ہو گئے؟

دوست - جی ہاں مگر بندے کے مذہب میں ٹینس کو عشق پر ہزار درجے ترجیح ہے (یہ کہہ کر دوست چلا جاتا ہے)

(مصنف تھوڑی دیر سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہتا ہے اور پھر کسی مصمم ارادے سے اُٹھ بیٹھتا ہے)

دوسرا پردہ (وقت ساڑھے چار بجے بعد دوپہر)

(تین ہندوستانی جنٹلمین فلالین کی پتلونیں اور بلیزر کوٹ پہنے ہوئے گول کمرے سے نکل کر ٹینس گراونڈ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ان کے بعد تین ساڑھی پوش خاتونیں نکلتی ہیں۔ ایک کی ساڑھی بہت زرق برق ہے اور جوتا بھی بہت شاندار ہے۔ دوسری دو ربڑ کے تلے والے جوتوں میں ہیں اور سفید ساڑھیاں پہنے ہیں)

مصنف کا دوست (مصنف کو مخاطب کرکے) تم تو کہتے تھے کہ ٹینس چھوڑ دی۔

مصنف۔ گر ضرورت بود روا باشد۔

(راستے میں فیصلہ ہوتا ہے کہ کون کس کے ساتھ کھیلے اور مصنف اور زرق برق ساڑھی الگ بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جب ٹینس کا ایک سٹ ختم ہوتا ہے تو مصنف کی معشوقہ بادلِ ناخواستہ مصنف کو مدعو کرتی ہے کہ ٹینس میں شریک ہو۔ مصنف بلاتامل ٹینس میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور معشوقہ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ معشوقہ کے بشرے سے صاف ظاہر ہے کہ ٹینس میں خاک بھی مزہ نہ آئے گا مگر مہمان کے ساتھ کج اخلاقی فیشن کے خلاف ہے۔ وہ مسکرا کر کہتی ہے کہ "میں آپ کی طرف کھیلوں گی"۔ مصنف جھک کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ ٹینس کے کھیل میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف باقی تین مردوں سے بدرجہا بہتر کھلاڑی ہے اور اُس کی معشوقہ تو اس قدر حیران بلکہ نادم ہوتی ہے کہ بات بات میں اپنی گذشتہ غلط فہمی کی تلافی کرنا چاہتی ہے۔ ٹینس کا کھیل ختم ہونے پر چونکہ موسم سردی کا ہے سب پھر کمرے میں جمع ہوتے ہیں)

مصنف کا دوست (مصنف کی معشوقہ کو مخاطب کرکے) یہ حضرت تو بڑے چھپے رستم نکلے۔

معشوقہ۔ جی ہاں۔

سہیلی۔ مجھے تو سخت گلہ ہے۔ میں سمجھی تھی کہ ان کے ساتھ لمبی علمی گفتگو ہوگی۔

مصنف۔ معافی چاہتا ہوں مگر خوش بھی ہوں کیونکہ میرے علمی معلومات بہت ہی محدود ہیں اور میری تمام قلعی کھل جاتی۔

سہیلی۔ مصنفوں کے لئے کسر نفسی تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

مصنف۔ آپ کی بات کیسے پلٹ دوں مگر واقعی مجھے کچھ نہیں آتا۔ (معشوقہ کی طرف اشارہ کرکے) یہ گواہ ہیں۔

معشوقہ۔ مجھے گواہ بناتے ہو تو پھر سچ سننے کے لئے بھی تیار رہو۔

مصنف۔ ضرور۔ فرمائیے وہ کیا سچ ہے؟

معشوقہ۔ یہ کہ آپ کو اور کچھ آتا ہو کہ نہ آتا ہو جھوٹے قصے بنانے خوب آتے ہیں۔

مصنّف۔ سوال یہ نہیں کہ میرے قصے جھوٹے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان قصوں میں کہیں بھی علمیت کی بُو ہے؟
معشوقہ۔ یہ تو کسی عالم سے پوچھئے؟

("تھینک یُو"۔ "بہت اچھا کھیل رہا" "پھر کھیلیں گے"۔ "آپ ہمارے ہاں آکر پرسوں کھیلئے"۔ "ضرور ضرور تھینک یُو"
"خدا حافظ" کا شور ہوتا ہے۔ کچھ مہمان رخصت ہوتے ہیں اور صرف مصنف، اُس کی معشوقہ، سہیلی اور مصنف کا دوست رہ جاتے ہیں۔ چاروں کرسیاں ایک دوسرے کے قریب کرکے باتیں کرنے لگ جاتے ہیں)

سہیلی (مصنف کو مخاطب کرکے) سب سے پہلی بات جو آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کے چھوٹے بڑے سب قصوں میں ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے کبھی موسم کا ذکر نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ بادل تھے کہ دھوپ تھی کہ ہوا تھی۔ اور مصنّف موسم سے اس قدر مدد لیتے ہیں کہ اگر اُن کی ہیروئن کے سر میں درد ہو تو موسم غریب کو ضرور گدلا ہونا پڑتا ہے، اور اگر ہیرو پر کوئی مصیبت آنی ہو تو آسمان کا رنگ پہلے بدلتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں ان باتوں کا تذکرہ تک نہیں۔ آخر آپ نے نیچر کو ردی کی ٹوکری میں کیوں ڈال رکھا ہے!

مصنّف۔ میری تمام تر دلچسپی انسانوں سے بلکہ انسانوں کے خیالات سے ہے۔ ممکن ہے کہ موسم کا اثر خیالات پر ہو مگر مجھے کبھی یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ خیالات کا نشو و نما کس طرح ہوتا ہے۔ میں تو جو خیالات فی الواقع موجود ہوں اُن کو لے لیتا ہوں اور اُن کے نتائج اخذ کرتا ہوں۔ اس لئے میری تحریر کو موسم سے کچھ بھی سروکار نہیں۔

معشوقہ۔ نتائج تو آپ ہمیشہ الٹے پلٹے نکالتے ہیں کبھی یہ کبھی وہ۔ مجھے تو کبھی بھی پتہ نہ چلا کہ آپ کو انسانوں سے محبت ہے کہ نفرت ہے۔ مذہب کو مرض سے تشبیہ آپ نے بیس دفعہ دی ہوگی جس شخص کو بنی نوع انسان سے محبت ہو کیا ممکن ہے کہ وہ مذہب کو ایک قسم کی عالمگیر وبا تصور کرے بلکہ یہاں تک لکھ دے کہ انسانی قوم من حیث القوم ایک قسم کا کیڑا ہے جو کرۂ زمین کی اوپر کی جلد میں پیدا ہوتا ہے اور پھر خود ہی اپنے آپ کو کاٹ ڈالتا ہے۔ ایک طرف تو آپ یہ لکھتے ہیں اور پھر دوسری طرف تصوف کی لہر جو چلتی ہے تو انسانوں کو آپ کی طرف سے یہ تلقین ہوتی ہے کہ محبت کے نشہ میں چور رہو۔ خدا جانے آپ کو انسانوں کی کمزوریوں پر ہنسنے میں کیا مزہ ملتا ہے؟

مصنّف۔ آپ کی نکتہ چینی قطعی درست ہے کیونکہ آپ کو یہ علم نہیں کہ میں ایک نئے مذہب کا موجد ہوں۔

سب۔ وہ کیا! وہ کیا!

مصنّف۔ وہ یہ کہ انسان نہ صرف اپنی کمزوریوں پر بلکہ اپنی طاقت پر، نہ صرف اپنی طاقت پر بلکہ اپنی ترقی کی خواہش پر

خوب طرح ہنسیں۔ نہ صرف ہنسیں بلکہ کھلے دل سے اس ترقی کی خواہش کا استہزا کریں۔ یہی ایک مذہب ہے جو انسان کو اُس اصلی جہنم سے بچا سکتا ہے جس کا نام خود پسندی ہے اور جس کا سیدھا راستہ وہ تمام مذاہب ہیں جو اِس وقت مروج ہیں یعنی وہ تمام مذاہب جن میں انسانی تخیل کے ساختہ دیوتا یا دیوتاؤں کو مٹانے والی بڑی طاقت خوف و امید دلا کر احکام کی تعمیل پر مُصر ہے۔

معشوقہ۔ چہ خوب۔ آپ کو صرف مصنف ہونا پسند نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی بھی خواہش ہے (قہقہہ لگا کر) یہ خود پسندی!

مصنف۔ خواہش تو اس سے بہت بڑھ کر تھی مگر خود پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی پرستش کی وجہ سے۔

معشوقہ۔ باتیں بنانے پر اتر آئے آپ!

مصنف اور اُس کا دوست (اکٹھے کہتے ہیں) اب اجازت دیجئے۔ دیر ہوگئی۔ بہت بہت شکریہ۔

(معشوقہ اور اُس کی سہیلی رہ جاتے ہیں)

سہیلی۔ یہ شخص اگر پاگل نہیں تو ہزاروں لاکھوں میں انتخاب ہے۔ تم کس قدر خوش قسمت ہو کہ ایسا آدمی تم پر مرتا ہے۔

معشوقہ۔ مرنے ورنے کی تو خبر نہیں مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ پاگل واگل خاک نہیں۔ سو کو پاگل کر کے چھوڑے یونہی بنتا بہت ہے۔

سہیلی۔ کیا تمہیں بھی اُس نے اپنا دیوانہ بنایا ہے کہ نہیں؟

معشوقہ۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میری بلا کسی مرد کے پیچھے دیوانی ہو۔

سہیلی۔ کیسی بے رحم ہو۔ واللہ باللہ اگر میں تمہاری دلی سہیلی نہ ہوتی تو اس شخص کو ضرور تم سے چُرا لینے کی کوشش کرتی۔

معشوقہ۔ ایک دفعہ نہیں سو دفعہ۔ آزادی کا زمانہ ہے۔

سہیلی۔ لعنت ہے اس آزادی پر کہ سہیلی کو سہیلی پر اعتبار نہ رہے۔ میں تو تم سے اپنے دلی پیار کے باعث پوچھ رہی تھی کہ آخر اس کے ساتھ شادی میں کیا ہرج ہے؟

معشوقہ (سہیلی کے گلے میں باہیں ڈال کر) بہن سچ پوچھو تو ایسی دو دلی ہو رہی ہوں کہ کیا بتاؤں۔ کبھی تو دل میں آتا ہے کہ ایسے آدمی کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے تو بھیک مانگنا بہتر ہے کیونکہ اُس کی جو بات ہے سو نرالی۔ دنیا سے وہ متنفر، عاقبت سے وہ باغی۔ آئے دن دنیا بھر کے اعتراضوں کا جواب دینے میں کون سر کھپائے۔ اور کبھی دل میں یہ آتا ہے کہ یہ زندگی تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی مگر اس شخص کے ساتھ تو دوزخ کا بھی لطف رہے گا۔

سہیلی - روپے پیسے کا کیا حال ہے؟

معشوقہ - سنتی ہوں کہ کافی جائداد ہے مگر ایسے آدمی کا کیا اعتبار؟ جس دن جی میں سمائے گی سب جائداد بیچ سادھو بن جائے گا۔

سہیلی - تم بھی پوری احمق ہو۔ تمہارے لئے ساڑھی خریدنے کے لئے تو شاید کچھ بیچ دے، ورنہ یہ شخص تو روپیہ گنوانے والا نظر نہیں آتا۔

معشوقہ - چلو اب چھوڑو بھی یہ قصّہ۔

سہیلی - ایک شرط پر۔

معشوقہ - وہ کیا؟

سہیلی - مانو تو بتاؤں۔

معشوقہ - اچھا۔

سہیلی - صبح اسے کھانے پر بلواؤ مگر اور کوئی نہ ہو۔

معشوقہ - اچھا۔

تیسرا پردہ (دوسرے دن صبح دس بجے)

(معشوقہ اُس کی سہیلی اور مصنف کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ معشوقہ کے روئیں روئیں سے شرارت ٹپکتی ہے۔ مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرارت دلی بے چینی کا برقع ہے)

مصنّف (معشوقہ کو مخاطب کرکے) اس ہمارے ملک کو مذاہب تو روند کر تباہ کر ہی چکے ہیں۔ رہا سہا دم موجودہ تہذیب کی لتاڑ سے نکل جائے گا۔

معشوقہ - اس دانشمندانہ جملے کی شانِ نزول کیا ہے؟ کیا مجھ پر کوئی اعتراض ہے؟

مصنّف - مجھے اور اعتراض کی مجال؟ ناممکن! صرف یہ خیال کر رہا تھا کہ تہذیب سے مجبور ایک خاتون اپنے دل کو کچل رہی ہیں۔

سہیلی - خدا کی پناہ - اگر آپ دل کی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تو کیا اپنی زبان پر بھی آپ کو قابو نہیں؟

معشوقہ - یہ نہ کہئے - نہ کہنے کی باتوں میں تو یہ خضرِ وقت ہیں کشتی ڈبو دیں گے مگر وجہ نہ بتائیں گے۔ مگر نہیں میں خوش ہوں کہ مجھے انہوں نے موقع دیا ہے کہ میں بھی اپنی عقل کی قینچی سے ان کی دماغی قطع و برید کروں مگر پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم

پولیس کی نوکری کر سکتی ہو؟

سہیلی۔ ضرور

معشوقہ۔ اچھا یہ شخص ایک گرفتار شدہ ملزم ہے اِس کی جیبوں کی تلاشی لو۔ اور اگر کوئی کاغذ ہو وہ نکال لو۔

(سہیلی جیبیں ٹٹولتی ہے۔ اتفاق سے وہی کاغذ جو مصنف کے دوست نے پہلے دن پڑھا تھا نکلتا ہے۔ مصنف خاموشی سے تلاشی ہونے دیتا ہے)

مصنّف۔ میں سچے دل سے عرض کرتا ہوں کہ یہ کاغذ ہرگز بالارادہ میری جیب میں نہ تھا بلکہ محض اتفاقیہ۔ اور میری نہایت مودبانہ عرض ہے کہ یہ پرچہ بن پڑھے مجھے واپس عنایت کیا جائے۔

معشوقہ۔ ہرگز نہیں۔ (سہیلی سے) تم اِسے بلند آواز سے پڑھو۔

مصنّف۔ ظلم کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

معشوقہ۔ وہ ظلم ہی کیا جس کی حد ہو۔

مصنّف۔ آپ کی خوشی۔

(یہ کہہ کر مصنف تو کرسی پر بے بسی کی حالت میں بیٹھ جاتا ہے اور سہیلی اتنا ہی حصہ پڑھتی ہے جو پہلے دن پڑھا گیا تھا)

معشوقہ۔ کیا ختم ہو گیا؟

سہیلی۔ نہیں چند سطریں اَور ہیں مگر کون پڑھے۔ مجھے تو اِس قسم کی تحریر ذرا نہیں بھاتی۔

معشوقہ۔ مجھے بہت پسند ہے۔ تم یقین جانو کہ یہ کسی انسان کی طرف اصلی خط نہیں ہے۔

(مصنف اپنی معشوقہ کے اس جملہ پر بے اختیار چونکتا ہوتا ہے اور بہت ہی استعجاب ظاہر کرتا ہے)

سہیلی۔ خط نہیں تو پھر کیا ہے؟

معشوقہ۔ یہ حضرت روحوں کے تاجر ہیں۔ انہیں کسی کی شخصیت سے کچھ بھی اُنس، کچھ بھی دلبستگی نہیں بلکہ چاہتے یہ ہیں کہ روحیں چُرا کر جمع کرتے جائیں بخیل کنجوسوں کی طرح۔ اور پھر خود ہی اس خزانے کا لطف اُٹھائیں۔

سہیلی۔ انوکھی بات ہے مگر اس خزانے سے فائدہ؟

معشوقہ۔ وہی خود پسندی۔

مصنّف۔ کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟

معشوقہ۔ شوق سے فرمائیے۔

مصنّف۔ آپ کی تشخیص ادھوری ہے۔ مجھے اگر کسی سے کوئی روح بشرطیکہ وہ حاصل کرنے کے قابل ہو، مل جائے تو

مَیں اُسے گرفتار کر کے بند رکھنا نہیں چاہتا بلکہ اسے آزاد کر کے اُس کی خدمت کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنے آپ سے واقف ہو اور اس نئے تعارف سے زندگی کا لطف اُٹھائے۔

معشوقہ ۔کیا معنی؟

مصنّف۔کئی معنی اور ہر شخص کے لئے مختلف معنی۔

معشوقہ ۔میرے لئے اِس جملے کیا معنی؟

مصنّف ۔یہ کہ آپ کے جسم میں بجائے ایک روح ہونے کے دو روحیں ہیں اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پرخاش ہیں۔ایک کامل آزادی کی حامی ہے۔دوسری مصلحتِ زندگی کے دام میں گرفتار ہے۔آج یہ دوسری روح جو اصل میں مردانہ روح ہے برسرِ اقتدار ہے۔دوسری جو زنانہ روح ہے اور جو کامل آزادی کی حامی ہے وہ مقید ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے موقع ملے تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا ممد و معاون کر دوں تاکہ پھر آپ کو اِس کشمکش سے آزادی ہو۔

معشوقہ۔یہ فقرے تو آپ ہر خاتون کو کہہ سکتے ہیں اور میں تو روح کی قائل ہی نہیں۔

مصنّف ۔آپ کے قائل نہ ہونے سے روح تو غائب نہیں ہو جاتی۔

معشوقہ ۔اچھا تو پھر مطلب کیا نکلا؟

مصنّف ۔اصلی مطلب اِن چند سطروں میں ہے جو پڑھنے سے رہ گئیں۔

معشوقہ ۔اچھا تو آپ وہ سنائیے۔(مصنف پڑھتا ہے)

"مگر یہ پہیلی مجھ سے نہ بوجھی جائے گی ہیں وہ معمّا نہ بنوں گا جب تک کہ تم خود اپنے آپ کو آسمان بن کر نہ دیکھو، خود اپنے آپ سے ہوا بن کر نہ لپٹو۔

پیاری کوئی کسی کا بن نہیں سکتا جب تک کہ وہ خود اپنا نہ بنے۔تم اپنی بنو تو دنیا تمہاری ہے۔

پیاری تم حسن سے بالاتر ہو۔تمہیں حسن کی ضرورت نہیں۔خوبصورتی تمہاری اتری ہوئی پوشاک ہے مگر کاش کہ تم عقل سے بھی بالاتر ہو جاؤ۔زندگی کے عقدے کو حل کرنے کی کوشش چھوڑو بلکہ اس عقدے میں خود سما جاؤ مگر یہ تب تک نہ ہو گا جب تک وہ زبردست طاقت جسے جاہل لوگ نیچر کہتے ہیں تم پر جادو نہ کرے۔

معشوقہ۔کیسا جادو؟

(سہیلی کسی بہانے سے کمرے سے باہر نکلتی ہے، چار خوبصورت آنکھوں میں صرف ایک خوبصورت نگاہ ہے آنکھ کا جادو چل جاتا ہے)

(اور اس کے بعد قہقہے پر قہقہہ)

عبدالعزیز

جفا سہنے کی عادت یعنی بنیادِ وفا ڈالی کسی سے میں نے راہ و رسم کی یوں ابتدا ڈالی

رہی یک چند نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی وہ اک بیکار سی تحریر تھی میں نے مٹا ڈالی

اُدھر تُو نے ترقی دی ادائے بے نیازی کو اِدھر عشّاق نے بھی خوئے تسلیم و رضا ڈالی

وہ امیدیں جو دل میں مُردہ تھیں اکبارگی اُٹھیں قیامت تُو نے برپا کی نگاہِ ناز کیا ڈالی

زمانے کی خلاف آہنگیاں گویا نہیں دیکھیں کہ پھر کمبخت تُو نے دل میں طرحِ مدعا ڈالی

بقدرِ التجا بڑھتی ہے اُس کی شانِ استغنا نئی مجھ پر مصیبت تُو نے اے دستِ دعا ڈالی

بڑھی سرگشتگی، شوریدگی، آشفتہ سامانی تری زلفِ پریشاں نے مرے سر کیا بلا ڈالی

حقیقت میں کیا نادرِ علاجِ فکرِ لاحاصل بظاہر حلق میں ساقی نے اک کڑوی دوا ڈالی

تری بیگانہ خوئی پردہ دارِ رازِ الفت تھی
کیا وحشتؔ کو رسوا جب نگاہِ آشنا ڈالی

رضا علی وحشتؔ

The Awakenig of the Soul.

بیداریٔ روح

آج قارئینِ ہمایوں کے سامنے میں اپنی نوعمر عزیزہ کی جن سے وہ پہلے تعارف حاصل کر چکے ہیں ایک انگریزی نظم اور اُس کے ساتھ اپنا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں جو حال میں ہمایوں کے علاوہ انڈین ریویو میں بھی طبع ہو رہی ہے +

ایک سولہ برس کی شاعرہ کا عمر بھر اسلامی و ہندوستانی ماحول میں رہ کر ایک غیر زبان پر اتنی قدرت رکھنا حیرت انگیز ہے البتہ اس کے ساتھ باوجود اردو سے دلچسپی رکھنے کے بحیثیت ایک شاعرہ کے اپنی زبان سے اُن کا کھویا جانا بھی قابلِ افسوس ضرور ہے۔ لیکن اِس حقیقت سے انکار کرنا بعید از انصاف ہوگا کہ شاعر و نقاش کی قوتِ اظہار بعض اوقات زبان و ملک کی قیود سے آزاد ہوتی ہے اور یوں آزاد رہ کر اگر وہ زیادہ بلند و بالا ہو جائے تو کون صاحبِ ذوق ہے جو اس رفعت و آزادگی کی دل سے داد نہ دے گا ۔۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

بش

I. THE CALL.

O soft is music that I send to thee
And sweet the call is of this boundless
sea,
Awake, O soul, from long long sleep,
And rise from the abysmal deep;
O, break the earthly bonds that here
thee bind,
And leave this little, mortal world
behind.

ندائے ربّانی

بھیجتا ہوں تجھ کو میں اِک نرم و نازک راگنی
بس کہ شیریں ہے صدا اِس بحرِ نامحدود کی
جاگ جاگ اے روح اپنے مدتوں کے خواب سے
باہر آغارِ الم سے بچ نکل سیلاب سے
توڑ دے ہاں توڑ دے ہستی کی اِس زنجیر کو
چھوڑ دے دنیا کو اِس دنیائے بے تنویر کو

I made the heaven's floating mass of
blue,
And tinted it with many a tender hue;

تیرتا سا نیل اِک میں نے بنایا آسماں
اور میں نے اُس کی رگ رگ میں بھریں رنگینیاں

I am the strom-wind's whirling might,
I am the soft moon's peaceful light;
In pleading stars I glitter from the sky,
On earth the fragrance of the flowers am I.

بادِ طوفاں خیز کی میں ہی ہوں عالم افگنی
بھولے بھالے چاند کی ہوں ہلکی ہلکی روشنی
دور تاروں میں فلک پر جھلملاتا میں ہی ہوں
اور زمیں کو بوئے گل بن کر بساتا میں ہی ہوں

O, I am He, who made the gentle breeze,
That stirs among the slender graceful.
trees;
I made the whirling fire-balls' light,
I made the majesty of night;
I made the wondrous tear-filled clouds
above,
And yet,'tis I am yearning for thy love

مَیں ہی ہوں جس نے بنائی ننھی مُنّی سی نسیم
جو کیا کرتی ہے چل کر جنگلوں کا دِل دو نیم
مَیں ہی ہوں جس نے بنایا مہرِ آتش زا کا نُور
مَیں ہی ہوں جس نے دکھایا عظمتِ شب کا ظہور
مَیں ہی ہوں وہ جس نے بھر دیں آنسوؤں سے بدلیاں
مَیں ہی ہوں جس نے بنائے یہ زمین و آسماں
پھر بھی ہوں میں منتظر تیری مروت کے لئے
آہ مَیں بیتاب ہوں تیری محبّت کے لئے

I sent some joy, some pain, some love to thee,
So that on earth thou may'st
remember me;
I stood revealed in many things;

مَیں نے بھیجا تجھ کو سُکھ بھی دُکھ بھی اور کچھ پیار بھی
تا زمیں پر رہ کے مُجھ کو یاد کر لے تُو کبھی
سینکڑوں چیزوں میں ہے پرتو فگن میرا ظہور
پھول میں میری ہی بُو کرنوں میں ہے میرا ہی نور

And now I give thee silver wings.

Arise to me, for I will give thee rest

And fold thee to my tender loving
breast.

اُٹھ مری جاں دیکھ پر چاندی کے دیتا ہوں تجھے
پیار کرنے کے لئے گودی میں لیتا ہوں تجھے
اُٹھ مری جاں تا ترے دل سے مراِ مِل جائے دل
گلشنِ الفت میں پھر میرا ترا کھل جائے دل

II. THE ANSWER.

جوابِ انسانی

From out the dreary sea of dark,

What sound is this I hear,

What light is that whose wondrous
spark,

Is drawing near, is drawing near.

A soft and silver melody,

Comes whipering to my ear,

The sobbing music calls to me,

What binds me here, what binds me
here?

A feeling sweet and infinite,

Is in the music's flow,

My dead numb heart is feeling it,

O let me go! O let me go!

دُور دُور اندر سے بحرِ تیرہ و تاریک کے
کیا ہے یہ آواز اے دِل سُن رہا ہوں مَیں جسے
نُور کیسا ہے یہ جس کی آسمانی روشنی
میری جانب آرہی ہے آرہی ہے آرہی؟

کرتی ہے اِک نرم و سیمیں راگنی سرگوشیاں
اور بُلاتے ہیں مجھے لے لے نغمے ہچکیاں
وائے قِسمت آکے اِس دنیا میں دل بھٹکا مرا
کس سے جی اٹکا ہے میرا کس سے جی اٹکا مرا!

سُن رہا ہوں نغمہ ہائے دلپذیر و دلستاں
ایک شیریں آسمانی جذبہ ہے جن میں نہاں
جاگ اُٹھا میرا مردہ دل بھی گانے دو مجھے
آہ جانے دو مجھے تم آہ جانے دو مجھے

O music full of life, of death!
In thee's Eternity;
A fever holds my gasping breath,
Who calls to me, Who calls to me?

بس کہ ہے اے راگ تجھ میں سرمدی تابندگی
موت ہے تجھ میں نہاں، تجھ سے عیاں ہے زندگی
کانپ اُٹھا جس سے میرے سازِ دل کا تار تار
آہ میرے واسطے کس کی ہے یہ کس کی پکار؟

'Tis Thou my Lord art calling me,
To rise I try in vain,
How shall I come, my love, to Thee
I'm bound by pain, I'm bound by pain.

ہاں بلاتا ہے مجھے تو میرے ربِّ ذوالجلال
چاہتا ہوں میں بھی اُٹھوں لیکن اُٹھنا ہے محال
کس طرح اے جانِ جاں میں آؤں پہلو میں ترے
درد ہے دِل میں مرے اُف درد ہے دل میں مرے

I saw Thy glitter in each star,
Thy beauty on the sea,
And from the sunset flaming far
Thou calledest me! Thou calledest me!

میں نے ہر تارے میں دیکھی آہ تیری روشنی
تھی سمندر پر بھی تیرے حُسن کی ضو افگنی
دُور افق پر ڈوبتے سورج کے لالہ زار سے
تُو نے اِک آواز دی، آواز دی تُو نے مجھے

Oh in the turmoil where I bled,
My torn heart cried for Thee,
My love for Thee was never dead,
I sighed for Thee, I sighed for Thee!

جال میں جنجال میں دنیائے بے درماں کے ہائے
تجھ سے دُور اے جانِ من یہ جی مرا مجھ کو ستائے
جب سے مجھ پر چل گیا تیری محبت کا فسوں
روز و شب تیرے لئے بے چین ہوں

Yet, Lord, I must not see Thy light,
Though heart with pain is sore,
For soiled by sin and lost in night,
I am not pure, I am not pure!

Nay I am wrong, for Thou art God,
The pain I did endure
With all my love for Thee, dear Lord,
Hath made me pure, Hath made me pure!

I leave the little twinge and ache
Of little worlds behind,
And all the little bonds I break
That here me bind, that here me bind!

I rise in wondrous ecstasy,
My test on earth is done,
And now immortal, pure and free
My Love, I come! my Love I come!

MUMTAZ JAHAN.

ہاں تمنا ہے تری میرے دلِ مجبور کو
کس طرح دیکھوں مگر یارب میں تیرے نور کو
قلب آلودہ ہے اور آوارۂ دنیا و دیں
نفس پاکیزہ نہیں ہے، آہ! پاکیزہ نہیں

مَیں غلط کہتا ہوں لیکن اے خدائے دوجہاں
درد و غم میں نے سہے تیرے لئے سب بے گماں
درد و غم سے جب ہؤا اک دیدۂ نمناک مَیں
ہوگیا پھر پاک مَیں اپنے گنہ سے پاک مَیں

چھوڑتا ہوں آج اِن چھوٹی سی دنیاؤں کو مَیں
کلفتوں کو اِن کی اور ان کی تمناؤں کو مَیں
چھوڑتا ہوں چھوڑتا ہوں اِس چمن کا آب و گِل
جس سے جی اٹکا ہے اور بھٹکا ہے جس سے میرا دل

اک نشاطِ حیرت افزا اب مِری رہبر بنی
ہو چکی دنیائے دوں میں ختم میری جاں کنی
غیر فانی پاک دِل آزاد ہو کر اب یہاں
تیرے پاس آتا ہوں تیرے پاس مَیں اے جانِ جاں

ل ب

خاتمہ

اب میرا وقت ہوگیا ہے ماں، مَیں جارہا ہوں۔

جب اکیلی صبح کے زرد سے اندھیرے میں تم بستر میں اپنے ننھے کے لئے اپنی باہیں پھیلاؤ گی تو میں کہوں گا "تمہارا ننھا یہاں نہیں ہے۔" ماں میں جارہا ہوں!

میں ہوا کا ایک ننھا سا جھونکا بن جاؤں گا اور تمہارے گلے مِل جاؤں گا اور ہیں پانی میں جب تم نہارہی ہوگی ننھی سی لہریں بن جاؤں گا اور تمہیں رہ رہ کر چوموں گا!

طوفانی رات میں جب مینہ کی بوندیں پتوں پر ٹپ ٹپ پڑرہی ہونگی تو تم اپنے بستر میں میری سرگوشیاں سنوگی اور میری مسکراہٹ بجلی کے ساتھ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے تمہارے کمرے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روشن کردے گی!

اگر تم رات کو دیر تک اپنے ننھے کے خیالوں میں جاگتی رہوگی تو میں دُور تاروں میں سے تمہیں یہ گیت سناؤں گا۔ "سوجا اے ماں سوجا!"

چاند کی بھٹکتی ہوئی کرنوں پر سوار ہوکر میں تمہارے بستر پر آجاؤں گا اور سونے میں تمہارے سینے پر لیٹ رہوں گا۔

میں ایک خواب بن جاؤں گا اور تمہارے ہونٹوں کے ننھے شگافوں سے ہیں تمہاری نیند کی گہرائیوں میں جا چھپوں گا اور جب تم یک لخت جاگ اُٹھوگی اور حیران ہوکر اِدھر اُدھر تکنے لگوگی تو میں اڑکر ایک جھلملاتے ہوئے جگنو کی طرح دُور تاریکی میں کہیں گم ہوجاؤں گا۔

جب پوجا کے بڑے تیوہار کے دن پڑوسیوں کے بچے آکر گھر میں کھیلیں گے تو میں بانسری کا راگ بن جاؤں گا اور سارا دن تمہارے دل میں دھڑکتا رہوں گا۔

جب پیاری خالہ پوجا کے تحفے لائے گی اور پوچھے گی کہ "بہن! کہاں ہے ہمارا ننھا؟" تو ماں تم چپکے سے اُسے بتاؤگی "وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں عیاں ہے وہ میرے روح و رواں میں پنہاں ہے!"

گلچیں

ایک نقاب پوش زندگی

میرے ایک دوست ہیں جنہیں دنیا کو دھوکا دینے میں لطف آتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اُن کی سیرت کے حقیقی جوہر سے لوگ واقف ہوں۔ وہ اپنی زندگی کو نقاب پوش بن کر گزارنا چاہتے ہیں، جس طرح ایشیائی نقلوں اور مغربی رقص کی محفلوں میں بعض دفعہ لوگ غیر معمولی طرح کا لباس پہن کر اور اپنا چہرہ چھپا کر آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی دنیا کو ایک تماشاگاہ سمجھتے ہیں جہاں ہر شخص کو نقاب پہن کر رہنا چاہیئے۔ اگرچہ اُن کا دل خالص سونے کا ہے اور اُن جذبات میں محبت اور خلوص کا عنصر ہے، لیکن انہوں نے اپنے طرزِ کلام، اپنے بشرے اپنے طرزِ ملاقات کو اس طرح ڈھالا ہے کہ ہر نیا شخص اُن کو آدم بیزار انسانی جذبات سے معرا، اور خشک سمجھتا ہے۔ وہ اس بات کی بالکل کوشش نہیں کرتے کہ اس خیال کو دُور کریں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہر ممکن طرح سے اس کو مستحکم کرتے ہیں۔

وہ، جیسا کہ میں نے کہا، اپنی روشنی کو تہِ دامن رکھتے ہیں۔ اور اپنے جذبات کو زیرِ عناں۔ اُن کا حساس اور فطرتاً ہمدرد دل دوسروں کی مدد کرنے، اُن کے رنج وغم میں شریک ہونے کے لئے تڑپتا ہے، لیکن کیا مجال کہ چہرے یا گفتگو سے یہ بات ظاہر ہو سکے۔ وہ دوسروں کے لئے اس طرح ایثار کرتے ہیں کہ اُن کو خواب وخیال میں بھی معلوم نہ ہو۔ اور اگر معلوم ہو جائے تو وہ چاہتے ہیں کہ اس بات کو ہنسی میں ٹال دیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اُن تمام انسانی جذبات اور انسانی کمزوریوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں جن کے متعلق دنیادار لوگ عام مجمعوں اور دوستوں کی صحبت میں لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جو اُن سے بہت اچھی طرح واقف نہیں اُن کی باتوں کو سنے تو یقیناً یہ خیال کرے کہ اُن سے زیادہ خود غرض، خود پرور اور برخود غلط شخص آسانی سے نہیں ملے گا۔ اُن کو اس بات میں لطف آتا ہے کہ لوگوں کی اُن خود فریبیوں کی پردہ دری کریں جن میں وہ عموماً مبتلا رہتے ہیں اور اُن کا مخصوص طریقہ اس پردہ دری کے لئے یہ ہے کہ خود کو سنجیدگی سے اُن تمام باتوں کے خلاف ظاہر کریں جن کی لوگ کم از کم زبان سے بہت قدر کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو مسلسل اور طویل نہیں ہوتی بلکہ اکثر دوسرے لوگوں کی گفتگو کے دوران میں وہ اپنے خشک طرز سے کوئی تیز ایسا جملہ کہہ دیتے ہیں جو لوگوں کے دماغی سکون کو پریشان کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص قوم یا قومی مفاد کے متعلق گفتگو کر رہا ہے اور سب لوگ اُس کے اِن بلند پایہ جذبات سے ہم آہنگ ہیں تو ہمارے دوست پر فرض ہو جاتا ہے کہ اُن کی کاٹ کی جائے۔ وہ کہیں گے :-

"مجھے تمہارے اِس مکر سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ قوم، قوم کا فائدہ، قربانی یہ سب الفاظ بے معنی ہیں کوئی شخص قوم کے لئے زندہ نہیں رہتا۔ ہر شخص محض اپنے فائدہ کے لئے کام کرتا ہے تکلیفیں اُٹھاتا ہے لیکن دوسروں کو دھوکا دینے یا عام آدمیوں کے طرزِ ادا سے مرعوب ہو کر وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ قوم یا خدا یا مذہب کی خاطر کیا ہے"

"تو کیا تمہارے نزدیک انسان کوئی کام اپنے فائدہ کے علاوہ اور کسی غرض سے نہیں کرتا"

اِس سوال کا جواب دینے سے اول تو وہ انکار کریں گے۔ "میں بحث میں نہیں پڑتا" اُن کی عادت ہے کہ اپنی رائے کو نہایت درجہ خود اعتمادی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اور بس۔ لیکن اگر زیادہ اصرار کیا جائے اور "صحبت ناجنس" نہ ہو تو وہ مکمل گفتگو کر لیتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہوگا "انسان ہرگز کوئی کام کسی اور غرض سے نہیں کرتا۔ بعض باتیں بظاہر بے غرضی کی معلوم ہوتی ہیں لیکن اُن میں بھی در اصل اپنا ہی فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً میں اپنے چند دوستوں کے لئے تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہوں، لیکن اس لئے نہیں کہ "انسانی ہمدردی" کا تقاضا ہے بلکہ اس لئے کہ اس سے میری اپنی طبیعت مطمئن اور مسرور ہوتی ہے۔ یہ میری ایک ذاتی غرض ہے۔ جس طرح میں اپنی ذات کے لئے آرام اور آسائش چاہتا ہوں اُسی طرح اپنے اُن دوستوں کے لئے بھی یہی خواہش ہے جو مجھے واقعاً عزیز ہیں۔ لیکن "مسلمانوں" یا "ہندوستانیوں" یا اِس قسم کی جماعتوں سے مجھے کوئی تعلق یا ہمدردی نہیں"

"آخر اگر آپس میں اتفاق اور ہمدردی نہ ہو تو لوگوں کا کام کیسے چلے؟"

"میرا خیال ہے کہ اگر ہر شخص اپنے ہی فائدہ کا خیال کیا کرے اور دوسروں کے معاملات میں دخل دینا اور اُن کے لئے سر کھپانا چھوڑ دے تو دنیا کے کاروبار بہت آرام سے طے پا جائیں"

یہ گویا اُن کا قطعی فیصلہ ہوگا اور اس کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوگی کہ اس معاملہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ رائے زنی کرے۔

اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کی جانب اُن کا ایک خاص رویہ ہے۔ وہ کبھی اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ کسی سے ملاقات پیدا کریں۔ اگر ملاقات پیدا ہو جائے تو اُس کو بڑھانے اور دوستی میں تبدیل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ بلکہ شروع ہی میں لوگوں پر ایسا اثر ڈالتے ہیں گویا وہ ایک غرّاتے ہوئے ریچھ ہیں جس سے علیحدہ ہی رہنا بہتر ہے۔ لیکن جب کوئی اُن کی نقاب الٹ کر اُن کی روح کی پاکیزگی اور خلوص سے واقف ہو جاتا ہے اور اپنے خلوص اور صاف گوئی سے اُن کے دل میں جگہ کر لیتا ہے تو پھر اُس کے ساتھ اس قدر وفاداری کا سلوک کرتے ہیں کہ عام لوگ اس

استحکام کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن اس میں بھی اُن کی ایک نرالی شان ہے اور وہ یہ کہ اُن کے دوستوں پر عام طور پر یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ اُن کو ذرا بھی اپنے دوستوں کا خیال ہے۔ اس معاملے میں اُن کا مسلک روشِ عام سے بالکل جدا ہے۔ عام لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ خواہ دل میں کسی شخص کی جانب سے کتنی برائی کیوں نہ ہو مگر ظاہر نہ کی جائے بلکہ اُس کو یہی یقین دلائیں کہ ہم اُس کے خیر خواہ اور مدّاح ہیں۔ برخلاف اِس کے ہمارے دوست کبھی کسی کی موجودگی میں اُس کی تعریف نہیں کرتے، اُس کی جانب سے استغنا برتتے ہیں، اُس کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ لیکن اُس کی غیر موجودگی میں، اُس کی پیٹھ کے پیچھے، نہ صرف اُس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اُس کی حمایت میں دلیرانہ اور لوگوں سے لڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ یہ رویہ لازمًا زیادہ مفید ہے۔ یا دنیا کا کام چلانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر جھوٹی ہنسی ہنسیں، جھوٹی تعریفیں کریں، دل کی بات دل ہی میں رکھیں، لوگوں کے سامنے اظہارِ محبت کریں اور پسِ پشت اپنا مقصد نکالنے کے لئے، اُن کے خلاف افواہیں پھیلائیں۔ عوام الناس کی زندگی کا نظام اِس قسم کے اصولوں پر قائم ہے۔ لیکن اگر اس ریاکاری کی دنیا میں کوئی سچا اور بے دھڑک شخص آ نکلے تو ہمیں اُس کے ساتھ نباہ کرنا چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے جہاں بہت نازک نازک شیشے کے برتن اور سامان رکھے ہوئے ہیں اِس لئے ہر شخص کو محتاط رہنا پڑتا ہے کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ لیکن اگر کوئی دیوانہ اس "کارگہِ شیشہ گر" میں پہنچ جائے تو اُسے بھی دنیا کے نظام کی پوشیدہ مصلحت سمجھنا چاہیئے۔

اُن میں جہاں یہ خواہش ہے کہ اپنے جذبات کو چھپائیں اور خود کو بالکل بے حس اور بے پروا ظاہر کریں وہاں اُن کو اپنے خیالات اور عقائد کو برملا طور پر ظاہر کرنے میں خاص لطف آتا ہے۔ مصلحت اُن کے نزدیک یا تو بے معنی لفظ ہے اور یا ڈرپوک ہونے اور ریاکاری کے ہم معنی ہے۔ جب کسی معاملہ یا کسی شخص کی بابت کوئی قطعی رائے ہوتی ہے تو اُس کا اظہار کرنے سے نہیں چُوکتے بلکہ خاص طور پر بالالتزام ایسے لوگوں کی موجودگی میں اُس کو ظاہر کرتے ہیں جن کو اُن سے اختلافِ رائے ہو۔ اُن کو سمجھایا جاتا ہے کہ تم ایسی حرکت نہ کرو۔ نقصان اُٹھاؤ گے۔ لیکن وہ اِس کی پروا نہیں کرتے کیونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ اُن کا وجود گویا ایک قائم بالذات چیز ہے۔ جس کے لئے دوسروں کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ نہ تعریف اُن کے نفس کو موٹا کرتی ہے نہ مذمت اُن کے سکونِ نفس کو متزلزل کرتی ہے خصوصًا عام لوگوں کی تعریف کو وہ دراصل ایک توہین سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تمام لوگ کسی شخص کی تعریف کریں تو سمجھ لو کہ وہ یا تو بالکل احمق اور بے رنگ شخص ہے جس میں کوئی شخصیت نہیں پائی جاتی، یا

اول درجہ کا چالاک اور بدمعاش آدمی ہے، جو ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ دھوکا دیتا ہے۔ البتہ اُن چند لوگوں کی تعریف اور رائے کی وہ قدر کرتے ہیں۔ جو اُن کے نزدیک صاحب الرائے ہیں۔ لیکن اس کمزوری کو بھی وہ حتی الامکان چھپاتے ہیں۔ پبلک کی جانب سے بے اعتنائی، مصلحت کی مخالفت، سچ پر اصرار اور ضد، ان تمام باتوں میں اُن کا کیرکٹر رومان رولاں کے شہرۂ آفاق ہیرو جین کرسٹوف سے ملتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں یہ بڑا فرق ہے کہ جین کرسٹوف عمل کا قائل تھا اور یہ اُس کے بھی منکر ہیں۔ اُس کی شخصیت نہایت متحرک اور پُرزور تھی اور وہ اپنی قوتِ جاذبہ سے انتہائی سست عناصر ساتھیوں میں اور بالکل جامد اور بےحس ماحول میں جان ڈال دیتا تھا۔ برخلاف اِس کے ہمارے یہ دوست اناطول فرانس کی طرح ایک دھیمی، اور نیم سنجیدہ اور نیم مزاحی Scepticism کے قائل ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دنیا کی تگ و دو میں حصہ لینا محض اپنی قوتوں اور وقت کو ضائع کرنا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ "اپنی قوتوں کو مجتمع رکھے" نہ معلوم کس لئے؟ اسی لئے وہ معمولی نقل و حرکت سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ آرام کرسی میں یا بستر پر لیٹ کر تفریحاً کوئی کتاب پڑھنا اُن کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ فطرتاً عزلت پسند ہیں اور اپنا وقت گزارنے کے لئے یا تو مطالعہ کرتے ہیں۔ یا چند چنے ہوئے دوستوں سے باتیں کرتے ہیں یا کھانے میں دلچسپی کا اظہار کرتے رہتے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں اِن ہی دو تین چیزوں میں انسان بغیر قوت خرچ کئے ہوئے وقت گزار سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا وہ چیز جسے "ولولۂ عمل" کہتے ہیں اُن میں مفقود ہے۔ یا کم از کم انہوں نے اس کو بالکل تسخیر کر لیا ہے۔ اُن کا قول ہے کہ "آدمی کو کم سے کم کام کرنا چاہیئے" یعنی صرف اس قدر جس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ باقی وقت فرصت میں اور تماشا دیکھنے میں گذارنا چاہیئے" اُن کے نزدیک دنیا ایک تماشا گھر ہے یا ایک قسم کی برات۔ اِس سے لطف اندوز ہونے کے لئے انسان کو ایک تماشہ بین ہونا چاہیئے کیونکہ تماشے کا لطف سب سے زیادہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو کھڑکی میں بیٹھ کر دوسرے لوگوں کو کھیلتا دیکھیں۔ خود ایک ایکٹر یا بازیگر اس تمام تقریب سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ کی بنا پر وہ اپنے دوستوں کو ہمیشہ یہ تلقین کرتے رہتے ہیں کہ تم کام، محنت، بھاگ دوڑ، کوشش لوگوں سے ملنے جلنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو اور اسی وجہ سے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت کام چور اور سست آدمی ہیں اور اُن سے کسی قسم کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ اُن کی طبیعت میں تشکیک کا عنصر غالب ہے۔ بلکہ اُن کے فلسفۂ زندگی کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ تشکیک ہی ہے۔ اُن کو تمام قائم کردہ عقائد اور اداروں اور دستوروں کی ہنسی اڑانے میں لطف آتا ہے۔ ہر قسم کی مذہبی ضد اور تعصب سے اُن کو نفرت ہے اور خود اُن میں سوائے اس تعصب کے اور کوئی تعصب نہیں کہ وہ ہر قسم کے مستحکم ارادہ لوگوں کی مخالفت کریں۔ اپنے خشک، نیم سنجیدہ، نیم مستہزی انداز میں

وہ انسان کے قدیم ترین اور بزرگ ترین تخیلات اور تصوّرات پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ خدا، مذہب، قوم، عورت، اخلاق غرض کوئی چیز اُن کی بے امان پردہ دری سے محفوظ نہیں۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ کس طرح ایمانًا سب باتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ عقل کو قادرِ مطلق سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اُس کی رسائی محدود ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ انسانی خیالات کی دنیا میں ایک سرحد ایسی آجاتی ہے۔ جہاں عقلِ انسانی سر جھکا کر ٹھیر جاتی ہے۔ اور جس سے آگے محض ایمان اور وجدان کی کارفرمائی ہے۔ اُن کو زندگی کے ایسے تجربات سے سابقہ نہیں پڑا جو انسان اور انسانی عقل کی کمزوری اور بے حسی کو عریاں کر دیتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ ابھی تک اپنے اس محبوب فریضہ پر قائم ہیں کہ انسان بجائے خود قائم بالذات اور کافی ہے اُس کو اپنے لئے کسی قسم کا سہارا نہ تلاش کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے اُن کی انفرادیت میں فرق پڑتا ہے!

اسی طرح وہ جماعتی زندگی کی پوری اہمیت اور غرض کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اس کے اصولوں سے متفق نہیں، کیونکہ وہ جماعت اور فرد میں ایک لازمی کشمکش اور تخالف کے قائل ہیں۔ جماعت کے مطالبات چونکہ عمومًا خود اُن کی شخصیت کے رجحان سے ہم آہنگ نہیں اس لئے وہ اُن کو ناجائز اور ناروا سمجھتے ہیں۔ "میں کیوں اپنے طرزِ زندگی، اپنی طبیعت کے میلانات اور خواہشوں کو دوسروں کے اغراض کے لئے قربان کروں؟ کیوں اپنے رویّہ، اپنے خیال، اپنی آزادیٔ رائے کو پبلک یا سوسائٹی کی خاطر ترک کروں جب کہ میں جانتا ہوں کہ "سوسائٹی" کے تقریبًا نصف افراد بیوقوف ہیں۔ اور نصف مکّار اور کمینے"؟ ایسے لوگوں کے لئے اُن کے دل میں کوئی رواداری یا تحمل نہیں خواہ اُن کی دنیاوی پوزیشن کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ بلکہ وہ خاص طور پر اُن لوگوں کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے جو اپنے کمینہ پن یا جوڑ توڑ کی وجہ سے دنیاوی عزت حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تمام لوگوں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اُن کی عزت کریں اور اُن کو عقلمند اور لائقِ تعظیم سمجھیں۔ اگر کسی بوری میں روپے بھر دیئے جائیں تو لوگ اس بوری کی پرستش کرنے لگتے ہیں لیکن اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ اُس حالت میں بھی ایک کم مایہ بوری ہی ہے۔ "پھر مجھ سے کیوں توقع کی جاتی ہے کہ میں باوجود اُن سے عقل اور اخلاق میں برتر ہونے کے، خود کو اُن سے کم درجہ سمجھوں اور اُن کے آگے جھکوں"؟

اُن کا یہی طرزِ عمل اُن تمام لوگوں کی جانب ہے جن کو وہ نااہل سمجھتے ہیں، اور ایسے لوگوں کے ساتھ وہ رسمی اخلاق بھی برتنے کو تیار نہیں۔ لوگ اُن کو اِس وجہ سے مغرور سمجھتے ہیں لیکن انہیں اس کی پروا نہیں، بلکہ وہ اس کو اپنی تعریف سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کے لوگ اُن سے ناخوش ہوں۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے جو کچھ کرتے ہیں اُس کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن بر خود غلط لوگوں کو زک دینا اور وہ بھی علانیہ طور پر اُن کے فرائض میں شامل ہے۔ "وہ سمجھوتے" اور رواداری

کے چنداں قائل نہیں۔ خدا لوگوں کے جرم دیکھتا ہے اُن کا رزق برقرار رکھتا ہے، لیکن یہ اس کے لئے تیار نہیں۔ اُن کو یہ معلوم نہیں کہ دنیا ہر قسم کے لوگوں سے بنتی ہے۔ ایک عقلمند آدمی کو لازم ہے کہ اپنے گرد و پیش کے واقعات اور لوگوں کے ساتھ صلح آشتی سے بسر کرے۔ اُن میں جہاں ایک جانب فلسفیانہ استغنا ہے جو اُن کی نظروں میں عمل کو بے معنی اور ہیچ بتاتا ہے۔ وہاں ایک قسم کا ڈان کوئک سوٹ جیسا مجاہدانہ جوش بھی ہے جو اُن کو ہر قسم کے تعصب تنگ نظری کمینہ پن کے خلاف اکساتا ہے۔ ان دونوں متضاد عناصر کے ملنے کی وجہ سے اُن کی شخصیت ایک حد تک بے قوت ہو کر رہ گئی ہے یعنی وہ عملاً کچھ نہیں کرتے۔ اُن کے اصول اور اخلاق کی پختگی اُن کو ماحول سے بیزار بناتی ہے۔ لیکن اُن کا استغنا اُن کو کام کرنے سے روکتا ہے۔ فطرت نے اپنی چالاکی سے اس اندرونی کشمکش کا فیصلہ اس طرح کیا ہے کہ وہ دنیا اور لوگوں کے خلاف زبانی جنگ کرتے رہتے ہیں اس طرح اُن کا غصہ دھیما اور اُن کی طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اور انہیں اپنے عقائد کو اعمال کا جامہ پہنانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن یہ کام نہ کرنا کسی بزدلی کا نتیجہ نہیں۔ سستی، اور ایک قسم کی بے نیازی کا نتیجہ ہے اور اس بات کا کہ وہ کام کرنا بجائے خود "کوفت" کا باعث سمجھتے ہیں۔ وہ اصلاح کی کوشش کو اپنا فرض ہی نہیں سمجھتے، اِس لئے اُن کے قانونِ اخلاق کے مطابق اس تساہل کی کوئی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہوتی۔

لیکن یہ بھی اُن کی عجیب و غریب طبیعت کا فریب ہے جس سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کیونکہ در اصل ادائے فرض میں وہ اِس درجہ مستحکم ہیں کہ ایسی بہت کم مثالیں پائی جائیں گی۔ جو کام اُن کے سپرد کر دو اور وہ اُس کو قبول کرلیں اُس کی جانب سے بالکل اطمینان ہو جانا چاہئے کہ وہ اس کو پورا کر دیں گے۔ گو بظاہر وہ یہی کہیں گے مجھے اِس سے کوفت ہوتی ہے لیکن در اصل اُن کی طبیعت میں ایک قسم کی Stoicism ہے جسے وہ اپنے استہزا اور تمسخر کے ذریعے سے چھپانا چاہتے ہیں۔ جس طرح بعض لوگ نیکی کر کے کنوئیں میں ڈالتے رہتے ہیں اسی طرح وہ جو کچھ کام بھی کرتے ہیں اُس کو کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں۔ کم از کم اس معنی میں کہ اُس کی نمود و نمائش سے ہمیشہ پہلو بچاتے ہیں۔

اُن کی گفتگو میں تیزاب اور سرکہ کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے یا شاید اسی کی وجہ سے وہ بہت دل چسپ ہوتی ہے اور وہ اُس کو پُر لطف بنانے کے لئے جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ بشرطیکہ اس جھوٹ سے اُن کی ذات کو کوئی فائدہ نہ پہنچے اور دوسروں کو نقصان نہ ہو۔ اِس قسم کے جھوٹ کو انھوں نے ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ وہ بالکل بے بنیاد خبروں اور باتوں کو اس سنجیدگی اور متانت سے بیان کرتے ہیں کہ ناواقف لوگ تو یقیناً اور اکثر مرتبہ اُن کے دوست بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اکثر جھوٹ اس لئے بھی بولتے ہیں کہ دوسروں کی رائے اور خیالات

معلوم کرسکیں لیکن بعد میں خود ہی اِس کو ظاہر بھی کر دیتے ہیں لیکن اگر جھوٹ بولنے سے اُن کا کوئی ذاتی فائدہ ہوتا ہے تو اُس وقت وہ اصولاً جھوٹ نہیں بولتے۔ کیونکہ یہ اُن کے نزدیک بزدلی ہے اور آرٹ کی تذلیل! دروغ گوئی ایک فنِ لطیف ہے اور فن بجائے خود اپنا مقصد ہوتا ہے۔ وہ خود اپنے لئے ایک دلیل جواز ہے۔ اُس کو کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانا یا اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا اُس کی شان کو کم کرنا ہے۔ اُن میں ایک قسم کا تہوّر ہے۔ یعنی اگر سچ بولنے میں اُن کو ذاتی طور پر کسی قسم کا خطرہ یا خدشہ ہو تو ضرور سچ بولیں گے۔ اُس وقت کسی قسم کا سمجھوتا یا مصلحت کا دخل ناممکن ہے۔

غرض انہوں نے اپنے لئے بعض نہایت بلند (اگرچہ کسی قدر غیر معمولی) معیارِ عمل قائم کر لئے ہیں اور وہ اپنی باتوں اور کاموں کو انہیں پر جانچتے ہیں۔ اگر وہ اپنے خیال کے مطابق اُن پر پُورے اتریں تو اُن کا ضمیر مطمئن رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے اُن کو غیر اہم اور غیر متعلق معلوم ہوتی ہے یعنی اپنی زندگی اور اپنی ذات کے لئے وہ خود ہی قانون اور اخلاق کا سرچشمہ ہیں۔ اُن کا مذہب، اُن کا فلسفہ اخلاق و معاشرت، اُن کی راست بازی کسی بیرونی اثر یا خوف یا امید پر منحصر نہیں۔ عام طور پر لوگ اکثر کام سوسائٹی کی رضاجوئی کی امید یا اُس کی ناراضگی کے ڈر سے کرتے ہیں لیکن اُن کی ہر چیز بشدت سے انفرادی ہے۔ اگر دنیا میں اُن کے سوا اور کوئی شخص نہ ہو یعنی اگر وہ کسی جماعت کے فرد نہ ہوں اور وہ تمام قیود اور بندشیں ہٹ جائیں جن کی وجہ سے ہمارے موجودہ نظامِ عمل اور نظامِ تمدّن کے اصول قائم ہوئے ہیں۔ تو اِس صورت میں بھی اُن کے اپنے اصولِ زندگی میں فرق نہ پڑے گا۔ اُن میں ایک زبردست اور اٹل عزتِ نفس ہے، ایک احساسِ خودی ہے جو اُن کو ہر قسم کے مکر و فریب، کمینہ پن، خود مطلبی اور دوسروں کی حقوق تلفی سے باز رکھتا ہے۔ بلکہ آپ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں ایک قسم کی عجیب نفس پرستی ہے جس کی اس طرح قلبِ ماہیت ہوگئی ہے کہ وہ بجائے ہر قسم کی برائیوں کی محرک ہونے کے ہر قسم کی خوبی کی ضامن ہے۔ اور چونکہ اُن میں یہ بات کسی مصلحت یا کسی جزا اور سزا کے خیال پر قائم نہیں اس لئے اُن پر ہر معاملہ میں پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ عام معنی میں کسی مذہب کے قائل نہیں یعنی وہ اُن اعمال اور عقائد و عبادات کو نہ ادا کرتے ہیں نہ مانتے ہیں جو بعض ضروری مصلحتوں کی وجہ سے مذہب کا جزوِ لازم بنائی گئی ہیں۔ لیکن اُن میں حقیقی مذہبی روح موجود ہے یعنی اپنے سامنے ایک اعلیٰ نصب العین رکھ کر (جو خود ساختہ ہے) ہمیشہ اُسی کے مطابق چلنا اور اُس کے راستے میں جو مشکلات اور تکالیف حائل ہوں اُن کو بے پروائی کے ساتھ نظر انداز کرنا۔ اگر کوئی تم سے پوچھے کہ اُن کا حشر کیا ہوگا تو کہہ دو کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے، مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

خواجہ غلام السیدین

اپنے دوست سے

جو حال دِل کا ہے کیسے تجھے بتاؤں دوست! | یہ داستانِ الم کیا تجھے سناؤں دوست!
تری خوشی کے لئے دِل کا یہ تقاضا ہے | ہزار غم ہوں مگر پھر بھی مسکراؤں دوست!
جو دل کی بات ہے لیکن وہ چھُپ نہیں سکتی | چھُپے گی تجھ سے نہ گو لاکھ اُسے چھپاؤں دوست!
سُنی کسی نے نہ دُنیا میں دل کی بات کبھی | جو گذری دل پہ مرے آ تجھے بتاؤں دوست!
ترے خیال میں اِک عمر کٹ گئی میری | جو زخم دل پہ لگے آ تجھے دکھاؤں دوست!
سُناؤں کِس کو تجھی کو نہ گر سناؤں میں | دکھاؤں کس کو تجھی کو نہ گر دکھاؤں دوست؟
جو میرے دل میں ہوئے جذب خشک ہو ہو کر | مَیں تیرے سامنے آنسو وہ پھر بہاؤں دوست!
مِلا جہاں میں مجھے کیا جو تُو ہی مل نہ سکا | جو تُو ہی مِل نہ سکا کِس سے دل مِلاؤں دوست؟
ہر ایک چیز کے کھونے سے تُو جو مِل جائے | ہر ایک چیز کو کھو کے تجھ کو پاؤں دوست!
خوشی کی چاہ ہے پھر بھی یہ چاہتا ہے دل | گداز کر دے جو دل کو وہ گیت گاؤں دوست!

ترے خیال میں غمگیں ہُوا بشیر کا دِل
جو حال دل کا ہے کیسے تجھے بتاؤں دوست!

بشیر

خزاں کی ایک رات

موسمِ خزاں کی ایک رات کا ذکر ہے میں عجب بے اطمینانی اور بے چینی کی حالت میں تھا۔ جس قصبہ میں میں ابھی ابھی وارد ہوا تھا اور جہاں میں کسی ایک متنفس سے بھی واقف نہ تھا میں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ میری جیب میں ایک پائی نہ تھی اور رات بھر کا بسیرا میسر نہ تھا۔

پہلے چند روز میں میں نے اپنے لباس کا ہر وہ حصہ بیچ کھایا جس کے بغیر میں ادھر اُدھر جا سکتا تھا۔ پھر شہر کو چھوڑ کر اُس حصہ میں چلا آیا جہاں دخانی جہازوں کے گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ وہ حصہ جو جہاز رانی کے زمانے میں زندگی کی جدوجہد کا مرکز بنا رہتا ہے لیکن جواب خاموش اور سنسان تھا کیونکہ یہ ماہِ اکتوبر کے آخری دن تھے

گیلی گیلی ریت پر اپنے پاؤں کو گھسیٹتے ہوئے کہ شاید اس میں کسی قسم کی خوراک کا کوئی ٹکڑا دبا ہوا ہو میں تن تنہا خالی مکانوں اور گوداموں میں گھوم رہا تھا اور دل ہی دل میں یہ خیال کر رہا تھا کہ کیا اچھا ہو جو پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔

موجودہ تہذیب و تمدن کو دیکھ کر ہمارا دل تو سیر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا جسم بھوکا ہی رہتا ہے۔ بازاروں میں جاؤ، تم عالی شان عمارتوں میں گھر جاؤ گے اور اُن کا نظارہ فنِ تعمیر، ترقیِ معاشرت اور ایسے ہی بلند پروازی کے دوسرے موضوعات پر تمہارے خیالات کے لئے تقویت بخش ثابت ہوگا، تم کو عمدہ عمدہ گرم لباسوں میں لپٹے ہوئے لوگ ملیں گے ـــــ بڑے نرمی سے بات کرنے والے، بڑی حکمت سے کنی کترا کے نکل جانے والے، تمہارے ننگِ زمانہ وجود سے نامعلوم طریقے پر نظریں پھیر لینے والے! ہاں، ہاں ایک بھوکے آدمی کا دل ہمیشہ اُس شخص سے زیادہ تندرست اور توانا ہوتا ہے جسے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہو اور عسرت ہی وہ صورتِ حالات ہے جس میں ہمیں اُن لوگوں کی بہبود کا خیال آتا ہے جن کا وقت فاقہ مستی میں کٹتا ہے۔

شام کا سایہ بڑھا چلا آتا تھا، مینہ برس رہا تھا اور شمال کی تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ خالی بیٹھکوں اور دوکانوں میں اُس کے گزرنے سے چیخوں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی اور دریا کی لہریں جو شور مچاتی ہوئی ریتیلے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اُس کے طمانچوں سے کف آلود ہو جاتی تھیں، اچھل اچھل کر گرتی تھیں ایک کے پیچھے ایک ہو کر دھندلی دوریوں کی طرف بھاگی جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا جاڑے کی شکل دیکھتے ہی بے تحاشا بھاگا ہے کہ کہیں

شمال کی برفانی ہوا اپنی بیڑیاں آج ہی رات اُس کے پاؤں میں نہ ڈال دے۔ آسمان بوجھل اور تاریک ہو رہا تھا اور اُس پر سے مینہ کے باریک باریک قطرے لگاتار گر رہے تھے۔ فطرت کا غم انگیز ماتمی گیت بید مجنوں کے دو بدشکل درختوں اور ایک اوندھی پڑی ہوئی اور اِن درختوں سے بندھی ہوئی کشتی کی موجودگی سے اور بھی موثر ہو گیا تھا۔

الٹی ہوئی کشتی جس کا پیندا ایٹھا ہوا تھا اور خراب و خستہ بوڑھے درخت جن کے برگ و ساز سرد ہوا لوٹ لے گئی تھی بلکہ ہر وہ چیز جو میرے اردگرد پھیلی تھی مفلوک الحال، ابتر اور بے جان نظر آتی تھی اور اس نظارے کو دیکھ دیکھ کر آسمان کے آنسو نہ تھمتے تھے...... ہر چیز تیرہ و تار ہو رہی تھی..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز مر چکی ہے اور صرف میں اکیلا زندہ رہ گیا ہوں اور میرے لئے بھی موت کا یہ زمہریر انتظار کر رہا ہے۔

اُس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی..... کیا ہی زمانہ تھا!

میں سرگیلی ریت پر دُور تک چلا گیا۔ سردی اور بھوک کے اعزاز میں میرے دانت ایک ساز کی طرح بج رہے تھے۔ ایک جگہ خالی الماریوں کے پیچھے میں کوئی کھانے کی چیز تلاش کر رہا تھا کہ یکایک میری نظر ایک انسانی صورت پر پڑی۔ اُس کا نسوانی لباس بارش کی وجہ سے تر بہ تر ہو کر اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے پیوستہ ہو گیا تھا۔ میں چُپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ریت میں کوئی خندق کھود رہی ہے۔

"تم یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے اُس کے قریب جا کر کہا۔

ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اب کہ وہ خوف سے بھری ہوئی بڑی بڑی نیلی نیلی آنکھیں کھولے میرے سامنے کھڑی تھی میں نے دیکھا کہ یہ ایک لڑکی ہے میری ہی عمر کی، جس کے روشن چہرے کو تین بڑے بڑے نیلے داغوں نے گہنا رکھا ہے۔ گو اِن داغوں کی تقسیم اُس کے چہرے پر نہایت موزونیت اور تناسب کے ساتھ ہوئی تھی پھر بھی انہوں نے اُس کے حسن کو چھپا دیا تھا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ اکیلے اکیلے نمایاں تھے۔ سب جسامت میں تقریباً برابر تھے ـــــ دو آنکھوں کے نیچے اور ایک جو ذرا بڑا تھا پیشانی پر ناک کے عین اوپر۔ بلاشبہ یہ کام تھا کسی اُس حسن کار کا جو انسانی صورتوں کے بگاڑنے کا خوگر ہو۔

وہ میری طرف دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھوں میں سے وحشت آہستہ آہستہ مفقود ہوتی گئی...... اُس نے ہاتھوں پر سے ریت جھاڑی، اپنے سر کے سوتی رومال کو ترتیب سے باندھا پھر ذرا جھکی اور کہا:

"میں سمجھتی ہوں تمہیں بھی کھانے کے لئے کچھ چاہیئے؟ تو پھر اس جگہ کو کھود و! میرے ہاتھ تھک گئے ہیں"

یہاں"ــــ اُس نے اپنے سر کی جنبش سے ایک دوکان کی طرف اشارہ کیا ـــ "یہاں روٹی کا مل جانا یقینی ہے...... اور سالن کا بھی........ یہ دوکان ان دنوں بھی کاروبار کر رہی ہے"۔

مَیں کھودنے لگا کچھ دیر ٹھہر کر اور میری طرف دیکھنے کے بعد وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور مجھے مدد دینے لگی ہم خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ میں اب نہیں کہہ سکتا کہ اُس وقت جرم، قانون ملکیت اور ایسی ہی وہ تمام دوسری باتیں جن کے متعلق تجربہ کاروں کی رائے ہے کہ زندگی کے ہر لمحہ میں ملحوظ رہنی چاہئیں میرے خیال میں تھیں یا نہیں۔ صداقت کے انتہائی قریب رہتے ہوئے مَیں اقرار کرتا ہوں کہ میں کھودنے میں اتنا منہمک تھا کہ اس ایک بات کے سوا کوئی دوسری بات میرے وہم وخیال میں بھی نہ آتی تھی کہ اِس الماری کے اندر کیا ہوگا!

شام کا سایہ پھیلتا گیا۔ چاروں طرف کہر کی تاریکی بڑھتی گئی۔ موجوں کا شور بھاری ہوتا گیا اور مینہ کے چھینٹے الماری کے تختوں پر پہلے سے بلند آواز کے ساتھ گرنے لگے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر پہرہ داروں کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس کی کوئی تہ بھی ہے؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اُس نے کیا کہا اِس لئے میں خاموش رہا۔

"مَیں کہتی ہوں، اِس الماری کی کوئی تہ بھی ہے؟ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم یہاں کھودتے کھودتے ایک خندق بنا دیں اور نتیجہ یہ ہو کہ الماری کے نیچے بھی لکڑی کے مضبوط تختے لگے ہوں۔ ایسی صورت میں ہم کیونکر انہیں اکھاڑ سکیں گے؟ بہتر ہو کہ تالے کو توڑ ڈالیں ـــ اس ناکارہ تالے کو"۔

عورتوں کو عمدہ خیالات شاذونادر ہی سوجھتے ہیں لیکن کبھی کبھی سوجھ ضرور جاتے ہیں۔ میں نے عمدہ خیالات کی ہمیشہ قدر کی ہے اور ہمیشہ جہاں تک ممکن ہو سکے اُن سے مستفید ہونے کی کوشش کی ہے۔

میں نے تالے کو پکڑ کر اِس زور سے مروڑا کہ وہ کنڈی سمیت اکھڑ آیا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھی اور الماری کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی "تم تو پتھر ہو پتھر!"

آج کسی عورت کا ایک چھوٹا سا تعریفی فقرہ میرے لئے اُس مرد کے بڑے سے بڑے قصیدے سے بھی زیادہ قدروقیمت رکھتا ہے جس میں تمام قدیم اور جدید لسانوں کی لسانیاں جمع ہوں، لیکن اُس وقت میرے مزاج میں اکھڑپن تھا اور اب اُس کی اصلاح ہو چکی ہے، چنانچہ اُس کی تحسین وتعریف پر کان نہ دھرتے ہوئے مَیں نے بےتابانہ اُس سے سوال کیا،۔

"اس میں کچھ ہے بھی؟"

وہ ایک بے کیف آواز کے ساتھ سب چیزوں کو گننے لگی۔

ٹوکری بھر بوتلیں ـــــ پوستینیں ـــــ ایک چھتری ـــــ لوہے کی ایک گڑوی"

ان میں کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ میری تمام امیدیں مٹ گئیں .... لیکن یکایک وہ شگفتہ خاطر بولی

"اہا! یہ لو!"

"کیا؟"

"روٹی..... ایک روٹی..... صرف بھیگ رہی ہے........ یہ لو!"

"اس نے اُسے میری طرف پھینک دیا اور پھر خود بھی چلی آئی۔ اُس کے آنے تک میں نے ایک بڑا سا لقمہ دانتوں سے توڑ کر اپنا منہ بھر لیا تھا اور اب اُسے چبا رہا تھا......

"آؤ، اس میں سے مجھے بھی تھوڑی سی دو!...... اور ہمیں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیئے..... لیکن ہم کہاں جائیں؟" وہ ہر طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگی...... فضا میں تاریکی، نمی اور شور تھا۔

"دیکھو وہ ایک الٹی ہوئی کشتی پڑی ہے..... آؤ وہاں چلیں"

"چلو!" اور ہم چل پڑے...... اپنے مالِ غنیمت کے حصے بخرے کرتے ہوئے اور اُس کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے اپنے کلّوں کو بھرتے ہوئے...... بارش اور تیز ہو گئی، دریا رعد کی طرح گرجنے لگا۔ کہیں نہ کہیں ایک مسلسل مضحکہ اڑانے والی سیٹی بج رہی تھی..... بالکل اس طرح جیسے کوئی بالا و برتر ہستی جسے کائنات میں کسی کا خوف نہ ہو تمام زمینی سرگرمیوں کی، خزاں کی اس ہیبت ناک رات کی اور ہماری جو اِس طوفانی رات کے ہیرو ہیں ہنسی اُڑا رہی ہے۔ اِس ہنسی کو سُن کر میرا دل پارہ پارہ ہو گیا، مگر اس کے باوجود میں اپنی روٹی حریصانہ کھاتا رہا، اور یہ لڑکی جو میرے بائیں جانب ساتھ ساتھ چل رہی تھی اس معاملہ میں بھی میرے قدم بہ قدم جا رہی تھی۔

میں نے ابھی تک اُس کا نام دریافت نہ کیا تھا، اب میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نتاشا" اُس نے جھٹ جواب دیا۔

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ میرے دل میں درد کی اک ٹیس اٹھی، اور پھر میں نے اپنی نظریں رات کی تاریکی کی طرف پھیر لیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری قسمت کی بد اندیش صورت میری طرف دیکھ دیکھ کر عجیب پُراسرار اور بے رحمانہ انداز سے مسکرا رہی ہے۔

مینہ کشتی کے تختوں پر تازیانوں کی طرح مسلسل پڑ رہا تھا، اُس کی ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ غم والم کے خیالات برانگیختہ کر رہی تھی اور ہوا جب کشتی کی ایک درز میں سے اُس کے ٹوٹے ہوئے پیندے میں داخل ہوتی تھی تو اُس میں سے ایک عجب اضطراب انگیز اور اُداس آواز اُٹھتی تھی۔ دریا کی لہریں آ آ کر ساحل سے ٹکراتی تھیں تو اُن میں سے ایک بھیانک اور مایوس کُن صدا پیدا ہوتی تھی، اِس طرح جیسے وہ کوئی رنج دہ اور ناقابلِ برداشت کہانی سنا رہی ہیں جو خود اُن کی ہمتوں کو توڑ توڑ کر رکھ دیتی ہے، ایسی کہانی جس کو سنائے بغیر وہ بھاگ جانا چاہتی ہیں لیکن جس کے سنانے پر وہ مجبور ہیں۔ بارش کی آواز دریا کی آواز سے مل کر ایک آہِ مسلسل بن جاتی تھی جو اوندھی کشتی کے اوپر تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ــــ جفاکش، زخمی دل اور خستہ و ماندہ زمین کی وہ بے اختتام آہ جو تابان و درخشاں بہاریں سے نکل کر سرد، کُہر آلود اور تاریک خزاں کی منزل سے گزرتے وقت اُس کے سینے میں سے نکلتی تھی۔ ہوا سنسان اور کف انگیز دریا پر چل رہی تھی ــــ چل رہی تھی اور اپنے الم ناک راگ گائے چلی جاتی تھی۔

کشتی کی اوٹ میں ہم بالکل بے آرامی کی حالت میں پڑے تھے۔ یہ تنگ تھی اور بھیگ رہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے پیندے میں سے بارش کے چھوٹے چھوٹے سرد قطرے ٹپکتے تھے اور ہوا کے سرد جھونکے اندر داخل ہوتے تھے۔ ہم خاموش بیٹھے تھے اور سردی سے کانپ رہے تھے۔ پھر مجھے نیند کا خیال آیا۔ نتاشا کشتی سے سہارا لگائے گُھم گُھما ہو کر ایک چھوٹی سی گیند بنی بیٹھی تھی۔ اپنی باہوں کو اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے اور اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے ہوئے اپنی کشادہ آنکھوں سے وہ دریا کی طرف گھور رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کے زرد چہرے پر نیلے داغوں کی وجہ سے اور بھی بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بالکل بے حرکت ہو رہی تھی اور یہ سکون و سکوت ــــ میں محسوس کرنے لگا کہ میرے اندر رفتہ رفتہ اُس کی طرف سے ایک خوف پیدا کر رہا ہے۔ میں اُس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر یہ سوچ رہا تھا کہ کیونکر شروع کروں۔

آخر اُسی نے ابتدا کی۔

"زندگی کیسا دکھ ہے!" اُس نے نہایت صفائی، محویت اور یقین کے لہجے میں کہا۔

لیکن یہ شکایت نہ تھی۔ اِن الفاظ کو کچھ ایسی بے اعتنائی سے ادا کیا گیا تھا کہ ان میں شکایت کا شائبہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اِس سادہ و بے لوث روح نے زندگی پر اپنی سمجھ کے مطابق غور کیا تھا ــــ غور کیا تھا اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر اُسے بلند آہنگی سے بیان کر دیا تھا اور میں اُس کی تردید نہ کر سکتا تھا کیونکہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ میری اپنی تردید ہوتی۔ اس لئے میں خاموش رہا، اور وہ اُسی طرح بے حرکت بیٹھی رہی۔

"کیا ہو گا . . . . . اگر ہم زندگی کو برا بھی کہہ دیں؟" نتاشا نے پھر کہا۔ اِس دفعہ بھی اُس کے لہجہ میں شکایت کا

کوئی پہلو نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زندگی کے متعلق اِن خیالات کے اظہار کے وقت اُس کے پیش اُس کی اپنی ذات تھی، اور اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اپنے آپ کو زندگی کی تضحیک و استہزا سے بچانے کے لئے وہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی کہ اُس کی تحقیر کرے۔

یہ سلسلۂ خیالات میرے لئے ناقابلِ بیان طور پر غم انگیز اور پُر درد تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر میں اب بھی خاموش رہا تو عجب نہیں کہ میں ظاہرا طور پر رونے لگوں..... اور ایک عورت کے سامنے یہ حرکت کیسی شرمناک معلوم ہوتی، خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ خود رو نہ رہی تھی۔ میں اُس سے باتیں کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"اور وہ کون تھا جس نے تمہیں پیٹا تھا؟" میں نے جھٹ کہہ دیا، کیونکہ میں اس سے کسی زیادہ دقیق اور لطیف بات کے سوچنے کا انتظار نہ کرنا چاہتا تھا۔

"یہ سب پاشکا کی مہربانی ہے"۔ اُس نے سادہ لوحی سے کہا۔

"اور وہ کون ہے؟"

"اُسے مجھ سے محبت ہے.....وہ نان بائی کا کام کرتا ہے۔"

"کیا وہ اکثر تمہیں مارتا ہے؟"

"جب کبھی شراب کے نشے میں ہوتا ہے، وہ مجھے مارتا ہے:.... اکثر!"

اب یکایک اُس نے میری طرف مڑ کر اپنے متعلق پاشکا کے متعلق اور اپنے باہمی تعلقات کی نسبت باتیں شروع کر دیں، کہ وہ ایک نان بائی تھا، اُس کی مونچھیں سرخ تھیں اور وہ ستار بہت اچھی بجاتا تھا۔ اور وہ اکثر اُس سے ملنے آتا تھا اور اُسے اُس سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی کیونکہ یہ خوش طبع چھوکرا عمدہ اور نفیس لباس پہنتا تھا۔ اُس کے پاس ایک واسکٹ تھی جس پر اُس کے پندرہ روبل خرچ ہوئے تھے اور ایک بہت خوبصورت مخملی بوٹ بھی تھا۔ یہ تھیں وہ تمام باتیں جنہوں نے اس سیدھی سادھی لڑکی کا دل موہ لیا تھا، اور اُس کی نظروں میں اعتبار پیدا کر لیا تھا۔ اور اسی اعتبار پر وہ اُس سے وہ تمام نقدی اڑائے جاتا تھا جو اُسے گھر سے ملتی تھی، لیکن اِس کی وہ ذرہ برابر بھی پروا نہ کرتی، اگر وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے دوسری لڑکیوں پیچھے نہ بھاگتا پھرتا۔

"اب کیا یہ میری توہین نہ تھی؟ میں دوسری لڑکیوں سے صورت شکل میں تو کم نہیں۔ یقیناً اس کے یہی معنی تھے کہ وہ مجھ سے مذاق کرتا ہے، نابکار۔ کل کی بات ہے میں اپنی مالکہ سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر اُس کے پاس گئی، اور وہاں میں نے دیکھا کہ ڈمکا شراب پی کر بدمست ہو رہی ہے اور پاشکا کی عقل بھی سمندر پار پہنچی ہوئی ہے۔ میں نے

کمانا اور ذلیل کمینے! اِس پر اُس نے مجھے خوب سزا دی۔ وہ مجھے لاتوں اور مکّوں سے مارتا رہا اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا رہا۔ لیکن یہ سب اُس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا جو بعد میں ہوُا۔ اُس نے میرا سارا لباس اتار لیا اور جب چھوڑا تو میں اسی حالت میں تھی جو میری اب ہے! اب کیسے مَیں اپنی بیگم کے سامنے جا سکتی تھی؟ اُس نے میری تمام چیزیں چھین لیں ...... میرا جاکٹ بھی لے لیا یہ ابھی بالکل نیا تھا، ابھی چند روز ہوئے مَیں نے اس پر ایک پنجہ خرچ کیا تھا ..... اُس نے میرے سر سے رومال بھی اتار لیا . . . . اور میرے خدا! میرا اب کیا انجام ہوگا؟ وہ یکایک ایک آزردہ اور دردمند آواز میں چلّا اٹھی ہوا چیخیں مارتی ہوئی چلنے لگی اور اَور زیادہ سرد اور نم آلود ہو گئی ..... میرے دانت پھر اچھل اچھل کر رقص کرنے لگے۔ وہ سردی سے بچنے کے لئے میری جانب چلی آئی اور میرے جسم سے لگ کر مجھ سے اتنی قریب ہو گئی کہ اندھیرے میں مجھے اُس کی آنکھوں کی چمک نظر آنے لگی۔

"کیسے کمبخت ہو تم تمام مرد! میرا بس چلے تو تم سب کو بھٹی میں ڈال کر جلا دوں، تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ اگر تم میں سے کوئی مر رہا ہو تو میں اُس کے منہ میں تھوکوں اور اُس کی پشہ برابر بھی پروا نہ کروں۔ کمینہ کتّے! تم خوشامدیں اور چاپلوسیاں کرتے ہو کتوں کی طرح دُمیں ہلا ہلا کر ہماری طرف آتے ہو اور ہم نادان اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی ہستی کو کھو بیٹھتے ہیں! پھر ذرا سی دیر بھی نہیں گزرتی کہ تم ہمیں اپنے پیروں تلے روندنا شروع کر دیتے ہو، بدنصیبو، بدبختو!"

وہ ہمیں بُرا بھلا کہہ رہی تھی لیکن اُس کے اِس بُرا بھلا کہنے میں کوئی طاقت، کوئی دشمنی کوئی نفرت نہ تھی اُس کی گفتگو کا لہجہ کسی طرح بھی اُس کے موضوع کا ہم آہنگ نہ تھا کیونکہ اُس میں کامل سکون تھا اور اُس کی آواز کی سرگرم خطرناک حد تک دھیمی تھی۔

مگر ان سب باتوں نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ قنوطیت کی وہ فصیح ترین کتابیں اور تقریریں بھی نہ کر سکیں، جن کا معتدبہ حصہ مَیں پڑھ چکا تھا اور جنہیں آج تک میں پڑھ رہا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ ایک مرتے ہوئے انسان کا درد و کرب اپنے اندر بہت زیادہ حقیقت اور قوت رکھتا ہے بہ نسبت موت کی اُس تصویر کے جسے کسی نے اپنے الفاظ کے باریک قلم سے کھینچ کر رکھ دیا ہو۔

مَیں اپنی حالت کو حقیقت میں ابتر محسوس کرنے لگا۔ نتاشا کی گفتگو سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ سردی کی شدت کی وجہ سے۔ مَیں کراہنے لگا اور اپنے دانت پیسنے لگا۔

اُسی وقت دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ میری طرف بڑھے ـــ ایک میری گردن کے گرد حائل ہو گیا اور دوسرا میرے چہرے پر آ گیا ـــ اور ساتھ ہی کسی نے فکرمند، نرم و شیریں اور دوستانہ آواز میں پُوچھا:

"تمہیں کیا چیز دکھ دے رہی ہے؟"

میں یہ یقین کر لینے پر تیار تھا کہ مجھ سے یہ سوال کرنے والا اُس نٹا شا کے سوا کوئی دوسرا ہے جس نے ابھی ابھی تمام مردوں کو بے حمیت ظاہر کیا تھا اور اُن کو تباہ و برباد کر دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن یہ وہی تھی اور اب وہ جلد جلد اور تیزی سے بولنے لگی تھی۔

"تمہیں کونسی چیز دکھ دے رہی ہے؟ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟ کیا تم ٹھٹھر رہے ہو؟ آہ، تم یوں ایک ننھے سے اُلّو کی طرح بیٹھے ہوئے کیسے عجیب معلوم ہو رہے ہو! تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تمہیں سردی ستا رہی ہے آؤ۔۔۔ یہاں لیٹ جاؤ اور میں تمہارے ساتھ لیٹ جاؤں گی۔۔۔ ہاں یونہی! اب اپنی باہیں میرے گرد لپیٹ لو۔۔۔۔۔ اَور کس کر! اب بتاؤ؟ اب تم بہت جلد گرم ہو جاؤ گے۔۔۔ اور پھر ہم ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے سو جائیں گے۔۔۔۔ رات بہت جلد گزر جائے گی۔۔۔ تم دیکھنا کہ کتنی جلد گزر جائے گی۔ میں کہتی ہوں۔۔۔۔ کیا تم بھی شراب پیا کرتے تھے۔۔۔۔؟ کیا تم سے بھی کام چھین لیا گیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ تم قطعاً پروا نہ کرو۔"

اور اُس نے مجھے آرام پہنچایا۔۔۔۔۔ میری ہمت بڑھائی۔

لعنت ہو میری اس زندگی پر! میری اس ایک مصیبت میں مصائب کی ایک دنیا بستی تھی! ذرا تصوّر کرو! میں جو انسانیت کے انجام پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے میں مصروف رہتا تھا، نظامِ تمدّن کو از سرِ نو ترتیب دینے کی تجویزیں سوچا کرتا تھا سیاسی انقلابات کے خیالات اپنے دماغ میں بسایا کرتا تھا اُن کتابوں کو پڑھا کرتا تھا جنہیں شیطان صفت حکمت و فراست سے لکھا گیا تھا اور جن کی انتہا گہرائی تک خود مصنفین کا دماغ بھی نہ پہنچ سکا ہوگا ـــ میں جو اپنی تمام قوت سے کوشش کر رہا تھا کہ اپنے آپ کو ایک "ذی اختیار عملی اشتراکی طاقت" بناؤں، بلکہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں نے ایک حد تک اپنے مقصد کی تکمیل کر لی ہے۔ میں جو اپنے خیال میں اُس مقام تک پہنچ چکا تھا جہاں میں نے سمجھ رکھا تھا کہ مجھے زندہ رہنے کا ایک امتیازی حق حاصل ہے اور مجھ میں وہ عظمت موجود ہے جو اس حق کو ثابت کرتی ہے اور میں دنیا کے عظیم الشان تاریخی کارناموں میں ایک اور کارنامہ کا اضافہ کرنے کے بالکل قابل ہوں یہاں پڑا تھا اور ایک عورت مجھے اپنے جسم کی حرارت سے گرما رہی تھی۔ ایک مفلوک الحال بے سروسامان، ستائی ہوئی ہستی جس کی عرصۂ حیات میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور جس کی مدد کرنے کا مجھے خیال تک نہ آیا تھا یہاں تک کہ اُس نے خود میری مدد کی اور اگر مجھے مدد کا خیال آ بھی جاتا تو یقیناً میں نہ جان سکتا کہ وہ کیونکر ہو سکتی ہے۔

میں یہ مان لینے پر تیار تھا کہ یہ کوئی خواب ہے جو مجھ پر گزر رہا ہے ـــ ایک ناخوشگوار اور اندوہگین خواب لیکن آہ! میرے لئے یہ خیال کرنا ناممکن تھا، کیونکہ بارش کے سرد سرد قطرے مجھ پر پڑ رہے تھے، وہ مجھے سردی

سے چھپارہی تھی اور اُس کی گرم گرم سانس میرے منہ سے چھو رہی تھی۔ ہوا شوروغل مچارہی تھی، بارش کے قطرے تیروں کی طرح کشتی پر پڑرہے تھے، لہریں ساحل سے ٹکرارہی تھیں اور ہم دونوں سردی سے اکڑے ہوئے اور کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔ اِس ساری کیفیت پر مجاز کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا، اور مجھے یقین ہے کہ آج تک کسی نے ایسا گراں بار اور ہولناک خواب نہ دیکھا ہوگا جیسی یہ حقیقت تھی۔

مگر نتاشا لگاتار اِدھر اُدھر کی باتیں کررہی تھی ـــــ ملاطفت اور ہمدردی کی باتیں، جیسی صرف عورتیں کرسکتی ہیں۔ اس کی آواز اور الفاظ کے تاثرات ایک ہلکی سی آگ کی طرح میرے سینے میں سلگنے لگے اور میرا دل پگھلنے لگا۔

پھر آنسو میری آنکھوں سے طوفانِ باراں کی طرح گرنے لگے، جنہوں نے بہت سی بدیوں بہت سی حماقتوں، بہت سے غموں کی گرد کو میرے دل سے دھو ڈالا جو اِس رات سے پہلے اُس پر جم رہی تھی۔ نتاشا مجھے تسلّی دے رہی تھی۔

"بس، بس، ننھے میاں اب چُپ ہوجاؤ! جانے بھی دو! اب چُپ ہوجاؤ! خدا تمہیں اور موقع دے گا۔۔۔۔ تم اپنی اصلاح کروگے اور اپنے حقیقی مقام پر پھر کھڑے ہوگے۔۔۔۔ اور سب کام اچھے ہوجائیں گے۔۔۔۔۔"

اور وہ مجھے چومتی جاتی تھی جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو چومتی ہے۔۔۔۔ بےنفس اور بےغرض ہوکر۔

"بس اب چُپ ہوجاؤ، مجھے تمہاری صورت دیکھ کر ہنسی آرہی ہے۔ صبح ہونے دو میں تمہارے لئے آپ کوئی جگہ تلاش کروں گی اگر تم نہیں کرسکے۔" اُس کی یہ پُرسکون اور ہمت افزا سرگوشیاں میرے کانوں میں اِس طرح گونج رہی تھیں جیسے یہ کوئی خواب ہو۔

صبح ہونے تک ہم وہیں پڑے رہے۔۔۔۔

اور جب صبح ہوئی ہم کشتی کے پیچھے سے نکلے اور شہر کو چلے گئے۔۔۔۔ پھر ہم نے ایک دوسرے سے دوستانہ طریق پر رخصت حاصل کی اور اُس کے بعد کبھی نہ مل سکے، گو پورے چھ ماہ تک میں نے اُس ہمدرد نتاشا کے لئے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا جس کے ساتھ میں نے خزاں کی یہ رات گزاری تھی۔

اگر وہ مرچکی ہے۔ اور اُس کے لئے اچھا ہے اگر وہ مرگئی ہو ـــ تو وہ یہ ابدی نیند امن کے ساتھ سوئے! اور اگر وہ زندہ ہے تو پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ اُس کی روح پر سلام ہو! اور اُس کی روح کو کبھی دنیا کی پستی کا احساس نہ ہو۔۔۔۔۔ کیونکہ اگر زندہ رہنا ہے تو یہ احساس زندگی کا ایک بےمصرف اور بےحاصل دُکھ ہے۔

گورکی

منصور احمد

پہلا گناہ

ننھا دیر سے باغ کے اندر اپنے کھیلوں میں مصروف تھا۔ بہار کے پھولوں پر بھنبھناتے ہوئے بھونروں اور رنگین تتلیوں کے تعاقب میں بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا، اُس کی چھوٹی سی لکڑی کی بندوق اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور آہستہ آہستہ وہ گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

عالمِ خواب میں بھی یہی نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کبھی وہ پرندوں کو پکڑنے کے لئے اونچے اونچے درختوں کی طرف اُچکتا اور کبھی کسی چڑیا کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ جنگلوں میں اپنی راہ سے بھٹک جاتا۔ خودرو پھولوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں، اور کھلے سبزہ زاروں میں بھاگتے ہوئے اُس کے ننگے پاؤں شبنم کی بارش سے بھیگ رہے تھے۔

ناشپاتی کے سرسبز درخت پر چہک چہک کر شیریں نغمے گانے والا، بھونروں اور تتلیوں کا دوست پرندہ اُس کے بے لوث دل کی معصوم دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ ننھا دیر سے اُسے جانتا تھا، اُس کو ہاتھوں میں پکڑ لینے کے لئے کئی بار وہ گر گر کر چوٹیں کھا چکا تھا اور جب پرندہ چہچہاتا ہوا کھلی ہوا میں اڑ کر اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو فرطِ رنج سے بارہا وہ چیخ چیخ کر روتے ہوئے زمین پر لوٹ چکا تھا۔ خواب کی دنیا میں بھی کبھی پریوں کے ہوا میں اُڑنے والے تخت پر بیٹھ کر وہ اُس کا تعاقب کرتا۔ کبھی خود اُس کے بھی ویسے ہی نرم و نازک اور خوشنما پر نکل آتے اور وہ ٹھنڈی ہواؤں میں ابر آلود آسمان کے اوپر یا چمکتے ہوئے سورج کی سیمیں شعاعوں کے سائے میں اُس کے پیچھے پیچھے اُڑتا۔

اب بھی یہ پرندہ عالمِ خواب میں بچے کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا اور اپنے ننھے ننھے بازو پھیلا کر بولا "اچھے پرندے! نیچے آجاؤ میں تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا" پرندہ چہکتا ہوا اُس کے سامنے سے جنگل کی طرف اڑا۔ ننھا اُس کے پیچھے بھاگا پرندہ اُس کو دق کرنے کیلئے ٹہنی ٹہنی بیٹھتا اور جب وہ قریب آتا پھر اُڑ کر آگے نکل جاتا۔

ننھا ناراض ہو گیا۔ بے اختیار اُس نے اپنی بندوق اٹھائی اور نشانہ باندھ کر لبلبی دبا دی۔ ایک زور کا دھماکا ہوا جس سے وہ خود بھی ڈر گیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ دفعتہً اُس کی آنکھ کھلی، اُس کی بندوق اُس کے قریب پڑی تھی اور باغ سے باہر جھاڑی میں کسی پرندے کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ننھا گھبرا

کر اُدھر بھاگا۔ اُس کا محبوب پرندہ جھاڑی میں گرا ہوا چیخ رہا تھا اور اُس کے ٹوٹے ہوئے بازو سے خون جاری تھا۔ کوئی شکاری اپنی بڑی سی بندوق کندھے پر رکھے اپنے گم شدہ شکار کو نہ پاکر اب تیزی سے آگے قدم بڑھا رہا تھا لیکن رنج و غم کے شدید احساس میں بچہ کو بجز پرندے اور اُس کے خون آلود بازو کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے پرندے کو ہاتھوں میں اُٹھا لیا اور اُس کو اُسی درخت کے نیچے لے آیا جس کے سایہ میں وہ کئی بار اُس کے میٹھے گیت سُن چکا تھا ۔۔۔ جہاں کبھی وہ پُرشوق نگاہوں سے اُس کو گھونسلے میں بیٹھے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

پرندے کی مادہ گھونسلے سے نکل کر بے تابانہ چیخ رہی تھی۔

ننھے کی دیرینہ خواہش آج پُوری ہو گئی تھی۔ وہ پرندے کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا تھا لیکن شاید زخمی پرندہ بھی اپنے ٹوٹے ہوئے بازو میں وہ درد محسوس نہ کرتا ہو جو اِس وقت بچے کے ننھے دل میں اُس کے لئے موجود تھا۔ اُس کے خیال میں پرندہ اُسی کے خود غرضانہ غصّہ کا شکار ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی حرکت پر پشیمان تھا اور دل ہی دل میں اپنی بندوق کو جو اُسے جان سے بھی عزیز تھی توڑ دینے کا عہد کر رہا تھا۔

اُسے اپنی عمر میں پہلی اور شاید آخری مرتبہ ندامت کا وہ شدید احساس ہوا جس سے صرف ایک معصوم اور بے لوث دل ہی آشنا ہو سکتا ہے۔ زندگی بھر میں اُس سے کئی لغزشیں ہونگی اور شاید پھر بھی کبھی اُسے نادم ہونا پڑے گا۔ لیکن اس "ناکردہ گناہ" کی ندامت کا مقابلہ پھر کبھی کسی بڑے سے بڑے گناہ کی ندامت بھی نہ کر سکے گی۔

پہلا گناہ پشیمانی کے اُس نازک پردہ کو اٹھا دیتا ہے جو گناہ اور معصومیت کے درمیان حائل ہوتا ہے۔

(ز۔ب)

محبّت

وہ ایک دوسرے کی طرف کھچے چلے گئے۔ فطرت نے کہا یہ محبت ہے،

وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے سہنے لگے۔ قانون نے کہا یہ محبت ہے،

وہ دو انسان تھے ایک دوسرے سے دُور جو باہمی محبت میں نیکی کے فرشتے بن گئے۔ خدا نے کہا محبت یہ ہے!

باغبان

بچّہ

اے گھر کے اُجالے! ترا پروانہ ہوں مَیں کیوں؟ کچھ تجھ کو خبر ہے ترا دیوانہ ہوں مَیں کیوں؟

میں 'دوش' ہوں

'فردا' ہے مرا جانِ پدر تُو!

اے نورِ نظر تُو!

کیوں چُومتا ہوں میں ترے ابرو؟ مرے ننھّے! کیوں جان سے پیارا ہے مجھے تُو؟ مرے ننھّے!

میں 'زینہ' ہوں

اور 'بام' مرا لختِ جگر تُو!

اے نورِ نظر تُو!

سَو جان سے کیوں لیتا ہوں مَیں تیری بلائیں؟ گھر کرتی ہیں دِل میں مرے کیوں تیری ادائیں؟

میں 'حرف' ہوں

'معنیٰ' ہے مرا جانِ پدر تُو!

اے نورِ نظر تُو!

پیکار تری ہے مری پیکار سے برتر! افکار ترے ہیں مرے افکار سے برتر!

پیارا ہے مجھے

اِس لئے اے لختِ جگر تُو!

اے نورِ نظر تُو!

امینِ حزیں

قوّتِ فیصلہ

ایک فلسفی کا قول ہے کہ انسانی مصائب کا سب سے بڑا سبب جرائم کے مقابلے میں قوتِ فیصلہ کی کمی ہے۔ اس بری عادت سے انسان نہ صرف اپنے متوسلین کو پابندِ آلام کرتا ہے بلکہ یہی کمزوری بالآخر خود اُس کی بربادی کا آلۂ کار بنتی ہے۔ تاریخِ عالم کے مشہور واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شجاع و فرزانہ انسان جو اپنی اولوالعزمانہ جدوجہد کے طفیل عروسِ کامیابی سے ہمکنار ہوئے، نہایت صائب الرائے اور اعلیٰ درجہ کی قوتِ فیصلہ کے مالک تھے۔ ہر کام کے متعلق اُن کا ایک فیصلہ ہوتا تھا، اٹل اور ناطق، اور دنیا کی کوئی قوت، کوئی طاقت پھر اُنہیں اپنے صادر کئے ہوئے فیصلہ سے انحراف پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔ ایک ایسا آدمی جو اپنی کوئی رائے نہ رکھتا ہو جو دو متضاد راؤں پر مہینوں دماغ سوزی کر کے بھی کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے وہ بہت جلد اپنی اس کمزوری اور قوتِ فیصلہ کے اس فقدان سے ارباب فراست پر ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ ایسی کمزور ہستی ہے جس کو اپنے جسم، اپنے خیالات اور اپنے دل و دماغ پر کسی قسم کا قابو حاصل نہیں اور وہ دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ دوسروں کا محکوم رہے۔ اور مشقت کی زندگی بسر کر کے ایک گمنام قبر میں ہمیشہ کے لئے سو جائے۔ اپنی رائے رکھنے والا انسان جو ہر معاملہ میں خواہ وہ کتنا ہی حقیر یا اہم کیوں نہ ہو بہت جلد صحیح نتیجہ پر پہنچ کر ایک آخری فیصلہ دے سکنے کا اہل ہو، دنیا کا بڑا آدمی ہے اور بڑا بننے کے لئے پھر وہ "موقع" یا "وقت" کا انتظار نہیں کرتا بلکہ تمام موافق حالات اور مساعد واقعات خود پیدا کر لیتا ہے۔

سنہ ۹۲ ہجری میں جب موسیٰ بن نصیر نے طارق ابن زیاد کو صرف بارہ ہزار آدمیوں کا مخلوط لشکر دے کر اندلس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تو راڈرک شاہِ سپین نے اپنی عظیم الشان سلطنت کے تمام ذرائع اور تمام طاقت کو ایک جگہ مجتمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ طارق کی دُور اندیش نگاہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ اتنی بڑی فوج سے جو مور و ملخ کی طرح اُمڈی چلی آ رہی تھی، مقابلہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ چنانچہ اس قائدِ اعظم نے حکم دے دیا کہ وہ تمام جہاز جن میں اُس کی فوج سوار ہو کر آئی تھی کنارِ بحر پر جلا دیئے جائیں تاکہ اُس کے سپاہیوں کے دماغ میں صرف فتح یا موت کا خیال باقی رہ جائے اور وہ فیصلہ کر لیں کہ ان دونوں میں سے کسے پسند کرتے ہیں۔ اب زندہ واپس جانے کی کوئی امید نہ تھی۔ بہادر سپہ سالار اور اُس کی جنگجو سپاہ اس بے جگری سے لڑی کہ تین دن کی جنگ میں انہوں نے یورپ کی قسمت کو زیر و زبر کر دیا۔ بادشاہ راڈرک کام آیا اور منصور و مظفر فوج شمالی علاقوں کی طرف بڑھنے لگی۔ نہ صرف ابتدائی حملوں میں طارق

نے اپنی عدیم النظیر قوتِ فیصلہ کا ثبوت دیا بلکہ اس کے بعد بھی جب اُس نے متعدد شہروں کو فتح کرلیا تو اپنے آقا موسیٰ کو اِن فتوحات کی خبر دی بقول علّامہ ایس۔ پی۔ سکاٹ، رشک و حسد موسیٰ کی طبیعت میں تھا۔ اُس نے فوراً طارق کو لکھا کہ جب تک وہ وہاں نہ پہنچیں پیش قدمی روک دی جائے لیکن طارق اچھی طرح جانتا تھا کہ دشمنوں کو آرام کرنے اور اپنی حالت کو درست کرلینے کا موقع دینا حماقت کا ارتکاب ہے۔ یہاں بھی اُس کی قوت فیصلہ ہی کام آئی اور اُس نے اپنے آقا کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے طلیطلہ پر حملہ کردیا۔[۱] یہ اُسی ذی ہمت طارق کے صحیح فیصلہ کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ۹۲ھ ہجری سے لے کر ۸۹۸ھ ہجری تک اندلس میں حکومت کرتے رہے اور اس عظمت و جلال کے ساتھ کہ یورپ کی کسی دوسری سلطنت کو اُن کے سامنے سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

کسی بات کے حسن و قبح پر نظر ڈال کر فوراً فیصلہ کرلینا اور پھر ایک راستہ تجویز کرکے اُس پر گامزن ہوجانا دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ تذبذب کی حالت بعض اوقات اتنی پریشان کن ثابت ہوتی ہے کہ انسان ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ سنسکرت کے قدیم افسانوں میں ایک نتیجہ خیز کہانی درج ہے کہ ایک مفتوح راجہ کی گریہ و زاری پر اُسے اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے دو بچوں میں سے کسی ایک کو قتل ہونے سے بچا سکتا ہے لیکن وہ کمزور دل و دماغ کا انسان وقتِ معینہ تک کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہنچ سکا اور اس عرصہ میں اُس کے دونوں بچے نہایت بے رحمی سے اُس کی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ درحقیقت ہر ایسا آدمی جو ہر بات میں اپنے ہر دوست سے مشورہ لینے کا عادی ہے، جو اپنی ہر تجویز کو سینکڑوں روپ میں دیکھتا ہے، خیالات کے قلعے بناتا ہے پھر بگاڑ دیتا ہے، آگے بڑھنے کا حوصلہ کرتا ہے لیکن ہمت ہار کر پسپا ہوجاتا ہے، دنیا میں کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتا اور نہ آج تک ایسے لوگ کسی کے دل میں اپنا وقار یا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کیونکہ وہ تو شک و شبہ کے خانہ زاد اور شیطانی وسوسوں کے غلام ہیں۔ اِس کے برعکس ایک صاحبِ ایقان ایک "خود رائے" انسان دنیا میں ایک قوت ہے۔ اُس کے پیشِ نظر ایک اہم مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کی خاطر وہ اپنی ساری طاقتیں ایک نقطہ پر مرکوز کردیتا ہے، کچھ مضائقہ نہیں اگر وہ مقصد حصولِ علم و دولت ہے یا شہرت و عزت یا منصب و مراتب یا جاہ طلبی — سکندر اعظم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب اُس سے یہ سوال کیا گیا کہ تم نے دنیا کس طرح فتح کی تو اُس نے جواب دیا "پس و پیش نہ کرنے سے"۔

جب قوم گال کی جنگجو افواج نے دورِ جمہوریت کے ایام میں روم کا محاصرہ کرلیا تو رومی اتنے عاجز آئے کہ انہوں

---

[۱] اخبار الاندلس، جلد اول صفحہ ۲۲۷۔ مترجمہ مولوی محمد خلیل الرحمن۔

نے زر و مال کے عوض آزادی خریدنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس وقت جب بڑے بڑے ترازوؤں کے پلڑوں پر سونے کے انبار رکھے جانے والے تھے کمیلس نمودار ہوا اور زرِ فدیہ کی بجائے اپنی تلوار ترازو کے پلڑے میں ڈال کر بلند آواز میں کہنے لگا "اے رومن قوم آزادی کا خریدنا تیری شان کے خلاف ہے اسے اپنی شمشیر خارا شگاف کے ذریعہ سے حاصل کر" ان شجاعانہ الفاظ اور اس مستعدانہ فیصلہ کا اتنا اثر ہوا کہ رومیوں نے اپنی آزادی کے دشمنوں کو شکست دے کر مقدس وطن کی سرزمین سے باہر نکال دیا۔

تاریخِ عالم کے اوراق اِس امر کے شاہد ہیں کہ قوم و افراد کی مصیبت اور ضرورت کے وقت کسی مستعد اور مستقل مزاج انسان کا صحیح لیکن عاجلانہ فیصلہ نہ صرف ابنائے وطن کو اُن مشکلات سے نجات دلاتا ہے جن میں وہ گرفتار ہوں بلکہ اکثر سلطنتوں کے جغرافیائی حدود بھی بدل دیتا ہے۔ ایسا آدمی زندہ سبق ہوتا ہے اُن انسانوں کے لئے جو ارادوں کے کمزور اور طبیعت کے وہمی ہوں جنہیں اپنے آپ پر کسی قسم کا اعتماد نہ ہو اور اپنے قویٰ اور اپنی مخفی طاقتوں پر کسی قسم کا بھروسا نہ رکھتے ہوں۔ اُس زمانہ میں جب مصر روم کی حمایت میں تھا انٹی اوچس اپی فینز نے قدیم تمدن کی سرزمین کے افسانہائے حسن و عشق اور اُس کی زرخیزی و زرریزی کے قصے سن کر اُس پر حملہ کر دیا۔ رومیوں نے اپنے ایک ایلچی کو حملہ آور بادشاہ کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ اُسے سمجھا بجھا کر واپس کر دے۔ ایلچی انٹی اوچس کو سکندریہ کے قریب ملا اور اُسے حملہ آور سپاہ سمیت لوٹ جانے کو کہا لیکن بادشاہ نے کچھ گول مول سا جواب دیا۔ دلاور رومی نے اِس بات سے مطمئن نہ ہو کر اپنی تلوار سے بادشاہ کے گرد ایک حلقہ کھینچ دیا اور اُسے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی اُس وقت تک ممانعت کر دی جب تک وہ اُس کے سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے لے۔ بے باک ایلچی کے اس فعل سے حملہ آور بادشاہ اتنا متاثر ہوا کہ وہ واپس جانے پر راضی ہو گیا اور یوں ایک فردِ واحد کی عقل و فراست سے ایک تباہی آور جنگ رک گئی[۵]۔ قدیم یونانیوں رومیوں اور عربوں کے متعلق بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے دنیا کے بیشتر ممالک کو فتح کرنے کا راز اُن کی قوتِ فیصلہ میں مضمر تھا۔ تاریخ دنیا کے صفحات پر مبنی کامیابیاں اور فتوحات زریں حروف میں تحریر کی جا چکی ہیں وہ صرف جلد فیصلہ کر لینے اور پھر اُس پر ثابت قدم رہنے کا نتیجہ تھیں۔

روزمرہ کی کاروباری زندگی کے مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ عام طور پر لوگوں میں کسی بات کے متعلق ایک ناطق فیصلہ نہ کرنے کا متعدی مرض اِس شدت سے سرایت کر گیا ہے کہ وہ کسی کام کی حقیقی ذمہ داری لینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ اس ذمہ داری کا انجام کیا ہوگا۔ وہ اس بات سے خائف ہیں کہ اگر کسی کام کے متعلق آج فیصلہ کر لیں تو ممکن ہے کل کوئی بہتر نتائج پیدا کرنے والی بات معرضِ شہود میں آ جائے اور انہیں یوم گذشتہ کے فیصلہ پر پچھتانا پڑے۔ ایسے محروم یقین انسان ایسی بری طرح اپنے ذاتی اعتماد کو تباہ کر لیتے ہیں کہ اپنی ساری زندگی میں کسی اہم معاملے کے متعلق ایک حقیقی اور آخری فیصلہ کر لینے کی انہیں جرأت ہی نہیں ہوتی اور پھر اس کا مہلک

[۵] رائزنگ ان دی ورلڈ صفحہ ۱۹۷

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر معاملہ کو دوسروں کی غلط یا صحیح رائے پر چھوڑ دینے کے عادی بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگیاں اُس جہاز سے مماثلت رکھتی ہیں جس کا کوئی بادبان نہ ہو اور جس کا منزلِ مقصود پر صحیح وسلامت پہنچ جانا محض سمندر کی متلاطم امواج کے رحم پر منحصر ہو۔ ہمارے دوستوں میں سے ایک شریف آدمی کو کسی بیمہ کمپنی سے چار ہزار روپیہ ملا۔ اب وہ اس کشمکش و پیچ میں پڑے کہ اِس روپے سے کون سا کاروبار شروع کرنا چاہئے یا اسے کس مصرف میں لانا چاہئے پیشتر اِس کے کہ مہینوں کے بار بار سوچنے اور دوستوں سے صلاح و مشورہ کرنے سے وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ سکیں چار ہزار کا چار ہزار روپیہ ہی ختم ہوگیا ـــــــ الحذر!!

اِس قسم کا تذبذب، بے ربط قوتِ ارادی اور کمزور و ناقص فیصلہ ہر انسان کو ہر شعبۂ زندگی میں آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ یاد رکھئے کوئی دانشمند اور مصروف آدمی آپ کے ذاتی معاملات کے لئے اپنا دماغ وقف نہیں کر سکتا۔ ہر معاملہ میں آپ کا اپنا ارادہ اور سلجھا ہوا فیصلہ ہونا چاہئے جو آپ کی فطرت کی عمیق گہرائیوں میں اس طرح پڑا ہے جس طرح غیر متحرک پانی سمندر کی تہ میں رہتا ہے ـــــــ جذبات کی لہروں سے ناآشنا، تاثرات اور وجدان کی دسترس سے دُور، دوستوں کے مشوروں اور غیروں کی نکتہ چینی سے بے نیاز اور وقتی ہنگامہ آرائیوں سے غیر متاثر۔ اِس قسم کا فیصلہ ہمیشہ اہم اور ضروری معاملات میں نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا ہے اور اسی قسم کے فیصلوں پر کوئی دبدبہ و وقار یا رعب نہیں چھا سکتا۔ وہ آزاد ہوتا ہے اور آزاد رہتا ہے۔ دنیا کے غم انگیز واقعات میں سب سے زیادہ دلدوز اور روح فرسا منظر وہ ہوتا ہے جب ایک عظیم الشان قابلیت اور بے مثل و دل پسند عادات کا مالک انسان اپنی ایک حقیر سی کمزوری کی بدولت معراجِ ترقی تک پہنچنے سے مجبوراً رُک جائے حالانکہ اُس کی بہت سی ذہنی قوتیں حد درجہ کی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبے میں ہزاروں تعلیم یافتہ انسان بہترین قابلیت رکھتے ہوئے بھی کمتر درجہ کی زندگیاں بسر کر رہے ہیں باوجودیکہ اُن کی صحت اور تعلیم و تربیت اُنہیں اعلیٰ مدارج تک بے روک ٹوک لے جا سکتی تھی بشرطیکہ اُن کی سرشت میں جلد اور آخری فیصلہ کر لینے کی اہلیت بھی موجود ہوتی۔ کسی کا یہ کہنا کس قدر صحیح ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ ناکامیاں "نااہلیت" کی بجائے غیر اعتمادی سے معرضِ وجود میں آئی ہیں۔

اپنے ہر کام کے متعلق ایک مربوط اور آخری فیصلہ کر لینے کی عادت نہ صرف اس لحاظ سے فائدہ بخش ہوتی ہے کہ انسان فضول تذبذب لاحاصل جس میں اپنا بہت سا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے دماغ کو بے سود پریشانی اور حس ادراک کو غیر ضروری اضطراب و انتشار سے بھی بچا لیتا ہے۔ قوتِ فیصلہ کوئی ایسا عطیۂ ایزدی نہیں جسے چند اور خاص خاص لوگوں کی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہو بلکہ ہر صحیح الدماغ شخص اِس نعمت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے بشرطیکہ

وہ اپنے دماغی وبدنی قویٰ پر بھروسا رکھنا اور اپنے فیصلوں میں مستعدی اور عجلت سے کام لینا سیکھ جائے۔ ایک مستعد اور وقتِ مقررہ پر کام کرنے والا آدمی ایک غیر مستعد اور جیمں بجیں میں وقت ضائع کرنے والے انسان سے اپنے اوقاتِ حیات میں دگنا کام کر لیتا ہے۔ کیونکہ آخرالذکر تو کسی قطعی فیصلہ پر ہی نہیں پہنچتا کہ اُسے کون سا کام سرانجام دینا ہے اور زندگی کے کون سے راستہ پر گامزن ہونا ہے۔ نپولین کہا کرتا تھا کہ ایک لڑائی خواہ دن بھر جاری رہے لیکن پھر بھی اُس کا انجام صرف چند نازک لمحات پر موقوف ہوتا ہے جن میں محارب اقوام کی قوتِ فیصلہ ہمیشہ کے لئے اُن کی قسمتوں کا دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ اُس کی قوتِ ارادی جس نے تقریباً تمام یورپ کو اپنے زیر نگین کر لیا تھا، معمولی سے معمولی احکام میں بھی اتنی ہی مستعد اور طے شدہ ہوتی تھی جتنی کہ ایک معرکۂ عظیم میں قطعی اور حتمی۔ ایقانِ مقاصد اور اپنے ہر فعل میں عجلت اور آمادگی کی عادت نے اُسے اِس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنی عدیم النظیر اور طرفہ کامیابیوں سے دنیا کو مبہوت اور متحیر کر دے۔ وہ ہر موقع پر فوراً پہنچ جاتا اور جتنا کام وہ ایک دن میں کر لیتا تھا ہر شخص کو حیرت زدہ بنا دینے کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے جسم میں ایک برقی رو دوڑا دیتا اور اُس کی غیر مفتوح قوتِ ادراک ساری فوج کے تنِ مردہ میں زندگی کا نیا خون پیدا کر دیتی تھی۔ اُس کے غیر ممکن الفسخ ارادے کمزور سے کمزور فوجی دستوں کو اُکسا کر ہر حملہ کیلئے چاق چوبند بنا دیتے اور بیوقوف اور کند ذہن آدمیوں کی رگوں میں شجاعت و بسالت کی موجیں پیدا کر دیتے تھے۔ وہ ہر دفعہ کہا کرتا تھا کہ "اگر" اور "لیکن" کو فی الحال بالائے طاق رکھ کر اِس کام کو انتہائی سرگرمی اور تیزی کے ساتھ سرانجام دو" اگر ضرورت ہوتی تو ایک سو میل کی سواری کے بعد بھی اپنی خط و کتابت، احکامات اور دیگر تفصیلات و جزئیات کی خاطر تمام رات بیدار رہتا تھا ——— کیسا عمدہ سبق ہے ایک "غیر یقینی" پُر تذبذب، نیم دل اور اپنے ہر نظریہ کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے والے کمزور انسان کے لئے۔

جب انگلستان اور آسٹریا نے نپولین کے پیغامِ صلح کو سراپائے حقارت سے ٹھکرا دیا تو اُس نے اپنے کثیر التعداد دشمنوں کو راہِ راست پر لانے اور اپنی عظمت و قوت کا مظاہرہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ وہ سپاہ سمیت کوہِ الپس کو عبور کر کے آسٹریا کی افواج پر اُن کے عقب سے حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن سوال یہ درپیش تھا کہ اِس فلک بوس پہاڑ کی ناہموار گھاٹیاں کس طرح طے کی جائیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے انجنیروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے علم و فن اور تجربہ کی رُو سے معلوم کریں کہ آیا سینٹ برنارڈ کے خوفناک دروں اور ناہموار چٹانوں کو عبور کرنا ممکنات میں سے ہے۔ جب وہ انجنیر واپس آئے تو اُس نے عجلت و بیتابی سے پوچھا "کیا اس راستہ سے گذر جانا ممکن ہے"؟

"شاید یہ ممکنات کی حدود کے اندر ہے" اُنھوں نے قدرے مشکوک لہجہ میں جواب دیا۔ یہ سنتے ہی نپولین نے آنِ واحد میں اپنے ارادوں کی تکمیل کے متعلق آخری فیصلہ کر لیا اور پیشتر اس کے کہ وہ ان ہیبت ناک دروں اور فلک بوس پہاڑوں کو عبور کرنے کے متعلق انجنیروں کی بیان کردہ بعید از فہم تکالیف پر غور کرتا اُس نے اپنے مخصوص انداز میں حکم دیا "تو پھر بڑھے چلو"۔ انگلستان اور آسٹریا کے مدبروں اور ماہرینِ فنونِ جنگ کے لبوں پر خندۂ استہزا[۵۵] پیدا ہوا جب اُنھوں نے سنا کہ نپولین اپنی ساٹھ ہزار فوج، بھاری توپ خانہ، ہزاروں من گولہ اور بارود اور تمام دیگر وزنی ساز و سامانِ جنگ سمیت کوہِ الپس کو عبور کرنا چاہتا ہے کیونکہ انہیں کے قول کے مطابق اس پہاڑ پر آج تک کسی قسم کی گاڑی کا پہیہ نہ متحرک ہوا تھا اور نہ آئندہ اُن کے نزدیک اس کی ناہموار چٹانوں پر کسی پہیے کے گھومنے کا امکان تھا۔

لیکن جب یہ غیر ممکن فعل علی الرغم توقع عمل میں آ گیا تو کئی جنگجو سپہ سالاروں اور دیگر اصحابِ فہم کی آنکھیں کھلیں کہ یہ کام تو آج سے بہت دیر پہلے انہی کے ہاتھوں درجۂ تکمیل تک پہنچ جانا چاہئے تھا اور انھوں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ کیوں ہم ان ہوشربا مشکلات اور رکاوٹوں کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے رہے۔ ان افسوس کرنے والے قائدین کے پاس ہر قسم کا سامان، ضروری اوزار، اکھڑ اور مشقت پسند سپاہی بھی موجود تھے لیکن ان میں نپولین جیسا عزمِ صمیم اور قوتِ فیصلہ جیسی ضروری ولابدی صفت موجود نہ تھی[۵۶] جس کی موجودگی میں انسان ایسی مشکلات و مصائب کو حقیر اور کم وقعت سمجھ کر ہر جگہ سمندر اور صحرا، پہاڑ اور دریا میں اپنا راستہ پیدا کر لیتا ہے پھر اپنے ہی ہاتھ سے صفحاتِ تاریخ پر اپنا نام و نشان لکھ دیتا ہے۔

دنیا میں کوئی ایسا پیشہ یا کاروبار نہیں جس کی کلفتیں یا تکلیفیں کسی وقت انسان کے دل میں رنج اور تکدر کا احساس نہ پیدا کر دیں۔ لیکن وہ نوجوان آدمی جو ہر ایسی تکلیف یا زندگی کی معمولی تلخ کامیوں سے اکتا کر اُس ملازمت یا پیشہ ہی کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، دنیا میں کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ قوتِ فیصلہ کے بغیر یکسوئیِ قلب نصیب نہیں ہو سکتی اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہر کام میں انتہائی انہماک اور استغراق کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ غیر مطمئن اور قوتِ فیصلہ سے بے بہرہ انسان تو اُس خشک پتے کی طرح ہے جو درخت سے علیحدہ ہو کر بادِ خزاں کے تند جھونکوں میں ہر چہار طرف لڑھکتا پھرے۔ وہ کسی کام میں بھی اپنی تمام طاقتوں کو مرکز پر نہیں لاتا۔ اگر وہ ایک کام شروع کرتا ہے تو دوسرے کام کا روشن پہلو اور غیر فطری کشش اُسے اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ اُس وقت اُسے کامل یقین ہو

---

[۵۵] نپولین اعظم جلد دوم صفحہ ۶۶۸۔ ترجمہ لائف آف نپولین جوزف ایس سی۔ ایبٹ مطبوعہ مطبع احمدی علی گڑھ۔
[۵۶] پشنگ ٹو دی فرنٹ۔ ڈاکٹر اوریزن سویٹ ماڈن۔

جاتا ہے کہ بس یہی کام ہے جس کے لئے قدرت نے مجھے دنیا میں بھیجا تھا اور اسی کام میں کامیابی حاصل کرنا میری زندگی کا واحد مقصد ہونا چاہئے۔ لیکن چند ہی دن بعد جب اس مفروضہ پھول کے کانٹے چبھنے شروع ہوتے ہیں تو اُس کا سارا جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے اُس وقت وہ کفِ افسوس ملتا ہے کہ کیوں اپنی پہلی ملازمت چھوڑ کر اس کلفت آمیز پیشہ کو میں نے اختیار کیا۔ ایسے لوگ اپنی زندگی کا بہترین حصّہ اسی مایوسی و نا امیدی اسی تذبذب اور حیص بیص میں ضائع کر دیتے ہیں لیکن کسی کام کے متعلق ایک ناطق فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کتنے نوجوان ہیں جو یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں جن کے مدِّ نظر ایک مقصد ہو جس کے حصول کی خاطر وہ تمام کچھ قربان کر کے اُسے حاصل کر لینے کے آرزومند ہوں۔ آج وہ اس محکمہ میں ہیں کل دوسرے میں۔ آج وکیل بننے کی خواہش اُن کے دل میں ہے تو کل ڈاکٹری کا معزز اور آزاد پیشہ اختیار کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن جب اپنے پڑوسی پر نظر پڑتی ہے تو محکمہ پولیس کا افسرِ اعلیٰ بننے کے لئے دل بے تاب ہو جاتا ہے یا کسی بزرگ سے ملنے جاتے ہیں تو اُس کی عزت و امارت دیکھ کر کرسی عدالت کو زینت بخشنے کی امنگیں دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔ ایسے لوگ کسی شعبۂ زندگی میں ترقی نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ ہر پیشہ اور ہر ملازمت کی ابتدائی منزلوں میں رہتے ہیں جو قدرے آرام دہ اور کسی حد تک تسلی بخش معلوم ہوتی ہیں لیکن افسوس تو اس امر کا ہے کہ جب ایسے انسان ناکامیٔ تمنا کا گلہ کرتے ہیں تو اپنی قسمت کو الزام دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے کئے کے خود ذمہ دار ہیں۔

ولیم پٹ کی قابلِ تقلید مثال شاید ایسے پُر تذبذب انسانوں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکے بچپن سے جوانی تک اُس کے مدِ نظر صرف ایک مقصد رہا جس کے حصول کی خاطر اُس نے کسی دیگر ترغیب و تحریص کی طرف ذرہ بھر بھی توجہ نہیں کی۔ اوائلِ عمر ہی میں اُس کے ذہن نشین کر دیا گیا تھا کہ اُس سے ایک بڑا آدمی بننے کی توقع کی جاتی ہے اور سارا خاندان اُس سے ایسی عزت و آبرو حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے جو اُس کے نیک نام باپ کے شایانِ شان ہو۔ یہ تھی اُس کی تمام تعلیم و تربیت کی کنجی۔ جہاں کہیں وہ جاتا، جس کام کو کرتا، کالج میں ہوتا یا کھیل کود کے میدان میں یہ بات کبھی بھی اُسے فراموش نہ ہوتی تھی کہ اُس کے والدین اُس سے ایک بڑا سیاسی مدبر بننے کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ خیال اُس کے رگ و ریشے میں ایسا سما گیا تھا کہ وہ اپنی تمام اخلاقی اور ارادی قوتوں کو ایک مقصدِ واحد کے حصول کی خاطر ایک نقطہ پر لے آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بائیس برس کی عمر میں وہ پارلیمنٹ کا ممبر، ۲۳ برس کی عمر میں وزیرِ خزانہ اور ۲۵ برس کی عمر میں انگلستان کا وزیرِ اعظم بن گیا۔ کالج چھوڑنے کے بعد اُس کے باپ نے ہندوستانی والدین کی طرح اپنے ہر دوست سے یہ نہیں کہا تھا کہ "ہمارا جگدیش نے ایم اے پاس کر لیا

ہے اُسے کس لائن میں جانا چاہیئے۔ آیا پروفیسر بننا چاہیئے یا بیرسٹر، فنانس کا امتحان دینا چاہیئے یا آئی سی ایس کا؟ ولیم پٹ کا مقصد فیصلہ شدہ تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے مشوروں میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی تمام قابلیتوں سمیت اُسے حاصل کرنے کے درپے ہوگیا اور بالآخر اُسے حاصل کرلیا۔

جدید ترکی کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ صرف ایک فردِ واحد کے عاجلانہ فیصلہ نے اُن کی بگڑی قسمت کو بنا دیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب قسطنطنیہ اتحادیوں کی اژدر دم توپوں کی زد میں تھا تو علاقہ سامسون اور اناطولیہ کے بعض حصوں میں اتحادیوں کے خلاف شورش پیدا ہونے لگی۔ داماد فرید پاشا وزیر اعظم ڈرے کہ کہیں یہ شورش خطرناک صورت اختیار نہ کرلے۔ انہوں نے ایک ایسا آدمی اناطولیہ بھیجنا چاہا جو ہر طرح کی بے چینی کا قلع قمع کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اُن کی نظرِ انتخاب مصطفےٰ کمال پر پڑی اور وہ مشرقی صوبوں کے جنگی انسپکٹر مقرر ہوگئے۔ ۱۶ مئی ۱۹۱۹ء کو انہیں جہاز "باندرمہ" سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہونا تھا۔ روانگی کے وقت وہ وزیروں اور سلطان وحید الدین سے رخصت ہونے گئے۔ قصرِ سلطانی سے نکل کر وہ "شیشلی" میں اپنے مکان پر پہنچے۔ جہاں اُن کے ایک دوست نے انہیں مطلع کیا کہ اتحادی طاقتوں نے سازش کی ہے کہ اُن کے جہاز کی روانگی میں دیر ہوجائے تاکہ اس عرصہ میں وہ اپنے جہاز سفر کے لئے تیار کرلیں اور عین سمندر میں اُن کا جہاز غرق کردیں۔

یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال نے ایک لمحہ تک سکوت کیا۔ یہ لمحہ ہمیشہ کے لئے ترکی کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیونکہ اسی ایک لمحہ کے فیصلہ پر اُن کی آزادی وحریت کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ برق آسا تیزی کے ساتھ اُنہوں نے تمام حالات پر نگاہ ڈال کر اپنے مقصد کے متعلق آخری فیصلہ کرلیا اور فوراً موٹر پر سوار ہوکر تیزی کے ساتھ ساحل کی طرف روانہ ہوگئے کیونکہ اس حالت میں ایک منٹ کی دیر بھی خطرناک تھی۔ انہوں نے جہاز پر پہنچتے ہی کپتان کو روانگی کا حکم دیا لیکن جہاز روانہ نہ ہوا۔ اُن کے بار بار سوال کرنے پر کپتان نے کہا "محکمہ جہازرانی کے ماہر اس وقت جہاز کے کل پرزے معائنہ کر رہے ہیں اُن کا حکم ہے کہ جب تک وہ اجازت نہ دیں جہاز نہ چلے۔" اب اُنہیں یقین ہوگیا کہ واقعی معاملہ دگرگوں ہے چنانچہ انہوں نے بڑی سختی سے کپتان کو حکم دیا "اِن ماہروں سے کہہ دو فوراً جہاز سے نکل جائیں اگر وہ نہ مانیں تو تم اُن کی پروا نہ کرو اور جہاز کا لنگر اٹھادو۔"

کپتان کو مجبوراً یہی کرنا پڑا۔ کچھ دُور آگے چل کر انہوں نے کپتان کو حقیقتِ حال سے واقف کیا۔ وہ بہت گھبرایا اور کہنے لگا "میرا جہاز بہت پرانا اور سست رفتار ہے جنگی جہازوں سے بھاگ نہ سکے گا۔"

مصطفےٰ کمال نے نہایت حوصلہ مندانہ انداز میں کہا "کوئی پروا نہیں۔ ساحل کے قریب قریب چلو، اگر جہاز غرق

ہوگیا تو میں خشکی تک جان بچا سکوں گا"

چنانچہ اُن کے حسبِ ہدایت جہاز کنارے کنارے چلا - یہاں تک کہ منزلِ مقصود تک پہنچ گیا بعد میں معلوم ہوا کہ دشمنوں کے جنگی جہاز اُن کے پیچھے چلے تھے مگر خوش قسمتی سے وہ بہت آگے نکل گئے اور سمندر میں طوفان شروع ہو گیا جس نے اُن کے جہازوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا[۵]۔

جیمز رسل لوول کے قول کے مطابق ہر قوم اور ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب اُسے سچائی اور دروغ گوئی کے مابین جنگ کے وقت فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ حق کا طرفدار ہوگا یا کذب و افترا کا حامی و پاسبان - جس طرح طارق اور مصطفےٰ کمال کی مستعدی اور قوتِ فیصلہ نے اپنی اپنی قوم کے لئے حکومت و آزادی کی شاہراہیں کھول دی تھیں اسی طرح خاندانِ بنی احمر کے آخری فرمانروا ابوعبداللہ نسلِ عباسی کے آخری تاجدار المعتصم باللہ اور خاندانِ تیموری کے آخری نام لیوا بہادر شاہ نے اپنے کمزور دل و دماغ، پست ارادوں اور وہمی دماغوں سے اپنے آباؤ اجداد کی مہتم بالشان سلطنتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا ہی سے ناپید کردیا - چارلس خامس کے شکوک نے، بقول موٹلے کے، متمدن دنیا کی قسمت کو بدل دیا تھا - یورپ کے تقریباً تمام مورخ اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ نپولین کا واٹرلو کی مشہور جنگ میں شکست کھانا محض اس سبب سے تھا کہ اُس موقعہ پر وہ پہلی سے قوتِ فیصلہ اور مستعدی کا اظہار نہ کر سکا جسے ایسے نازک مواقع پر وہ مشعلِ راہ بنایا کرتا تھا اور جس میں اُس کی گذشتہ جنگوں کی کامیابی کا راز مضمر تھا[۶] - سوبرن نے کیا خوب کہا ہے "میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ خدا اُس شخص کے داہنے ہاتھ میں ہے جس کا دل جانتا ہے کہ کب ارادوں کو قوت سے فعل میں لانا چاہیئے اور کب انہیں ملتوی کر دینا چاہیئے"[۷]۔

ہماری خانگی زندگی میں بھی کاروباری زندگی کی طرح قوتِ فیصلہ کی صفت عنقا ہے - اگر آپ عورت ہیں تو اپنے گھر کو دیکھ لیجئے - اگر آپ مرد ہیں تو ذرا اپنی میز اور کتب خانہ کا ملاحظہ کیجئے - کتنی چیزیں ہیں کہ ترتیب و قرینے سے رکھی ہیں - کتنا سامان، کتنے کاغذ یا کتنی کتابیں یا اخبار ہیں کہ فضول پڑے ہیں - اس کا سبب کیا ہے؟ یہی کہ آپ اُن کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ رکھنے کی چیزیں ہیں یا پھینک دینے کی - گھر کے بہت سے کونے ٹوٹے پھوٹے سامان اور پھٹے پرانے کپڑوں سے اٹے پڑے ہیں لیکن بیگم ہیں کہ فیصلہ ہی نہیں کر چکتیں کہ آخر یہ تمام بے کار سامان گھر کا ایک حصہ کیوں روکے ہوئے ہے - میاں کے پلنگ اور میز پر کاغذ کتابیں اس طرح بکھری پڑی ہیں کہ کباڑی کی دوکان سے بدتر منظر پیدا کر رہی ہیں لیکن وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اِن ناکارہ چیزوں کو کیوں احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے - آج سے تین سال پیشتر جب گھر کے اس غیر

---

[۵] الہلال جلد ۸ نمبر ۸ [۶] دی سیکرٹ آف اچیومنٹ - مارڈن [۷] بوتھ ویل - سوبرن

ضروری سامان کی طرف میرا ذہن منتقل ہؤا تو باور کیجیئے کہ میں نے دو دو بیلوں والے چار چھکڑے لاد کر کباڑی کے ہاں بھجوا دیئے اور یقین جانئے کہ اس سامان میں سے مجھے آج تک شاذونادر ہی کسی چیز کے متعلق خیال آیا ہوگا کہ اس وقت وہ موجود ہوتی تو کام آجاتی۔ کتنے بزرگ ہیں جو ہر دفعہ مکان تبدیل کرتے وقت اسی ناکارہ سامان کو گناہ کی طرح کاندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں اور اُس کی قیمت سے کئی گنا زیادہ اُس کے لانے اور لے جانے کا کرایہ ادا کر چکے ہیں اور پھر اسے حرزِجان بنائے ہوئے ہیں۔ امریکہ کی مشہور علم حیات کی ماہر عورت ڈاکٹر لیونا بریڈ، امراض اور اُن کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ "زاید" ہمیشہ بیماری پیدا کرنے والا ہوتا ہے"ـــــ ہمارے مکانات ہمارے کاروبار، ہماری روحیں اور قوائے انہضام فضلیات کے دُور نہ ہونے سے کتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

"قطعیت"، ایک صفت ہے جس سے صرف اعلیٰ درجہ کے دستکار اور صنّاع ہی متصف ہوتے ہیں۔ یہ اپنے فن کے ماہرینِ کامل کا امتیازی نشان ہے۔ دنیا کے مشہور سنگ تراشوں، گی اوٹو اور گنووا، کے مجسموں کو دیکھ لیجئے کہ اُن کی تراش میں ان اُستادوں نے ایک بھی تو بےمعنی ضرب نہیں لگائی۔ اُن کے اوزار کی ہر حرکت یقینی اور فیصلہ شدہ ہوتی تھی۔ شہرۂ آفاق مصور مائیکل انجیلو کے شاہکار دیکھ لیجیئے کوئی لکیر کوئی دائرہ یا کوئی خط بھی تو ایسا نہیں جو قطعی اور حتمی نہ ہو۔ جب پروفیسر عنایت خاں اور ماسٹر محمد حسین کی مشاق انگلیاں پیانو اور ہارمونیم کے پردوں پر پڑتی ہیں تو اُن کی موسیقی اور عام لوگوں کی موسیقی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ مقدم الذکر کے ساز کی ہر آواز صاف، اُن کی ہر انگلی کا ہر دباؤ تذبذب سے معرا اور اُن کے پھرتیلے اور تجربہ کار ہاتھ کی ہر جنبش آخری اور فیصلہ شدہ ہوتی ہے۔ اُن کی انگلیاں ایک پردہ کو غلطی سے چھو کر دوسرے پر لوٹ آنا نہیں جانتیں۔

پھر دنیا میں ایسے انسان بھی موجود ہیں جو صفتِ فیصلہ سے بے بہرہ ہونے پر بھی ایک کاذب فخر کرتے ہیں۔ میاں جمیل ہیں کہ وہ کبھی خطوط کا جواب ہی نہیں دیتے۔ خط لکھتے ہیں چاک کر دیتے ہیں۔ لفافہ بند کر کے پھر کھول لیتے ہیں، کچھ حصہ حذف کر کے چند فقرات کا اضافہ کرتے ہیں، لکھتے ہیں، پھر سوچتے ہیں حتیٰ کہ دوسرے دن پر لکھنا اٹھا رکھتے ہیں اور اپنی اس کمزوری کو اس فخر پر محمول فرماتے ہیں کہ وہ نہایت غور و فکر سے لکھنے کے عادی ہیں۔ ثریا خانم ہیں کہ کسی تقریب میں کبھی وقت پر نہیں پہنچتیں۔ اُن کے بروقت نہ پہنچنے کے کئی وجوہ ہیں لیکن سب سے بڑا سبب اُن کی طبیعت میں قوتِ فیصلہ کی کمی ہے۔ وہ اِس بات کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتیں کہ کس وقت جانے کی تیاری کرنی چاہیئے۔ کون سا لباس پہننا چاہیئے اور کس ماما کو ساتھ لے جانا چاہیئے۔ اُن کے لئے سب سے بڑا تشویش انگیز امر یہ ہوتا ہے کہ اِس موقع پر کون سا زیور زیب بدن کروں۔ آیا چندن ہار کے ساتھ ہلکی بالیاں ہوں یا جڑاؤ بُندے۔ بائیں ہاتھ میں اگر

ہیرے کی انگشتری ہے تو سنہری گھڑی کس کلائی پر باندھی جائے۔ فاختئی رنگ کی ساری اتار کر گلناری آسمانی اور بنفشئی رنگ کی متعدد ساریاں کئی دفعہ تبدیل کرتی ہیں۔ سینکڑوں دفعہ ماما گلنار سے پوچھتی ہیں "اچھی سچ بتا ناکونسا رنگ اچھا ہے؟" اُدھر گیارہ عورتیں کھانے پر اُن کا انتظار کر رہی ہیں۔ اِن گیارہ میں سے دس تو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی ہیں اگر اُن کا بس چلے تو وہ ثریا خانم کو کچا چبا جائیں۔ گیارھویں شریف عورت کے دل میں محض اس وجہ سے یہ منتقمانہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا کہ چند ماہ بعد ثریا خانم اُس کی بہو بننے والی ہے اور جب وہ بہو بن کر سسرال آجاتی ہے تو یہی قوتِ فیصلہ کا فقدان اُس کے تمام رنج و آلام کا موجب ہوتا ہے۔

ہماری خانگی زندگی کے المناک واقعات میں سب سے زیادہ رنجدہ میاں بیوی کی بے معنی رنجش ہوتی ہے۔ ذرا سی ناراضی سے دونوں کے دلوں میں گرہیں بیٹھ جاتی ہیں پھر وہ کتنے عرصہ تک اس کے متعلق فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ یہ خامشی اور کدورت کس طرح دُور ہو سکتی ہے۔ خدا مغفرت کرے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے کیا خوب لکھا ہے کہ میاں بی بی شروع سے اپنا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ صاف رکھیں اور ادنیٰ رنجش کو بھی پیدا نہ ہونے دیں ورنہ یہی چھوٹی چھوٹی رنجشیں جمع ہو کر آخر کو فسادِ عظیم اور بگاڑ ہو جائیں گے۔ رنجش کو پیدا نہ ہونے دینے کی یہ حکمت ہے کہ جب کوئی ذرا سی بات بھی خلافِ مزاج واقع ہو اُس کو دل میں نہ رکھا رُو در رو کہہ کر صاف کر لیا[۵] ملکہ وکٹوریا آنجہانی نے ایک دفعہ خانگی معاملات میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے خاوند کو حاکمانہ انداز میں مخاطب کیا۔ شاہزادہ البرٹ اپنی عزتِ نفس کو اِن الفاظ سے زیادہ مجروح نہ کرنا چاہتے تھے اس لئے وہ اپنے کمرہ میں چلے گئے اور اُس کا دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا۔ پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"دروازہ پر کون ہے؟ شہزادہ نے دریافت کیا۔

"میں ہوں۔ ملکہ انگلستان کے لئے دروازہ کھول دو!" ملکہ معظمہ نے ذرا ترش روئی سے جواب دیا"

لیکن اِس حکم کی تعمیل میں دروازہ نہ کھلا اور اس آواز کے جواب میں اندر سے کوئی صدا نہ آئی۔ ملکہ وکٹوریا اس عرصہ میں خاموش کچھ سوچتی رہیں وہ اپنے خاوند کی ناراضی محسوس کر چکی تھیں۔ اور اسی وقت رُو در رُو ہو کر اس معاملہ کو صاف کر لینا چاہتی تھیں۔ "بالآخر مجھے کیا کرنا چاہئے؟" انہوں نے دل میں سوچا اور چند لمحوں کے بعد وہ ایک آخری فیصلہ پر پہنچ گئیں اور ایسے ہی فیصلہ پر پہنچنا ملکہ وکٹوریا جیسی نیک دل خاتون کے لئے زیبا و سزاوار تھا۔ وقفۂ دراز

---

[۵] بنات النعش صفحہ ۵۸ مطبوعہ نولکشور پریس (۱۸۸۵ء)

کے بعد دروازہ پھر آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا گیا ـــــ "کون ہے؟" شاہزادہ نے استفسار کیا۔

"میں ہوں، وکٹوریا، تمہاری بیوی" ملکہ معظمہ نے نہایت محبت بھرے انداز میں جواب دیا۔

شہزادہ نے دروازہ کھول دیا اور یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ میاں بیوی کی رنجش فوراً دُور ہو گئی۔ آہ! میری دلی تمنا ہے کہ ہر ہندوستانی عورت اس واقعہ سے ایک بہت بڑا سبق حاصل کرکے اپنی ساری زندگی مسرت و شادمانی سے بسر کرنا سیکھ جائے کیونکہ عورتیں ہی سب سے زیادہ قوتِ فیصلہ کی صفت سے محروم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر فرینک کرین نے لکھا ہے کہ قوتِ فیصلہ کی صفت سے ہمارا محروم ہونا صرف اس سبب سے ہے کہ ہم میں غور و فکر کی عادت مفقود ہے۔ ہر امر کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے سوچنا اور غور کرنا لازمی ہوتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ سوچنا ہی دنیا میں سب سے زیادہ محنت طلب کام ہے۔ دماغ کا بے معنی طور پر غیر مسلسل اور بے ربط خیالات کی تصویریں بنا بنا کر بگاڑنے کا نام سوچنا نہیں بلکہ سوچنا وہ ہے جس کا انجام ایک نہایت صحیح اور سلجھا ہوا فیصلہ ہو۔ دنیا میں کوئی شخص ہر چیز کے متعلق ایک ناطق حکم نہیں دے سکتا کہ فلاں چیز یقینی طور پر اچھی اور فلاں یقینی طور پر صحیح ہے۔ ایسے مواقع پر جو کچھ ایک سمجھدار اور بالغ نظر انسان کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ واقعات کو فہم و ادراک کے ترازو میں وزن کر لے اور دیکھ لے کہ کون سا پلڑا بھاری ہے؟ بعض لوگ صرف اس وجہ سے فیصلہ کرنا ناپسند کرتے ہیں کہ وہ ہر بات میں "تیقن" چاہتے ہیں اور وہ آدمی جو ہر بات میں یقین اور طمانیت چاہتا ہے دنیاوی کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سب سے بڑا اطمینان جو ہم حاصل کر سکتے ہیں وہ اسی ترازو کے پلڑے ہیں جن میں واقعات و قیاسات وزن ہو رہے ہیں۔

علاوہ ازیں اپنے معاملات کے متعلق جلد فیصلہ کر لینے والا انسان اُس آدمی پر ہر طرح فوقیت رکھتا ہے جس کا کام غیروں کے مشوروں سے سرانجام پاتا ہے۔ اس بات میں نہیں کہ اول الذکر ہمیشہ صحیح فیصلہ کر لیتا ہے بلکہ اس امر میں کہ وہ ہمیشہ قابلِ اعتماد اور اپنی ہٹ کا پکا انسان ہوتا ہے جس سے ہر شخص رشتہ داری، دوستی یا کاروبار کرنا پسند کرتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اُس کا فیصلہ ہر دفعہ صحیح نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی بات کے متعلق کچھ نہ کچھ فیصلہ ضرور کر لیتا ہے اور موخر الذکر تو امید و بیم اور تذبذب کی حالت میں وقت گزار دیتا ہے۔

ڈاکٹر کرین کا یہ کہنا ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے کہ دنیا کے تین سب سے اہم مضمون وہ ہیں جن کے متعلق

---

۱ ڈاکٹر فرینک کرینز ایسیز۔

ہم کچھ سوچنا پسند ہی نہیں کرتے اور وہ مضامین ہیں مذہب، حکومت اور دولت۔ مجھے معلوم ہے کہ مذہب کے بارے میں گفتگو کرنا، اور پھر اِس پُر آشوب زمانہ میں، ایک خطرناک کام ہے اور نہ میں کسی کے جذبات و احساسات کو مجروح کرنا چاہتا ہوں لیکن پھر بھی ہر سمجھدار آدمی اِس امر کے متعلق اعتراف کر لینے پر مجبور ہے کہ اُس نے اپنے مذہبی اصولوں اور اعتقادات پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ ایک دفعہ کوئی مذہب یا کسی فرقہ کے اصول قبول کر لینے کے بعد ہم اُن کے متعلق تقریر، تحریر اور دلائل کے ذریعہ سے اندھا دھند یہ ثابت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ جس راستہ پر ہم گامزن ہیں وہی صراطِ مستقیم ہے اور اُسی پر چلنے میں ہماری فلاح اور اُسی پر چلنا ہماری نجات کا باعث ہے۔ لیکن اس امر کی تحقیق کے لئے کہ آیا فی الواقع ہمارے اعتقادات ایسے ہی صحیح اور یقینی ہیں جیسا ہم سمجھتے ہیں ہم میں سے بہت کم اپنے دماغ کو اِس امر کے متعلق سوچنے کی تکلیف دینا پسند کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی ہم کسی معترض سے اپنے مذہب کے متعلق کوئی نکتہ چینی سنتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اُسے کوئی تشفی بخش جواب دیں غیض وغضب کا خُون ہماری رگوں میں کھولنے لگتا ہے۔

یہی حال سیاست کا ہے۔ سیاست اور حکومت میں گہرا تعلق ہے اور حکومت کے متعلق سوچنا اپنی آزادی، اپنے حقوق اور اپنی تعلیم کے متعلق سوچنا ہے۔ لیکن کیا ہم نے اِس کے متعلق کبھی سوچا بھی ہے؟

اس کا صرف ایک جواب ہے کہ اس معاملے پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا اور نہ آئندہ کریں گے ـــــ کیوں؟

اِس لئے کہ ہمارے ذہن میں ایک ایسی سیاسی جماعت کا خیال ہے جو ہمارے لئے سوچتی ہے اور ہمیں سوچنے کی ذہنی تکلیف سے بچا کر ہمارے معاملات اور ہماری قسمت کے متعلق فیصلے کرتی ہے۔ نہ صرف ہم معمولی عقل و دانش کے لوگ اُن کے فیصلوں پر آمنا و صدقنا کہنے کے عادی ہیں بلکہ بڑے بڑے سیاست دان، جج، وزیر، جغادری قانون دان اور دیگر اصحابِ فہم سیاسی جماعت کے اشارۂ ابرو پر یوں سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں جس طرح کوئی پجاری اپنے دیوتا کی چوکھٹ پر جوشِ عبودیت میں جبینِ نیاز جھکا دیتا ہے۔ صرف اتنی ہی بات پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ وہ اسے ایک افضل ترین نیکی تصور کرتے ہیں اور ہر موقع چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں کہ ہم تمام عمر کانگریس یا لیگ کے پیرو اور مجلسِ خلافت یا ہندو مہاسبھا کے حامی کار رہے ہیں جس کا مطلب صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ نصف صدی یا گذشتہ تیرہ سال تک اپنے حقوقِ آزادی کے متعلق انہوں نے سوچنے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی بلکہ غیروں کے دماغ اُن کی قسمتوں کے متعلق سوچنے کا کام کرتے رہے ہیں۔

دنیا میں کون ایسا انسان ہے جو دولت و تنعم کی فراوانی سے بہرہ اندوز ہونا نہیں چاہتا۔ غربت کے پھندوں سے

نجات حاصل کرنے کا راز صرف کفایت شعاری میں مضمر ہے۔ لیکن کفایت شعار بننے کے لئے ہمیں دن میں بیسیوں دفعہ نہایت حزم و عجلت سے اِس بات کا فیصلہ کرنے کی علادت اختیار کرنی پڑتی ہے کہ ہم غیر ضروری اشیا کی خرید پر روپیہ صرف نہ کریں۔ خوبصورت و آرام دہ ملبوسات، خورونوش کی لذیذ اشیا اور قیمتی سامانِ آرائش وتزئین ہماری توجہات کو جذب کر لینے کی مقناطیسی قوت اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں لیکن اس جذب کا ردِعمل قوتِ فیصلہ پر منحصر ہے۔ جیمز پارٹن نے لکھا ہے کہ اگر تم کسی نوجوان آدمی کے متعلق یہ دریافت کرنا چاہو کہ آیا مادرِ فطرت نے اُسے ایک بادشاہ کی ذہنیت دی ہے یا ایک غلام کی تو اُسے ایک ہزار ڈالر دے دو اور پھر دیکھو کہ وہ اس روپے کو کس مصرف میں لاتا ہے۔ اگر وہ راہنما بننے یا حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے تو وہ اُسے ایک محفوظ جگہ پر رکھ دے گا اور مناسب موقع پر اُسے خرچ کرے گا اگر وہ خدمت گذار اور غلام بننے کے لئے پیدا ہوا ہے تو وہ فوراً اُسے اظہارِ امارت کا شوق پورا کرنے کے لئے بے دریغ صرف کرنا شروع کر دے گا۔ روپیہ کمانا اتنا مشکل نہیں جتنا اُس کا پس انداز کرنا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب اقوام میں عیش و عشرت کا مرض حد سے بڑھ جاتا ہے، جب فضول خرچی کفایت شعاری کی جگہ لے لیتی ہے، جب نمود، تصنّع اور بناوٹ عام طبائع پر محیط ہو جاتے ہیں۔ جب امرا اور عمائدِ سلطنت قوتِ فیصلہ سے بے بہرہ اور اُن کے راحت پسند دماغ غور و فکر کی صنعت سے محروم ہو جاتے ہیں تو فطرت کا اٹل قانون اُنھیں ہمیشہ کے لئے دنیا کے پردہ ہی سے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ روم کی شہنشاہیت کے ایام میں امرا اور عمائدِ وقت کے آرام طلب دماغ عادتِ فکر اور قوتِ فیصلہ سے ایسے ہی بے نیاز تھے جیسے مغلیہ خاندان اور شاہانِ اودھ کے آخری فرمانرواؤں کے[۱۰] رعیت محض اتنے سے خیال سے لرزہ بر اندام ہو جاتی تھی کہ مبادا اسکندریہ سے اناج لانے والے جہاز دیر سے پہنچیں اور اُن کے ننھے ننھے بچے اُن کی آنکھوں کے سامنے شدتِ گرسنگی سے رو رو کر ہلکان ہو جائیں لیکن طبقۂ اعلیٰ کے امرا ایک ایک دعوت پر لاتعداد روپیہ صرف کر دیتے تھے۔ طاؤسِ زریں بال کے دماغ اور عندلیبِ خوشنوا کی زبانیں اُن کے مرغوب طبع کھانے تھے اور لاکھوں روپے کی مالیت کے پیمانہ ہائے نیلمیں اور بادۂ گلرنگ سے لبریز مرصع کار ساغر اُن کی میزوں کی زیب و زینت رومی بیگمات کے زرّیں ملبوسات پر اس قدر روپیہ صرف ہوتا تھا کہ اُن کی ساخت و تزئین کا تصوّر بھی دماغ میں نہیں آ سکتا۔ پلینی ہمیں بتاتا ہے کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے حسنِ مجسم لولیا پالینا کا وہ نادرِ روزگار لباس دیکھا ہے

---

[۱۰] بخوفِ طوالت میں نے ان لوگوں کی فضول خرچیوں کا ذکر نظر انداز کر دیا ہے جن کے خیالات جیسا کہ ہمیں ایک لکھنوی مورخ اور مضمون نگار بتاتا ہے، ہزاروں روپے کا عطر اپنے اصطبلوں میں چھڑکوا دیتے تھے۔

جسے وہ غیرتِ حسن اپنی منگنی کی ضیافت پر زیب بدن کر کے آئی تھی۔ یہ خیرہ کن لباس تمام و کمال اعلیٰ قسم کے آبدار موتیوں، انمول زمردوں اور فقید النظیر سبزوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اس کی ساخت پر دو کروڑ سیسٹرس[۱] خرچ آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لباس اُس کے بہت سے دوسرے ملبوسات سے کم خرچ تھا ــــ

بسیار خوری، فضول خرچی، ظاہرداری، فاسق خیالات اور ضعفِ فیصلہ کی محرومی اور دیگر معیوب عادات انہیں دن بدن تہور و شجاعت کے بلند مقام سے ذلت کے نشیب کی طرف دھکیل رہی تھیں اور اُن کے تعیش پرست دماغ اِس بات کے سوچنے کی اہلیت بھی نہ رکھتے تھے کہ تباہی کے اس ہولناک غار سے کس طرح نکلیں اور مصائب و فاقہ کشی کے بندھنوں کو کس طرح توڑیں۔

رومی ضیافتوں کے اخراجات نہ صرف ہوشربا ہیں بلکہ تاریخ کی معتبر شہادت کی عدم موجودگی میں شاید لوگ انہیں باور ہی نہ کریں۔ سوٹونی اس ایک ایسی دعوت کا ذکر کرتا ہے جو ویٹلی اس کو اُس کے بھائی نے دی تھی جس میں دیگر چیزوں کے علاوہ دو ہزار منتخب اقسام کی مچھلیاں اور سات ہزار نہایت نازک و خوش نما پرندوں کا گوشت رکھا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بہت بڑے طشت کا بیشتر حصہ، جو اپنے حجم اور جسامت کے لحاظ سے "منروا کی ڈھال" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، سکارس[۲] کے جگروں ہوراج کے دماغوں اور طوطیانِ شکر ریز کی زبانوں سے لبریز تھا۔ یہ بیش قیمت اشیا محض اِس لئے مہیا کی جاتی تھیں کہ اُن کے مہمان اِن ضیافتوں کے اخراجات کا تصوّر دماغ میں لا سکیں۔

پھر آپ جانتے ہیں کہ اِن فضول خرچیوں، عیش پرستیوں اور کوتہ اندیشیوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس کا نتیجہ وہی تھا جو ابتدائے آفرینش سے قسامِ ازل نے ایسی اقوام کے نامۂ اعمال میں لکھ رکھا ہے ــــ تباہی!! پھر اسی برباد شدہ قوم کی خاکستر پر ایک ایسی سلطنت قائم ہوئی جس نے اپنی شوکت و سطوت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دیا۔ لیکن جب اُن کے دماغ بھی اپنے پیشروؤں کی طرح زہرہ جبینوں کے رقصِ نیم عریاں اور آتشِ سیال کے چھلکتے ہوئے پیمانوں پر نثار ہونے لگے اور اس تعیش پرستی نے اُن کے قوائے فکریہ کو سلب کر لیا تو شجاعانِ عرب نے صحرا سے نکل کر اِس انداز سے اِس عدیم النظیر شان و جلال والی سلطنت کا تختہ الٹ دیا کہ دنیا مبہوت اور ششدر رہ گئی۔ مفتوح قوم قوتِ فیصلہ کے فقدان سے نفس پرست اور فضول خرچ بن گئی تھی اور فاتح قوم قوتِ فیصلہ کی موجودگی میں خدا پرست اور کفایت شعار بنی ہوئی تھی۔ یہودیوں کو دیکھ لیجئے ہر ملک و قوم میں ذلیل و خوار تھے لیکن یہ کفایت شعاری کا صلہ

---

[۱] اُس زمانہ کا رائج الوقت سکہ۔ [۲] ایک نہایت نازک و نادر قسم کی مچھلی۔

ہے کہ آج کئی باجبروت سلطنتوں کے کیسۂ زر کی ڈوریاں اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ ڈاکٹر فرینکلن کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ہماری آنکھیں نہیں جو ہمیں تباہ و برباد کرتی ہیں بلکہ یہ دوسروں کی آنکھیں ہیں جن کی فردوس نظری کا سامان ہم اپنا محنت سے کمایا ہوا روپیہ خرچ کر کے مہیّا کرتے ہیں۔ ابتدائے عمر ہی میں ہمیں قوتِ فیصلہ کی عادت پیدا کر لینی چاہئے تاکہ جب کسی غیر ضروری لیکن جاذبِ نظر چیز کو دیکھیں تو کہہ سکیں کہ "اس کی مجھے ضرورت نہیں"۔ صرف یہ پانچ لفظ ایک فلسفی کے قول کے مطابق قوت، تہوّر اور انسانیت کا نشان ہیں۔

حضور سرورِ کائنات کی مبارک زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دوسری نیکیوں کی طرح قوتِ فیصلہ کی صفت بھی مزاجِ گرامی میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ آپ ہر معاملہ کے سب پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیتے تھے لیکن جب کسی امر کے متعلق فیصلہ ہو جاتا تو اُس سے انحراف کرنا آپ کی طبیعت کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ جنگِ احد کے موقع پر آپ نے لڑائی کا ارادہ کرنے سے پہلے اصحابِ کرام سے اس بارے میں مشورہ کیا تو یہ بات قرار پائی کہ میدان میں نکل کر لڑنا چاہئے۔ اِس پر حضور نے خود زیبِ سر فرما لیا اور روانگی کا ارادہ کر لیا۔ اِس وقت پھر بعض لوگوں کی رائے بدلی اور انہوں ـــــ نے آپ کو ٹھہرنے کا مشورہ دیا مگر آپ نے اُن کی طرف کچھ التفات نہ فرمائی اور کہا کہ "یہ بات نبی کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ خود پہن کر اتار دے تاوقتیکہ اللہ اُسے حکم نہ دے"[1]

اپنے فیصلہ سے منحرف ہو جانے والا انسان، خواہ اُس کی دیگر صفات کتنی ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں، ایک ثابت قدم اور مستقل مزاج انسان سے کارزارِ حیات میں گوئے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ عزمِ راسخ اور قوتِ فیصلہ رکھنے والا انسان جانتا ہے کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور یقیناً دنیا کو اُس کے لئے راستہ صاف کرنا پڑے گا۔ مجھے یہاں تک کہہ دینے میں بھی باک نہیں کہ ایک مفکّر کا دماغ صمیمیتِ عزم کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں۔ لوکن، مشہور رومی جنگجو، مصلح اور مقنن سیزر کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ انسان جو نہایت دانشمندی سے کسی بات کے متعلق سوچتا ہے پھر اُسے عملی جامہ پہنانے کے لئے پختہ ارادہ کر لیتا ہے اور اس کے بعد تمام مشکلات کو حقیر سمجھ کر سرانجام دینے کے لئے مستعد و آمادہ ہو جاتا ہے، ہر شعبۂ زندگی کے مقامِ بلند پر پہنچ سکتا ہے۔

اُس زمانہ میں جب سینٹ پیٹرسبرگ سے کرماسکو تک ریلوے لائین بنانے کے لئے ابتدائی پیمائشیں ہو رہی تھیں، زار نکولس کو معلوم ہوا کہ وہ افسر جن کی تحویل میں یہ کام دیا گیا ہے بجائے فنی مصلحتوں کے زیادہ تر ذاتی مفاد پر توجہ دے رہے ہیں، چنانچہ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اِس معاملہ کو پرانے شہنشاہی طریق پر سلجھا دے گا جب

---

[1] تذکرۃ الحبیب صفحہ ۴۴ بحوالہ سیرت ابن ہشام صفحہ ۴۴۸، مولفہ مفتی محمد انوار الحق ایم، اے۔

وزیر نے اس ریلوے لائن کا نقشہ بادشاہ کے سامنے مجوزہ راستہ واضح کرنے کے لئے پیش کیا تو اُس نے ایک رول کے ساتھ سینٹ پیٹرسبرگ سے لے کر ماسکو تک سیدھی لکیر کھینچ دی اور فیصلہ کُن انداز میں کہا "تمہیں اس ریلوے لائن کو یوں بنانا ہوگا" —— اور وہ ریلوے لائن اُسی طرح بنائی گئی +

اگر تمہاری سیرت میں قوتِ فیصلہ کی کمی ہے تو اپنے قوائے مدرکہ کو بیدار کرو کہ وہ اس اعلیٰ ترین صفت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کردیں۔ ایسے کام کو کل پر اٹھا رکھنا مصلحتِ وقت سے بعید ہے آج ہی سے اس عادت کو اختیار کرنا شروع کردو۔ اِس عادت کو جزوِ سیرت بنانے کا آسان اور بہترین طریق یہ ہے کہ جب کبھی کسی چیز کے متعلق تمہیں فیصلہ کرنا ہو، خواہ وہ معاملہ کتنا ہی اہم یا کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اپنی تمام قوتوں کو اُس کے متعلق سوچنے کے لئے وقف کردو، اُسے عقل وفہم اور واقعات وقیاسات کے ترازو میں وزن کرلو اور پھر ایک عمدہ اور دانشمندانہ فیصلہ کرلو۔ اِس غور وفکر کا جو حاصل ہو اُس پر ثابت قدم رہو اور کسی دلیل وبرہان کو پھر اُس میں دخل انداز نہ ہونے دو —— بہت کم عرصہ میں تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ دنیا تمہیں ایک طاقت ایک انسان تصور کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شروع شروع میں تم سے غلطیاں سرزد ہوں لیکن وہ طاقت اور اعتمادِ نفس جو تم نے فیصلوں پر جمے رہنے سے حاصل کیا ہے نہ صرف تمہارے کاروبار بلکہ خانگی ومعاشرتی زندگی میں بھی ممد ومعاون ثابت ہوگا اور اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو سمجھ لو کہ تمہیں شاہراہِ زندگی سے مجبوراً ہٹ جانا پڑے گا کیونکہ اُن لوگوں کو آگے بڑھنا ہے جو اِس صفت سے متصف ہیں یا جو اِس عادت کو اختیار کرنے کی سعی میں مبتلا ہیں +

محمد ضیاء الدین شمسی

ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز سیکھو۔ ہر روز آگے کو قدم بڑھاؤ۔ ہر روز اپنے خدا کو یاد کرو اور ہر روز اپنے ہم جنسوں کے لئے کوئی ذرا سا ہی مفید کام کردو!

خدا ایسا حاکم نہیں جو محض تعظیم وتکریم کی خوشامد سے خوش ہو جائے خدا ایک ایسا معلم ہے جو اپنے سب سے محنتی شاگرد پر سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔

باغبان

الہامات

یہ اک شانِ خدا ہے، مَیں نہیں ہوں
وہی جلوہ نما ہے، مَیں نہیں ہوں

زمانہ پہلے مجھ کو ڈھونڈتا ہے
مگر تیرا پتا ہے، مَیں نہیں ہوں

ترے ہوتے مری ہستی کا کیا ذکر
یہی کہنا بجا ہے، مَیں نہیں ہوں

ترے جلووں میں کھو جاتا، مگر آہ
جہاں تُو جلوہ زا ہے، مَیں نہیں ہوں

تری بزمِ طرب ہے اور کُل احباب
مقدّر کا گلہ ہے، مَیں نہیں ہوں

صدائے "نحن اقرب" کہہ رہی ہے
کہ تُو مجھ سے جدا ہے، مَیں نہیں ہوں

وہ خود تشریف فرمائے جہاں ہیں
"تُمہیں دھوکا ہُوا ہے، مَیں نہیں ہوں"

وہ خود اِس انجمن کے درمیاں ہیں
اُنہیں کا سامنا ہے، مَیں نہیں ہوں

کہاں میں اور کہاں خبطِ "انا الحق"
کوئی میرے سوا ہے، مَیں نہیں ہوں

دل و جاں، فہم و دانش دینے والے
فقط تیری عطا ہے، میں نہیں ہوں

مجھے آزادؔ! دنیا کیوں نہ پُوجے
کسی کا نقشِ پا ہے، میں نہیں ہوں

حکیم آزاد انصاری

جب تک

جب تک تیری آنکھوں میں نیکی کی جھلک ہے دوست! میں تیرا ہوں
جب تک تیرے حسن میں محبت کا جلوہ ہے دوست! میں تیرا ہوں

جب تک تجھے

بیمار سے ہمدردی ہے دوست!

نادار سے ہمدردی ہے دوست!

مَیں تیرا ہوں

جب تک تُو

کمربستہ ہے اَوروں کی خدمت کے لئے

وفادار ہے اپنے ضمیر کے سامنے

استادہ ہے اپنے خدا کے حضور، دوست

مَیں تیرا ہوں

جب تک تجھ میں یوں

قربانی کی لگن ہے

ایثار کی روشنی ہے

دوستی کی نکہت ہے، دوست!

مَیں تیرا اور صرف تیرا ہوں

باغباں

مصطفےٰ فریبی

(سرزمین افغانستان کی ایک داستان)

"جس طرح کوندا لپک کر، شعلہ بھڑک کر، بجلی تڑپ کر رہ جاتی ہے ٹھیک اُسی طرح محبت بھی ایک محدود عرصہ تک روح کو تڑپا کر، سکون کو اضطراب سے بدل کر دل و دماغ کو متلاطم کر کے ختم ہو جاتی ہے ـــــ جہاں آرا! تمہارے لئے اب میرے مینائے دل میں صہبائے محبت کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے، پھر اس سے کیا حاصل کہ میں اپنی زندگی کے زرین لمحات جو بے حد قیمتی اور افتخارِ روزگار ہیں، تیری محبت کے قصے سننے میں صرف کر دوں" مصطفےٰ فریبی نے جہاں آرا پر ایک نگاہِ مستغنی ڈال کر اتنا کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

پاک نفس لڑکی میں اگر تھوڑا سا پندارِ حسن بھی ہوتا تو وہ اِس تحقیرِ محبت سے تڑپ اُٹھتی اور غزالِ رعنا کی طرح طرارے بھرتی ہوئی اپنے مسکن کو نکل جاتی ـــــ یا وہ اپنی گردن کو اک اندازِ تفاخر کے ساتھ بلند کر کے اتنا جنوِ ر کہہ دیتی کہ جاؤ جی جاؤ میں ایک ایسے نوجوان سے محبت کرتی ہوں جس پر تازگی برستی ہے، لیکن جہاں آرا معصوم تھی اور عشق و محبت کی گھاتوں سے نا آشنا تھی۔ اُس نے سر جھکا کر سرد آہ کھینچی، پھر گرم آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر ٹپکا کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی: "لیکن تمہارا وہ پیمانِ محبت ......"

مرد ہو یا عورت اُس کے سامنے جب کسی کا سرِ نیایش جھکے، تو فطرتاً اُس کے دل میں نخوت اور پندار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مصطفےٰ فریبی نے سر کی جنبشِ تمکنت کے ساتھ جواب دیا: "جہاں آرا ایک وقت میں تمہاری ذات میرے لئے سرمایۂ لذت و سکون آرائی ضرور تھی، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اب وہ دور ہو چکا، اب تمہاری چچیری بہن "نور محل" نے میری شہرِ حیات پر قبضہ کر لیا ہے!"

"تمہیں تو پیمانِ محبت باندھے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا!"

"خدا شاہد ہے کہ اِس مختصر سے عرصہ میں، میں نے تم سے محبت نہیں کی تمہاری پرستش کی ہے لیکن اب تو کسی اور سنگیں دل کا سودائے سنگیں ہے!"

یہ کہہ کر مصطفےٰ فریبی کے جذبات و امیال میں ہیجان پڑ گیا۔ پھر اُس نے جذبات پر قابو پا کر کہا عالم نور کی شہزادی نور محل کے لانبے لانبے گھنے سیاہ بال اُس کی مے فروش

آنکھیں اور اُس کے چہرے کی تماشا سوز لمعانیت نے مجھے خستہ و برباد کر رکھا ہے ـــــ چودہ پندرہ سال کا سن ہے یہ وہ عالم ہے کہ نور محل کو دیکھ کر انسان کا سینہ پھٹنے لگتا ہے! خدا نے چاہا تو میں نور محل ہی سے شادی کروں گا!"

"تم نے ایک مختصر عرصہ تک مجھ سے محبت کی ہے لیکن شادی کی خواہش کبھی ظاہر نہیں کی" جہاں آرا کا نازک دماغ تپ اُٹھا اور اُس کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔

"جہاں آرا! میری محبت کا دورِ اولین محض ہنگامی اور وقتی تھا لیکن نور محل کی محبت غیر فانی اور ابدی ہے محبت کی اِن سنہری زنجیروں کو نہ تو دنیا کی کوئی زبردست قوت توڑ سکتی ہے اور نہ قضا و قدر کے مضبوط ہاتھ توڑ سکتے ہیں!!" مصطفٰے محمود خاں نے جواب دیا۔ دنیا کی عظیم الشان حکومتوں کو فتح کر لینا آسان ہے لیکن دلوں کی تسخیر دشوار ہے بخصوصاً صنفِ نازک کے دل پر حکومت کرنا مشکل سی مشکل ہے عورت نہ تو مرد کی شجاعت و بسالت سے مرعوب ہوتی ہے اور نہ دولت و امارت سے مسخر ہوتی ہے۔ وہ صرف ایک لطف انگیز نگاہ اور ایک محبت سے لبریز دل کے سامنے اپنے تمام ہتھیار ڈال دیتی ہے اور غلامی کا دم بھرنے لگتی ہے اگر اُسے محبت کا بھرا اور ملکہ دیا جائے تو وہ بھی برابر کا جواب دیتی ہے۔

مصطفٰے فریبی اپنے قبیلے آغا خیل میں حسن و جمال کے علاوہ شجاعت و تہوّر میں بھی انتخاب تھا۔ قرب و جوار کے شعوب و قبائل میں جہاں اُس کی شجاعت و جمال کے چرچے ہونے تھے، وہاں اُس کی عیاری کے قصّے بھی ضرور بیان کئے جاتے تھے۔

کوہِ بابا کے مغربی دامن میں جہاں آرا کا قبیلہ موسیٰ خیل آباد تھا۔ ہر دو قبیلوں میں مدت سے باہمی مخاصمت ومناقشت چلی آتی تھی۔ جب جہاں آرا اور مصطفٰے کی محبت کا چرچا ہوا تو منافرت اور بھی بڑھ گئی۔

جہاں آرا نے مصطفٰے سے پوچھا: "کیا نور محل تمہاری محبت سے آگاہ ہے؟"

"ہاں ایک بار اُسے جتا دیا تھا!"

"پھر کیا جواب ملا تھا!"

"نور محل میرے رخسار پر ایک ہلکا سا طمانچہ مار کر چلی گئی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں محبت کے جذبات کروٹیں بدل رہے ہیں۔ آج پھر نور محل سے ملنے کے لئے آیا تھا اور راہ میں تم سے ملاقات ہو گئی"۔

جہاں آرا نے کہا: "اچھا، آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ خدا حافظ!"

مصطفٰے فریبی نے جہاں آرا کو روک کر کہا: "ٹھیرو! ابھی گھر جانے کی کیا جلدی ہے؟"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر محجوب انداز کے ساتھ کہنے لگا: "اپنی دیرینہ محبت کا صدقہ میری غمخواری کرو!"

"مجھے محمد (صلعم) کی قسم کہ میں تمہاری غمخواری کروں گی!"

"مَیں تمہاری سعی کا مدۃ العمر منت پذیر رہوں گا!"

پھر مصطفیٰ فریبی نے جہاں آرا کے چہرہ پر ایک چھپلتی ہوئی نگاہ ڈال کر اپنی پہلی محبت کی بے ثباتی پر افسوس کیا اور اِک کشمکش و اضطراب میں پڑ گیا، ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا۔ ایک لمحہ کے بعد جذبات و عواطف پر قابو پاکر اُس نے کہا: "ہمارا مُلّا صرف دو روز تک یہاں رہے گا پھر وہ دو ماہ کے لئے کابل جارہا ہے، کیونکہ ہم لوگ اُس کے اِسراف کے متکفل نہیں ہوسکتے۔ اگر نور محل کو میرا پیغام پہنچا دو تو ......"

"کون سا پیغام؟"

"چاند جب برستے ہوئے نور کے ساتھ طلوع ہو، اُس وقت نور محل کو "دُرّانی محل" میں لے آؤ، ہمارا مُلّا وہاں موجود ہوگا اور ہم نکاح کرلیں گے"۔

یہ سُن کر جہاں آرا اُچھل پڑی، جس طرح شیرنی گولی کھا کر بپھرتی ہے۔

"یہ کام تو مجھ سے نہ ہوگا"

"تم نے ابھی قسم کھائی ہے کیا وہ وعدہ نقش برآب تھا؟"

"وہ قطعًا نہیں آئے گی"۔

"اِک بار میرا پیغام پہنچا دو۔ وہ ضرور مان جائے گی، مجھے آنکھوں کی کیفیات پڑھ لینے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ میں نور محل کی آنکھوں میں محبت کا لوچ جھلکتا ہوا دیکھ چکا ہوں!"

جہاں آرا نے اِک خندۂ تضحیک کے ساتھ جواب دیا: "اچھا تمہارا پیغام پہنچا دوں گی"۔

"خدا حافظ"!

"خدا حافظ!"

"دُرّانی محل"، عظمتِ ماضیہ کی اِک مٹی ہوئی یادگار ہے، اک زمانہ ہؤا کہ یہاں افغانستان کے امیر دادِ عیش دیا کرتے تھے لیکن اب گیدڑ اور اُلّو بولتے ہیں۔

دن کا شور بالیںِ سکوت پر سر رکھ کر سو گیا تھا خاموشی کے فرمان جاری ہو چکے تھے۔ شجر و حجر تاریکی میں لپٹے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ مصطفیٰ فریبی مُلّا حاجی عثمان کو لے کر دُرّانی محل کی طرف چل دیا۔ لیکن دل امید و بیم کی کشمکش

میں مبتلا تھا راستہ تیرہ و تار اور بھیانک تھا۔ موسلا دھار بارش نے اک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ دونوں مجبور ہو کر "درّانی محل" کے قریب اک زیتون کے درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ بادل کی گرج زمین و آسمان میں زلزلہ ڈال رہی تھی، زہرہ گداز تبسمِ برق پہاڑوں اور جنگلوں کا دل ہلائے دیتا تھا۔ دفعتاً مغرب کی طرف سے ایک عورت کپڑوں میں لپٹی لپٹائی، منہ پر نقاب ڈالے نمودار ہوئی۔ مصطفےٰ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بڑھ کر پوچھا "کیوں مجھ سے شادی کرو گی نا؟" عورت نے نغمہ صفت آواز میں جواب دیا "جی ہاں!"

ایجاب و قبول کے بعد حاجی عثمان نے خطبۂ نکاح پڑھ دیا۔ مصطفےٰ فریبی نے وفورِ شوق میں لرزتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ عورت کے چہرہ سے نقاب اُٹھائی۔ چاند نے بدلی سے سر نکالا، مصطفےٰ کلیجہ تھام کر رہ گیا، کیونکہ وہ جہاں آرا تھی۔ ایک لمحہ تک اُن پر سنگین خاموشی طاری رہی۔ آخر مصطفےٰ نے سنبھل کر کہا:

"میں تجھ سے محبت تو نہیں کر سکتا —— لیکن نکاح کر چکا ہوں" پھر جہاں آرا کا منہ چوم کر اُس کی چالاکی اور فریب کی دل کھول کر داد دی۔ پیت کی ماری جہاں آرا نے خوشی کی پھولی ہوئی سانسوں میں جواب دیا: "محبت اِس قسم کے فریب سکھا دیتی ہے"۔

کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن مصطفےٰ شکار کھیل کر واپس گھر آیا تو جہاں آرا سر جھکائے ہوئے سینے پرونے میں مشغول تھی۔ مصطفےٰ نے پوچھا: "کیا سی رہی ہو؟"

جہاں آرا نے شرما کر جواب دیا: "جب بہار آئے گی خدا ہمیں چاند سا بچہ دے گا، اُس کے لئے کپڑے سی رہی ہوں"۔ جہاں آرا کے رخسار فرطِ حیا سے تمتما اُٹھے۔

شروع بہار میں ایک دن صبح کے وقت جہاں آرا کا چہرہ وحشتناک اور متغیر سا نظر آنے لگا۔ پھر اُس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

عورت کا دل بہت نازک ہوتا ہے لیکن جب وہ مرد کی امانت دار ہو جاتی ہے تو اور بھی زیادہ رقیق القلب ہو جاتی ہے۔ میکا اُسے بار بار یاد آتا ہے اور وہ بات بات پر رو دیتی ہے۔ مصطفےٰ نے جہاں آرا کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ کر کہا: "میں تمہاری ماں کو بلا کے لاتا ہوں"۔

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ جہاں آرا نے پہلے تو مسکرا دیا پھر گھبرا کر کہا: "اُس طرف تمہارا جانا قرینِ مصلحت نہیں۔ میرا قبیلہ تمہارے خون کا پیاسا ہے"۔

عورت اپنے آرام و آسائش کے لئے یہ کبھی گوارا نہیں کرتی کہ اُس کا سرتاج خطرہ میں کود ے۔

یہ سُن کر مصطفےٰ کھکھلا کر ہنس پڑا ۔ پھر اپنی آبدار تلوار کو بے نیام کر کے بولا :

" یہ تلوار میری محافظت کرے گی "

" اچھا خدا ہی تمہارا ناصر و مددگار ہے "

مصطفےٰ برق نمط تیزی کے ساتھ گھر سے نکل کر پہاڑ کو چیرتا ہوا کوہِ بابا کی ترائی میں پہنچا ۔ ایک لمبے تڑنگے ، چوڑے چکلے ، ہل شل نوجوان نے للکار کر کہا : "ٹھیرو ! ——— کون ہو ؟"

مصطفےٰ نے تلوار کو بے نیام کر کے اُسے سنبھالا ۔ پھر اُسے خیال آیا کہ مَیں مرنے مارنے کے لئے نہیں آیا ، بلکہ ایک اہم کام کی غرض سے قبیلہ موسیٰ خیل جا رہا ہوں ۔ اور اُس پہرہ دار کو اپنی آمد کی غرض بتائی ۔ نوجوان افغان نے اپنی عالی حوصلگی کا ثبوت دے کر مصطفےٰ کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی ۔ ابھی وہ بہت دُور نہ گیا تھا کہ ایک اور نوجوان نے راستہ روک کر کہا کہ اپنا خنجر مجھے دے دو ۔ مصطفےٰ نے صبر کا گھونٹ پی کر وہ خنجر اُس کے حوالے کر دیا ۔ اور نزدیک کے ایک باغ میں داخل ہو کر پھول توڑنے شروع کئے ۔ ایک سیاہ فام نوجوان کرنجی آنکھوں والے محافظ نے اُسے ٹوک کر کہا کہ سپر مجھے دو ۔ مصطفےٰ نے غصّہ سے لال پیلا ہو کر اپنی سپر اُسے دے دی ۔ جس وقت ماہِ درخشاں معشوقہ کائنات کو چادرِ نور اُڑھا چکا تو مصطفےٰ بستی موسیٰ خیل میں پہنچا ۔ جہاں آرا کی ماں آمنہ بیگم چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ۔ بڑھاپے نے اُس کا چہرہ پژمردہ کر دیا تھا ۔

مصطفےٰ کو دیکھ کر آمنہ بیگم کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور کروٹ بدل کر کہا : "تم کس منہ سے یہاں آئے ہو ؟ اب کوئی اور فریب کھیلنا چاہتے ہو ؟ !!"

مصطفےٰ نے جھینپ کر جواب دیا ۔ "جہاں آرا کو دردِ زہ شروع ہو گیا ہے ایسے نازک وقت میں اُسے تمہارے دستِ شفقت کی ضرورت ہے "

آمنہ بیگم نے اپنا متورم پاؤں دکھا کر کہا : " میرے پاؤں سوج رہے ہیں ۔ میرے لئے تو کئی دن سے چلنا دوبھر ہو رہا ہے "

" مَیں تم کو اُٹھا کر لے چلوں گا "

" راستہ بے حد دشوار ہے ، کہیں گرا کر میری ہڈیاں توڑ دو گے ——— ایک تجویز ہے کہ نور محل کو کیوں نہ بھیج دوں "

آمنہ بیگم نے نور محل کو ہاتھ کے اشارہ سے بلایا ۔ نور محل نے آتے ہی کہا کہ مَیں جہاں آرا کی خدمت کے لئے

فلسفۂ یاس

زندگی ایک دکھ ہے ، اور اس دکھ کا علاج موت ہے جو خود ایک دکھ ہے ۔ جوں جوں اس خیال پر غور کروگے تمہیں اندازہ ہوگا کہ انسان کا دماغ آج تک اس سے زیادہ تلخ حقیقت تک نہیں پہنچ سکا ۔ اِس فلسفۂ یاس نے دنیا میں دو بہت بڑے حکیم پیدا کئے جن میں سے ایک کو عقلیات کی طرح روحانیات میں بھی ویسا ہی بلکہ اس سے بلند تر مرتبہ حاصل ہے ۔ دونوں میں بعض مسائل پر اگرچہ جزئی اختلافات بھی ہیں جو زمان و مکان کے بُعد ، ملک و قوم کے امتیاز اور افتادِ طبیعت کے انفرادی فرق کا قدرتی نتیجہ ہیں ۔ اِس کے علاوہ کسی عظیم الشان نظامِ فلسفہ کو ایک سادہ سے جملہ میں بیان کرنا نہ صرف ناممکن بلکہ بسا اوقات گمراہ کن ثابت ہوتا ہے ، لیکن اگر الفاظ کے مفہوم کو ذرا وسعت دی جائے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ صدہا برس کے فصل کے ساتھ اسی ایک تاریک خیال نے اپنے دو نہایت جلیل القدر شارح پیدا کئے ۔ مشرق میں گوتم بدھ اور مغرب میں آرتھر شوپن ہار ۔

اِس عالمِ اسباب میں ہر کام جو کیا جاتا ہے ، ہر واقعہ جو ظہور میں آتا ہے اُس کی کوئی نہ کوئی غایت ضرور ہوتی ہے اور ہمارا ذہن فوراً اُس سے واقف ہونا چاہتا ہے ۔ لیکن قدرت کے کارخانے کا سب سے بڑا اور اہم کام یعنی نوعِ انسان کا وجود ، اِس پر بہت کم لوگ دھیان کرتے ہیں ۔ آخر انسان دنیا میں کس لئے آتا ہے ؟ کیا رنج و غم سہنے کے لئے اور تقدیر کے پہیے کی لپیٹ میں آنے کے لئے ؟ ایک خوفناک اور پُراسرار طاقت اُسے عدم کے تاریک خلا سے نکال لاتی ہے اور اپنے وقت کی ازل سے مقرر رفتار کے ساتھ اُسے زندگی کے ایک اُفق سے لے کر دوسرے اُفق تک لے جاتی ہے ۔ وہ روتا ہے ہاتھ پاؤں مارتا ہے ، اپنی میعادِ حیات کو کچھ دن اور دراز کرنا چاہتا ہے لیکن یہ پوشیدہ طاقت جو اُسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اُسے گھسیٹتی ہوئی ، خاموش اور بے رحم ، بڑھے جاتی ہے ۔ آخری کنارے پر پہنچ کر مائیں اپنے بلکتے ہوئے بچوں کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہیں ، بچھڑتے ہوئے رفیق حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور وہ بدنصیب مہجور جس کے لئے کسی دُور افتادہ کی ایک نگاہ ، ایک لفظ ہی عمر بھر کی پریشانیوں کی تلافی کر دیتا ، آنے والے کے وقت پر پہنچ جانے کے لئے بے اثر دعائیں کرتا ہے ، لیکن یہ طاقت جس کی آنکھیں بینا مگر کان بہرے ہیں اپنی بے پناہ رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور اپنے گرفتاروں میں سے ایک ایک کو اپنے اٹل قانون کے مطابق ابدی ظلمت کے اُس گھاٹ اُتار دیتی ہے جہاں سے وہ پھر کبھی نہیں لوٹتا ۔ اس تگ و دو اور درد و کرب کے سلسلے سے کیا اور کس کا مقصد پورا ہوتا ہے ؟ کیا کوئی فوق البشر ہستی یا ہستیاں ایسی ہیں جو کسی مجبوری سے یا اپنی مرضی سے ، اِس زہرہ گداز طریقہ پر اپنی کسی احتیاج کی تشفی کر رہی ہیں ؟ اگر ہیں

تو آنہیں ہم کو اس طرح تختۂ مشق بنا لینے کا کیا حق حاصل ہے اور کیا کبھی کوئی ایسا وقت بھی آئے گا کہ اس مقصد کے پورا ہو جانے کے بعد ان تکلیفوں سے نجات ملے گی؟

سوچنے والے انسان کے لئے جو خود لطیف الحس ہونے کے ساتھ دوسروں کے احساسات کا بھی اندازہ رکھتا ہو۔ یہ زندگی سراپا درد ہے۔ جوں جوں دماغ میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی، یہ حقیقت زیادہ واضح اور دردناک طور پر محسوس ہونے لگے گی۔ کیونکہ انسان کی ذات وسیع ہوتے ہوتے رفتہ رفتہ تمام عالم اور اس کے درد کا احاطہ کرنے لگتی ہے۔ بہت سے بڑے بڑے شعرا کا کلام جو زندگی کے صحیح ترجمان ہیں اس حقیقت کا شاہد ہے، اور یہ بالکل سچ ہے کہ اگر زندگی کو، بہ اصطلاح ولیم جیمز "نیم شبی نقطۂ نظر" سے دیکھنا مقصود ہو تو اس سے زیادہ قوی دلیل ذہن میں نہیں آسکتی کہ زندہ مخلوق کو متاعِ غم بقدر معیارِ زیست کی بلندی کے تقسیم ہوئی ہے، یعنی جوں جوں زندگی کو ترقی اور فروغ اور رفعت ملے گی، اتنی ہی ناشاد ہوتی جائے گی۔ ذہنی ترقی کے زینہ میں جتنے بلند تر ہوتے جاؤ گے، اتنا ہی درد و کرب کو فزوں تر پاؤ گے۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور نوع انسان میں ارتقائے حیات کے مدارج جس تناسب سے بلند یا پست ہیں اسی کے مطابق ان کے احساس غم کی کیفیتیں بھی بلند و پست ہیں۔ بلاشبہ ایسے انسان بھی دنیا میں کم نہیں جو شکم پری خوش باشی اور تن پروری کے سوا کوئی اور کام جانتے ہی نہیں لیکن ان کی سطح حیات دراصل حیوانات سے بلند نہیں ہوتی۔ ان کے لئے "امروز" ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ دوش و فردا کے خیالات ان کو نہیں ستاتے اور روح کی بے فکری خود ان کے بدن کی پرورش کرتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے "مہذب حیوانوں" اور ایک بھینس یا ہاتھی یا گینڈے کے درمیان کوئی قابلِ ذکر فرق حائل ہے؟ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ "انسان کو حیوان سے بہت زیادہ روحانی کوفت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ انسان تصورات کے تعقل کا ملکہ رکھتا ہے جو حیوان کو میسر نہیں"۔ جوں جوں زندگی فروغ پاتی ہے اس کے ساتھ چپکے چپکے وہ شے بھی پیدا ہوتی جاتی ہے جو زندگی کی سب سے بڑی حریف ہے۔ تو کیا ان حقائق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی ایک ایسی بر خود غلط چیز ہے جس کے ارتقا کا گویا نصب العین زیادہ سے زیادہ خائب و خاسر، زیادہ سے زیادہ گرفتارِ عقوبت ہونا ہے! بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان اگر انسان ہے تو زندگی کے ترددات و آلام، خواہ بلند ہوں یا پست، کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

زندگی کے صرف ایک واقعہ پر غور کرو، یعنی زندگی کے انجام پر۔ قدیم یونانی اس آئینہ میں اپنی حیات شخصی کے

تصور Idea تعقل Conception

سے بے آب و رنگ ہو جانے کی تاریک تصویر دیکھتے تھے، دہشت کھا کر پیچھے ہٹتے تھے اور زندگی اور اس کی لذتوں پر اپنی گرفت اور مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ یونانیوں کے دل میں موت کے متعلق خاص دہشت اور تنفر کا جذبہ تھا جو مشہور ہے۔ اپنی لطیف صناعی، اپنے حسین و جمیل تخیل، اپنی شاعرانہ رسوم پرستش، اپنے زندہ دلی کے میلوں اور تیوہاروں، اپنی شگفتہ تفریح گاہوں غرض اپنے تمام کاروبارِ عیش سے بچھڑ کر کسی نامعلوم سرزمین کو چل دینے کا تصور اُن کے نزدیک ایک خوفناک خیال تھا۔ ہم اپنے وطن سے ایک معمولی دنیوی سفر پر جاتے ہیں تو ہمارا دل اُداس اور ہمارے عزیزوں کی آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک ایسی سرزمین کو ہمیشہ کے لئے سفر کر جانا جس کی سرحد پر ہمارے زمان و مکان کے مظاہر ختم ہو جاتے ہیں، قدرتہً کتنا شاق ہونا چاہیئے! کیونکہ اس مسئلہ سے بحث نہ بھی کی جائے کہ موت کے بعد روح زندہ رہتی ہے یا فنا ہو جاتی ہے، پھر بھی اتنا تو یقینی ہے کہ جب ہم اس دنیائے اجسام سے نکل گئے اور ایک ایسے عالم میں جا داخل ہوئے جس کا قانون (یا عدم قانون؟) تحدیدات زمان و مکان سے مشروط نہیں تو ہم ابدالآباد تک وہ نہیں ہو سکتے جو یہاں تھے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی جب ظواہر کے عالم سے نکل کر اعیان کے عالم میں داخل ہوتی ہے تو شخصیت یعنی انفرادی وجود کا کسی نہ کسی طرح منقلب ہو جانا ناگزیر ہے۔ اسی لئے موت ایک ایسا مرحلہ ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے انسان کی روح کانپتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے نظارے نے تو عمری ہی میں کپل وستو کے ذکی الاحساس شہزادے کو چونکا دیا تھا۔ اور ذرا غور کرو تو انسان کی عمر بھر کی جدوجہد کا یہ انجام واقعی کس قدر حسرت ناک ہے! اس اعتبار سے دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارفرمائے کائنات نے اس فنا کی محفل میں ایک ایک نفس کو ایک ایک زندگی کو ایک المیہ ناٹک بنا دینے کے لیے ایک ہمہ گیر اور ہمہ رس قانون قائم کر دیا ہے۔ گویا کائنات کی بنیاد الم پر استوار ہوئی ہے اس لئے مسرت کے ساتھ واقعیت یا دوام کے رنگ میں اسے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ مسرت ایک سوانگ ہے جو الم نے اس لئے بھرا ہے کہ جب آخر کار وہ اپنے بھیانک چہرے کو بے نقاب کرے تو اپنے ستم رسیدوں کو بڑی سے بڑی حد تک محوِ اذیت دیکھ سکے۔ وہ بڑے بڑے ارادے جو اپنی ایک جنبش میں اُٹھ کر آسمان کو چوم لیتے تھے اور جن کو پورا کرنے کے لئے ایسی ایسی سینکڑوں عمریں درکار تھیں، خانگی زندگی کی وہ مسرتیں جن کے آگے دُنیا کے سب آرام ہیچ تھے، جب دن بھر کی کلفت سے تھکا ہارا باپ بیوی بچوں کے درمیان بیٹھتا تھا، ننھے ننھے معصوم فرشتوں کی تتلی باتیں سُن کر اپنی سب پریشانیاں بھول جاتا تھا اور اپنے گھر کو بہشت کا ہمسر سمجھتا تھا، وہ پاک اور طاہر گھڑیاں جب ماں اپنے بچے کو دیکھتی تھی اور ایک ایک

صناعی Art تحدیدات Limitations ظواہر Phenomena اعیان Noumena

شخصیت Personality المیہ ناٹک Tragedy

نگاہ میں اُس کی ساری ماتم سمٹ کر آجاتی تھی، عشق کی وہ ہزار ساعتیں جن کے لئے ایک لمحہ ابد اور ابد صرف ایک لمحہ تھا جب چاندنی سے نکھری ہوئی راتوں میں سایۂ اشجار کے نیچے ایک ایک سانس دو دھڑکتے ہوئے دلوں سے نسیم محبت کے جھونکے لاتا تھا، وہ اُمنگوں سے بھرا دل جو کبھی پورا نہ ہونے والے ارمان کے سہارے جی رہا تھا اور اس امید پر انتظار کی ختم نہ ہونے والی گھڑیاں گنتا تھا کہ کبھی تو اس کا خدا ضرور اس کی سنے گا سب کو موت ہیں کر گورِ غریباں کی زینت بنا دیتی ہے ؎

آرزوئیں مٹ گئیں دل مٹ گیا ہم مٹ گئے — دل جلوں کی یادگار اک اُن کی تربت رہ گئی
رونے دھونے کے لئے جلنے جلانے کے لئے — دل جلوں کی قبر پر اک شمع حسرت رہ گئی

یہ خیالات روح پر جو کیفیت طاری کر دیتے ہیں اسے "قنوطیت" کا نام دیا جاتا ہے۔ ناامیدی اور زیست سے بیزاری اس کیفیت کی نمایاں خصوصیتیں ہیں اور یہ ایک حد تک انکارِ خدا کو بھی مستلزم ہے۔ قنوطیت کے خلاف ایک عام تعصب لوگوں کے دل میں جاگزیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض عوام کالانعام بھی اپنی دماغی فرومایگی کے باعث اسے کوئی ادنیٰ درجہ کی قابلِ تضحیک چیز سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اس منزل تک نہیں پہنچا اُسے اپنی روحانی ترقی میں شبہ کرنا چاہیے۔ امریکا کا سب سے بڑا فلسفی اگرچہ خود کوئی قنوطی نہیں لیکن حیاتِ فکری میں ارتقائے حزن کے منازل گنتا ہوا قنوطیت کے متعلق بالکل بجا طور پر کہتا ہے: "کوئی حیوان اس قسم کے حزن سے آشنا نہیں ہو سکتا، کوئی شخص جو مذہبیت کے جذبہ سے معرا ہو اس کا شکار نہیں ہو سکتا۔ یہ احتیاج مذہب کی تشفی نہ ہونے پر ایک مایوسانہ کپکپی ہے اور محض حیوانی تجربہ کا ناگزیر نتیجہ نہیں" اس سے اوپر وہ اس کیفیت کی تحلیل اس طرح کرتا ہے:۔ "ہمارے مقدس صحائف اور روایات ہمیں ایک خدائے واحد کا پتا بتاتی ہیں جس نے آسمان و زمین کو بنایا اور اُن پر نظر ڈال کر دیکھا کہ وہ اچھے ہیں[1]۔ لیکن زیادہ غائر نظر سے دیکھنے پر ہم مظاہر کائنات کو کسی ایک قابلِ فہم رشتے میں منسلک کرنے سے سر بسر قاصر رہ جاتے ہیں۔ ہر وہ مشاہدہ جو ہمارے دل میں تسبیح و تقدیس کے جذبات برانگیختہ کرتا ہے، اُس کے دوش بدوش ہم ایک ایسا متضاد مظاہرہ بھی موجود پاتے ہیں جو دل سے مذہبیت کے ان تمام تاثرات کو یک قلم محو کر دیتا ہے۔ حسن اور گھناونا پن محبت اور ستمگاری، حیات اور ممات، قدم بہ قدم ایک ناقابلِ تفریق اشتراک کی حالت میں نظر آتے ہیں اور رفتہ رفتہ رحمان و رحیم خدا کے قدیم اور محبوب خیال کے بجائے نامعلوم طور سے ہمارے تصور پر ایک ہولناک قوت حاوی ہو جاتی ہے جسے محبت اور عداوت سے مطلق سروکار نہیں اور جو تمام اشیا کو ایک ہی انجام تک پہنچانے کے لئے بے مقصد و بے مدعا دھکیلتی لئے جاتی ہے۔"

قنوطیت Pessimism

[1] کتاب پیدائش کے آغاز کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خیال جو نہایت نازک مگر ساتھ ہی نہایت وحشت ناک ہے صرف اُن لوگوں کی زندگی کو تلخ کرتا ہے جن کی فطرت کا خمیر شدید مذہبی تشنگی ہو۔ قنوطیت یاس کا فلسفہ ہے اور سب سے زیادہ مایوس وہی دل ہوتے ہیں جن کی توقعات سب سے زیادہ ہوں۔ ولیم جیمز نے زندگی اور اس کی قدر و قیمت پر جو مضمون لکھا ہے اِس میں اُس نے اُنیسویں صدی کے مشہور انگریز قنوطی شاعر جیمز ٹامسن کی ایک درد ناک نظم نقل کی ہے۔ زاہدوں کو اِن اشعار میں شاید ایک کج نہاد انسان کی ہذیاں سرائی کے سوا کچھ نظر نہ آئے لیکن درحقیقت یہ درد و حسرت سے بھرے ہوئے الفاظ ایک شکست خوردہ اور ناکام روح کی سسکیاں ہیں جو اِس قدر حسّاس تھی کہ دنیا اور اُس کا کرب و عذاب اُس کے لئے جہنم کا نظارہ بن گیا۔ ہم اِن اشعار کا ترجمہ نثر میں یہاں درج کرتے ہیں :-

اِس دکھ درد کی دنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب کون ہے؟ میرا خیال ہے میں ہوں۔

لیکن میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ اپنی اس حالت کو چھوڑ کر وہ ہو جاؤں، وہ جس نے ایسی مخلوق کا خالق بن کر اپنی ذلت اور رسوائی کا سامان پیدا کیا۔

نابکار سے نابکار چیز تجھ سے کم نابکار ہے۔ تجھ سے جو اس کے وجود کا مبدء ہے!

اے میرے خالق اے میرے خداوند! اے کینہ توز منتقم! اے خوفناک بداندیش! میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ تیری تمام ظاہر و پوشیدہ قوتوں اور اُن تمام عبادت گاہوں کے بدلے میں بھی جو تیرے نام کی تقدیس کے لئے کھڑی کی گئی ہیں، میں ایسے انسان اور ایسی دنیا پیدا کرنے کے ذلت آفریں جرم کا الزام اپنے سر نہ لوں۔

اُردو شعر میں اس خیال کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے اکثر پُرانے شاعروں کی دلچسپیاں بعض خاص موضوعات تک اِس طرح محدود ہو گئی تھیں کہ زندگی کا سب سے مشکل اور الجھا ہوا مسئلہ اپنی خوفناک عریانی کے ساتھ اُن کے سامنے نہ آسکا۔ البتہ غالبؔ کے کلام میں اِس طرز خیال کا سُراغ جا بجا ملتا ہے۔ فلسفۂ قنوطیت کی ترجمانی کا حق سب سے شاندار اور ہیبت افزا طریقہ پر غالبؔ نے وہاں ادا کیا ہے جہاں اُس نے انسان کی زندگی کی تمثیل ایک نادان بچے کی بھولی بھالی اچھل کود سے لی ہے جو خوشی خوشی خاک دھول اُڑاتا پھرتا ہے اور اپنے اِس کھیل میں مگن ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ ایک تاریک سایہ، ایک کپکپا دینے والی طاقت اُس کے سر پر ہر گھڑی منڈلاتی رہتی ہے۔ یہ خاک دھول کیا ہے؟ اُمید کے نت نئے فریب! اور یہ خوفناک طاقت کیا ہے؟ یاس کی بھیانک شکل! ازل اور ابد اس کے دو زہرہ گداز ہونٹ ہیں جو ایک بے رحمانہ قہقہہ میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ یاس اس خاک سے کھیلتے ہوئے بچے کو دیکھتی ہے اور اس کے انجام کو سوچ کر اس کے بھولے پن پر ہنستی ہے ؎

خاک بازئ امید کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی قوم میں فلسفۂ یاس اُس وقت پیدا ہوتا اور نشوونما پاتا ہے جب اُس قوم کا تمدن اپنے عروجِ ترقی پر ہو۔ طفولیت کے عہد سے گزر کر ایک نوجوان کے دل میں اُمنگوں اور ولولوں کا طوفان اُٹھتا ہے اور بڑے سے بڑا کارنامہ بھی اس کی ہمت کو بقدرِ ظرف معلوم نہیں ہوتا لیکن اس کے بعد ایک ایسی منزل آتی ہے جس سے اکثر نوجوانوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ تشکیک و بدگمانی اور یاس و قنوط کی منزل ہے جب حقیقی دنیا کی تلخیاں ان کی خیالی دُنیا کے شہد میں زہر ٹپکانے لگتی ہیں۔ فرد کی طرح قوم کو بھی اِسی انداز میں "حقائق کی بربریت" سے سابقہ پڑتا ہے۔ قوم پہلے پہل کس امید سے علم و عمل کے میدان میں قدم بڑھاتی ہے لیکن ایک خاص نقطۂ کمال پر پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے تخیل پر قنوطیت کا رنگ چڑھنے لگتا ہے جس وقت یونانی تہذیب اپنی بلند ترین منزلِ عروج کے قریب تھی، تمام ملک میں سیاسی بیداری کی روح پھیل چکی تھی، شہری حکومتوں کی بنیاد استوار ہو چکی تھی اور یونان سے باہر مشرق و مغرب میں یونانی نوآبادیاں قائم ہو چکی تھیں یونان کے "سات سیانے" یونان کی حکمت کی داغ بیل ڈال چکے تھے، اور فلسفہ میں طبیعی، ریاضیاتی، وحدت الوجودی اور مادہ پرستانہ اصول سے کائنات اور اُس کے مظاہر کی توجیہ کی جا رہی تھی، اُس وقت یونان کے محزون فلسفی ہرقلیطوس کا ظہور ہوا جس کے اقوال کی شاعرانہ نزاکت شوپنہار کی نثر اور لطیف تشبیہات کی یاد دلاتی ہے۔ اور جب سقراط اپنا عہد گزار چکا تو "کلبیت" کا مسلک قائم ہوا جو بدھ یا شوپنہار کی قنوطیت سے بہت قریب کی مشابہت رکھتا ہے۔ ہم میں سے اکثر دیوجانس کلبی کے نام سے واقف ہیں جس کی "کلبیت" کے افسانے زبان زدِ خاص و عام اور ہر کہ ومہ کا سرمایۂ تمسخر ہیں۔ اس شخص کے زمانہ میں کلبیت ترمل کرتے کرتے واقعی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس کا مقصد بجز دنیا کے تمام لذائذ سے اجتناب کرنے اور اپنے بنی نوع کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے کے اور کچھ نہ رہا تھا۔ رومۃ الکبریٰ کے عروج کے زمانہ میں بھی اُس تمام طنطنہ و طمطراق کے درمیان بے اطمینانی اور بے کلی کی یہی کیفیت نمودار ہوئی اور جب رواقی و ابیقوری اصول رومی دنیا کی تشفی نہ کر سکے تو سکندریہ میں فلاطونیتِ جدیدہ کا نیم مذہبی مسلک قائم ہوا۔

عبرانی قوم کے مقدس صحائف پر نظر ڈالو جب تک یہود مصائب و آلام کا شکار رہے اُن کا دل امید اور اُس کے ہنگاموں سے روشن رہا۔ لیکن جب اُن کی تہذیب و شائستگی کو عروج ہوا اور مذہب و معاشرت کے نظام میں پختگی آگئی

کلبیت Cynicism — رواقی Stoic — ابیقوری Epicurean

فلاطونیتِ جدیدہ Neo Platonism

تو اُن کی مذہبی کتابیں بھی اِس قسم کے الفاظ سے خالی نہ رہیں ،۔

نابود ہو وہ دن جس میں مَیں پیدا ہوا اور وہ رات جس رات میں کہتے تھے کہ ایک لڑکا پیٹ میں پڑا ۔ وُہ دن اندھیرا ہو، خُدا اوپر سے اُس پر نگاہ نہ کرے اور اُجالا اُس پر نہ چمکے ۔ اندھیرا اور موت کا سایہ اُسے آلودہ کرے، ایک بدلی اُس پر چھا جائے، دن کی کالک اُسے ڈرا دے ———

میں رحم ہی میں مرکیوں نہ گیا؟ پیٹ سے نکلتے ہی میں نے جان کیوں نہ دی؟ ——— یا میں ہوا نہ ہوتا اُس حمل کی مانند جو چھپ کے گرا ہے ۔ یا اُن بچوں کی مانند جنھوں نے اُجالا نہیں دیکھا ۔ وہاں شریر ستانے سے باز آتے اور تھکے ماندے چین سے ہیں ۔ وہاں اسیر مل کر آرام کرتے ہیں اور ظالم کی آواز پھر نہیں سنتے ۔ چھوٹے بڑے وہاں برابر ہیں اور غلام اپنے آقا سے آزاد ہے ۔

روشنی اُس کو جو پریشانی میں ہے، کیوں بخشی جاتی اور زندگی اُن کو جو شکستہ خاطر ہوں؟ وہ موت کی راہ دیکھتے ہیں پر وہ نہیں آتی اور گاڑے ہوئے خزانے کی بہ نسبت زیادہ آرزو کے ساتھ اس کے لئے کھودتے ہیں ۔ وہ تو گور میں جاتے وقت نہایت خوشوقت ہوتے ہیں اور باغ باغ ہوجاتے ۔ ایسے کو کیوں روشنی بخشی جاتی جس کی راہ اُس سے چھپی ہے ۔ اور جسے خُدا نے گھیر کر تنگ کیا ہے؟

"ایوب کی کتاب" باب ۳

یونانیوں رومیوں اور بنی اسرائیل کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہی ہندوستان اور یورپ کی اقوام کے لئے بھی درست ہے ۔ جیمز ٹامسن جس کے اشعار کا ترجمہ ہم نے اوپر درج کیا ہے اُنیسویں صدی کا شاعر ہے ۔ اِسی دورِ ترقی کے ایک اور بڑے انگریزی شاعر میتھو آرنلڈ کے کلام میں بھی یاس کا رنگ غالب ہے ۔ لیکن اس کی قنوطیت نرم، لطیف اور دل گداز ہے بخلاف اِسکے ٹامسن کا تخیل تاریک، تند بلکہ وحشیانہ ہے ۔ اصل میں بات یہ ہے کہ عقلیت اور استدلال کے زمانہ میں مذہب اور الہام کی آواز سننا مشکل ہو جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں انسان کا علم عقلی توجیہ پر اس قدر منحصر ہو جاتا ہے کہ اعتقاد کی حیثیت وہم پرستی اور ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں رہ جاتی ۔ بُدھ کو خُدا کی ہستی کے سمجھنے میں یہی وقت پیش آئی ۔ بدھ مت کے ظہور کے وقت آریا قوم کو اس جنوبی سرزمین میں آباد ہوئے صدیاں گذر چکی تھیں ۔ ویدوں کے منتر آریا ورت میں مدت سے دھرم کا دیا بنے ہوئے تھے اور اب اُپنشدوں کا زمانہ بھی آچکا تھا ۔ ذات پات کی تفریق کے اُصول پر ایک پیچیدہ نظامِ معاشرت وضع ہو چکا تھا جس کے مطابق زندگی کے کاروبار چل رہے تھے ۔ رامائن اور مہابھارت کو تصنیف ہوئے زمانے بیت چکے تھے ۔ منو کا دھرم شاستر لکھا جا چکا تھا یا کم از کم اس کا مواد تیار ہو چکا تھا ۔ زیادہ ترقی یافتہ لوگ مذہبی سوالات کے

حل میں عقل لڑانے لگے تھے، چنانچہ فلسفہ کے چھ درشن قائم تھے جو کائنات، خدا، مادہ اور روح کی حقیقت اور انسانی علم کی ماہیت سے بحث کرتے تھے۔ یہ حالات تھے جب سورج بنسی خاندان کے ایک راجپوت شہزادے کے دل میں سچ کو پا لینے کی لگن لگی ہوئی تھی اور برسوں کی سوچ بچار کے بعد اس کا دماغ قنوطیت کے اس عظیم الشان اور پاکیزہ مذہب تک پہنچا جس پر آج دنیا کے چالیس پچاس کروڑ انسانوں کا ایمان ہے۔

کچھ ایسے ہی حالات تھے جن میں المانی حکیم آرتھر شوپنہار کی قنوطیت نے پرورش پائی۔ یورپ کا علم و تمدن انیسویں صدی میں اپنے منتہائے کمال کو پہنچ رہا تھا۔ اقوامِ فرنگ اپنے اپنے ملکوں سے باہر نکل کر دنیا بھر پر اپنا سیاسی یا علمی اقتدار قائم کر چکی تھیں۔ سائنس نے گذشتہ تین سو سال کے عرصہ میں عدیم المثال اور حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ مادے اور اس کے مظاہر نے انسان کی توجہ کو اس طرح اپنی طرف جذب کر رکھا تھا جس طرح نوعِ انسان کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ انگلستان کے فلسفۂ احساسیت کے بعد کانٹ نے مستحکم دلائل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انسان مظاہر کائنات کی تشریح و توجیہ تو اپنی عقل سے کر سکتا ہے لیکن عینِ ہستی تک اس کے ادراک کی رسائی کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہ زمانہ تھا جب قنوطی خیالات کا ایک طوفان امنڈ پڑا۔ گوئٹے کا مشہور ناول "ورٹر کی مصیبتیں" اور شوپنہار کی شہرۂ آفاق کتاب "دنیا بحیثیت ارادہ و تصور" اسی کی یادگاریں ہیں۔

دنیا میں صرف ایک چیز قنوطیت کی کامیاب حریف ہوتی ہے اور وہ اعتقادِ مذہبی یا ایمان بالغیب ہے۔

حمید احمد خان کرم آباد

احساسیت Sensationalism

رنگینیاں

آسماں پر انجمن تاروں کی ہے دنیائے رنگ
ساغرِ مہتاب میں بے تاب ہے صہبائے رنگ

اُن کا جلوہ ہے کہ رقصِ نُور ہے بالائے نُور
اُن کا چہرہ ہے کہ موجِ رنگ ہے بالائے رنگ

"اس تعلق پر بھی یہ فرقِ مراتب اے خدا"
عشق ساغر زہر کا ہے حُسن ہے مینائے رنگ

پھر حسینوں نے کیا زیبِ بدن رنگیں لباس
عالمِ ایجاد یکسر بن گیا پہنائے رنگ

میرا عشقِ جاوداں ہے مسند آرائے جنوں
میرا حسن گلفشاں ہے انجمن آرائے رنگ

بہار کی دلفریبیوں میں ہُوا گلستاں تمام رنگیں
فروغِ نسرین و نسترن سے نگاہ روشن ہے شام رنگیں

وہ غنچۂ باغِ نوجوانی ہے ایک تصویرِ شادمانی
نظر فسوں گر، خرام دلکش، مزاج شیریں، کلام رنگیں

عابدؔ

ہمیشہ!

ہم نے اُس محبت کو پالیا ہے اے دوست! جس کی اِک دنیا کو چاہت ہو!
وہ پھول ہمارے باغ میں کھِل گیا ہے جس کی نکہت دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے،
وہ موتی، وہ چمکدار موتی ہمیں مل گیا ہے جس کی تابش جسم و جان کو منور کر دیتی ہے،
محبت انسان کے دل کی جان اور اُس کے جسم کی روح ہے اور پھر محبت بھی اک ایسی پاک وصاف اک ایسی بلند و بالا محبت جس کی اے دوست اک دنیا کو چاہت ہو!

مانا کہ دنیا دھوکے کی بستی اور زندگی مصیبتوں کا گھر ہے مانا کہ ہماری کئی دنیاوی امیدیں اب بھی روز بروز یاس و کلفت بنتی رہتی ہیں لیکن میں بھی سوچوں تو سہی تو بھی دیکھیے تو سہی کہ کیا اس دنیا ہی کے اندر ہمیں وہ چیز نہیں مل گئی جس کے ہوتے نہ دھوکے ہیں نہ مصیبتیں مصیبت جو یاس ہیں امید جو تکلیف میں تدبیر کی صورت بن کر نظر آتی ہے جس کا مُوقلم ہر لمحہ زندگی کی روکھی پھیکی تصویر میں احساس و ایثار کی رنگینیاں بھرتا رہتا ہے! کیا ہمیں وہ چیز نہیں مل گئی؟ ہاں! وہی چیز اے دوست! جس کی دنیا بھر کو چاہت ہو!

لاکھ شکر ہے خدائے عزّوجل کا جس نے محبت کے واسطہ سے ملایا مجھے اور تجھے!

ہم باہم ملتے ہیں لیکن یہ کیا ہے اے دوست! جو ہم سنتے ہیں جب کبھی ہم باہم ملتے ہیں؟
یہ کیسی آواز ہے جو یوں صاف سنائی دیتی ہے مجھے اور تجھے کہ
"اِس محبت کو دلوں میں پیدا کیا ہے میں نے لیکن اسے رکھنا اسے بڑھانا ہے تمہیں تم دونوں ہی کو"

آہ ہم نے اُس محبت کو پالیا ہے اے دوست جس کی اک دنیا کو چاہت ہو لیکن ابھی ہمیں اِس محبت کو ابھی ہمیں اِک ایسی محبت کو برقرار رکھنا ہے جو دنیا بھر کو مشکل میں ڈال دے!

ہم نے پالیا ہے اُس محبت کو جس کی ہمیں چاہت تھی لیکن ابھی اُس محبت نے ہمیں نہیں پایا جس کو ہمیشہ سے ہماری چاہت رہی ہے!

میرا اور تیرا نفس گاہے گاہے جسم و نظر کے لطف و لذت کو چاہے تو چاہے لیکن حق یہ ہے کہ نہ میرا دل نہ تیرا نہ میری روح نہ تیری اس لطف و لذت سے اپنا حقیقی لطف اُٹھا سکتی ہے۔ ہم چند روز چند ماہ یا چند سال ہی شباب

کے خواب دیکھ لیں یہ سراب دیکھ لیں خیر دیکھ لیں لیکن پھر ہماری دکھیتی آنکھیں سالوں تک ہی ندامت کے اُن آنسوؤں سے تیرہ و تار رہیں گی جو برائی کی دھندلی سی صورت دیکھ کر بھی اُبل پڑتے ہیں میرے اور تیرے دل ہیں دوست!

میں یہ نہیں کہتا کہ ہم دنیا کو چھوڑ دیں اِس سے رشتۂ الفت توڑ دیں اِس سے منہ موڑ کر جنگلوں کی راہ لیں اور وہیں محبت و عبادت میں اپنی رہی سہی زندگی گذار دیں ۔ جنگل بھی آخر اس دنیا ہی کے اندر ہیں رشتۂ الفت بھی خواہ مجھ میں اور تجھ میں ہی سہی اِس دنیا ہی میں پیدا ہؤا اور جنگل بیابان! کیا انسان کا دل ہی اک گھنا جنگل یا اک لق و دق بیابان نہیں جب اُس میں صداقت کی روشنی یا جب اُس میں محبت کا سایہ نہ ہو۔ اور پھر محبت کیا نری جداگانہ صحبت ہی میں ہے اور پھر عبادت کیا نری مراقبانہ خلوت ہی میں ہے جو دنیا سے دُور، انسانوں کی بستی سے دُور ہمارے حصول کی منتظر ہیں ؟

نہیں ہمیں رہنا ہے اِسی دنیا میں انہیں دنیا والوں میں اور انہیں دنیا والوں کے لئے لیکن ہاں اِن دنیا والوں سے کچھ نہ کچھ الگ تھلگ! کیا اِسی ایک دنیا میں لاکھوں کروڑوں دنیائیں نہیں کہ جتنے دنیا والے ہیں اُتنی ہی دنیائیں ہیں۔ پھر کیا حُسنِ قسمت سے نہیں نہیں حُسنِ محبت سے میری اور تیری دنیا اے دوست! اِک دوسرے سے مل نہیں گئی ؟

ہاں میری اور تیری دنیا نے اک دوسرے کو پا لیا ہے اے دوست لیکن ابھی ان دو دنیاؤں کو مل جل کر سفر کرنا ہے حقیقت کی اُس عظیم الشان دنیا کی طرف جو ازل سے برابر ہماری طرف چلی آ رہی ہے اور جس کی رفتار میں دو دلوں کے اتّصال سے وہ سرعت و کشش پیدا ہوتی ہے جس سے باہم ملے ہوئے دل اپنے اندر اک سخت ہیجان لیکن ساتھ ہی اک امن و اطمینان بھی محسوس کرنے لگ جائیں +

محبت کی تخلیق خدا کے ہاتھوں تھی اے دوست لیکن اُس کا ارتقا اُس نے ہم ناچیز بندوں ہی کے سپرد کیا ہے! یہ امانت ہے اُس پاک و بلند ہمہ گیر روح کی ہمارے دلوں کے پاس ۔ پھول جو اُس نے ہم پر پھینکا اور کیا ہے موتی جو اُس نے ہم کو پیش کیا ہے اب یہ پھول نہ مرجھائے یہ موتی نہ ٹوٹنے پائے یہ کام ہے ہمارا ۔ اُسے دینا تھا اُس نے دیا، ہمیں لینا تھا ہم نے لیا، اب اِس کا رکھنا اب اس کا سینے سے لگائے رکھنا اِس طرح کہ میری تیری زندگی میں، اور اس زندگی سے دنیا بھر میں اس کی خوشبو پھیلے اس کی روشنی پھیلے یہ ہے اے دوست کام میرا اور تیرا! ــــــ اس لئے کہ جتنی خوشی ہمیں اِس کے پانے کی ہے جس قدر اِس نے ہماری زندگی کو مسرور و پُرنور کر دیا ہے اُتنا ہی رنج و الم ہمیں اِس کے کھو دینے میں ہوگا اُسی قدر یاس و حرمان دنیا بھر پر

تاریکی بن کر چھا جائے گا ہمارے لئے اگر ہم نے اپنے تئیں اس کے لئے وقف نہ کر دیا ——— کیونکہ اے دوست! اس کی حفاظت صیانت میں اس کے نشوو ارتقا میں جان و دل اور جسم و روح سبھی کی ضرورت ہے، ہر ساعت ہر ثانیہ اسی کی حضوری میں صرف کرنا اور اسی کے فکر و تخیل کے لئے نذر کر دینا ہے قطعی!

اس سے یہ نہ سمجھنا میرے دوست! کہ ہماری یہ محبت ہم کو دنیا جہاں سے الگ کر دے گی اپنے لئے وقف کرے گی ہمیں اپنے اور دنیا کے کاموں سے علیحدہ کر کے اپنے جزیرۂ عافیت میں جگہ دے گی! نہیں محبت الگ نہیں کرتی علیحدہ نہیں کرتی حسد سے چھین نہیں لیتی بلکہ وہ تو ملاتی ہے اکٹھا کرتی ہے اپنا آپ دے دیتی ہے کہ بچھڑے ہوئے سب کے سب ملیں، لڑنے والے سب کے سب اکٹھے ہو جائیں، دنیا محض اک بھیڑ نہ ہو فقط اک شورش محفل نہ ہو بلکہ دنیا والے سب ایک ہی خاندان کے رکن ایک ہی گھرانے کے سپوت ایک ہی گھر کے رہنے والے ہو جائیں اور سب جو اب الگ الگ ہیں ایک سے ایک مل جائیں اور مل جل کر کام کریں اور مل جل کر ہی رہیں سہیں +

محبت اے دوست! ہمیں دنیا میں صحیح طور پر رہنا زندگی میں صحیح طور پر جینا اوروں سے صحیح طور پر ملنا اوروں کو صحیح طور پر ملانا سکھائے گی اور نہ سکھائے گی تو پیارے دوست! پھر وہ محبت نہیں پھر وہ رہے نہ رہے کیا مضائقہ ہے پھر وہ میرے اور کسی اَور کے درمیان پھر وہ تیرے اور کسی اَور کے درمیان ہوا کرے رہا کرے مگر پھر وہ میرے تیرے درمیان نہ ہو اور نہ رہے تو بہتر ہے!

وہ محبتیں جو جسم و نظر کی ہوتی ہیں وہ محبتیں جو اپنی ظاہری یا چھپی غرض کی ہوتی ہیں میں نے دیکھی ہیں اور شاید تو نے بھی دیکھی ہونگی دوست! تو اب کیا ضرور ہے کہ ہم اُن کو رقص کرتے دیکھیں پھر اپنے اس جسم و جان میں - کیا خوشی اِس رقص ہی میں مستور ہے۔ کیا خوشی وہی ہے جو لوگوں کو اپنے قہقہہ خیز سیر تماشوں میں ملتی ہے؛ قہقہے انسانی فطرت کے چھپے ہیں اِن کو دبانا اور مٹا دینا ظلم ہے لیکن کیا وہی قہقہے قہقہے ہیں جو جان بُوجھ کر یا ہمارے بے جانے پست جذبات کو ہمارے اندر چپکے ہی چپکے اُبھارا اور ہماری فطرت کو یوں گرایا کریں؟ اور پھر کیا روحانی مسرت صرف متانت اور خاموشی کے پہرے میں ذرا سا مسکرا ہی سکتی ہے اور کیا حقیقت کچھ ایسی درشت اور خونخوار شے ہے کہ حق کے طلبگار کو اُس کی آرزو میں ہنسی کو جرم اور خوشی کو اک گناہ سمجھنا پڑتا ہے؟ نہیں خدا کچھ ایسا تارک الدنیا نہیں جتنا اُسے سمجھا جاتا ہے۔ ہوتا تو وہ دنیا کو بناتا ہی کیوں، نری عقبیٰ پر کیوں بس نہ کر دیتا۔ نہیں دنیا خدا کو پیاری ہے بھلا دنیا نہ ہوتی تو پھر خدا کو اپنی ضرورت ہی کیا تھی! اب

تو خدا کی محبت کو جب اپنی زندگی کے لئے حُسن کی ضرورت پڑی تو اُس نے دنیا بنائی۔ یُوں بنی یہ دنیا خدا کی پیاری! اور جو خدا کو پیاری ہو جو خدا کی محبت کے اندر سے پیدا ہوئی ہو ہم اُسے کیونکر پیار نہ کریں اُس کے اندر رہ کر ہم کیونکر سراپا محبت نہ ہو جائیں۔ ہماری محبت جواب ہے اُس محبت کا جو خدا کے اندر سے اس طرح پھُوٹ کر بہتی رہتی ہے جیسے پانی کا چشمہ کسی عظیم الشان پہاڑ کے اندر سے۔ ہمارا سچے طور پر اک دوسرے سے محبت کرنا فی الحقیقت ہمارا خدا سے اور خدا کا ہم سے محبت کرنا ہے! محبت کے برقی احساسات نورِ خدا ہی کی بجلیوں کے ننھے شوخ بچے ہیں!

تو اے دوست! جو محبت سچی ہو دنیا کے نافہم حسد اور قابلِ رحم الزام (کے خلاف آہ ہم خلاف کیوں کہیں بس اسی) کے متعلق اُس کا اک یہی جواب اک یہی عذر بس ہے کہ وہ خود خدا کی پیدا کی ہوئی اور دنیا بھر کی خدمت کرنے والی ہے۔ اُس کو علیحدگی کی صرف اتنی ضرورت ہے کہ وہ اُس پاکیزہ چشمے کے پانیوں سے اک ایسی سیرابی حاصل کرے جس کی روانی سے ایک نیک و مفید تر زندگی کی شادابیاں قائم رہیں اور جس سے خلوت میں وہ اُن ناصاف خیالوں کو مل جل کو دھوڈالے جو انسانی محفل میں روزمرہ کے افکار و جذبات سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اَوروں کی جگ ہنسائی کا جواب اوروں سے بے اعتنائی نہیں بلکہ صرف اک خاموش ہمدردی اور اک چھپی ہوئی صبر آمیز تسلی کہ آخر کار خدا کی دنیا میں سب کچھ ٹھیک ہو کے رہنا ہے!

اور اے دوست! ہم اس محبت کو کیونکر محض خیالی سمجھیں جب ہمارے روزمرہ کے خیال یوں ہمارے روزمرہ کے کاموں میں جنم لیتے رہتے ہیں۔ انسان کی روح اُس کے جسم سے کچھ اتنی الگ نہیں جتنی کہ اُسے زبردستی کہا اور بنایا جاتا ہے۔ جسم تو بیچارا اک لباس ہے اور بس۔ اُس میں نہ کچھ برائی ہے نہ بھلائی۔ وہ تو ایک خاموش خادم ہے اور بس جو بھی ہم کہیں وہ کئے جاتا ہے۔ ہم اُسے خوش رکھنا چاہیں تو خوش ہے۔ دکھ دینا چاہیں تو دکھی ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہماری یہ روحانی محبت ہمارے جسم و جان سے بالکل بے تعلق ہو کے رہے سو جب سے لے دوست اِس محبت نے میری رُوح میں جگہ پائی ہے میرا جسم زیادہ پُرصحت میرا دماغ زیادہ قوی اور میرا دل زیادہ پُر احساس اور زیادہ حق شناس ہونے پر آمادہ رہتا ہے۔ تُو تو خیر کہ نیر النفس ہمیشہ زیادہ راست رو تھا اور خدا کرے ہمیشہ زیادہ ہی راست رو رہے خدا کرے تو ہمیشہ میری زندگی کے بلند تصورات کی تصویر ہو کر رہے مجھ سے زیادہ بلند و بالا مجھ سے زیادہ نیک و پاک کہ میں ہمیشہ تیری ذات کے اثر میں آگے کو بڑھوں اور اوپر کو اٹھوں تُو تو خیر اس محبت سے پہلے اور اس محبت کے اندر بھی غایت

دِ جو پُرایثار و پُرمروت ہے لیکن ہیں وہ جو حرص و ہوا کا شکار تھا وہ جسے پست جذبوں سے سروکار رہتا تھا میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے تئیں غرور و خود نمائی سے پاک و صاف رکھوں تو تیری محبت اور خدا کی بے پایاں عنایت کے سائے میں مَیں ایک دن اک ایسی ہستی بن جاؤں جو ہاں کچھ نہ کچھ تیری پُرخلوص محبت کے قابل ہو جس میں تو اک ہم احساس نفس پائے جو ازل سے برابر تیری طرف سرگرم سفر تھا ـــــــ اِس میں مجھے شک نہیں اور تجھے بھی کیوں ہو کہ ہم دونوں ہمیشہ سے اک دوسرے کی طرف چلے آتے تھے اور آخر اب آکر اک دوسرے سے مل گئے!

تو ہاں پیارے دوست! جب سے مَیں نے تجھے اپنی محبت دی ہے محبت خود قوت و توانائی کا ایک چشمہ بن کر میرے دل سے جابجا پھوٹ نکلی ہے۔ مجھے ہر شخص سے مجھے ہر کام سے مجھے ہر بات سے کچھ الفت سی ہو گئی ہے الفت جو بلاشبہ اس تیری ہی محبت سے پھوٹی ہے + میں شاہ راہ پر جب کسی اپاہج کو دیکھتا ہوں تو آنسو میری آنکھوں میں بھر آنے لگتے ہیں ـــــــ ہمیشہ نہیں کبھی کبھی لیکن پہلے اتنا بھی اس قدر شاذ تھا کہ کالعدم۔ میں گلی کوچوں میں گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگ جاتا ہوں کہ یہ بھی میری طرح کے انسان ہیں جن میں اکثر مجھ سے زیادہ صاف دل زیادہ جفاکش اور یقیناً زیادہ مستحق مسرت ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ اُن کی صفائے قلب اور اُن کی محنت و ریاضت بالکل رائگاں جاتی معلوم ہوتی ہے + دنیا میں لاکھوں کانیں ہیں جن میں کروڑوں ہیرے چھپے پڑے ہیں لیکن دنیا کو اُن کی قدر نہیں۔ کس لئے؟ محض اس لئے کہ انسانوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں۔ آہ! اس دنیا کو بے اعتنائی نے بے پروائی نے منافرت نے مجاہدت نے ایک اندھیر نگری بنا رکھا ہے۔ اگر وہ روشنی جو ہر سینے میں ہے چمکنے لگے تو ہر گھر ایک نور کی جلوہ گاہ اور ہر آبادی رشکِ صد ارم اور غیرتِ صد جنت ہو جائے۔ اور کیا اب بھی بعض جھونپڑوں میں شاید کسی محل میں بھی یہ عالم نہیں اور کیا دنیا بھی ایک روز یوں خلدِ بریں نہ بن جائے گی؟ بن جائے گی یقیناً بن جائے گی!!

پیارے دوست! اب تو جب میں اک پھول کو دیکھتا ہوں تو مَیں اُس کی طرف کھچا چلا جاتا ہوں اور پھول کیا باغ کی ہر روش میں درختوں کی پتیوں میں صبح و شام کی ہلکی ہواؤں میں ڈوبتے سورج اور نکلتے چاند میں بلکہ مڑتے ہوئے رستے میں اُڑتے ہوئے پکھیرو میں مجھے اب وہ کچھ نظر آرہا ہے جو پہلے شاید ہی کبھی نظر آیا ہو + ہاں میں سمجھتا ہوں کیوں؟ یہ سب ایک ہی صانع کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اسی لئے ان میں مشابہت اور

مناسبت اسی لئے ان میں محبت و مودت بھی ہے یہ جو ایک ہی گھرانے کے بچے ہیں یہ ایک دوسرے سے کیونکر نہ مل جل جائیں؟ کائنات ایک ہی وسیع خاندان ہے جس کا ہر کہ ومہ ایک دوسرے سے اک نہ مٹنے والی محبت اور اک نہ ہٹنے والی کشش سے واصل و وابستہ ہے +

اور یہی نہیں! اے دوست! بلکہ میں گئے گذرے زمانوں کی زبان کو اب بہتر سمجھ لیتا ہوں مصنفوں اور شاعروں پیغمبروں اور رہنماؤں کے اشاروں کو اب میں بہتر جان رہا ہوں۔ وہ میرے ہم راز و ہم نوا بنتے معلوم ہوتے ہیں، میں کھویا ہوا تھا اُن سے اب تک اب میں پالوں گا اُن کو اور اُن کے تصورات کو اے دوست اگر اس جد وجہد میں تُو میرے ساتھ ہو!

اِس سے قبل بھی بعض دفعہ ایسا ہوا کہ جب زندگی میں میری کوئی خواہش پوری ہوئی مجھے عزت ملی یا مجھے کوئی اور کامیابی یا خوشی حاصل ہوئی تو میں دنیا اور دنیا والوں سے خوش ہوگیا اور لگا رنگ رلیاں منانے لیکن ہر بار چند ماہ کے بعد ہی وہ خوشی ناپید اور وہ رنگ رلیاں قطعی ملیا میٹ ہوگئیں۔ اب بھی اگر یونہی ہونا ہے تو کاش اے دوست! خدا میری روح کو برباد کردے خدا میرے وجود کو فنا کردے کہ میں زندگی میں یکسر مایوس ہوکر نہ رہ جاؤں۔ مجھے تجھ سے تو محبت ہے ہی لیکن میں اُس زندگی کو بھی ذرا چھوڑنا نہیں چاہتا جس کی ایک پیاری سی جھلک اب میں نے دیکھ پائی ہے +

کام مجھ سے بہتر سر انجام ہوتے ہیں کھیل میں بہتر کھیلتا ہوں۔ پاکیزگی، باقاعدگی، ترتیب سب میری زندگی میں چلی آتی ہیں اور کیسے؟ سب اے دوست! تیری وجہ سے سب اک تیری بے لاگ محبت کے باعث! پھر کون نہ کہے گا کہ محبت خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے انسان کے لئے اور محبت ہی انسان کا سب سے بڑا اور اہم کام ہے اِس دنیا میں!

کہتے ہیں دنیا نکمے اور برے آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ کوئی مجھے یہ بتائے کہ اُن نکمے اور برے آدمیوں سے کتنی کچھ نفرت بھی کی گئی ہے۔ محبت ان کو کس نے دی ہے؟ کس نے پیار سے دلاسے سے محبت سے اُن کو اُن کی حالت اور چھپی ہوئی قوت سے کبھی آگاہ کیا؟ کہتے ہیں دنیا بیماروں کا ہسپتال ہے ناداروں کا قید خانہ ہے۔ کتنوں کی علالت میں ہمدردی اور محبت نے عیادت کی؟ کتنوں کو محبت سی بیش بہا نعمت کسی نے دی کہ وہ اپنی ناداری کو محسوس کرکے جی ہی جی میں روز و شب نہ کڑھتے رہتے؟ خدا نے انسان کو ہزاروں نعمتیں دیں اور ساتھ ہی آزادی بھی لیکن افسوس کہ ابھی تک اُسے شاید اسی آزادی کے باعث ہی محبت سی نعمت سے فائدہ

اُٹھانا نہ آیا! آہ! اب شاید وقت آرہا ہے کہ انسانیت کی تاریکیوں میں یہ شمعِ کشتہ روشن ہوکر جابجا دل وجان کو فروزاں کردے!

لیکن میری عاجزانہ درخواست ہے تجھ سے اے دوست! کہیں اس سے تو مجھے بہت نیک و راست رو نہ سمجھنے لگ جانا۔ آہ بلکہ جب سے تیری محبت کی دولت مجھ پر نچھاور ہو رہی ہے میری زندگی مجھے اُن تمام اوصاف سے خالی نظر آنے لگی ہے جن کو تیری محبت بآوازِ بلند پکارتی ہے۔ وہ چلے آتے ہیں لیکن میں ہوں کہ مجھ میں اس دولت کو سمیٹنے کی طاقت ابھی بہت کم ہے۔ جس قدر یہ شیرِ طیؔ فان اُمڈا چلا آتا ہے اُسی قدر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کوتاہیوں سے کیونکر اپنے دست وپا کو خدا کے بڑے اور اچھے اچھے کام کرنے کے مدتوں ناقابل بنائے رکھا۔ میری لغزشیں میری کمزوریاں میرے گناہ اب کانٹے بن بن کر مجھے چبھتے ہیں جب سے اے دوست تیری محبت کا پھول میرے گلزار میں کھلا ہے! اگر میں پہلے سے بہتر ہوں تو یہ کیا بہتری ہے! جو میں تھا مجھے اُس سے کیا؟ چاہئے کہ میں ہو جاؤں وہ جو مجھے ہونا چاہئے! ماضی سے مقابلہ لاحاصل ہے کہ میرے حال کو ہمیشہ مستقبل کی تمنا ہے۔ نیکی کی کوئی انتہا نہیں، نہ نیکی کی خوشی کی، نہ نیک محبت کی، پھر کیونکر میں ہمیشہ اپنی کوتاہیاں ہی نہ دیکھوں پھر کیونکر میں ہمیشہ عجز وانکسار سے آگے ہی کو قدم نہ بڑھائے جاؤں؟!

یہ سب کچھ ناممکن سہی لیکن محبت اے دوست! ناممکن ہی کو ہاتھ میں لیتی ہے کیونکہ وہ خود ناممکن ہے! کیا خدا بھی ناممکن نہیں؟ کیا مکمل نیکی کیا مکمل محبت کیا خدائے رحیم ورحمٰن کیا یہ سبھی ناممکن نہیں؟ ہاں! یہی وہ ناممکنات ہیں جنہیں انسان کو اپنی روح میں زمانے کے ساتھ مل کر ممکن اور اغلب اور یقینی بنانا ہے۔ یہ ہے انسان کا کام کائنات میں اور مقدر میں یہی ہے کہ یہ کام انسان کے ہاتھوں ہو کے رہے!

مجھ میں اور شاید تجھ میں بھی ابھی لاکھوں کمزوریاں ہیں دوست! نہیں مجھے محض تیری خوشامد منظور نہیں خوشامد اے دوست! محبت کو برباد کر دیتی ہے کیونکہ وہ اصلیت کو چھپا لیتی ہے تُو نے مجھے اجازت دی ہے حکم دیا ہے درخواست کی ہے کہ میں ہر قدم پر تجھے اُن لغزشوں سے آگاہ کروں جو میں تجھ میں دیکھوں۔ کیا یہی اعتراف کیا یہی اجازت ودرخواست تجھے اُن لغزشوں سے روز بروز صاف بچا لینے کی ذمہ دار نہیں؟ کیوں نہیں تُو جو میرے تصورات کا ماویٰ وملجا ہے تُو جو پھول ہے میرے باغِ حیات کا کیا تجھے جب میں کانٹوں میں گرتا دیکھوں گا تو کانٹوں کو ہٹا نہ دوں گا تجھے صاف بچا نہ لوں گا؟ نہیں خوشامد کا زمانہ اگر تھا تو اب ہو چکا، اب تو محبت ورہنمائی کا وقت ہے۔

آہ! اب کہیں جا کر وقت آیا ہے دوست! کہ مجھے اور تجھے جو باتیں اوروں کے کہے بُری لگتی تھیں وہ

محبت میں ہم اک دوسرے سے سنیں اور دیکھیں کہ ہم ہیں کیا کچھ کمیاں ہیں جن کے پورا کرنے میں ہماری محبت کا قیام اور ہماری زندگی کا دوام ہے!

اس لئے اے دوست! اگر میں اور تو ایک دوسرے کی مصاحبت ایک دوسرے کی خلوت کے تمنائی ہوں محض ایک دوسرے کے ہوجانا چاہیں فقط ایک دوسرے میں دنیا جہان کی خوشی دیکھیں تو تعجب نہ کر تو گریز نہ کر اس تمنا سے کہ ہمیں مل جل کر اُس عظیم الشان مہم کو سرانجام دینا ہے اُس کی کامرانی وظفرمندی کی تدبیر و ترتیب لحظہ بہ لحظہ سوچنی ہے جس میں ہماری ساری طاقت و توانائی صرف ہونے والی ہے اور جس کا نام صحیح زندگی ہے!

اور پھر اگر میں چاہوں کہ ہماری یہ محبت یا سبھی کچھ ہو اور یا پھر کچھ بھی نہ تو تعجب نہ کر کہ محبت جو خدا کا جلوہ ہے لامحدود ہے خدا کے لامحدود کی طرح - یہاں "اتنی" اور "کتنی" کی گنجائش نہیں یہاں تو "جتنی" بھی ہو کم ہو!

اور پھر محبت کہتے ہیں صرف عورت اور مرد میں ہوسکتی ہے کہ یہ ایک جنسی جذبہ ہے - محبت کی اے دوست! لاکھوں شکلیں ہیں ایک سے ایک پاکیزہ - میں نہیں کہتا کہ شادی میں محبت ناممکن ہے ناممکن نہیں لیکن مشکل ضرور ہے - میں نہیں کہتا کہ مرد عورت کو ایک دوسرے سے محبت نہیں ہوتی آخر عشق کا لفظ اسی عموماً پست سے تعلق میں گھر کر ہی تو زمین و آسمان میں بدنام ہوچکا ہے - میں تو صرف یہ محسوس کرتا ہوں کہ محبت میں اچھی محبت میں مجھے کبھی مرد عورت کے امتیاز کا پتہ نہیں چلا - کیا محبت مرد مرد میں نہیں ہوتی عورت عورت میں نہیں ہوتی ماں کو بچے سے بچے کو ماں سے نہیں ہوتی چڑیا کو اپنے ننھے سے نہیں ہوتی؟ محبت تو ہم کو اک تنہا نظارے اک گرتے ہوئے آبشار اک اٹھتے ہوئے طوفان سے ہوجاتی ہے - محبت پھول کو پھول سے پنکھڑی کو پنکھڑی سے کرنوں کو کرنوں سے - پھر کیا وہ مرد عورت ہی میں نہیں ہوسکتی جب تک اُن میں جنسی جذبہ پیدا نہ ہوجائے نہیں! یہی جنسی جذبہ اپنی پستیاں چھوڑ کر زندگی کی سب سے بلند چوٹیوں کی طرف چل نکلتا ہے - یہ برائی خود ملیا میٹ ہو کر نیکی کی صورت اختیار کرلیتی ہے، آہ! خدا کی وسیع کائنات میں کونسی برائی ہے جو صورت بدل کر ہمارے ہاتھوں ہی نیکی نہیں بن سکتی؟ - یہ ہے وہ کام جو خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے!

اے دوست! ہم نے اُس محبت کو پالیا ہے جو ہمارے خیال و خواب میں بھی نہ تھی اور اے دوست ہمیں ابھی پانا ہے اور ہم پالیں گے یقینی طور پر اُس محبت کو جو ابھی فقط ہمارے خیال و خواب میں پرتو افگن ہے! خیال و خواب میں؟ کیا محبت خود ایک خیال نہیں خود ہی اک خواب نہیں کہ وہ زندگی کی تاریک راتوں کو

اپنی چھپی ہوئی شمع سے رہ رہ کر روشن کرتی رہے؟

محبت اے دوست! دن کی روشنی نہیں اگرچہ اُس کی آنکھیں سورج کی کرنوں سے بھی خیرہ نہیں ہو سکتیں محبت تو اے دوست! راتوں کی چاندنی ہے تاروں کی جھلملاہٹ ہے اور یہ اِس لئے کہ ہماری نازک نگاہیں ابھی اُس کے نور و ظہور کی ٹھیک تاب نہیں لا سکتیں۔ جو کچھ بھی ہے جو کچھ بھی اسے خدا نے بنایا ہے محبت! اے دوست! حقیقت میں انسان کی زندگی اور خدا کی حقیقت ہے! پھر خدا نہ کرے کہ کبھی میرے پیارے دوست اے میری زندگی کی روشنی اے میرے باغ کے تنہا پھول! کبھی میرا تیرا دل ایک دوسرے کی انتہائی محبت سے خالی اور یوں اس غیر انجام مسرت سے محروم ہو جائے!! خدا نہ کرے کہ کبھی! بلکہ خدا یہ کرے کہ ہمیشہ میں تجھے اور تو مجھے آگے کی طرف اُوپر کی طرف لئے چلے؛ میں تجھے اور تو مجھے جگائے جائے بڑھائے جائے پیار سے، محبت سے، ہیں تجھے اور تُو مجھے! خدا کرے کہ ہمیشہ!

نثار احمد

اے جان ہے باغِ مگر شوکت میری　　اے جان ہے بحرِ عیش و دولت میری
آجا مرے دل میں تو گزر کر ان سے　　اے جان بہشت ہے محبّت میری

بھیجا مجھے تُو نے اِک وفا کا پیغام　　ایثار کا عفّت و حیا کا پیغام
یُوں کر دیا جس نے دل کو بیدار و بلند　　تیرا نہیں، ہے مرے خدا کا پیغام

آیا مجھے میرے مہ لقا کا پیغام　　نیکی کا محبّت کا وفا کا پیغام
اُلفت میں مری سدا چمکتے رہنا　　ظلمت کو ہے رُتبہِ بے بہا کا پیغام

تم اور میں

اے دوست تم اور میں دو دل یک دل ہونے کے لئے دُنیا میں آئے! ـــــ لیکن اُس وقت جب کہ ہم دونوں نے یہ محسوس کیا کہ تم میرے لئے اور میں تمہارے لئے ہوں تو وقت ہاتھ سے جا چکا تھا بلکہ ایسا خیال بھی دل میں لانا ہمارے لئے ایک گناہِ عظیم تھا۔ نفسِ انسانی مجبور ہے اور معذور۔ آرزوؤں کے طوفان نے بحرِ دل میں تلاطم برپا کر دیا۔ تمناؤں کی سیاہ گھٹاؤں سے زندگی کا آسمان تیرہ و تار ہو گیا مگر ہم اپنی اُس زبردست قوتِ ارادی سے جو خدا کی مہربانی نے بچپن سے ہمارے دلوں میں رکھ دی تھی ان رہ رہ کر اُبھرنے والی اُمنگوں کی طغیانی سے اپنے دل و دماغ کو پامال ہو جانے سے بچاتے رہے!

وقت یوں ہی کٹتا گیا، برسوں گذر گئے، شاید ہم ایک دوسرے کو بالکل فراموش بھی کر چکے اور زندگی کی الجھنوں اور دنیا کے دھندوں میں ایسے گرفتار ہو گئے کہ ان سے رہائی پانا مشکل بلکہ ناممکن نظر آنے لگا۔

ناگہاں ہمارے فلکِ زیست پر محبت کا ایک ایسا چمکتا ستارہ روشن ہوا جس نے تمہیں ہمہ تن شوق اور بالکل بے اختیار کر دیا۔ راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ راحت و اطمینان نے خیر باد کہی۔ آنسو زار و قطار بہنے لگے۔ مجھے حیرانی و پریشانی تھی کہ نہ جانے اِس کا کیا انجام ہوگا مگر شکر ہے خدائے ذوالجلال کا جس نے ایمان کی روشن مشعل اور ضمیر کی چمکتی ہوئی روشنی سے مجھے اپنی سیدھی راہ دکھا دی، اسپِ زیست کی باگ ڈور میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور تمہیں اور اپنے آپ کو اس طوفان میں سے صاف بچا لیا!

پھر اے دوست! اب وہ دن آیا کہ تم ہمہ تن شوق ہو اور میں مجسم انتظار۔ میرے تمام ارادے میری طاقتِ ضبط جواب دے چکی تھی۔ اُس وقت ہاں اُس وقت میں نے اپنے آپ کو خدا کے اور تمہارے سپرد کیا۔ خدا جانے ہم کدھر کو بہے جاتے اور کہاں سے کہاں پہنچ جاتے جب تم نے محسوس کیا کہ اب میرا دامن تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں میں نے بلکہ دستِ قدرت نے ایک کڑے امتحان میں ڈالا۔ تم پورے اُترے ایسے پورے اُترے! کامیاب ہوئے اور ایسے کامیاب ہوئے کہ جس پر میں جتنا ناز کروں کم ہے۔ تم نے مجھے آتشِ محبت میں جل جانے سے کس خوش اسلوبی سے بچایا۔ مجھے دین و دنیا کی راحتوں سے مالا مال کر دیا!

اب تم اور میں اے دوست شاداں و فرحاں ہوں کہ ہم نے وہ کام سرانجام دیا جسے شاید ہی کوئی کر سکے ؟! ؟

* * * * * * * * * * * * * * *

نواہائے راز

وہ جان کیا، جو صرفِ تمنّا نہ ہوگئی
وہ روح کیا، جو سوز سراپا نہ ہوگئی

قلبِ حزیں کو دیکھ کے وہ حُسنِ جاں فروز
ہے کون سی خوشی جو مُہیّا نہ ہوگئی

دیکھو تو پردۂ ہوسِ گُل میں کیا ہُوا
بلبل ہلاکِ جلوۂ جانا نہ ہوگئی

پیدا ضیائے طُور تری شمعِ رُخ سے ہے
نارِ کلیم آتشِ پروانہ ہوگئی

تیرا وجود رونقِ کاشانہ تھا کبھی
اب تیری یاد شمعِ سیہ خانہ ہوگئی

ہر سانس پھونکتی تھی فسونِ ہوائے ناز
وہ زندگی مرے لئے افسانہ ہوگئی

حامد علی خاںؔ

Interesting

ڈاکٹر ڈوڈو

اکرام بھائی تمہارا چھٹی تاریخ کا خط سول، زمیندار، انقلاب اور گورو گھنٹال کے بہت سے پرانے نمبروں سمیت ملا۔ میں نے ان تمام اخبارات کو بڑے غور سے پڑھا۔ اور ڈاکٹر ڈوڈو والے سلسلے کو حد سے زیادہ دلچسپ پایا۔ تم لکھتے ہو "ایلوپیتھی۔ ویدک اور یونانی طرز علاج کی اس تنزاع کے متعلق اپنی رائے لکھو" تمہارے کہنے کے مطابق میں نے اس معاملے کو بہت ہی غور سے مطالعہ کیا ہے۔ مگر اسے متعدد بار پڑھنے کے باوجود بھی میں تمہیں اس "نزاع" کے متعلق اپنی رائے نہیں دے سکتا۔

تم جانتے ہو کہ میں ڈاکٹری کے علاوہ یونانی اور ویدک میں بھی خاصی مہارت رکھتا ہوں اور ایک عرصہ سے ڈاکٹر ویدا اور حکیم کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ مجھے اس دوران میں ایلوپیتھی، یونانی اور ویدک طریق علاج کے متعلق بہت سے تجربے حاصل ہوئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں تمہیں ان کا مختصر حال لکھوں تاکہ تم خود ان تینوں طریقوں کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکو۔

اس خط میں میں اپنی ابتدائی طبابت کے دو ایک ایلوپیتھک "تجربوں" کے حالات تحریر کرتا ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں ایک عرصہ تک ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ مگر انتہائی کوششوں کے باوجود مجھے کسی قسم کی کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ آخر فیصلہ کیا کہ کسی جگہ اپنا ذاتی مطب جاری کیا جائے۔ اس فیصلہ کے بعد میں کئی ماہ تک پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبوں میں اس غرض سے گھومتا رہا کہ اپنے کام کے لئے کوئی ایسی موزوں جگہ ڈھونڈوں جہاں امراض بہت ہوں اور ڈاکٹر کم۔ مگر صوبے بھر میں مجھے ایسی کوئی جگہ نہ ملی۔

امراض کی زیادتی تو خیر سے ہر شہر اور ہر قصبے میں موجود تھی مگر ساتھ ہی ہر جگہ ڈاکٹروں کی فراوانی بھی تھی۔

چھ ماہ تک لگاتار کوشش کرنے کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ ریاست کشمیر میں طبابت کا میدان بہت وسیع ہے اور ایک ہشیار اور قابل ڈاکٹر وہاں ضرور کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی میں نے کشمیر پہنچنے کی تیاری شروع کر دی اور کچھ دنوں کے بعد بستر بوریا اٹھا ریاست کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر میں ایک دو ہفتہ تک "امراض زیادہ اور ڈاکٹر کم" والے معیار کو مد نظر رکھتا ہوا ریاست کے دارالخلافہ سری نگر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ آخر کار اچھی طرح سوچ سمجھ لینے کے بعد میں نے سری نگر ہی میں کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ شہر کے سب سے بڑے اور بارونق بازار امیرکدل میں ایک دکان کرایہ پر لے کر

اُس میں اپنے مختصر سے دواخانے کا سامان بڑے قرینے سے لگا دیا۔ دکان کے باہر کئی ایک بڑے بڑے رنگین بورڈ آویزاں کئے۔ اور بہت سے مختلف اشتہار "سری نگر میں ایک تجربہ کار اور لائق ڈاکٹر" "تمام انسانی امراض کا شرطیہ علاج" "ہیضے کے مریضوں کو مژدہ" وغیرہ وغیرہ سارے شہر میں تقسیم کرائے۔ اور دکان کے ایک گوشے میں ایک بہت بڑی میز لگا کر پورے اطمینان کے ساتھ کرسی پر ڈٹ گیا۔ میز پر ڈاکٹری کی دو ایک کتابیں، سات آٹھ چھوٹی بڑی شیشیاں۔ ایک بہت موٹی انگریزی کی ڈکشنری اور ایک دو خالی رجسٹر رکھ دیئے گئے۔

اکرام میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اُس کرسی پر میں کتنے عرصہ تک صبح چھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک بیکار بیٹھا رہا۔ کئی ماہ گذر گئے اور باوجود اِس بات کے کہ شہر میں ہیضے کا اور دیگر امراض کا بازار بہت گرم تھا میری طبابت سرد ہی رہی۔ صبح سے شام تک کئی بار بڑی عاجزی اور انکسار کے ساتھ دعائیں مانگتا کہ یا الٰہی مریض بھیج، مگر بے سود۔ کئی بار نئے اشتہار تقسیم کئے بلکہ اخبارات میں مضمون بھی چھپوائے لیکن قسمت نے یاوری نہ کی مریضوں کو نہ آنا تھا نہ آئے۔

ایک روز حسبِ معمول کرسی پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا کہ ایک عورت دکان میں داخل ہوئی اُسے دیکھ کر میں جھٹ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جی میں خیال کیا کہ شاید دعا قبول ہوگئی۔ "آئیے تشریف رکھئے" کہہ کر میں نے اُسے دوسری کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ عورت نے کرسی پر بیٹھ کر کہا "ڈاکٹر صاحب میرے ایک دانت میں کل صبح سے سخت درد ہو رہا ہے" میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ "آخر مریض آ ہی پہنچا" قریب تھا کہ یہ فقرہ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل جاتا مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑی نرمی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ایک دو مختلف سوالات اُس سے پوچھے اور پھر اُس کے دانتوں کا امتحان شروع کیا۔ ایک دو منٹ تک دانتوں کو بغور دیکھا اور ہر طرح سے اپنی تسلی کر لینے کے بعد میں نے اپنا آخری فیصلہ دیدیا۔ "یہ دانت تو آپ کو نکلوانا ہی پڑے گا" "اگر آپ مناسب خیال کرتے ہیں تو نکال دیجئے مجھے بے حد تکلیف ہو رہی ہے" عورت نے درد کی شدت سے بیتاب ہو کر رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

اُس کے رضامند ہو جانے پر میں نے اپنا زنگ آلود زنبور نکالا اور اُسے اچھی طرح صاف کرنے کے بعد کوٹ اُتارا قمیص کی آستینیں چڑھا دانت اُکھیڑنے کے لئے مستعد ہو گیا، اور ایک ہی جھٹکے میں دانت نکال کر رکھ دیا۔ کچھ دیر تک تو عورت دم بخود بیٹھی رہی۔ اِس کے بعد ہاتھ کی ایک اُنگلی سے دانتوں کو ٹٹولتے ہوئے اُس نے ایک چیخ ماری اور تڑپ کر کہا "آپ نے...... غلط... دانت ... نکال دیا...." میں گھبرا گیا مگر اپنی گھبراہٹ کو بصد دقت چھپاتے ہوئے کہا "یہی دانت تو آپ نے بتایا تھا" عورت نے اپنے ہونٹوں سے خون پونچھ کر اور اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "نہیں جی میں نے تو یہ دانت بتایا تھا" اِس پر میں نے دوبارہ اُس کے دانتوں کا امتحان کیا اور دس پندرہ

منٹ تک بغور دیکھنے کے بعد زنبور کو صاف کرکے ایک دانت پر رکھا اور اُس سے پوچھا "یہی دانت ہے نا؟" عورت نے سر کو ہلاتے ہوئے کہا "ہاں یہی"

میں نے بسم اللہ کہہ کر دوسرا دانت بھی ایک ہی جھٹکے سے نکال کر باہر رکھ دیا۔ اکرام میری حیرت اور غصے کی کوئی انتہا نہ تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے ایک بھی غلط دانت ہی نکالا۔ عورت درد کی شدت سے بیہوش ہوگئی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ تو دیر تک اپنی کرسی پر بیٹھی "ہائے ہائے" کرتی رہی اور میں اپنی کرسی پر سر جھکائے یہ سوچتا رہا کہ پھر کوشش کرنی چاہئیے یا نہیں۔

بھائی اس سے زیادہ میں تمہیں اس دانتوں والے حادثہ کے متعلق اور کچھ نہیں بتانا چاہتا کہ اس روز عورت کے چلے جانے کے بعد میری میز پر شام تک تین یا چار دانت پڑے رہے اور میں سارا دن کرسی پر بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ آیا اصلی درد والا دانت بھی ان دانتوں میں موجود ہے یا نہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن سے میری دکان پر مریض آنے شروع ہوگئے اور میں جی ہی جی میں خوشیاں منانے لگا کہ آخر میری محنت اور میرا انتظار رائگان نہیں گیا۔ ہر روز صبح آٹھ بجے سے دس گیارہ بجے تک کان آنکھ اور ناک کے بیسیوں مریض آتے جن کا علاج میں بڑی دیانتداری اور محنت کے ساتھ کیا کرتا۔ رفتہ رفتہ شہر کے ایک خاصے بڑے حصے میں میری شہرت ہوگئی اور امیرا کدل کے علاقے میں میں بھی کامیاب ڈاکٹروں میں شمار ہونے لگا

انہی ایام میں میرے پاس ایک پانچ چھ سال کے بچے کو لایا گیا جس کے حلق میں ایک سکہ پھنسا ہوا تھا۔ بچے کے ساتھ اس کے والدین اس کے بھائی اور بہنیں اور اور بہت سا ہجوم تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بچے کے حلق میں سکہ کوئی آٹھ گھنٹے سے اٹکا ہوا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ سکہ کس قسم کا ہے۔ بچے کے باپ کا خیال تھا کہ پائی ہے۔ اس کی ایک بہن کہتی تھی کہ دھیلا ہے مگر اس کی ماں کو شک تھا کہ پیسہ ہے۔ میں نے اس کے حلق کا اندر اور باہر سے امتحان کیا کوئی سخت چیز جو ٹٹولنے سے واقعی سکہ معلوم ہوتی تھی اس میں پھنسی ہوئی تھی۔ بچے کی حالت بہت ردی ہو رہی تھی اور وہ بالکل بے ہوش تھا۔ اس کا گلا اندر اور باہر دونوں طرف سے سوجا ہوا تھا۔ اور وہ بڑی دقت کے ساتھ رُک رُک کر سانس لے رہا تھا۔ اکرام میں بظاہر تو تمام باتیں دیکھنے میں ہمہ تن محو تھا مگر دراصل جی میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ پائی، یا دھیلا، یا پیسہ، یا جو کچھ بھی حلق میں پھنسا ہوا ہے کیسے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا میں نے اپنے کالج کے زمانے میں کبھی ایسی تکلیف یا اس کا علاج نہیں پڑھا تھا۔ بڑے غور اور سوچ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس سکے کو حلق سے باہر نکالنا چاہئیے۔

بچے کو میز پر لٹاکر میں نے سب لوگوں کو اِردگرد سے ہٹادیا اور تاکید کردی کہ کوئی شخص بھی دکان کے اندر نہ رہے
اِس کے بعد اپنے اوزاروں میں سے ایک لمبی مگر پتلی سی چمٹی نکال کر بڑی احتیاط اور آہستگی کے ساتھ اُسے حلق میں داخل
کیا، اور کچھ دیر تک سِکّے کو اُس کی جگہ سے اِدھر اُدھر ہلانے کی کوشش کرتا رہا ۔ مگر سِکّہ کمبخت کچھ اِس طرح پھنسا ہوا تھا
کہ کئی بار زور لگانے پر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا ۔ پورے ایک گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ سِکّہ کسی
طرح سے بھی باہر نہیں نکالا جاسکتا لہذا اِسے حلق سے نیچے اُتارنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے
سِکّے کو اندر کی طرف اُتارنے کی تیاری کی ۔ پہلے تو میں اُسے چمٹی کے ساتھ آہستہ آہستہ اندر کی طرف کو دھکیلتا رہا مگر جب
وہ کسی طرح سے بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا تو پھر میں نے زیادہ زور لگانا شروع کیا ۔ آخر خاصی جدوجہد کے بعد سِکّہ ذرا سا ہلا اور اپنی
جگہ سے کوئی ایک انچ کا چوتھا حصّہ نیچے چلا گیا ۔ مگر اِس جگہ پہنچ کر وہ پھر بُری طرح پھنس گیا ۔ خیر جوں توں کرکے اُسے وہاں سے ہلایا
اور وہ تھوڑا سا اور نیچے اُترا ۔ اِس جگہ سے اُس کا اندر پھینک دینا نہایت آسان تھا چنانچہ میں نے اُسے آخری بار دھکیلا اور اب کے وہ
نہایت آسانی سے نیچے اُتر گیا ۔ بچّے نے اپنے سر کو پہلے تو ذرا سا ہلایا اور پھر کھانستے ہوئے اپنے ہاتھ اور پاؤں کو یکبارگی زور زور سے
اِدھر اُدھر مارنا شروع کیا ۔ اُس کے اِس طرح یکایک ہلنے سے میرے ہاتھ میں سے چمٹی کا وہ سرا جسے میں اپنی انگلیوں سے تھامے ہوئے
تھا چھوٹ گیا ۔ میں نے فوراً ایک ہاتھ سے بچے کے ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیا تاکہ اُسے زیادہ ہلنے نہ دوں اور دوسرا ہاتھ اُسکے مُنہ میں چمٹی
کے سرے کے لئے ڈالا مگر میں بہت حیران ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ چمٹی حلق میں پھنس گئی ہے ۔ پہلے تو میں اِسے ایک نہایت معمولی
بات سمجھا اور بڑی احتیاط سے اُسکے سرے کو پکڑ کر باہر کھینچنا چاہا مگر اچھا خاصا زور لگانے پر بھی چمٹی باہر نہ نکلی تو مجھے بڑی تشویش پیدا ہوئی
اور میں سخت گھبرا گیا کہ یا الٰہی یہ کیا مصیبت پڑ گئی ۔ دو چار منٹ تک تو میں پریشانی کی حالت میں دم بخود کھڑا رہا مگر اسکے بعد اپنے
آپ کو سنبھالا اور چمٹی کو باہر نکالنے کی تجویز کرنے لگا ۔ پہلے چمٹی کے سرے کو انگلیوں میں دبا کر باہر کو کھینچا پھر ایک دوسری چمٹی کے ساتھ
اُسے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر بے سود ۔ چمٹی اپنی جگہ سے نہ ہلی ۔

اکرام بھائی! اسکے بعد میں پورے ایک گھنٹے تک چمٹی کو باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہا ۔ باقی چمٹیوں کو باری باری سے استعمال کیا
اِس کے علاوہ دوسرے اوزاروں سے بھی اُسے باہر کھینچا یہاں تک کہ چھوٹے بڑے زنبوروں کو بھی کام میں لایا مگر چمٹی باہر نہ نکل سکی
اِس اثنا میں ایک بار یہ خیال بھی جی میں آیا کہ کیوں نہ اسے سکّے ہی کی طرح اندر کی طرف کو دھکیلنے کی کوشش کروں ۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ
اِس سے زیادہ اور حماقت ہو نہیں سکتی ۔ غرضکہ ہر ممکن کوشش کے بعد میں نے بچے کی نبض اور اُسکے دل کی حرکت کو دیکھا ۔ میرا اپنا دل دھک
گیا ۔ کیونکہ نبض وغیرہ کے دیکھنے سے مجھے یقین ہوگیا کہ بچہ کوئی دم کا مہمان ہے ۔ اِس بے بسی کے عالم میں سراسیمہ کھڑا بچے کی طرف
دیکھ رہا تھا کہ بچے کا باپ گھبرایا ہوا داخل ہوا ۔ میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ سکّہ نکالنے سے پہلے میں نے تمام لوگوں کو دکان سے باہر

نکال دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ کوئی شخص بھی اندر نہ آئے) اُسے دیکھکر میرے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے اور قریب تھا کہ میں اُسے صاف صاف کہہ دیتا کہ تمہارا بچہ نزع کی حالت میں ہے اور اُس کی جان میں نے لی ہے۔ مگر اُس نے نہایت آہستگی سے پوچھا، "ڈاکٹر صاحب سکّہ نکلا ہے یا نہیں؟" سِکّے کا لفظ سنتے ہی فوراً جی میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے کہہ دوں کہ سکّہ ابھی نہیں نکلا۔ "نہیں صاحب میں نے تو اپنی طرف سے ہزار کوشش کی ہے مگر سکّہ ابھی تک نہیں نکلا۔" اور اس فقرے کے ایک منٹ بعد میں نے گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے پھر کہا، "آپ کو یقین ہے کہ بچے کے حلق میں سکہ ہی پھنسا ہوا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ تو کوئی ..... لمبی ..... سی چیز ہے ..... چم ......" مگر یہاں پہنچ کر میں یکایک رُک گیا۔ بچے کا باپ ایک عجیب مایوسانہ انداز میں بچے کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا "اب کیا کیا جائے"، اُس نے گھبرا کر پوچھا۔ "میرے خیال میں تو آپ اِسے فوراً سٹیٹ ہسپتال میں لے جائیں۔ شاید وہاں کسی طریقے سے سکّہ ..... یا جو چیز بھی حلق میں پھنسی ہوئی ہے نکل سکے ..... مگر جلدی کیجئے بچے کی حالت بہت ردی ہو رہی ہے۔"

دوسرے دن میں نے سُنا کہ بچہ بچ گیا ہے اور ہسپتال کے ایک ڈاکٹر نے ایک "بہت لمبی چمٹی" نکالی ہے جو بارہ تیرہ گھنٹے سے بچے کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔

اکرام خط بہت طویل ہو گیا ہے اس لئے میں صرف ایک اور واقعہ اپنی کشمیر کی طبابت کے متعلق تحریر کرتا ہوں اس کے بعد ان شاء اللہ اپنے دوسرے خط میں مزید حالات قلمبند کروں گا۔ اِس واقعہ کی تفصیل لکھنے سے پیشتر میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہی واقعہ کشمیر سے میرے چلے آنے کا باعث ہوا اور جس روز یہ پیش آیا اُس کے دوسرے یا تیسرے ہی دن مجھے بستر بوریا اُٹھا کر سری نگر سے پنجاب کی طرف بھاگنا پڑا۔

متذکرہ بالا واقعہ کے کوئی ایک ماہ بعد مجھے رات کے وقت ایک مریض کو دیکھنے کے لئے مہاراج گنج بلوایا گیا۔ مہاراج گنج میرے مکان سے آدھ میل کے فاصلہ پر شہر کا سب سے زیادہ گنجان اور بارونق علاقہ ہے۔ اور اُن دنوں اُس علاقے میں ہیضے کا بہت زور تھا۔ یوں تو میری دکان پر اب اچھے خاصے مریض آنے شروع ہو گئے تھے مگر مجھے ابھی تک مریض کو اُس کے مکان پر جا کر دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اب چونکہ مجھے مکان پر بلایا گیا تھا میں بہت خوش تھا۔ اُس شخص کے ہمراہ جو مجھے بلانے کے لئے آیا میں کوئی دس منٹ میں مریض کے مکان پر جا پہنچا۔ مریض کا باپ گھر کی ڈیوڑھی میں میرا انتظار کر رہا تھا اور وہ مجھے فوراً مریض کے کمرے میں لے گیا۔

میرا مریض اٹھائیس تیس سال کی عمر کا نوجوان کمرے کے ایک کونے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا میں نے جاتے ہی اُس کا حال دریافت کرنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ تقریباً چار دن سے اُس بیچارے کا بول و براز رکا ہوا ہے۔ دو تین روز سے وہ کسی حکیم کا علاج کرا

رہے تھے مگر اُس کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ میں نے مریض کی نبض اُسکے دل کی حرکت اور اُسکے پیٹ وغیرہ کا خوب معائنہ کیا اور کامل ایک گھنٹہ تک دیکھنے کے بعد مریض اور اُسکے باپ کو بہت سی تسلیاں دیتے ہوئے نسخہ لکھا اور پھر چند ایک ضروری ہدایات دے کر کہا۔ "کوئی فکر کی بات نہیں میری دوا کے استعمال سے انشاءاللہ ایک آدھ گھنٹہ میں تکلیف رفع ہو جائے گی" اِس کے بعد مزید تاکید کرکے اور اپنی فیس جیب میں ڈال کر ـــ میں اپنے گھر واپس چلا آیا۔

دوسرے دن صبح کے وقت آدمی آیا اور معلوم ہوا کہ مریض کی حالت بدستور ہے اور میری دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا میں نے نسخہ تبدیل کر دیا اور دوسری دوا بنا کر بھیج دی۔

شام کے قریب وہی پھر آیا اور مجھے بلا کر مکان پر لے گیا۔ مریض کی حالت پہلے کی بہ نسبت زیادہ خراب تھی۔ میں نے نسخے میں پھر تبدیلی کی اور واپس آکر دکان سے اسے بھی بھجوا دیا۔

غرضکہ دو تین روز میں مجھے چار پانچ مرتبہ مریض کے مکان پر بلایا گیا، لیکن میرے علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ مریض کی حالت زیادہ ردی ہوتی چلی گئی۔ آخری بار مجھے جو آدمی بلانے آیا اُس نے آتے ہی کہا کہ مریض بہت ہی بُری حالت میں ہے آپ جلد آئیں۔ میں تانگے میں سوار ہو کر فوراً وہاں پہنچا ـــ مریض نزع کی حالت میں دم توڑ رہا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا میں نے اُس کی نبض اپنے ہاتھ میں لے کر دل کی حرکت کو دیکھنا شروع کیا ـــــ دس پندرہ منٹ کی خاموشی کے بعد میں مریض کی چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہو گیا اور نہایت آہستگی سے کہا "خدا کو یہی منظور تھا"، یہ کہہ کر میں مکان سے باہر چلا آیا۔ گھر والوں کی چیخوں اور رونے کی آوازوں سے محلے بھر میں ایک کہرام مچ گیا۔

دوسرے یا تیسرے روز میں نے سری نگر کے ایک اخبار کے پہلے ہی صفحہ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا دیکھا :-

سری نگر میں مردہ زندہ ہو گیا

اور اِس سُرخی کے نیچے یہ خبر درج تھی :-

اشاعتِ دیروزہ میں ہم خواجہ عبدالباقی صاحب رئیس مہاراج گنج کے بڑے صاحبزادے خواجہ معین الدین کی بے وقت موت کی اندوہناک خبر درج کر چکے ہیں۔ کل شام کے وقت جب مرحوم کے جنازہ کو درگجن کے قبرستان میں پیوندِ خاک کیا جا رہا تھا ایک حیرت انگیز واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ عین اُس وقت جب لحد کے دہانے کو بند کرکے مٹی دینے لگے لحد کے اندر سے ایک دہشت ناک چیخ کی آواز سُنائی دی جسے سُنکر دفن کرنے والے اِس قدر ڈرے کہ قبر کو اُسی حالت میں چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے مگر خواجہ عبدالباقی صاحب اور اُن کے ایک اور عزیز فوراً قبر میں کود پڑے اور اُنہوں نے جلدی سے دہانے کی

کچھ اینٹیں ہٹا کر لحد کے اندر جھانکا۔ نعش بائیں جانب کروٹ بدل چکی تھی۔ لحد کی باقی ماندہ اینٹیں اکھیڑ کر نعش کو قبر سے باہر نکالا گیا اور دل کی حرکت کو دیکھا گیا۔ دل بالکل بے حس تھا مگر زرد چہرے پر ایک بہت ہی خفیف سی سُرخی کی جھلک موجود تھی ایک دو سمجھدار بزرگوں کی تجویز پر نعش کو اسی وقت مشن ہسپتال میں (جو درگجن کے قبرستان کے قریب ہی واقعہ ہے) پہنچایا گیا اور ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے نعش کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر موصوف نے پوسٹ مارٹم امتحان کے بعد مفصلہ ذیل حالات ہمارے پاس بغرضِ اشاعت ارسال کئے ہیں:۔

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ معین الدین مرحوم تقریباً آٹھ دس روز سے انتڑیوں کی خرابی کی وجہ سے بیمار تھے۔ وفات سے کوئی چار روز پہلے اُن کا پیشاب وغیرہ بالکل رُکا ہوا تھا۔ اپنی بیماری کے زمانہ میں پہلے تو وہ کسی حکیم کے زیرِ علاج رہے مگر بعد میں امیر کدل کے ڈاکٹر ..... صاحب اُن کا علاج کرتے رہے۔ اُن کے علاج سے مرحوم کی تکلیف اور زیادہ ہوتی چلی گئی۔ اور وفات سے دو دن پہلے سے وہ بالکل بیہوش تھے۔ اُن کا دل بیماری سے پہلے بھی کچھ کمزور تھا اور بیہوشی کے دنوں میں اُن کے دل کی حرکت اسقدر خفیف تھی کہ ڈاکٹر ..... صاحب نے آخری دن اپنا اطمینان کرنے کے بغیر ہی یہ سمجھ لیا کہ مریض مر چکا ہے۔ حالانکہ وہ زندہ تھا اور اگر اُسے زندہ دفن نہ کر دیا جاتا تو میرے خیال میں وہ ضرور جانبر ہو جاتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مرحوم کو لحد میں رکھکر لحد کا دہانہ بند کیا جا رہا تھا اُنہیں قبر کے اندر ہی پیشاب آگیا اور پیشاب آنے سے وہ ہوش میں آگئے۔ اُنہوں نے کروٹ بھی بدلی۔ مگر قبر کی تاریکی اور ہوا کی کمی سے اُن کا دم رُک گیا اچانک ڈر جانے سے اُن کے دل کی حرکت بالکل بند ہو گئی اور وہ لحد کے اندر ہی جاں بحق ہو گئے۔"

لطیف الرحمن

کب تک یہ جنونِ خود پرستی کب تک
یہ شورِ خودی یہ جوشِ مستی کب تک

ہستی پہ گھمنڈ کرنے والے کچھ سوچ
ہستی ہی پہ غرّہ ہے تو ہستی کب تک

آزاد

شاعر کی جھیل

(۱)

شورش سے یکسر آزاد　رحمت کے گہواروں میں
زہریلے کانٹوں سے پاک　فردوسی گلزاروں میں
تاریکی سے کوسوں دور　فطرت کے انواروں میں
برفانی دنیا کے پاس　باعظمت کہساروں میں

زرّیں موجوں سے لبریز
چاندی سے پانی کی جھیل

(۲)

منزل طے کر لینے پر　تارے جب تھک جاتے ہیں
گردوں کے ویرانے سے　زرّیں جھیل پہ آتے ہیں
لمبے لمبے غوطے مار　ہنستے ہیں اور گاتے ہیں
ہوتا ہے پھر غسلِ نور　رات کی عید مناتے ہیں

فردوسی چشموں کی موج
روشن سیّاروں کی جھیل

(۳)

تاروں کے جانے کے بعد　حوریں آیا کرتی ہیں
فردوسی پھولوں کے ہار　ہر شب لایا کرتی ہیں
غسلِ نور سے ہو کر پاک　نغمے گایا کرتی ہیں
پھولوں کو بوسے دیکر　واپس جایا کرتی ہیں

معصومی کی بزمِ راز
حوروں کی فردوسی جھیل

(۴)

دیکھ کر اک پاکیزہ خواب!　شاعر جھیل پہ آتا ہے
موجیں سجدے کرتی ہیں　جب، وہ نغمے گاتا ہے
پھر وہ سب فردوسی پھول　جھولی میں بھر لاتا ہے
ان پھولوں کو پگلا کر!　رنگیں شعر بناتا ہے

الہامی نغموں کا ساز
فطرت کے شاعر کی جھیل

روش صدیقی

انگریزی زبان کا ایک ہندوستانی شاعر

اسی بدنصیب ہندوستان میں جس کی بستیوں پر غلامی ایک کالی گھٹا بن کر چھا رہی ہے ایسے ایسے دلیر و آزاد خیال انسان آباد ہیں کہ بڑی بڑی لڑائیاں لڑنے والے اپنے علم و فن پر ناز کرنے والے ملکوں کو اُن کی تیزیٔ طبع اور اُن کی فہم و ذکاوت پر بے اختیار رشک آجائے!

گاندھی اور ٹیگور اور بوس تو ایک عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن ان بزرگوں کے علاوہ آج ہندی نوجوانوں کے زمرے میں بیسیوں ایسے افراد ہیں جن کی ذکاوت ایک دن دنیا بھر میں سونے چاندی کی طرح چمکے گی! ان میں ایک شخص ہرندر ناتھ چٹو پادھیا ہے!

مسٹر چٹو پادھیا مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی ہیں۔ مسز نائیڈو ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں علاوہ اپنی سیاسی قابلیت کے اپنی انگریزی شاعری کے باعث کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں مگر توقع ہے کہ اُن کے بھائی شاعری کے میدان میں یقیناً اُن سے سبقت لے جائیں گے! جس بھارت ماتا کے گھر میں ایسے ایسے بہن بھائی موجود ہیں اُسے کوئی کب تک طاقت کے قید خانے میں غلامی کی زنجیروں سے جکڑے رکھے گا؟ یہ قیدی قید کرنے والے کی زبان ہی میں وہ باتیں کر رہے ہیں جو زمین و آسمان کو جنبش میں لادیں پھر کب تک ممکن ہے کہ قید کرنے والے کا وجود ہی اس زبردست زلزلے سے محفوظ رہے؟

مسٹر چٹو پادھیا جو ابھی بالکل نوعمر ہیں اپنے بچپن ہی سے ایک شاعر مزاج آدمی تھے اور اُن کے والد نے یہ دیکھ کر کہ میرے بیٹے کی فطرت راگ اور شعر میں بے اختیار اپنا اظہار ڈھونڈ رہی ہے اُنہیں رسمی حصول تعلیم کے ظلم و ستم سے بچا لیا اور اپنے سایۂ عاطفت کے اندر اپنی رہنمائی میں اُن کو آزاد چھوڑ دیا کہ جس طرح اُن کی طبیعت شگفتہ ہونا چاہے ہوا کرے اوائل عمر ہی سے اُن کی خواہش رہی کہ وہ ہندوستان میں ایک اعلےٰ درجہ کا تھیئٹر قائم کریں اور یہاں کے ناٹک کو عام خاک و خاشاک سے پاک کر کے اُسے اُس بلند سطح پر پہنچا دیں جہاں تفریح طبع قومی و انفرادی نشو و نما کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس غرض سے اُنہوں نے ۱۹۱۹ء میں یورپ کا سفر کیا۔ ۱۹۱۸ء میں اُن کی نظموں کی پہلی کتاب شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھی۔ اب کیمبرج کے انگریزی جامعہ نے اُن کی قابلیت و شخصیت کی داد دے کر اُن کی ہمت بڑھائی۔ اس کے بعد اک مدت اُنہوں نے یورپ کے برِ اعظم میں سیر و سفر کرنے میں گذاری اور اس سفر میں بہت سے شہرۂ آفاق مصنفین سے اُن کا دوستانہ تعارف ہوا۔

۱۹۲۲ء میں واپس آکر انہوں نے تھیٹر کی اصلاح و ترقی کا کام اپنے ذمے لیا۔ اس دشوار و اہم کام میں اُن کی قابل و حساس رفیقِ زندگی اُن کے منصوبے کی روح و رواں بن گئی۔ جن لوگوں کو ان فہیم و شریف خاتون سے تعارف کی عزت حاصل ہے وہ جان سکتے ہیں کہ علم و ترقی کی روشنی کیونکر اس گھرانے سے نکل کر ہندوستان کی بعض تاریکیوں میں پھیلنے والی ہے۔
کملا دیوی صاحبہ اس وقت تعلیمی انجمن نسوانِ ہند کی سیکرٹری ہیں اور اپنے وطن کی تعلیمی ترقی کی غرض سے چند ماہ سے سارے ہندوستان کا اپنے صرف پر دورہ کر رہی ہیں۔ لاہور میں اُن کے دورانِ قیام میں اُن کی فصاحت و بلاغت اور اُن کی شرافت و بے تعصبی نے ہزاروں کے دل موہ لئے۔

مسٹر چٹو پادھیا کی نظموں کا ایک مجموعہ Poems & Plays حال ہی میں مدراس میں Hogarth Press سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ جس میں صفحے صفحے پر اچھوتے اور نازک خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تعریف لاحاصل ہے۔ فاؤلر رائٹ حال کا ایک انگریزی شاعر لکھتا ہے کہ مسٹر چٹو پادھیا نے انگریزی شاعری کو فروغ دینے میں جو بیش بہا کام کیا ہے وہ کسی اور غیر انگریزی شاعر نے نہیں کیا۔ مشتے نمونہ از خروارے ہم اُن کے منظوم کلام کے چند ٹکڑے نثر میں پیش کرتے ہیں۔

اس لئے کہ

اس لئے کہ میں نے ایک ایسا کام کر دیا جو ایک انسان کو نہ کرنا چاہیئے تھا۔ ایک تاریک بادل آیا اور اپنے سائے کے ساتھ زندگی بخشنے والے سُورج کے اوپر چھا گیا۔ کئی دنوں لگاتار کئی دنوں مینہ آسمان سے موسلا دھار برسا کیا۔ بجلی چمکا کی بادل گرجا کیا۔ کسانوں نے زمین کو اپنا رونا روتے سُنا کہ اب کی تو قحط نے مجھے دبا لیا۔ ان آسمان کے پانیوں نے میرا دانہ دُنکا برباد کر دیا پھر کسانوں کے جھونپڑے ایک ایک کر کے مٹی میں مٹی ہوتے چلے۔ دُنیا بیواؤں کی سرزمین ہو گئی۔ بچے مارے بھوک کے سسک سسک کر بلبلانے۔ عورتوں نے تھوڑے سے سونے چاندی کے لئے اپنے جسم بیچ ڈالے کہ ان ننھوں کی خوراک کا سامان ہو جائے روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کے لئے انسانیت ماری ماری پھرنے لگی۔ لال لال قحط لاکھوں زرد رُو مُردوں پر گذر اوقات کرنے لگا اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ میں نے خُدا کی بے شمار حدوں میں سے ایک حد کو توڑ دیا۔

کائنات

میں تجھے جانتا تھا دُنیا کے شروع ہونے سے پہلے بہت پہلے۔ اُس سے پہلے کہ پُرزور تخلیقی جذبۂ خداوندی مٹی میں دوڑ پڑا اور اس کے خموش و زرد بطون میں سے اُس نے تجھے ایک عورت اور مجھے ایک مرد بنا دیا۔

ابھی جیسا کہ آسمان اپنے تاروں سے خالی تھا اُس سے پہلے کہ پہلی بہار سُرخ سرور نشاط بن کر پھوٹ نکلی! اُس سے پہلے کہ پہلا پتّا زمین پر نکل آیا اے قائم و دائم محبت کی دیوی میں نے اپنے سراپا میں تیری پیدائش محسوس کی!

تیری آنکھیں شام کی روشنی سے زیادہ نرم و نازک، تیری پیشانی ایک پہاڑ کی بلندی سے زیادہ خاموش و مطمئن، تیرے زُلف و گیسو اندھیری راتوں سے زیادہ تاریک یہ سب اُس سے پہلے کہ دنیا پیدا ہوئی میری نگاہوں کے سامنے تھے!

اور اس سہیں ساعت میں جب ہم ایک دوسرے سے ہمکنار ہوئے اُس زمانے سے پہلے جب زمانے کا وجود نہ تھا پانی اور ہوا راگ اور آگ اور پھر ایک عظیم الشان سنہری اور نیلگوں دنیا میں جھلک اُٹھے!

زمانہ ایک دریا کی مانند گھڑیوں کی لہریں بن بن کر موج زن ہوا۔ پیاری پیاری رنگینیاں پھولوں میں آنکھ مچولی کھیلنے لگیں اور گہرے نیلے رنگ کے مور ہلکی ہلکی ننھی پھواریں چھم چھم کرنے لگے اور جا بجا عجیب و غریب محل اور عجیب و غریب بُرج ظہور میں آگئے۔ جب ہم دو ذرّے ایک دوسرے سے متصل ہوئے اور پیار کرنے لگے اور اس پیار میں بے اختیار گیت گانے لگ گئے تو جنگل کے جنگل خزاں کا ارغوانی غرور بن کر پھوٹ نکلے ہرن اپنی مست آنکھوں کے ساتھ تاریکی میں سے کود پڑا اور حُسن اپنے پُر راز غار میں چھپ رہنا بھول گیا!

سُرخیوں کا میلہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک سُرخیوں کا میلہ ہوا جس میں تمام زمین و آسمان کی سُرخیاں آئیں۔ ایک نرم و نازک گلنار کی خوشبودار سُرخی، شعلۂ مرگ کی پُر راز سُرخی، ایک خرگوش کی آنکھوں کی اُداس سُرخی، ایک شام و شفق سے رنگیں شدہ چوٹی کی سُرخی ایک ننھے بچے کے گالوں کی جیتی جاگتی پیاری سُرخی، ایک طوطے کی چونچ کی سخت گہری سُرخی، ایک جنگلی پھل کی گرم سُرخی، فاختہ کی پتلیوں کی سُرخی، کسی محبت کرنے والے دل کی تن تنہا سُرخی ——— لیکن جب سُرخیوں کا میلہ شروع ہوا تو ایک سُرخی باہر کھڑی تھی برادری سے خارج، یہ تھی انسان کے غصّے کی سُرخی!

(ب)

محفلِ ادب

بہاری لال کا بیانِ حُسن

بہاری لال، ہندی زبان کے اُن نہایت بلند پایہ شاعروں میں سے ہے، جن کی زبان قدرتی اور منجھی ہوئی، سلیس اور بانکی اور دیکھنے میں بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی جذبات کی گہرائی میں اتھاہ ہے۔

بہاری کی شاعری کا ہر ایک دوہا ایک خوبصورت کھینچی ہوئی زندگی سے بھری ہوئی اور بولتی چالتی تصویر ہے جس کے ایک ایک خط کے کھینچنے اور پھر اُس میں پُرکیف رنگ بھرنے میں شاعر نے اپنے حیرت آفرین کمال کا ثبوت دیا ہے۔ شاعر کی قوتِ متخیلہ جتنی باریک بین نکتہ رس ہے، اُتنی ہی وسیع بھی ہے۔ اس مضمون میں ہم اردو پڑھنے والوں کو بہاری کی حسن نگاری سے واقف کرانا چاہتے ہیں۔

خوبصورتی اندرونی ہو یا بیرونی، مگر وہ الفاظ کی قید و بند میں نہیں آسکتی وہ سب بندشوں سے آزاد اور بیان کے احاطے سے پرے ہے۔ اُس کا بیان یہی ہے کہ اسے بتایا نہیں جاسکتا۔ ہم اپنے الفاظ کے ذریعہ سے خاکا کھینچ سکتے ہیں، رنگوں کو بھر سکتے ہیں، مگر وہ حیرت انگیز، ہر پل میں نئی، موہ لینے والی قوت کے ذریعہ سے کھینچنے والا حسن تو دل کے جذبات میں آسمان کی آخری چمکتی ہوئی لکیر کی طرح صرف اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے، مگر قابو میں نہیں آتا اور وہ گرفت میں تو تب آتا جب کہ کوئی اُسے پورے طور پر دیکھ سکتا۔ آخر کار پورے طور پر تحلیل کر کے بھی کوئی بتا سکتا ہے کہ حسن کیا چیز ہے۔ بہاری کہتا ہے کہ

سمے سمے سندر سبے روپ کروپ نہ کوے

من کی رچی جیتی جتے، تت تتی رچی ہوے

کیا بات کہی ہے، سمے سمے پر سب چیزیں سندر ہیں۔ دنیا میں سروپ (خوبصورت) اور کروپ (بدصورت) کوئی شے نہیں ہے، جدھر من کی جتنی رغبت اور جھکاؤ ہوتا ہے، وہ اتنا ہی حسین معلوم ہوتا ہے۔ آج جسے ہم کروپ کہہ رہے ہیں، کوئی وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ ہمیں وہی چیز سروپ معلوم ہونے لگتی ہے جس شے کو ہم کبھی بھی ایک آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے آج گھنٹوں آنکھیں جما جما کر دیکھتے ہیں تو بھی اس سے ہمیں سیری نہیں ہوتی۔ تو پھر سندرتا (حسن) معلوم کیسے ہوتی ہے اور کس مقدار میں؟ اس کا جواب بہاری نے دوسرے مصرع میں دیا ہے کہ جدھر من کا جتنا جھکاؤ ہوتا ہے۔ یہاں جتنا کا مطلب ہے جتنا زیادہ۔ یعنی ہمارا دل جس چیز کی طرف جتنا زیادہ جھکتا ہے اُتنی ہی وہ شے ہمیں حسین معلوم ہوتی ہے

ہندی شاعری میں حسن کی جن تصویروں کو کھینچا گیا ہے اُن میں انسانی حسن ہی سب سے زیادہ ممتاز پایا جاتا ہے اور اُس میں بھی خصوصیت کے ساتھ نسوانی حسن ۔ کیونکہ اس شاعری میں خدا بھی انسان ہی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس لئے اس کے رہنے سہنے کو خوب بھگتی بھرے چاؤ سے بیان کیا گیا ہے، اس کے نکھ سکھ کا بیان بھی کچھ نرالا نہیں، کیونکہ اُس کے ساتھ رادھا وغیرہ کا بیان بھی آجاتا ہے۔ بہاری لال نے جو حسن نگاری کی ہے وہ بھی انسانی حسن پر مبنی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اُس نے اپنی گہری باتیں اس طرح لکھی ہیں کہ وہ دوسرے موقعوں پر بھی ہو بہو صادق آجاتی ہیں یہ اُس کے کہنے کا مخصوص سلیقہ ہے، چونکہ وہ انسان ہے اس لئے اکثر اُس کا خیال انسان ہی کی طرف زیادہ جاتا ہے۔ نہ صرف ہندی زبان میں بلکہ دنیا کی تمام زبانوں میں جہاں جہاں حسن کا بیان کیا گیا ہے، وہاں انسانی حسن ہی مسند صدر پر نظر آتا ہے اور اُس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انسان کا دل قدرتاً انسان ہی کی طرف کھنچتا ہے اور اسی سے اُس کا زیادہ تعلق رہتا ہے۔ انسانی حسن نے اپنے سامنے انسانی کائنات کے تمام حسنوں کو پھیکا کر دیا ہے۔ اگر مظاہر قدرت اپنے جذبات کے اظہار کی طاقت رکھتے تو وہ بتا سکتے کہ انسانی حسن کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔ یہ کہنے سے ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہندی میں کسی دوسری شے کے حسن کو کمال خوبی سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ ہندی میں انسانی حسن کا بیان بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

اب ہم بہاری لال کی شاعری کے تھوڑے سے نمونے پیش کرتے ہیں:۔

لال تمہارے روپ کی اہو ریت یہ کون
جاسوں لاگت پلکو درگ لاگت پلک پلون

اے پیارے تیرے حسن کی وہ کون سی انوکھی ادا ہے، وہ کونسا عجیب انداز ہے کہ جس کی بدولت تیرے روپ سے آنکھوں کے ایک پل بھر لگتے ہی پھر ایک پل کے لئے پلکیں نہیں لگتیں، یعنی نہیں جھپکتیں اور کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

روپ سدھا آسو چھکیو، آسو پیت بنیں
پیالیں اوٹھ پریا بدن، رہیو لگائے نین

حسن کی امرت سے بھری ہوئی شراب سے وہ اس طرح چھک گیا ہے، اس طرح مست ہو گیا ہے کہ اب اس سے شراب پیتے ہی نہیں بنتی۔ پیالے سے ہونٹھ لگے ہوئے ہیں، لیکن آنکھیں پیاری کے بدن کے ساتھ لگی رہ گئی ہیں۔

لینے ہوں ساہس سہس کینے جتن ہزار
لوئن لوئن سندہ تن، پیری نہ پاوت پار

بیچاری آنکھیں ہزار ہمت کرتی ہیں، ہزار کوششیں کرتی ہیں، لیکن وہ جسم کیا ہے، ایک حسن کا سمندر ہے، آنکھیں تیر تیر کر رہ جاتی ہیں، لیکن اُس کا کنارا نہیں پاتیں، ہزار محنت اور جتن اس لئے کرنے پڑتے ہیں کہ لوگ کچھ کہنے نہ لگ جائیں، پھر ہزار کوشش اور ہمت کر کے جب آنکھیں اس سمندر میں تیرنے نکلتی ہیں تو کہیں اُس کا کنارہ ہی نہیں پاتیں، کہیں پر اُن کے پاؤں بھی نہیں ٹکتے، بس آنکھیں بیچاری تیرتی ہی تیرتی رہ جاتی ہیں

ڈر نہ ٹرے، نیند نہ پرے، ہرے نہ کال رپا کو

چھنکو چھاکی اُچھکے نہ پھری کھرو ستم چھپوی چھا کو

چھپو کا چھاک، حسن کا نشہ اور سب نشوں سے زبردست ہوتا ہے۔ اَور نشوں کو بار بار چڑھانا پڑتا ہے لیکن یہ نشہ ایک پل بھی پی لینے پر پھر اُترتا ہی نہیں، اَور نشے ڈر سے اتر جاتے ہیں، لیکن یہ کسی طرح ڈر سے بھی نہیں ٹلتا، دوسرے نشے نیند کے آجانے سے سرد ہو جاتے ہیں، لیکن حسن کا نشہ تو نیند سے بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں تو نیند ہی نہیں آتی۔ دوسری قسم کے نشے اپنا وقت پُورا ہو جانے پر خود بخود اُتر جاتے ہیں، لیکن اسے تو وقت کا پورا ہونا بھی دُور نہیں کر سکتا

اوپر جتنے دوہے لکھے گئے ہیں، اُن سب میں پڑھنے والوں نے اِس بات کو محسوس کیا ہوگا کہ ان میں جس قسم کے حسن کا بیان کیا گیا ہے، یہ وہ حسن ہے جس میں اُس کی گرفت میں نہ آنے والی گہرائی کی طرف اشارہ اور کنایہ ہے۔ اس حسن کی طرف آنکھیں بے بس ہو کر ٹکتی ہیں۔ وہاں پھسل پھسل کر بھی جمی پڑی رہتی ہیں، مگر اُس کا راز نہیں کھلتا، وہ حسن نہ تو دیکھتے ہی بنتا ہے اور نہ بے دیکھے۔ ان سب دوہوں میں حسن کی وہ چھب دکھائی گئی ہے، جو پورے طور پر بیان میں نہیں آسکتی۔ اب ہم ایسے دوہے پیش کریں گے جن میں شاعر نے حسن کو بیرونی لباس پہنا کر اُس کو مرئی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حسن کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ہمارے کہنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ حسن حقیقت میں ایک ہی چیز ہے۔ لیکن اُس کا ایک تو وہ جلوہ ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے، اور جس کی ہم تعریف بھی کرتے ہیں۔ اور دوسرا وہ ہے جو ہزار آنکھیں کھول کر دیکھنے پر بھی صاف صاف جلوہ گر نہیں ہوتا، بیان کرنے سے بھی اُس کی تصویر سامنے نہیں آتی، وہ تو پورے طور پر بیان کرنے پر بھی بے بیان ہی رہتا ہے، اُس کے دیکھنے سے جو حیرانی یا کشش وغیرہ مختلف حالتیں گذرتی ہیں، محض اُن کے بیان سے اس حسن کی بے مثالی، گہرائی، اور بوالعجبی کا علم ہوتا ہے، لیکن خود وہ حسن تو ہمیشہ پرے ہی پرے رہتا ہے۔ ؎

واہی لکھیں لوٹن لگے، کون جوت کی جوت ــــــــ جاکے تن کی چھانہ ڈھگ چھانہ سی ہوت

اُسے دیکھ کر کس دوشیزہ کی تابش آنکھوں کو اچھی لگ سکتی ہے، یعنی نہیں لگ سکتی، اُس کے آگے ساری نوجوان

عورتوں کی رونق ماند پڑ جاتی ہے اُس کو دیکھ کر؛ شاعر دوسرے مصرع میں اُس کا جواب دیتا ہے: جس کے جسم کی پرچھائیں کے سامنے چاندنی بھی چھاؤں سی ہو جاتی ہے۔

آنگ روپ آنگی درسی، آنگیں آنگ دریں ——— بھئی جو چھبی تن وسن لی، اورن سکیں سو نہ بین

اُس جسم میں کپڑوں کے مل جانے سے (کپڑوں کے اس طرح مل جانے سے کہ وہ الگ نظر نہیں آتے) جو حسن پیدا ہو گیا ہے اُسے زبان سے ادا نہیں کیا جاسکتا، ایک ایک عضو کی چمک سے کپڑا چھپ جاتا ہے، مگر کپڑوں سے جسم نہیں چھپتا کیا بات کہی ہے، کپڑا بدن کو ڈھکنے کے لئے پہنا جاتا ہے، لیکن بدن کی چمک اتنی زیادہ ہے کہ کپڑا اس میں چھپ جاتا ہے اور اعضا نہیں چھپتے، وہ تو صاف جھلملاتے ہیں۔

مانہو، سُر سرِتا دل جل، اُچھرت جگ مین ——— چمچات چنچل نین، بیچ گھونگھٹ پٹ جھین

اُس کی چنچل آنکھیں مہین اور پتلے گھونگھٹ کے اندر ایسی چمچا رہی ہیں جیسے گنگا کے شفاف پانی میں دو مچھلیاں اُچھل رہی ہوں۔

چوکا چمکنی چوندھ میں، پرتی چوندھ سی ڈیٹھ ——— نیک ہنسوں ہی بانی تجی لکھیو پرت منہ نیٹھ

سکھی! تو اپنی اس ہنسی کی عادت کو ذرا کم کردے، تیری اس عادت کی وجہ سے تیرا منہ بڑی مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ تیرے چوکے (سامنے کے دانتوں) کی چکاچوندھ میں آنکھیں چندھیا سی جاتی ہیں۔ اور تیرا منہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں ہنسی کی چمک کی چوندھ سے آنکھوں کا چوندھیا جانا اور پھر چہرے کا نظر نہ آسکنا شاعر نے کس خوبی سے کہا ہے۔

"اردو"

فریاد

یہ افسانہ نہیں سچے واقعات ہیں۔ اور جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے۔ آپ کو اس لئے سناتا ہوں کہ انصاف چاہتا ہوں۔

اُس کے آنے کا وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ۳۱ مئی اور یکم جون کی درمیانی رات تھی۔ گرمی روزوں پر تھی۔ ہوا کا نام نہ تھا ہماری کوٹھی شہر کے باہر دوسرے شہروں سے آنے والی سڑک پر واقع تھی۔ صبح کے قریباً چار بجے ہونگے کہ اُسے اٹھا کر میرے پاس لائے۔ ضعف و نقاہت سے چُور تھا، آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ تھی۔ بہت دُور و دراز کا سفر طے کر کے آیا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ دیکھنے سے بہت معمر ظاہر ہوتا تھا۔ بے شمار جھرّیاں پڑی تھیں۔ منہ میں دانت ایک نہ تھا۔ میں نے اُسے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا کہ کچھ خوراک دینے کی کوشش کی جائے۔ پانی گرم کرایا گیا۔ نوکر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ گھر بھر جاگ گیا ——— لیجیو! ——— پکڑیو! ———

کئی گھنٹے کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے دوائی دی، اور بہت کوشش کی گئی پھر بھی دوسرے تیسرے دن اِس قابل ہُوا کہ کچھ خوراک دی جاسکے۔ وہ بھی قطرہ قطرہ کرکے اور بہت تھوڑی مقدار میں +

میں نے اُس سے پوچھنا چاہا کہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ یہاں کیسے آیا وغیرہ لیکن اب ایک مشکل نئی پیدا ہوئی وہ یہ کہ اُس کی زبان کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بولتا ضرور تھا اور بہت کرکے زور زور سے اشارے بھی کرتا لیکن کچھ پتہ نہ چلتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجبورًا اُس کے لئے ایک کمرہ علیحدہ کردیا۔ اور دن رات خبرگیری کے جو وسائل ممکن تھے مہیا کردیئے گئے۔

ایک عرصہ کے بعد وہ اس قابل ہُوا کہ کھڑا ہوسکے۔ اِس اثنا میں ہماری زبان کے چند الفاظ اُسے یاد ہوگئے تھے اور اُس کی زبان بھی تھوڑی بہت گھروالوں کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ لیکن اتنی نہیں کہ اُس سے کوئی بات تفصیلًا دریافت کی جاسکے۔ میں نے اپنی حیثیت کے مطابق بلکہ اس سے بڑھ کر اُس کے کھانے کپڑے اور ضروریات کا خیال رکھا کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ وہ سو رہا ہوتا تو گھر بھر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی آواز نکالتا۔ میرے پاس کوئی کپڑا ہو یا نہ ہو اُس کے لئے نئے دھلے دھلائے جوڑے ہروقت تیار رہتے۔ وہ بھی بے پروا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات دن میں تین تین چار چار مرتبہ کپڑے بدلتا +

میں نے تو اُس کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ اب سنئے کہ اُس نے میرے ساتھ کیا کیا ۔۔۔۔۔

جس وقت سے اُس نے میرے گھر میں قدم رکھا۔ ہرچیز کو اپنا بنانا شروع کردیا۔ خواہ ارادتًا خواہ اپنی عمر اور نقاہت کی وجہ سے ایک عرصۂ دراز میں وہ اس قابل ہُوا کہ چل پھر سکے۔ پھر تو گویا میرے گھر بھر کا وہی مالک تھا +

ایک دن میں اپنی طبیعت میں کچھ کمزوری سی محسوس کررہا تھا کہ اُس پر میری نگاہ پڑی۔ اُس کا چہرہ پہلے کی نسبت بہت صاف ہوگیا تھا۔ اور طاقت کے آثار نمایاں تھے۔ میں فورًا اُٹھ کر آئینے کے پاس گیا تو دیکھا کہ میری کنپٹیوں پر بال سفید ہونے لگے تھے۔ اِس کے بعد میں روزانہ غور کرتا رہا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ آہستہ آہستہ دن بدن میرا معدہ تک کمزور ہوتا جارہا ہے لیکن اُس کے دانت نکل رہے ہیں گویا میں بوڑھا ہوتا جارہا ہوں اور وہ جوان ہورہا ہے۔ میری بیوی کے ساتھ بھی اُس نے اختلاط بڑھانا شروع کردیا۔ اور وہ اُس کی طرف مائل ہوتی گئی۔ اور یہ بات یہاں تک بڑھی کہ علانیہ میرے سامنے اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا۔

رفتہ رفتہ اب یہ حال ہے کہ میری جوانی اُس نے چھین لی ہے۔ گھر کے مال و اسباب کا وہ مالک ہوگیا ہے۔ میری بیوی پر اُس کا قبضہ ہے۔ نوکر چاکر اُس کا حکم مانتے ہیں میری کوئی نہیں سنتا۔

ابھی کل کی بات ہے میں کمرے میں بیٹھا ہُوا تھا کہ ٹہلتا ہُوا آیا اور میز پر میری سونے کی گھڑی رکھی تھی وہ اٹھا کر چلتا بنا۔ میں نے کہا یہ کیوں لئے جاتے ہو یہ تو میری ہے۔ کہنے لگا نہیں میری ہے۔ اور باہر نکل گیا۔ غضب تو یہ ہے کہ میری بیوی

پاس کھڑی مسکراتی رہی بلکہ الٹا مجھ سے کہنے لگی کہ تم خود بچے کی عادت بگاڑتے ہو ———

——— اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں!

میاں عطا الرحمٰن "نیرنگ خیال"

فضولی

ایران میں حافظ کے تتبع بہت شعرا ہوئے اور ترکی میں بھی حافظ کا اتباع کیا گیا۔ سلاطین و امرا نے جو شعر کہتے تھے غزلیں لکھی ہیں۔ غزلیات کا مشہور ترکی شاعر جو کہ قدیم ترکی کا سب سے بڑا شاعر بھی سمجھا جاتا ہے "فضولی" ہے جس کا زمانہ حیات سولھویں صدی میں تھا۔ وہ ترکی کا حافظ کہلاتا ہے۔ اس کا عام مضمون عشق ہے اس باب میں اُس کے الفاظ غمناک و یاس انگیز ہیں، جو ایک ایسی روح سے نکلے ہیں جو نہایت نازک اور ذکی الحس ہے جو ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، جس کا دل صدمے اُٹھائے ہوئے ہے، جو ایسے الفاظ ہیں کہ دل سے نکلتے ہی دل میں جا بیٹھتے ہیں۔

ذیل میں "منتخباتِ اشعارِ عشقیہ ترکی" سے فضولی کے چند ابیات نقل کئے جاتے ہیں، جن میں کسی قدر مذہبی خیالات کی امانت بھی پائی جاتی ہے:۔

"میرے اچھے دوست! جو شخص اپنی جان نہیں دیتا اُسے حیاتِ جاودانی حاصل نہیں ہوتی ہمیشہ زندہ رہنے والا وہی ہے جو تیرے لئے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے تیرا افسون و کرشمہ عاشقوں کو بغیر کسی تکلیف کے دوبارہ زندہ کر دیتا ہے، تُو اپنے وقت کا مسیحا ہے۔"

میں اُس معشوقہ کو جس کے ابرو بت جیسے ہیں چھوڑ کر محراب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اے مومن مجھے چھوڑ دے، مجھے عشقِ الٰہی کی طرف مائل نہ کر۔"

"اے دیندارو! واعظ جہنم کے تذکرے میں مشغول ہے ذرا اُس کے وعظ میں آؤ اور جہنم کو دیکھو۔"

"اردو"

انتظار

میں دروازے کے کھلنے کی آواز سنتا ہوں، چٹخنی کے اُٹھنے کی آواز آتی ہے۔۔۔۔۔ نہیں وہ تو ہوا ہے جو درختوں کے پتوں میں سے سرسرکرتی ہوئی گزر رہی ہے۔

اے میرے مکان تو اپنے آپ کو آراستہ کر کہ آج تیری قسمت میں کسی کا استقبال ہے۔

خاموش سنو وہ باہر کے درختوں میں کیسی سرسراہٹ ہے۔۔۔۔۔ نہیں وہ تو کوئی ڈرا ہوا پرندہ ہے۔

جرمن "عالمگیر"

تبصرہ

ماہِ نو۔ پروفیسر محمد اکبر منیر ایم اے کی فارسی نظموں کا مجموعہ ہے جو مطبع معارف اعظم گڈھ میں دیدہ زیب سامانِ طباعت وکتابت کے ساتھ چھپا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ کتاب کے اخیر میں کس مقصد سے ایک اردو نظم کا اضافہ کیا گیا ہے جو یقیناً پروفیسر منیر کی شاعری کا بہترین نمونہ نہیں ہے۔ فارسی نظموں میں سے اکثر دلکش اور محاسنِ شعری سے متصف ہیں۔ کہیں کہیں بیان کی ناپختگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً

بہار آمد و گلزار کرد صحرارا ــ بیا ز کنج لحد خیز و بیں تماشا را

پروفیسر منیر کی شاعری کے خارجی اثرات میں تین قابل ذکر ہیں (ا) کلامِ اقبال (ب) ایران کی جدید شاعری (ج) ایران کی قدیم شاعری۔ یہ تینوں اثرات "ماہِ نو" میں جابجا جھلکتے ہیں لیکن اقبال کا اثر سب سے زیادہ غالب معلوم ہوتا ہے۔ قدیم رنگ دیکھنا ہو تو "رو بہ طہران" کے نام کی نظم میں سے مثلاً یہ شعر دیکھئے جو پہلی ہی نظر میں حافظ کی یاد دلاتا ہے

یکے داند طبیعتیم یکے خواند الیتیم ــ یکے دیگر تصور مے کند ہم این و ہم آنم

ایران کی نئی شاعری کا رنگ جو ہندوستان کے فارسی گو شاعروں کو میسر نہیں پروفیسر منیر کی متعدد نظموں میں جلوہ گر ہے۔

مرغ دلم از شکوہ ز صیاد ندارد ــ یارب چہ کند؟ طاقتِ فریاد ندارد

ہر چند زخورشید رُخاں پُر شدہ طہران ــ حقا کہ جہاں سوزیٔ بغداد ندارد

از دست جہانے شدہ آلودہ طبیعت ــ ایں طرفہ عروسیست کہ داماد ندارد

اقبال کے اثر کی مثالیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ اُن کا یہاں نقل کرنا شاید تحصیلِ حاصل پر محمول کیا جائے۔ منیر صاحب کو فارسی شعر سے خاص شغف ہے، اور اُن کی زبان ڈھلی ہوئی صاف اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ آغاز کی نظم جس میں شاعر نے اپنے نقاد سے خطاب کیا ہے

مشمر حقیر زادۂ طبعِ جوانِ من ــ این قطرۂ آب دانۂ گوہر شود ہمی

پوری کی پوری لطافتِ بیان وخیال کی عمدہ مثال ہے۔ مجموعہ میں اور بھی بہت سی اچھی اچھی نظمیں ہیں مثلاً "خوشۂ پروین" "نوائے شاعر" یا "دجلۂ بغداد" جس کے اشعار میں خاص روانی جوش اور خلوص ہے۔ خیال میں انوکھا پن نہ بھی ہو تب بھی بیان کی پاکیزگی اور گداز دل کو خود بخود اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ "گل خودرو" اور "سرودِ مستانہ" بھی عمدہ اور نفیس نظمیں ہیں اور ہو بہو اقبال کی شاعری کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ بعض نظموں میں بحر کی خوبی اور ندرت نے عجیب روح ڈال دی ہے

مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

برخیز و ہمی جو، صحن چمنے را | با مطرب و ساقی بساز انجمنے را
گر خلد بخواہی، در دست بیاور | شیریں دہنے را شیریں سخنے را
من دل شدہ ندہم، از بہر دو عالم | طرفِ چمنے را، سیمیں زقنے را

کتاب پر قیمت درج نہیں۔ مولوی نواب الدین اینڈ سنز مالکانِ کتب خانہ مقبول عام بیڈن روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

خاکِ پروانہ - یہ "پریم چند" صاحب کے چودہ منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے "پریم چند" ہماری زبان کے پہلے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اور افسانہ کے شعبہ میں اردو ادب ہمیشہ اُن کا ممنونِ احسان رہے گا۔ انسانی فطرت اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور تکلیفوں کی تصویر کھینچنے میں انہیں کمال حاصل ہے اور یہی افسانہ نگاری کا کمال ہے۔ اُن کا اندازِ بیان نہایت پختہ سلجھا ہوا اور پاکیزہ ہے اور اُن کی افسانہ نگاری کی طرز کے لئے نہایت موزوں ہے۔ افسانوں کے اس مجموعہ میں وسعتِ انتخاب اور تنوع کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ "نادان دوست" جسے بجا طور پر افتتاحی افسانے کی جگہ دی گئی ہے بچپن کی معصومیت اور بھولے پن کی نہایت دلنشیں اور پیاری تصویر ہے اور ہمارے نزدیک اسی ایک افسانہ سے افسانہ نگار کے کمالِ فن کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے ڈنمارک کے ادیب اینڈرسن نے بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی ہیں اُن کے مانند یہ افسانہ بھی ظاہر کی طفلانہ سادگی کے باوجود زندگی پر ایک عمیق اور فلسفیانہ تبصرہ ہے ملک کے موجودہ سیاسی مذہبی مسائل نے بھی مصنف کی توجہ سے کچھ حصہ لیا ہے "تالیف" شدھی کی تحریک کے متعلق ایک افسانہ ہے اور "ستیہ گرہ" میں حکومت اور کانگریس کی خاموش کشمکش دکھائی ہے۔ اس افسانے میں پنڈت موٹے رام کا خاکا نہایت دلچسپ ہے۔ جلسہ میں پنڈت جی کی تقریر جس خوبی سے قلمبند کی ہے وہ خاص طور پر قابلِ داد ہے۔ اسی قبیل سے وہ نظارہ ہے جو رات کی تاریکی میں پنڈت جی اور خوانچہ فروش کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ اِس پورے افسانے سے پتہ چل سکتا ہے کہ مصنف کا دسترخوان ظرافت کے نمک سے خالی نہیں۔ خاتمہ کے افسانے کے متعلق (جس کے عنوان سے پورا مجموعہ نامزد کیا گیا ہے) ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ "خاکِ پروانہ" کا نام اس پر زبردستی منڈھا ہوا معلوم ہوتا ہے ورنہ نفسِ مضمون کے اعتبار سے افسانہ کو اس نام سے کوئی صاف اور سیدھا تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

یہ قابلِ قدر مجموعہ دھنپت رائے صاحب ۶۷ ہیوٹ روڈ لکھنو سے ایک روپے میں مل سکتا ہے۔ اس کا خریدنا ہمارے خیال میں ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا کیونکہ ایک روپے میں نہ صرف ایک نفیس چیز خریدار کے ہاتھ آئے گی بلکہ لائق مصنف کی بجا ہمت افزائی بھی ہوگی جو ہر بہی خواہِ اردو کا اخلاقی فرض ہے۔

تصاویر

۱۔ جزیرۂ موئت I'll des Muettes دنیا کا سب سے چھوٹا جزیرہ ہے جو جنیوا جھیل کے جنوب مغربی دامن میں کلاراں کے گاؤں کے قریب ساحل سے کچھ ہی دُور واقع ہے جزیرہ کے سامنے کی جانب فرانس ہے اور اِس طرف سوئٹزرلینڈ۔ گویہ جگہ ایک شخصی ملکیت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن سیر کرنے والوں کو اس میں جانے کی عام اجازت ہے۔

۲۔ خوش حالی کا تعاقب Die Jagd nach dem Gluck ایک بہت بڑے جرمن مصوّر روڈولف ہن برگ Rudolf Hennberg کی دلکش اور بلیغ مصوّری کا شاہکار ہے۔ یہ تصویر حکومت کے قومی تصویرخانہ Konglich National Galerie میں آویزاں ہے۔

۳۔ احمد بک زوغو کی عکسی تصویر پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کے مضمون "البانیہ" سے متعلق ہے۔

۴۔ چڑیا کا سبق L'Education de l'oiseau مشہور فرانسیسی مصوّر ایل پیرالٹ L. Perrault کی بے مثال مصوّری کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصویر ابھی حرکت کرنے لگے گی۔

۵۔ بقا Immortalite لکسمبرگ کے عجائب خانہ کا ایک مجسمہ ہے جو ایل لانج پابیڈ L. Longepied کی سنگتراشی کا ایک غیرفانی نقش ہے۔

۶۔ نپولین میدانِ ابوکیر میں Napoléon a'la Bataille d'Aboukir. فرانسیسی مصوّر لوژن Le Jeune. کی ایک عظیم الشان تصویر ہے جو ورسائی کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ نپولین کا قاعدہ تھا کہ جب وہ میدانِ جنگ سے واپس آتا تھا تو اس معرکہ کی ایک تصویر بنواتا تھا جس میں اُس کی اپنی ذات ایک نمایاں حیثیت سے موجود ہوتی تھی، چنانچہ اس قسم کی کئی ایک تصاویر ورسائی کے عجائب خانہ میں موجود ہیں لیکن یہ سب تصاویر صرف اُن معرکوں کی ہیں جن میں اُسے غلبہ حاصل ہوا۔ جن جنگوں میں وہ مغلوب ہوا اُن کی تصاویر موجود نہیں مثلاً عکہ کی لڑائی کی کوئی تصویر نہیں۔

۷۔ جون کیٹس۔ John Keats.

راقم گمنام سے۔ اگر آپ ایک ذاتی خط میں اپنا پتہ لکھ دیں گے تو ہمایوں بلامعاوضہ آپ کے پاس آتا رہے گا۔ اُس کے لئے اتنا معاوضہ بس ہے کہ اُس کے لفظوں کے کسی زندگی میں کچھ معنی ہوں + باقی پھر!

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵ — نمبر

بابت ماہِ فروری ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱- امان اللہ خاں - ۲- ثریا خانم

رباعیات

(۱)

اے نور ترے نغمۂ فراواں تیری
ہے ذروں میں تصویر درخشاں تیری
ظلمت بھی نہیں تیرے کرم سے محروم
ممنون ہے شب بادۂ ایماں تیری

(۲)

گویا ہے فزوں عرش سے رفعت اپنی
ہے نور جہاں تاب حقیقت اپنی
انسان ہے وہ آپ کو جو پہچانے
حاصل کرے کھوئی ہوئی وقعت اپنی

(۳)

جو پھول نہیں دامنِ گلشن میں ابھی
مستور ہیں وہ صبح کے دامن میں ابھی
انسان خدا سے کبھی مایوس نہ ہو
شعلے ہیں بہت وادیِ ایمن میں ابھی

(۴)

گردش میں نہیں ہے جامِ عالم گویا
ہے یہ انتظامِ عالم گویا
حکمت ہے عبث تنظیمِ عالم گویا
ہے سعیِ عمل نصیبِ عالم گویا
ہے درسِ عمل نظامِ عالم گویا

گویا جہان آبادی

رباعیات

(۱)

برباد کیا تھا اسے منت نے مری
آباد کیا پھر اسے مشقت نے تری
محبوس کیا نہ اسے ہوس غلامی تیری
آزاد کیا پھر اسے محبت نے تری

(۲)

وہ جاں نہیں جاں نہیں ہے ہمت جس میں
وہ دل نہیں دل نہیں ہے غیرت جس میں
چمکے جو نہ موتی تو وہ موتی کیا ہے
وہ گل نہیں گل نہیں ہے نکہت جس میں

(۳)

انسان ہے وہ کیا نہ ہو مروت جس میں
بے جان ہے وہ ہو نہ ثبات الفت جس میں
دل کیا ہے وہ درد جس میں اور دل کا نہ ہو
وہ روح ہی کیا نہ ہو محبت جس میں

(۴)

اسرار بقا کا اک خزانہ ہے علم
انوار قضا کا آشیانہ ہے علم
آغاز کوئی نہ کوئی جس کا انجام
انسان و خدا کا وہ فسانہ ہے علم

ب . ل .

امان اللہ خاںؒ سے

اے انقلاب و عزم و شجاعت کے تاجدار
اے انکسار و حلم و اخوت کے تاجدار

ایثار و لطف و صدق و محبت کے شہسوار
فرقت میں ہے تری دلِ اسلام داغ دار

ہمراہ لے کے گلشنِ مسلم کا رنگ و بُو
جاتا ہے ہم کو چھوڑ کے کیوں آہ آج تُو

نخلِ مراد پر کوئی بجلی سی گر گئی؟
روحِ امان کون سی آفت میں گھر گئی؟

سمجھا نہ تجھ کو تیرے وطن نے ہزار حیف
جانا نہ اپنے گل کو چمن نے ہزار حیف

بیداری و کمال کی امید تجھ سے تھی
یعنی ہلال والوں کو سو عید تجھ سے تھی

تو وسطِ ایشیا کی تھی وہ شمعِ جاں گداز
افشا ہُوا جہاں پہ ترقی کا جس سے راز

اے عندلیبِ گلشنِ ایثار تُو نہ جا
اے خدمت و وفا کے پرستار تُو نہ جا

ویراں ترے بغیر ہیں مشرق کی بستیاں
پھر ہم ہیں اور پھر وہی غفلت پرستیاں

آجا کہ روز و شب ہے یہاں تیرا انتظار
مرجھا رہے ہیں پھول ترے عندلیب زار

جاں آ کے ان میں ڈال دے اے جاں پھر ایک بار
باغِ بہشت ہو یہ بیاباں پھر ایک بار

ب ل

جہاں نما

بغاوتِ افغانستان

حالات اس سرعت سے بدل رہے ہیں کہ اُس حادثۂ المیہ کے انجام کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا جس کی خبر ہمیں لاہور میں ۱۴ جنوری کی شب کو ملی، لیکن کیا یہی افغانستان کی کم بدبختی ہے کہ آج اُس کا تاجدار بے خانماں ہو رہا ہے اور اپنی ہی سلطنت میں اپنی ہی رعایا کے ہاتھوں اُسے چین نصیب نہیں۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ کیا وجوہ تھیں جنہوں نے تختِ افغانستان کو الٹ کر رکھ دیا۔ بظاہر تو یہ جنونی ملاؤں کی جہالت کا ایک مظاہرہ معلوم ہوتا ہے، لیکن بہت ممکن ہے کہ اس کی تہ میں بعض بین الاقوامی بھید کیا برسرِ کار ہوں۔ کچھ بھی ہو یہ ایک ایسا روڑا ہے جو افغانستان ہی کی نہیں بلکہ تمام ایشیا کی راہِ ترقی میں آ اٹکا ہے

امان اللہ خاں نے دس سال تک افغانستان میں حکومت کی ہے اور اُن کا دورِ حکومت اِس ہنگامہ خیز ملک کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ پتھروں اور ٹیلوں کی یہ سرزمین اِس سے پہلے مہذب و متمدن ممالک کی فہرست میں کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہ رکھتی تھی۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا وہ وقار و اقتدار قائم کیا کہ دنیا کو اس کی فوقیت و برتری کا اعتراف کرتے ہی بنی۔

ترقی کے لئے اُن کی روح بے قرار تھی وہ جلد سے جلد اُس کے بامِ رفیع تک پہنچ جانا چاہتے تھے لیکن انہیں یہ خیال نہ تھا کہ وہ قوم جو ظلمت و جہالت کے تاریک غاروں میں گری پڑی ہے کیونکر یک بہ یک علم و آگاہی کے آفتابِ عالمتاب سے آنکھ ملا سکے گی۔ انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ مجنون و متعصب مذہبیوں کی خفاش صفت آنکھوں کو آہستہ آہستہ اِس نور سے مانوس کرنا چاہیئے۔

یورپی لباس و وضع کا اختیار کرنا تو خیر ایک ایسی بات ہے جسے مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن دوسری اصلاحات کے معاملہ میں انہوں نے کبھی اسلام کے احکام سے تجاوز نہیں کیا۔ اگر انہوں نے تعددِ ازدواج سے اپنی قوم کو روکا تو فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ کے رُو سے روکا، کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ امرا اپنی بیویوں سے عدل نہیں کر سکتے۔ اگر انہوں نے پردہ اُٹھانے کا حکم دیا تو الا ما ظھر منھا کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر دیا۔ اگر انہوں نے لڑکیوں کے لئے تعلیم گاہیں کھولیں تو طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ سے متاثر ہو کر کھولیں۔

اگر انھوں نے لڑکیوں کو یورپ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تو اطلبوا العلم ولو کان بالصین کی تعمیل میں بھیجا۔ اور اِن سب باتوں سے اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ اُن کی قوم توہمات کے طلسم سے آزاد ہو کر، خونریزی غارت گری اور جہالت کو ترک کر کے دنیا کی متمدن و مہذب قوموں میں ایک جگہ حاصل کرلے۔

افغانستان کا تخت امان اللہ خاں ہی کو زیب دیتا ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہؤا تو یہ ایک یقینی بات ہے کہ جو بھی وہاں برسرِ اقتدار ہوگا اُسے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے وہی وسائل اختیار کرنے پڑیں گے جو امان اللہ خاں نے کئے۔

ثریّا خانم

افغانستان کی اصلاحات اور انقلاب میں ملکہ ثریّا خانم کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم اور عورتوں کی آزادی کے قیام کے لئے انھوں نے بیش از بیش خدمات انجام دی ہیں۔ تعددِ ازدواج کا انسداد، زنانہ مدرسوں کا افتتاح اور سنگین پردے کی مخالفت در اصل وہ تحریکیں ہیں جن کی تہ میں ثریّا خانم ہی کی روشن دماغی کارفرما تھی۔ اخبار "سنڈے ایکسپریس" کا ایک نامہ نگار اُن کے متعلق لکھتا ہے:-

یہ ملکہ جس نے ایک ایسے ملک کے دارالحکومت میں عوام کے سامنے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا ہے جہاں اعلیٰ طبقہ کی کوئی عورت اس سے پہلے بے نقاب نہ ہوئی تھی اور جس نے فوجوں میں ہلچل ڈال دی ہے اور آتشِ جنگ مشتعل کر دی ہے ایک پریوں کی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔

اُس کا چہرہ خوبصورت اور چھوٹا ہے، آنکھیں رقیق اور بھوری ہیں اور لہراتے ہوئے سنہری بال ہیں۔ وہ فارسی بولتی ہے، فرانسیسی معلوم ہوتی ہے، شام میں پیدا ہوئی تھی اور ایک افغان وزیر اور شامی شہزادی کی بیٹی ہے۔

جب میں نے اُسے لندن میں دیکھا تو اُس کا لباس ایسا تھا کہ کوئی جانے وہ وائنا میں پیدا ہوئی ہے اور وہ شیریں فارسی زبان میں گفتگو کرتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موسیقی کا چشمہ ابل رہا ہے۔

وہ ہمیشہ اپنے شوہر کے پیچھے پیچھے چلتی تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایسی محبت جھلک رہی ہوتی تھی جس میں احترام بھی شامل ہو۔

وہ تعلیم کی بہت بڑی حامی ہے، غلامی کی دشمن اور جادۂ حریت کی رہنما ہے —— اور مدبر و منتظم ہے۔

اُس نے کابل میں، مدرسے قائم کئے جہاں لڑکیاں سیکھتی ہیں کہ اُن مردوں کے سامنے جن کے پاس اُن کے

والدین نے اُن کو بیچ دیا ہے" ہاں" اور "نہ" کہنے کے علاوہ بھی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ ان مدرسوں کو ملکہ کی ماں چلاتی ہے لیکن اُن کا منبع و مصدر ملکہ ہی ہے۔

ملکہ کے وضع و لباس نے کابل کی دکانوں اور اُن کی درآمد برآمد تک کی اصلاح کر دی ہے۔ اُس نے نفیس کپڑے، ریشم اور زیورات کی صنعت کو فروغ دیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ میرے پیرس فراک اور کلوک سب ملکی ریشم وغیرہ سے تیار ہوں اُس نے مشرق کی قدیم صنعتوں اور دستکاریوں پر شاہی مہر ثبت کر دی ہے، اور یُوں اُس نے نہ صرف مغرب کا نشان مشرق پر لگایا ہے بلکہ مشرق کا نشان مغرب پر بھی لگا دیا ہے۔

بنگال کا قدیم دارالحکومت

بہت کم لوگوں کو اس امر کا علم ہے کہ مرشد آباد اور ڈھاکہ سے پہلے بنگال کا دارالحکومت کئی صدیوں تک گوڑ یا لکشمن وتی تھا۔ بہت سے بنگالی یہ نہیں جانتے کہ گوڑ کہاں واقع ہے۔ گوڑ شمالی بنگال کے ایک قدیم شہر کا نام ہے جو ۹ صدیوں تک بنگال کی راجدھانی بنا رہا۔ اُس کا اصلی نام گوڑا ہے جس کا ماخذ بنگالی نام گُڑ ہے جو گنے کی رس سے بنتا ہے۔ بنگال کے قدیم ترین تاریخی واقعات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گوڑ اُس سلطنت کا دارالحکومت تھا جس کی بنیاد آٹھویں صدی کے وسط میں دھرم پال نے ڈالی تھی۔ بارھویں صدی کے خاتمہ پر پال خاندان کے راجہ رام پال نے گوڑ کا نام رام نتی رکھا۔ پھر سینا خاندان کے راجہ لکشمن سینا نے دارالحکومت کا نام لکشمن وتی رکھا۔ آخر مغلیہ خاندان کے شہنشاہ ہمایوں نے اس کا نام جنت آباد رکھا۔ شمس الدین فیروز شاہ نے جو بنگال کا ایک خود مختار بادشاہ تھا قدیم گوڑ کے شمال میں فیروز آباد کے نام سے ایک بستی قائم کی جو ۱۳۴۵ء سے ۱۴۴۶ء تک دارالحکومت رہی۔ ۱۴۴۶ء میں گوڑ پھر دارالحکومت ہو گیا۔ آخر ۱۵۷۵ء میں ایک مہلک وبا نے اس شہر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

بدھ مت اور ہندو مذہب کے عہد میں قدیم گوڑ کے آثار کا اب کوئی نشان نہیں ملتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے کھنڈر مٹی کے بڑے بڑے ٹیلوں میں دبے ہوئے ہیں جو بلال باڑی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ٹیلے مالدہ کے مشرق کی طرف واقع ہیں۔ گوڑ کے کھنڈر سینکڑوں سیاحوں کے لئے ایک خاص کشش رکھتے ہیں کیونکہ اسلامی عہد کی شاندار یادگاریں ابھی تک اہلِ نظر کے لئے ایک عبرت خیز داستان ہیں۔

روح کا وزن

مسٹر جے ہیوٹ میکنزی نے جو برٹش کالج آف سائیکک سائنس کے پرنسپل ہیں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دوسری مادی اشیا کی طرح انسانی روح کا بھی وزن کیا جا سکتا ہے۔ بقول مسٹر میکنزی روح مادہ پر مشتمل ہے لیکن یہ ایسا لطیف مادہ ہے کہ انسان کی برہنہ آنکھ کو نظر نہیں آسکتا۔ اس کی حرکت کی رفتار اس قدر زیادہ ہے کہ سوائے اُن خاص لوگوں کے جو باطن کا حال معلوم کرنے کی استعداد رکھتے ہیں کوئی شخص اس رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن سائنس دان مقناطیسی عمل سے اس رفتار کو گھٹا سکتے ہیں۔ اور اس حالت میں روح پر مادہ کی بھاری تہ اس قدر چڑھائی جا سکتی ہے کہ انسانی آنکھ اُسے اچھی طرح دیکھ سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس لفظی گورکھ دھندے کے یہ معنے ہیں کہ صرف روحانیات کے ماہرین ہی ایسی چیزیں دیکھتے اور جانتے ہیں جن کی حقیقت عام اشخاص کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔

مسٹر میکنزی اپنے اُن تجربوں کی بنا پر جو انہوں نے مریضوں کے بستر مرگ پر کئے ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کی روح کا وزن ایک اونس کا چوتھا حصہ ہے۔ لیکن وزن کرنے کے بعد ایک گھنٹہ کے اندر روح کا وزن اونس کا ۱/۶۴ حصہ رہ جاتا ہے۔ یہ کمی کچھ تو روح کے اڑنے اور کچھ زمین کی طرف اُس کے مادی ذرات کے گر جانے سے وقوع میں آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ موت کے بعد جسم سے روح کے نکلنے کی تصویر دکھائی جاتی ہے۔

ایک انگریزی اخبار کی اولوالعزمی

مشہور و معروف ہفتہ وار اخبار "سپکٹیٹر" کے ایڈیٹر نے صحافت میں ایک انوکھا خیال پیدا کیا ہے۔ انہوں نے ایک مجلس قائم کی ہے جس کے ارکان ایک معلّم، ایک انگلستان کے گرجا کے پادری، ایک طبیب اور دو حکمائے نفسیات ہونگے۔ اگر ناظرین اخبار میں سے کوئی اپنے کسی ذاتی مسئلہ کے متعلق اُن سے رائے لینا چاہے گا تو تمام ارکان اپنے اپنے علم کے مطابق مجلس میں اس پر بحث کریں گے اور جو فیصلہ وہ متفقہ طور پر کریں گے وہ سوال کرنے والے کے پاس خط کے ذریعہ سے بھیج دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اخبار میں ایک صفحہ مخصوص کیا جاتے گا جس میں عام فائدے اور دلچسپی کے مسائل درج ہوں گے۔ یقیناً ناظرین اخبار کی یہ ایک گراں بہا خدمت ہے۔ کاش کہ اردو صحافت میں بھی ایسی باتیں ممکن ہوسکیں۔

شاہنامۂ فردوسی کے مآخذ و مصادر

یہ مضمون فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے اور اُس بسیط مقالہ سے ماخوذ ہے جو ابو منصور عبدالملک بن محمد بن اسماعیل الثعالبی متوفی ۴۲۹ھ (مابین ۱۰۳۷ء و ۱۰۳۸ء) مصنف یتیمۃ الدھر کی کتاب "غرر اخبار ملوک الفرس و سیرہم" ("غرر السیر") (متن و فرانسیسی ترجمہ مطبوعہ مطبع قیصرہ فرانس پیرس ۱۹۰۰ء) پر اُس کے مصحح و مترجم موسیو زوطان بیر (Zotenberg) نے لکھا ہے۔ یہ ایک نہایت مبسوط تاریخ تھی جس میں الثعالبی نے اپنے عہد تک کے واقعات درج کئے تھے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک اس کتاب کا کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ قسطنطنیہ اور بوڈلین (آکسفورڈ) کے نسخے نامکمل ہیں۔ آکسفورڈ کا نسخہ خلفائے بنو عباس کی ابتدائی تاریخ پر ختم ہو جاتا ہے جو حصہ زوطان بیر نے شائع کیا ہے وہ صرف ایران کے شاہانِ قبلِ اسلام سے تعلق رکھتا ہے اور بڑی تقطیع کے جلی ٹائپ میں مع ترجمہ ساڑھے سات سو صفحوں میں آیا ہے۔

زوطان بیر نے اپنے مقالہ میں علاوہ بعض دیگر مباحث کے "شاہنامۂ فردوسی" اور "غرر السیر" کے مضامین کا مقابلہ کیا اور دونوں کے مآخذ سے بحث کی ہے۔ اُس مقالہ سے جو حصے ہم نے ترجمہ کے لئے انتخاب کئے ہیں وہ اسی مخصوص مبحث سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک دلچسپ علمی و تاریخی تحقیقات کی حیثیت سے نہایت قیمتی اور قابلِ قدر ہیں۔ زوطان بیر کو ایران کے ادبیات و تاریخ سے خاص شغف ہے اور اُس نے بلعمی کی "تاریخِ طبری" کا بھی فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

(سید حسن برنی)

میں اُس مصنف سے جس کا اس کتاب میں دو مقامات (ص ۱۰ و ۳۸۸) پر مسعودی المروزی کے نام سے ذکر آیا ہے واقف نہیں ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی کتاب شاہانِ ایران کی تاریخ سے تعلق رکھتی تھی اور فارسی نظم مُزدَوِج یعنی مثنوی میں بحرِ متقارب میں لکھی گئی تھی جو رزمیہ شاعری کے لئے مخصوص بحر ہے۔ یہ قیاس کرنا ناگزیر ہے کہ یہ نظم بہت کم مشہور تھی، یا فردوسی سے پیشتر کی دوسری رزمیہ نظموں کی طرح اُس میں قومی تاریخ کے بعض حصے یا ممکن ہے کہ صرف بعض مشاہیر کے کارنامے ہی درج تھے۔ فردوسی نے جو یہ ادّعا کیا ہے کہ اِس سے پیشتر کسی نے ایران کی قدیم روایات کو نظم نہیں کیا اُس سے فردوسی کی مراد تمام شاہانِ ایران کی مکمل تاریخ سے ہے۔

"آئین نامہ" کے متعلق جو ایران کے ادبِ قدیم کی ایک مشہور تصنیف تھی جس قدر حالات دستیاب ہوئے ہیں وہ سب

مسعودی کی کتاب "التنبیہ" سے ماخوذ ہیں۔ کتاب "عیون الاخبار" مصنفۂ ابن قتیبہ میں اس کے چند انتخابات درج ہیں۔ اُن کے علاوہ وہ اقتباسات ہیں جو ہماری کتاب میں دستیاب ہوتے ہیں (ص ۴ و ما بعد) اور غالباً براہِ راست یا بالواسطہ ابن المقفع کے عربی ترجمہ سے لئے گئے ہیں۔

مسعودی نے دربار کے آداب و مراسم اور طبقات کی اُس معاشی تقسیم کے متعلق، جو ساسانی خاندان کے بانی نے مقرر کئے تھے جو کچھ لکھا ہے اور نیز کتاب "مرزبان نامہ" کا باب ہم اسی کتاب سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

ہماری کتاب میں دو مقامات پر (ص ۲۶۳ و ۴۵۷) "صاحب کتاب شاہنامہ" کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے پہلا مقام ("وقال صاحب کتاب شاہنامہ انہ ارجاسف وہو الاشہر") شاہنامۂ فردوسی سے وابستہ ہوسکتا ہے۔ فردوسی نے اس بادشاہِ توران کا نام ارجاسپ ہی لکھا ہے، جیسے طبری نے خرساف اور ابن خردادبہ نے بقول ہمارے مصنف (الثعالبی)، کے "ہزار ائسف" لکھا ہے لیکن چونکہ لفظ ارجاسپ قدیم روایت کے مطابق ہے اور جیسا کہ الثعالبی نے لکھا ہے زیادہ متداول ہے، اس لئے قدرتی طور پر دیگر تحریرات میں بھی دستیاب ہوگا اور اس لئے اُس مطابقت سے کوئی یقینی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ برخلاف اس کے دوسرا مقام جو اشکانی تاجدار اور اُس کی سلطنت کی مدت سے تعلق رکھتا ہے نہ صرف یہ کہ شاہنامہ میں موجود نہیں ہے، بلکہ فردوسی کے بیان کے صریح خلاف ہے۔ فردوسی اشکانی بادشاہوں کی میعادِ سلطنت اس لئے بیان نہیں کرسکا کہ اُس کا ذکر "نامۂ خسرواں" میں جس سے اُس نے نقل کی تھی موجود نہیں تھا۔

چو کوتاہ شد شاخ وہم بیخ شاں   نگوید جہاں دیدہ تاریخ شاں

ازایشاں بجز نام نشنیدہ ام   نہ در نامۂ خسرواں دیدہ ام

بلاشبہ جس زمانہ میں ہماری کتاب (غرر السیر) تصنیف ہوئی، فردوسی کی نظم کو مکمل ہوئے کئی برس ہوچکے تھے، اور اس کے بعض اجزا شاعر کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور ثعالبی معاصر مصنف ہونے کی حیثیت سے اس مشہور رزمیہ نظم سے واقف بھی ہوگا۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ فردوسی کی کتاب کی اُس وقت تک اتنی کافی اشاعت ہوچکی تھی کہ وہ محض "شاہنامہ" کے نام سے مشہور ہو، یا اس نام سے سوائے اُس کے اور کوئی کتاب شہرت نہ رکھتی ہو، اور اُس کا مصنف بھی اتنا معروف ہوچکا ہو کہ اُس کا نام لینے کی حاجت نہ رہے، ظاہر ہے کہ اگر ثعالبی کے الفاظ "قال صاحب کتاب شاہنامہ" کا اشارہ فردوسی کی طرف مانا جائے تو ثعالبی کے بیان کے اسی قسم کے معنی قرار دینے پڑیں گے۔

یہ بات معلوم ہے کہ "شاہنامہ" کا لفظ فردوسی ہی کی نظم کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ "شاہنامہ" کے نام سے فارسی

۵۔ دیکھو الآثار الباقیۂ البیرونی مصححہ سخاؤ (Sachau) ص ۱۱۲ و ما بعد

زبان کی دوسری کتابیں بھی موسوم پائی جاتی ہیں۔ البیرونی نے شاہنامہ ابوعلی محمد بن احمد البلخی اور شاہنامۂ ابومنصور بن عبدالرزاق کا ذکر کیا ہے۔[۵] ایک روایت میں جو شاہنامۂ فردوسی کے ایک فارسی دیباچہ میں پائی جاتی ہے جو چوتھی صدی ہجری کے اواسط میں چار ایرانی علما نے ابومنصور عبدالرزاق والیٔ طوس کے لئے لکھا تھا۔ موخرالذکر شاہنامہ کو فردوسی کی نظم کا براہِ راست ماخذ قرار دیا ہے۔ گو یہ دیباچہ بعض صحیح اطلاعات کے ساتھ کثیر التعداد غلط معلومات اور جعلی روایات سے پُر ہے، لیکن نولڈیکے (Noldeke) نے شاہنامۂ فردوسی کی تصنیف کی بابت ابن عبدالرزاق مذکور کے متعلق اس دیباچہ کی روایت کو ایک حد تک باور کیا ہے۔ لیکن یہ امر توجہ طلب ہے کہ شاہنامۂ ابن عبدالرزاق میں البیرونی کے بیان کی رُو سے، اگرچہ اشکانیوں کی کم و بیش مکمل تاریخ نہ تھی تو بھی کم از کم اُس خاندان کے بادشاہوں کے سنینِ حکومت ضرور درج تھے اگر فردوسی کے پیشِ نظر یہ کتاب ہوتی تو اُس نے وہ دو شعر جو اوپر درج ہوئے نہ لکھے ہوتے۔

وہ اقتباسات جو ثعالبی نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں، شاہنامۂ ابنِ عبدالرزاق سے وابستہ نہیں ہو سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ جو کچھ پہلے اشکانی بادشاہ اور اُس کی مدتِ سلطنت کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ اُس جدول کے مطابق نہیں ہوتا جو بیرونی نے دی ہے جس طریق پر ثعالبی نے شاہنامہ کا ذکر کیا ہے، اُس سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو عام طور پر متداول تھی اور جس کا تذکرہ ابن الاثیر نے محمود کے ایک مقولہ میں کیا ہے (دیکھو ابن الاثیر ج ۹ ص ۲۶۱)

اس کتاب کے علاوہ "غرر السیر" کے مصنف کے پیشِ نظر بحیثیت خاص ماخذ کے ایک اور تاریخ بھی تھی جو تین طور پر ایران کی غیر تاریخی حکایات کے متعلق فردوسی کی نظم سے بہت کچھ ملتی ہے۔ نہ صرف قدیم داستانیں اپنی ترتیب و سلسلہ میں اور حکایات و وقائع فردوسی کی نظم اور ہماری کتاب میں یکساں ہیں، بلکہ واقعہ نگاری کی جزئیات تک اکثر ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔

فریدوں اپنے بیٹے ایرج کو اپنے دو بھائیوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "تو انہیں کھا ڈال قبل اس کے کہ وہ مجھے کھا جائیں (ص ۴۵) اسی قسم کا خطاب اسی تشبیہ کے ساتھ فریدوں کی اس تقریر میں جو فردوسی کے شاہنامہ میں درج ہے پایا جاتا ہے۔ منوچہر سلم کا پیچھا کرتے ہوئے کہتا ہے "اے بادشاہ کیوں بھاگتا ہے، میں تیرے لئے وہ تاج لایا ہوں جس کے لئے تو نے ایرج کو قتل کیا۔ (ص ۶۳) فردوسی بھی اسی طرح لکھتا ہے:۔ تو نے اپنے بھائی کو تاج کے لئے قتل کیا تجھے ایک تاج مل گیا۔ تو راستہ میں کب تک بھاگے گا اے پادشاہ میں تیرے لئے تاج اور تخت لایا ہوں" سام زال کا خط جس میں مہراب کی لڑکی کی شادی کرنے کی خواہش کی گئی تھی ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے: "جیسے طیور نے پرورش کیا ہو اور جس کی جائے پناہ پہاڑ ہوں وہی اپنے باپ سے ایسی خواہش ظاہر کر سکتا تھا (ص ۸۳) فردوسی لکھتا ہے جس شخص کو وحشی پرندے

پالا ہو، وہی اس قسم کی خواہش کے پُورا ہونے کی آرزو کرے گا۔ منوچہر زال سے جو اپنے باپ کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے، کہتا ہے، "تیرا باپ تیرے دیدار کا مشتاق نہیں ہے۔ اُس کی مشتاق وہ ہے جو مہراب کی بیٹی ہے" (ص ۹۱) شاہنامہ میں ہے:۔ "مہراب کی بیٹی تیرے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ تو سام بن نریمان کے دیکھنے کو کیوں اتنا بے چین ہے" قباذ بازمان ایرانی پہلوان سے لڑنے کے لئے آتے ہوئے اپنے بھائی قارن سے جو اُس سے لوٹ جانے کی التجا کرتا ہے کہتا ہے:۔ "عالمِ آخرت میں زندہ پہنچنا ناممکن ہے (ص ۱۰۵) شاہنامہ میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ افراسیاب پیران سے سیاوش کے بارے میں کہتا ہے:۔ "کیکاؤس پر تعجب ہے وہ ایسی صورت کی جدائی پر کس طرح صبر کرتا ہے جس سے زیادہ حسین اور شاندار میں نے کوئی صورت نہیں دیکھی" شاہنامہ میں ہے اس کے بعد وہ پیران کی جانب متوجہ ہوا اور کہا "کاؤس کم عقل بوڑھا ہے، جو سیاوش جیسی لڑکی سے جو ایسی بلند بالا اور بہادر ہے جدا ہونے کے لئے تیار ہو گیا" سیاوش پیران سے کہتا ہے:۔ "اگر خدا کے علم میں پہلے سے یہ تھا کہ میں ایرانشہر سے دُور رہوں اور نہ اپنے باپ کیکاؤس کو دیکھوں اور نہ اپنے آقا رستم کو، اور تو اُن دونوں کی جگہ قائم مقام بنے تو جو تیرا جی چاہے کر" (ص ۲۰۵) فردوسی کہتا ہے:۔ "سیاوش نے پیران پر ایک نظر ڈالی اور اُس سے کہا "اگر میں ایران کبھی نہ لوٹنے پاؤں گا اور نہ کاؤس کو اور نہ زال کو جس نے مجھے پالا ہے اور نہ رستم کو جو میرے لئے خوش و خرم بہار ہے دیکھ سکوں گا تو مجھے میرے باپ سے علیحدہ کر دے اور میرے لئے اس شادی کا انتظام کر دے" کیخسرو کے متعلق جب کہ وہ سیاوش آباد کو مع گیو اور اپنی ماں کے چھوڑ کر جا رہا تھا لکھا ہے "گیو کو ایک تیار موٹے تازے گھوڑے پر سوار کیا جو اپنے پیروں سے پرواز کرتا تھا، اور اپنی ماں کو ایسے گھوڑے پر سوار کیا جس کے چاروں قدموں میں ہوا کے نعل لگے تھے" فردوسی کہتا ہے۔ "انہوں نے اپنے اسپانِ بادپا پر زین کسا" ملکہ ہمائی اپنے بیٹے کو شناخت کرتی ہے "جب دارا سپاہیوں میں اُس کے سامنے سے گذرا اور اُس (ہمائی) کی آنکھ نے اُس (دارا) کے حسن اور ہیبت کو بخوبی دیکھا تو اُس کی پستان سے دودھ بہنے لگا اور اُس کے قلب نے کہا کہ یہ تیرا بیٹا ہے" (ص ۳۹۶) شاہنامہ میں ہے "جب اُس نے وہ سینہ اور دل پسند خصوصیات دیکھیں تو اُس کی پستانِ مادری سے دودھ بہنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ مشابہتیں جو صرف ایران کی روایات کے مشترکہ مواد سے تعلق نہیں رکھتی ہیں بلکہ داستاں سرائی کے ادبیات سے بھی متعلق ہیں ثابت کرتی ہیں کہ دونوں کتابوں کے متن ایک مشترک ماخذ پر مبنی ہیں لیکن ثعالبی کے بیانات کے میلانِ اختصار اور فردوسی کے نظم کے رجحانِ تفصیل کو ملحوظ رکھنے کے بعد بھی دونوں تصانیف میں کثیر التعداد قابلِ توجہ اختلافات پائے جاتے ہیں، جن میں سے میں بعض خاص خاص اختلافات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہماری کتاب ("غرر") میں ابتدائی شاہانِ ایران کے قوانین و ایجادات کے متعلق جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ

شاہنامہ سے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں۔ کیومرث کے متعلق اس میں دو روایتیں طبری سے ماخوذ ہیں (ج ا ص ۱۴۷، ۱۴۱)
ان میں سے ایک روایت بیرونی نے بھی شاہنامۂ بلخی سے نقل کی ہے (آثار الباقیہ ص ۹۹ سطر ۲۲ و ص ۱۰۰ سطر ۱) جنگ
کیومرث و اہرمن، کیومرث کے بیٹے سیامک کی موت، کیومرث و ہوشنگ کی جنگ دیو سیاہ سے، ہوشنگ کی آتش
پرستی اور عید سادہ کی بنیاد، اور خیداسپ وزیر طہمورث کے متعلق جو حکایات فردوسی نے لکھی ہیں وہ اس کتاب میں
موجود نہیں ہیں۔ ہوشنگ کی تاریخ (ص ۵ و مابعد) زیادہ تر طبری کے مطابق ہے (ج ا ص ۱۷۲ و مابعد) اور تاریخ طہمورث
کے بعض جزئیات طبری سے مشابہ ہیں (ج ا ص ۱۷۵) ثعالبی کی بیان کی ہوئی بعض حکایات ضحاک کے متعلق (ص ۱)
فردوسی میں نہیں ہیں، بالخصوص ضحاک کے اس جادو کی روایت جو ضحاک نے آدم کی زبان کے کچھ الفاظ استعمال
کر کے کیا تھا (ص ۲۴)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مذکورہ بالا یکساں بیانات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ اگرچہ ہمارے مصنف کے بعض مقامات کا وہی ماخذ ہے
جو فارسی نظم (شاہنامہ) کا ہے لیکن پھر بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جو، علاوہ اُن بعض انتخابات کے جو مختلف
مصنفین سے لئے گئے ہیں اور اُن کے نام بیان کر دیئے گئے ہیں، کسی دوسرے آخذ پر مبنی ہیں۔ اس موافقت و اختلاف
کی توجیہ زیادہ قدرتی طور پر ہو جاتی ہے اگر ہم فرض کرلیں کہ فردوسی اور ثعالبی نے مختلف روایتوں کا جن کا اوپر جاکر ایک
ہی ماخذ تھا تتبع کیا ہے۔

اگرچہ فارسی روایت متعلق بہ شاہنامۂ نثر مصنفہ عبدالرزاق و تصنیف شاہنامۂ فردوسی قطعی طور پر صحیح نہیں سمجھی
جاسکتی لیکن فردوسی کی ذاتی شہادت اس روایت کے خاص حصوں کی تائید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شاعر اپنے دیباچہ میں ظاہر کرتا ہے کہ اپنے ایک دوست کی مہربانی سے اُسے ایک "نامۂ باستان" دستیاب ہوا جس
کے منتشر اجزا ایک نامور شخص نے جمع کئے تھے۔ اگر اُن الفاظ سے واقعی اُس کتاب کی طرف اشارہ ہے جو عبدالرزاق
نے ترتیب دی تھی تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ فردوسی کا نسخہ اُس نسخہ سے مختلف تھا جس کا ذکر البیرونی نے کیا ہے۔ بہرحال
فردوسی نے نہایت صاف طور پر بیان کیا ہے کہ یہ کتاب "نامۂ خسرواں" اُس کی نظم کا ماخذ ہے۔

ہم اُن کتابوں سے جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، واقف نہیں ہیں، جن سے فردوسی نے علاوہ "نامۂ خسرواں"
کے کام لیا ہے۔ اُن کتابوں میں ایک اور "نامۂ خسرواں" کا بھی ذکر ہے جو بانصا و برتھا اور جو ایک شخص موسوم بہ سرو آزاد
نے فردوسی کو دیا تھا۔ رہے وہ قصص جو فردوسی نے بعض دہقانوں کی زبانی جمع کرنا بیان کئے ہیں، اُن کے متعلق خیال
کیا جاسکتا ہے کہ جیسا کہ نولڈیکے نے ثابت کیا ہے یہ محض شاعرانہ انداز بیان ہے، جو حقیقت سے خالی ہے۔ یا اس

سے یہ مطلب سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ شاعر نے اصلی کتبِ تاریخ سے نقل کیا تھا اُس کی تصدیق و تائید زبانی روایات سے بھی ہوتی تھی۔

شاہنامۂ منظومِ فردوسی اغلباً شاہانِ ایران کی قدیم تاریخ سے جس کا نام "خدائی نامہ" تھا اور جو عربوں کی فتحِ ایران سے کچھ ہی مدت قبل پہلوی زبان میں تصنیف ہوا تھا ماخوذ ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ چار صدی کے دوران میں فردوسی کے زمانہ تک بغیر تغیر و تبدل کے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے محاورہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ "بہ تجدید" پا چکی تھی۔ سب سے اول زبان کے لحاظ سے تجدید ہوئی۔ اس تجدید نے یا تو فارسی زبان کے قدرتی ارتقا کا تتبع کیا، اگرچہ یہ ارتقا ایک حد تک ملک کے گہرے سیاسی اور تمدنی انقلاب سے رُک گیا تھا، یا ادبی زندگی کے ایک طویل مدت تک رکے رہنے کی وجہ سے یہ کتاب زمانۂ مابعد میں پہلوی سے جدید فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ جہاں تک کہ اُس کے مضامین کا تعلق ہے اس کتاب میں مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ تبدیلیاں اُن معلومات اور دینی روایات کی وجہ سے جو دوسری تاریخی کتابوں مثلاً "آئین نامہ" سے لی گئی تھیں وقوع میں آئیں۔ متون کے اختلاط کے باعث "خدائی نامہ" کے مختلف نسخے متداول تھے جن میں اکثر اختلافات اور دُوسری روایتیں نقل تھیں جو شاہنامہ میں بھی درج کردی گئی ہیں۔

ابن المقفع کے کیئے ہوئے اردو ترجمۂ "خدائی نامہ" میں بھی اس قسم کی تبدیلیاں ہوئیں۔ کاتبوں اور مالکانِ نسخ اور بعد از ان ذی علم اصحاب نے اُس میں وہ اختلافات جو مختلف نسخوں یا ترجموں سے دستیاب ہوئے شامل کر دیئے۔ یہ ترجمہ متعدد عربی تواریخِ ایران کا جن کے نام "سیر ملوک الفرس" ہیں ماخذ ہے۔ ابن المقفع کے متن کو نقل کرتے ہوئے "سیر الملوک" کے مصنفوں نے کم و بیش ترمیمیں کیں اور دیگر معلومات کو جو مختلف ذرائع سے بہم پہنچیں شامل کر دیا۔

البیرونی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شاہنامہ سے عربی تواریخ نے اقتباسات کئے ہیں، اور بعض علامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہنامہ پر عربی تواریخ کا اثر پڑا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے زیادہ تر قیاسی ہے، اِس لئے کہ "خدائی نامہ" اور اُن کتابوں کی جو "خدائی نامہ" سے ماخوذ ہیں تاریخ ابھی تک تاریک ہے۔ نولڈیکے نے اپنے ترجمۂ تاریخِ طبری (متعلقِ ایرانِ قدیم) اور اُن حواشی میں جو اس کتاب پر لکھے ہیں اور اُس تصنیف میں جو فردوسی کی نظم پر قلمبند کی ہے ایران کی تاریخ کے عربی و فارسی مآخذ و مصادر کے متعلق بعض مسائل مختتم طور پر حل کر دیئے ہیں۔ بیرون روزن (Baron le V. Rosen) نے بھی ایک مخصوص اور مکمل مقالہ میں جس میں خدائی نامہ کے عربی ترجمہ پر نئی روشنی ڈالی ہے بعض واقعات و نتائج کو پیش کیا ہے جو بیش بہا علمی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان

دونوں فضلا کے استنباط کئے ہوئے نتائج پر مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا اور اس لئے اُن کے حوالہ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے اکثر عربی مورخوں نے جن کی تصانیف ہمارے زمانہ تک پہنچ سکی ہیں اپنی معلومات ابن المقفع کے قدیم متن سے حاصل نہیں کی ہیں، بلکہ وہ کسی نہ کسی سیر الملوک کے نسخہ پر مبنی ہیں۔ باوجود اختلافات کے وہ حکایات اکثر اوقات یکساں الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ان مصنّفین نے اپنی ادبی عادت کے مطابق اپنے اقتباسات کو عینًا اپنے مآخذ کے الفاظ میں نقل کر دیا ہے۔ ثعالبی نے بھی دینوری، طبری اور مسعودی کی طرح ابن المقفع کے خدائی نامہ کا براہِ راست استعمال نہیں کیا، بلکہ اُس کا ماخذ "خدائی نامہ" کا ایک ایسا ترجمہ ہے جس پر نظرِ ثانی ہو چکی ہے +

سید حسن برنی

غنچۂ پژمردہ

اے چراغِ بزمِ گلشن، اے جمالِ آشکار
تیرے دم سے تھی کبھی آباد دنیائے بہار

اضطرابِ روئے گلشن ہے پرافشانی تری
انتشارِ بزمِ عشرت ہے پریشانی تری

حُسن کی آنکھیں ہیں نم اس حالتِ غمناک پر
فصلِ گل کو نوحہ گر پاتا ہوں تیری خاک پر

کتنے نغمے ساز میں تیرے ابھی خوابیدہ ہیں
کتنے جلوے ہیں کہ دامن میں ترے پوشیدہ ہیں

جھوم کر اُٹھتی ہے متوالی گھٹا تیرے لئے؟
رقص کرتی ہے کبھی اب بھی صبا تیرے لئے؟

کہاں ہے؟

وہ تنگ و تاریک پیچ در پیچ گلیوں کا مجموعہ جو میرا دماغ ہے اور جس کے حفظانِ صحت کے ذمہ دار چند شاعر، چند فلسفی، اور چند مورخ ہیں اس کرۂ زمین کی طرح اپنے گرد بھی گھومتا ہے، سالانہ چکر میں بھی ہے اور نظامِ شمسی کی طرح خدا جانے کدھر سے آیا ہے اور کدھر کو جا رہا ہے۔ مجھے نہ اس کی گردش پر اعتراض ہے نہ اس کے قرار کی پروا۔ سیر تماشے سے غرض ہے اور وہ پوری ہو رہی ہے۔ رات اِن گلیوں میں عجب طوفان برپا ہؤا اور وہ یوں ہؤا۔

منگل کے دن دس جولائی ۱۵۸۴ء کو "خاموش ولیم" اپنی بیوی کے ہمراہ ساڑھے بارہ بجے بعد دوپہر کھانے کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ بالتھزار جرارڈ (Balthazar Gerard) نے پاسپورٹ طلب کیا۔ شاہزادی (خاموش ولیم کی بیوی) اس شخص کی ہیئت سے متعجب ہوئی اور سراسیمگی سے اپنے سرتاج سے پوچھنے لگی کہ "یہ اجنبی کون ہے"؟ خاموش ولیم نے اُس سائل کے مضطرب چہرے کو کچھ نہ پرکھا اور ایک سکرٹری کو حکم دے دیا کہ پاسپورٹ فوراً تیار کر دو۔ شاہزادی کو چین نہ آیا اور پھر گھبرا کر دبی زبان سے بولی کہ اِس قسم کا شیطنت فرسودہ چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا"۔ مگر "خاموش ولیم" پر کچھ اثر نہ ہؤا اور کھانے کی میز پر حسبِ معمول شاہانہ مگر متین دل لگی والی فقرے بازی ہوتی رہی۔ دو بجے یہ لوگ میز سے اُٹھے، شاہزادہ سب سے آگے تھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں اپنے پرائیویٹ کمرے کی طرف روانہ ہؤا۔ دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ ایک ساتھ والے محراب سے ایک شخص نے نکلتے ہی ایک دو فٹ کے فاصلہ سے پستول کی تین گولیاں چلائیں، سیدھی دل کی طرف۔ ایک تو جسم پھاڑ کر پرلی دیوار پر لگی اور دو جسم ہی میں رہیں۔ شاہزادے نے فرانسیسی زبان میں یہ دو جملے کہے۔

"اے خدا! میری روح پر رحم کر۔"

"اے خدا! میری غریب رعایا پر رحم کر۔"

سوائے ایک "ہاں" کے یہ آخری جملے تھے جو "خاموش ولیم" کی زبان سے نکلے۔ عین اِن فقروں کے بعد اُس کی ہمشیرہ کیتھرین نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم اپنی روح یسوع مسیح کے سپرد کرتے ہو اور اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے سخت نقاہت کی حالت میں نیم شنود

"ہاں"

کو زبان پر رواں کیا اور پھر "خاموش ولیم" ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

۲

قاتل یعنی بالتھزار جرارڈ (Balthazar Gerard) ایک پہلو والے دروازے سے نکل کر انتہائی سرعت سے لپکا۔ قلعہ کی دیوار تک تقریباً پہنچ چکا تھا کہ ایک کوڑے کی ڈھیر سے پاؤں اٹکنے کے باعث ٹھوکر کھا کر گرا۔ اُٹھا تو کئی غلام اور سپاہی کلہاڑیاں لئے ہوئے اُس کے سر پر تھے۔ انہوں نے اسے دبوچا۔ وہ اپنے دونوں پستول وہیں پھینک آیا تھا جہاں اُس نے قتل کیا تھا۔ ارادہ اُس کا یہ تھا کہ خندق سے تیر کر نکل جائے اور اس مطلب کے لئے اُس کے پاس دو مشکیزے اور اُن میں پھونک بھرنے کے لئے ایک پائپ موجود تھا۔ خندق کے پار اُس کے لئے ایک گھوڑا حاضر تھا۔

جب گرفتار ہؤا تو اُس نے دلیری سے جرم کا اقبال کیا۔ فوراً اُسے واپس لایا گیا اور شہر کے مجسٹریٹوں نے اُس پر سوال کئے۔ اس کے بعد اُسے طرح طرح کے عذاب دیئے گئے۔

یہ پست قامت کریہ منظر بالتھزار جرارڈ (Balthazar Gerard) جو ایک تھپڑ کی مار نہ تھا عجب دل گردے کا انسان تھا۔ جب یونہی جھوٹ اُسے کہا گیا کہ شہزادہ نہیں مرا تو نہ اُس نے اِس بات پر اعتبار کیا نہ مایوسی ظاہر کی بلکہ نہایت اطمینان سے یہ کہنے لگا "تین زہر آلود گولیاں شہزادے کے معدے میں مَیں نے چلائیں وہ ضرور مر چکا ہوگا۔ مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ دوسری پستول کی گولیاں نہ چلا سکا۔ اگر میں ہزار فرسنگ دُور ہوتا تو پھر بھی اس قتل کے لئے واپس آتا"۔

اس کے بعد قاتل نے مکمل اطمینان سے ایک طول طویل اقبالِ جرم تحریر کیا۔ اُسے قسم قسم کے وحشیانہ عذاب دیئے گئے مگر ہر عذاب کے بعد وہ آسانی وتحمل سے بلکہ فصاحت سے گفتگو کرتا اور اس بردباری پر اُس کے جج اس قدر متعجب ہوئے کہ انہیں یقین ہوگیا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ ہر قسم کے عذاب اُس نے سہے مگر ایک دفعہ اُس نے

"آہ"

نہ کی یہی کہتا رہا کہ "اگر ہزار دفعہ مجھے سزا موت دی جاتی تو بھی یہ مہم مَیں ضرور دہراتا"۔ جو موجود تھے اُن میں سے بعض نے تو اُس کے انسان ہونے ہی کو باور نہ کیا۔ بعض نے یہ پُوچھا "تم نے کب سے اپنے آپ کو شیطان کے پاس فروخت کیا ہے؟"۔ وہ نرمی سے جواب میں کہنے لگا کہ "مجھے شیطان سے تعارف نہیں"۔ جو خوراک اُسے قید خانہ میں ملتی رہی اُس کے لئے اُس نے ججوں کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ اس عنایت کے صلے میں وہ انہیں نیک اجر دے گا۔ جب پوچھا گیا کہ "کیسے" تو بولا کہ بہشت میں اُن کے لئے وکالت کرے گا۔ قاتل کو یہ حکم سنایا گیا کہ اول اُس کا دایاں ہاتھ آگ کی طرح گرم

لوہے سے ملایا جائے گا اور چھ مختلف چمٹوں سے اُس کا گوشت اُس کی ہڈیوں سے نوچا جائے گا۔ زندہ اُس کے ٹکڑے کئے جائیں گے اور اُس کی انتڑیاں زندگی کی حالت میں نکالی جائیں گی اور اُس کا دل نکال کر اُس کے منہ پر پھینکا جائیگا اور پھر اُس کا سر کاٹا جائے گا۔

۱۴ جولائی کو یہ سزا پوری طرح سخت وحشت سے دی گئی۔ جرارڈ کے اعصاب اِس بلا کے تھے کہ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے وہ ایک نیم بریاں لوتھ تھا مگر جب ایک لوہار کو جو اُس کے پستول کو ہتھوڑے سے چکنا چور کر رہا تھا ایک اُڑنے والے ٹکڑے سے کان پر ذرا سی چوٹ آئی اور لوگ اُس پر ہنسے تو جرارڈ بھی مسکرایا۔ ان ہونٹوں پر وہ تبسم ابھی تھا جب اُس کا دل چیر کر اُس کے منہ پر پھینکا گیا۔ اُس وقت اُس کا دم واپسیں تھا۔

۳

حکومت کے راز عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ خاموش ولیم ۵۱ سال ۱۶ دن کا تھا جب اُسے قتل کیا گیا۔ اُس نے اپنے ملک کو سپین کی غلامی سے آزاد کرنے میں وقف رکھا۔ سپین والوں نے سارے یورپ میں علانیہ مشہور کر رکھا تھا کہ جو شخص خاموش ولیم کو قتل کرے گا اُسے بے شمار انعام ملے گا۔ یہ انعام فلپ شاہنشاہِ سپین کے حکم سے جرارڈ کے وارثوں کو ملا۔ ڈیوک Parma نے اپنے شاہنشاہ کو اِن لفظوں میں اطلاع دی کہ بیچارا جرارڈ پھانسی پا چکا ہے مگر اُس کے ماں باپ موجود ہیں اور وہ سفارش کرتا ہے کہ وہ انعام عطا ہو جس کا ایسا قابلِ تعریف اور فیاضانہ فعل پوری طرح سے مستحق ہے۔ بجائے پچیس ہزار کراؤن موعود کے تین نوابیاں جرارڈ کے والدین کو ملیں اور اُن کا شمار رؤسا میں ہونے لگا۔ کچھ سالوں بعد جب خاموش ولیم کا ولیعہد ستائیس سال سپین میں رہ کر اپنی ڈچ عادات گنوا کر واپس اپنے ملک میں آیا تو فلپ ثانی شاہنشاہِ سپین نے خسروانہ مرحمت سے یہ کہا کہ "تمہیں وہ تینوں نوابیاں واپس مل سکتی ہیں بشرطیکہ تم محصول کا ایک مقررہ حصّہ اپنے والد کے قاتل کے خاندان کو مقررہ طور پر ادا کرتے رہو۔ یہ تینوں نوابیاں خاموش ولیم کی تھیں۔ بیٹے نے اس ستم ظریفی سے نفرت ظاہر کی مگر انسانی تاریخ ہمیشہ کے لئے اس زہر سے آلودہ رہے گی کہ حکومت کے زور پر قاتل کے ورثا کو مقتول کی جائداد بطورِ قصاص ملی۔

خاموش ولیم کا نہ مٹنے والا نام اب بھی اس کے ملک میں زندہ ہے مگر یاد میں صرف کبھی کبھی آتا ہے۔ لوگوں کو فرصت نہیں کہ پرانے دھندوں میں سر کھپائیں۔

۴

طوفان چاہے سمندروں میں ہوں اور چاہے دماغوں میں آخر تھمتے ہیں اور جب خاموش ولیم اور جرارڈ اور

اُن کے رفیقوں اور دشمنوں کو میں آرام سے سُلا چکا اور اپنے اور اُن کے درمیان پورے تین سو چالیس سال کا فاصلہ ازسر نو قائم کر چکا دوقت کی دقت مجھے اکثر رہتی ہے۔ پڑھتے پڑھاتے کبھی میں افلاطون کے یونان میں جا نکلتا ہوں تو کبھی شیلے کے انگلستان میں اور پھر مجھے بیسویں صدی میں واپس آنا قدرے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ صرف آنکھوں سے پڑھتے ہیں مگر دل کو متحرک ہونے سے روکتے ہیں وہ زندہ افلاطون اور زندہ شیلے کی ملاقات سے محروم ہیں) تو یہ خیال آیا کہ اس سارے نظامِ عالم کو "خاموش ولیم" کی طرح خاموش کرنے والا کیا کوئی جرارڈ ہوگا اور کہاں سے آئے گا یا یہ نظام یونہی بے بسی سے خاموش ہو جائے گا؟ جرارڈ اپنی نظروں میں ایک اعلیٰ ترین ہستی تھا۔ جب اُسے ایک سخت مکروہ ستم کا عذاب دیا گیا اور اُس کا سر خون آلود تھا تو وہ اُٹھا اور اُس نے بڑے غرور سے کہا

"Ecce Homo"

عیسائی ملکوں میں استعارتاً اس جملے کے وہی معنے ہیں جو اسلامی ممالک میں انا الحق کے ہیں۔ جرارڈ خلوصِ دل سے رومن کیتھولک تھا اور اُس کے عقیدے میں "خاموش ولیم" جیسے مرتد کو قتل کرنا کارِ ثواب تھا۔ اس لئے اُس نے آپ کو مسیح کے برابر سمجھا۔ اپنے نزدیک وہ ایک مرتد کو قتل کر کے نظامِ عالم کو ایک نئی روح بخش رہا تھا۔ کیا یہ نظام مرتد ہو رہا ہے اور اگر ہو رہا ہے تو کیوں کوئی جرارڈ پیدا نہیں ہوتا؟

۵

یا یہ ہوگا کہ "خاموش ولیم" کے برعکس نظامِ عالم اپنی بیوی کی باموقع خبردار کرنے والی فریاد کو سن لے!! اور یوں قتل ہونے سے بچ جائے! مگر وہ مردم شناس رفیقِ زندگی کہاں ہے؟

فلک پیما

مرہم زخم سینہ ام بادِ صبا نمے شود　　سوختہ ماں شبِ فراق، صبح چرا نمے شود
داغ ز دل خدر کند زخم ز سینہ رو کشد　　مائل آشیانِ من برقِ بلا نمے شود
کشورِ فقر و فاقہ را تا نہ کنم ز کف رہا
سایہ فگن بہ فرقِ من بالِ ہما نمے شود

وحشت

تجلّیات

تقدیر کا گِلہ بھی تو کرنا نہیں مجھے
الزام سر پہ غیر کے دھرنا نہیں مجھے

موجود بھی ازل سے ہُوں اور جاوداں بھی ہُوں
خوفِ فنا نہیں ہے کہ مرنا نہیں مجھے

ساحل پہ جاؤں گا بھی تو موجوں کو چیر کر
کشتی کے بل پہ پار اُترنا نہیں مجھے

منزل مری بلند ہے خورشید و ماہ سے
خورشید و ماہ پر ہی ٹھہرنا نہیں مجھے

ہے کائنات ایک صنم خانۂ جمال
نذرِ مجاز روح کو کرنا نہیں مجھے

طُوفانِ اضطراب ہوں منزل کہیں نہیں
بہتا ہوں برق وار ٹھہرنا نہیں مجھے

مسجودِ مہر و ماہ ہوں، معبُودِ کائنات
سجدہ کسی کے در پہ بھی کرنا نہیں مجھے

خورشید وار مجھ کو چمکنا ہے ایک دن
راتوں کو آہ آہ ہی کرنا نہیں مجھے

گرتا ہوں بار بار ابھرتا ہوں بار بار
کہتا ہے کون گر کے اُبھرنا نہیں مجھے

ہر گام پر ہزار مُصیبت سہی مگر
ہے اقتضائے عشق کہ ڈرنا نہیں مجھے

رہ جائے گا گلوں میں مرا رنگ و بُو اثرؔ
موجِ صبا کی طرح گزرنا نہیں مجھے

آثر صہبائی

لیلا

(۱)

لیلا بابو شیام نرائن کی اکلوتی بیٹی تھی، اندھیرے گھر کا چراغ تھی، خزاں رسیدہ چمن کا تنہا پھول تھی، پھر اگر آٹھ ہی برس کی عمر میں اُس کا بیاہ رچایا گیا تو کسی کو تعجب کیوں ہو، ماں کے ارمان بھرے دل کو کون سمجھاتا "میرے ایک ہی بچی ہے، ہونے کو اوپر تلے چار ہُوئے مگر پرماتما کی اچھیا سے ایک بھی نہ جیا، اور جیتا کیونکر سب کو خود انہوں نے مارا ہے، جب میں نے کہا پروجن کردوں، سگائی لے لوں، جب ہی انہوں نے ٹوکا، ابھی عمر ہی کیا ہے سب ہو جائے گا، آخر ایک بھی نہ رہا، اب میں کسی کی نہ سنوں گی۔ لیلا میری ہے کسی کو کیا حق ہے جو کوئی ٹوک لگائے۔ مَیں نے بات پکّی کرلی ہے، لڑکا لالوں کا لال ہے، صورت شکل روپیہ پیسہ پرماتما کا دیا سب کچھ ہے، پڑھا لکھا بھی خاصا ہے، خاصا نہیں تو اور پڑھ جائے گا، اور زیادہ پڑھے لکھے نک چڑھے ہوتے ہیں، جب دیکھو کتاب سے سر مار رہے ہیں آگ لگے ایسی کتاب کو، جب کوئی بات کرے تو جواب نہیں اور جواب دیا بھی تو "ہوں" "ہاں" ایسا آدمی کس کام کا، سری کرشن نیک اور بھولا ہے باپ کی دکان خاصی چل رہی ہے، اب کوئی دن جاتا ہے کہ وہ بھی دکان پر بیٹھنے لگے گا، دکان کے لائق وہ پڑھ ہی گیا ہے"،

آخر سری کرشن کی لیلا سے شادی ہو کر رہی، مگر قسمت کا لکھا کب ٹلتا ہے، ہونی ہو کر رہتی ہے، پھیرے پھرے ابھی پُورا ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ غریب سری کرشن چیچک کی نذر ہُوا، لیلا کے ماں باپ کو اپنے کم سن داماد کی موت پر بہت رنج ہُوا۔ لیلا خود اس رنج میں شریک تھی مگر اس لئے نہیں کہ یہ اُس کے خاوند کی موت کا غم ہے، اُس غریب کو ابھی اتنی سمجھ کہاں، وہ تو محض اِس لئے غمگین تھی کہ اُس کے ماں باپ غمگین ہیں،

لیلا بیوہ ہوگئی، یہ بچپن اور بیوگی، آٹھ برس کی جان وہ کیا جانے بیوگی کسے کہتے ہیں۔ ودھوا دھرم کیا ہیں مستقبل کا تیرہ و تار میدان سامنے تھا اور وہ کنارے پر اُس کی وسعت سے بے خبر تنہا کھڑی تھی،

بابو شیام نرائن متھرا میں ایک بنک کے مینجر تھے، اُن کی بیوی اور کم سن بیوہ بیٹی کے علاوہ اُن کے ایک دوست کا یتیم لڑکا راج کشور بھی اُن کے یہاں رہتا تھا، اُس کو انہوں نے بچپن سے پالا تھا،

لیلا اور راج کشور ساتھ پلے بڑھے، ساتھ رہے سہے، کھیلے کودے، دونوں پیار اور محبت سے رہتے، دونوں کو

ایک دوسرے سے دل بستگی تھی، راج کشور ایک سکول میں پڑھتا تھا اور لیلا کو خود پڑھاتا تھا، جوں جوں دن گذرتے گئے راج کشور کے دل میں لیلا کی محبت گھر کرتی گئی لیکن اُس نے کبھی اپنے دل کا راز افشا نہ کیا، محبت کی آگ بھڑکتی رہی اور وہ اُسے خاموشی کے ساتھ دل میں دبائے رہا،

محبت کی منزلیں کبھی آسانی سے طے نہیں ہوتیں، محلہ کی عورتوں میں چرچا شروع ہوا، بدگوئی بہت جلد اپنا اثر کرتی ہے، ایک دن جمناجی کے گھاٹ پر جسے عورتوں کی چھوٹی سی پارلیمنٹ سمجھنا چاہئے، لیلا اور راج کشور کا اہم مسئلہ زیر بحث آیا۔

"راج کشور پل بھر کو گھر سے نہیں نکلتا، مرد مانس کو ایسا بھی کیا گھر میں گھس کر بیٹھنا ہے"،

"اور لیلا کو نہیں دیکھتی ہو، پرمیشور میرا جانے اپنے لالہ سے زیادہ راج کشور پر جان دے ہے"

"اری رہنے بھی دے، کون نہیں جانتا ہے، جوان جوون لوگ کو گھر میں بٹھا رکھا ہے، گلو کہہ رہی تھی دو جگہ سے بات آئی، اب کیا بدھواؤں کے بیاہ نہیں ہوتے ہیں، پر کسی کو کرنی ہو تو بات ہے"

اس گفتگو کا مجموعی اثر ہر عورت اپنے ساتھ لے گئی اور اب یہ مسئلہ محلہ بھر کے لئے فرصت کے اوقات کا ایک دلچسپ موضوع تھا جس کی اصل کچھ بھی نہ تھی وہ ایک ایسا امرِ واقعہ بن گیا جس پر یقین نہ لانا گویا حماقت کا ثبوت دینا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ بات راج کشور کے کانوں تک پہنچی، اُس کے جذبات کے ہیجان کا اندازہ مشکل ہے، بے گناہ اور معصوم لیلا پر یہ بے بنیاد بہتان وہ کیونکر برداشت کرتا اور خصوصاً اس صورت میں کہ اس بہتان کا سبب خود اُس کی ذات تھی، اُس نے سوچا اب میرا اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے، میں نے تاؤجی (شیام نرائن) کے نام پر بٹہ لگایا، میں نے لیلا کو کہیں کا نہ چھوڑا، کاش میں نے کبھی اِس گھر کی صورت نہ دیکھی ہوتی، اب میں یہاں نہ رہوں گا، مگر اس سے لیلا کو رنج ہوگا، شاید نہ ہوگا، کیونکہ وہ ابھی نہیں جانتی کہ محبت کیا چیز ہے، چند روز ضرور اُسے خیال رہے گا۔ ہاں چند روز تو ضرور خیال رہے گا مگر پھر رفتہ رفتہ بھول جائے گی۔

آخر راج کشور نے اُسی رات کو بابو شیام نرائن کے نام ایک خط لکھا اور اُس میں تفصیل کے ساتھ اُن کے سایۂ عاطفت سے محروم رہنے کے اسباب بیان کئے، اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور پَو پھٹنے سے پہلے جمناجی کی راہ لی۔

(۲)

جب سورج کی نرم اور ملائم کرنوں نے دنیا کو بے نقاب کیا اور لوگ خواب کے محلوں سے نکل کر پھر وہیں آگئے جہاں رات کو سوئے تھے تو بابو شیام نرائن کھڑے ہوئے راج کشور کا خط پڑھ رہے تھے، اُن کے چہرے سے افسردگی اور

پریشانی کے آثار نمایاں تھے، انہیں راج کشور سے محبت تھی، اسے اپنے بچے کی طرح پالا تھا، لیلا پر بہ ظاہر تو اس واقعہ کا کچھ اثر نہ تھا لیکن دل کی آگ کیونکر بجھتی اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

یہ غریب لیلا کی مصیبتوں کی ابتدا تھی، راج کشور کے جانے کے کچھ ہی مدت بعد بابو شیام نرائن کا انتقال ہو گیا، اپنے عزیز خاوند کی موت کا غم لیلا کی ماں سے برداشت نہ ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ بھی راہی ملک بقا ہوئی، اب لیلا دنیا میں تنہا رہ گئی بھرا ابھرا یا گھر خالی ہو گیا، ماں باپ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے، راج کشور کا خیال بے شک دل میں جاگزیں تھا مگر اُس کا سراغ لگنا معلوم۔

بابو شیام نرائن کے ایک قریبی رشتہ دار تھے لالہ رمیش پرشاد۔ اُن کے پاس افیون کا ٹھیکہ تھا کبھی کبھی چرس اور شراب کا شغل بھی کرتے تھے مگر جہاں تک گھر کا تعلق تھا بہت کفایت شعار تھے چار پانچ آنے روز کی چاٹ اور رات کے وقت دو آنے روز کا دودھ یہ اُن کا ذاتی خرچ تھا۔

لالہ رمیش پرشاد بہ ظاہر لیلی پر ترس کھا کر اُسے اپنے گھر لے آئے اور جیسا کہ ایسے موقعوں پر عموماً ہوتا ہے اُس کے باپ کا تمام نقد و جنس بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اول اول تو لیلا کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن آخر لالہ رمیش پرشاد اپنی خباثتِ نفس سے باز نہ رہ سکے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ایک بزرگ کی حیثیت سے گر کر ایک بے تکلف دوست کی حیثیت اختیار کرنی چاہی، غریب لیلا نے مختلف طریقوں سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ایک روز لالہ جی کو مخاطب کر کے کہا "چاچا جی مجھے آپ کیوں دکھی کرتے ہیں۔ مجھ مصیبت کی ماری کا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے، پرمیشور جانے میں دکھ بھوگنے کے لئے کیوں جی رہی ہوں جب آپ ہی میرے ساتھ ایسا برتاؤ کریں گے تو میں کہاں جاؤں گی، میں آپ کو پتا جی کی جگہ سمجھتی ہوں" لالہ رمیش پرشاد اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اس کے بعد کچھ کہنے کی ہمت تو نہ پڑی مگر لیلا کے ساتھ اُن کے برتاؤ میں بہت فرق آگیا۔ گھر کا تمام کاروبار اُسے انجام دینا پڑتا تھا یہاں تک کہ مصرانی بھی منسوخ کر دی گئی اور اُس کے فرائض بھی لیلا ہی کے سپرد ہوئے، ایک روز لیلا دال میں نمک ڈالنا بھول گئی لالہ رمیش پرشاد کھانا کھانے بیٹھے تو پہلا نوالا منہ میں رکھتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی، اٹھ کر غریب یتیم اور بے کس لیلا کے دو تین لاتیں رسید کیں اور اُسی وقت گھر سے نکال دیا۔

جاڑوں کے دن تھے، رات کا وقت تھا، ہر طرف کہرا چھا رہا تھا ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا، سڑک کی لالٹین ایک آنکھ کا دیو معلوم ہوتی تھی، لیلا کی زندگی میں یہ بہت نازک وقت تھا، سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگی، گھر نہیں در نہیں، کوئی بات پوچھنے والا نہیں، کسی کا سہارا نہیں کیا کرے کہاں جائے، باپ نے جو کچھ نقد و جنس چھوڑا تھا وہ

بھی موذی رمیش کی نذر ہوا۔ جب بہت دیر اسی طرح گزر گئی تو اُسے شانتی دیوی کا خیال آیا، یہ ایک نہایت نیک، خوش خُلق اور رحم دل عورت تھیں، اُن کے خاوند لالہ انوپ سنگھ گوئلا گھر سے خوشحال تھے اور رمیش پرشاد کے مکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر رہتے تھے۔ شانتی کبھی کبھی رمیش پرشاد کے یہاں آیا جایا کرتی تھی اور لیلا سے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی اُسے یہ تو معلوم تھا کہ لیلا یتیم ہے اور بیوہ ہے لیکن اُس کے ساتھ رمیش کے برتاؤ کا اُسے علم نہ تھا اور علم کیونکر ہوتا کم سخن لیلا نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا، اور کوئی کیوں کہنے لگا تھا۔ آج جب رو رو کر لیلا نے اپنی مصیبت کی داستان سنائی تو شانتی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اُس نے تسلّی اور دلاسا دے کر کہا ہم لوگ کل شام کو بنارس جائیں گے اب وہیں قیام کا ارادہ ہے، تمہارا جی چاہے تو ہمارے ساتھ چلنا جس طرح مجھ سے بن پڑے گا میں تمہاری مدد کروں گی، بے کسی اور بے بسی میں ہمدردی کے دو لفظ بھی دنیا کی ہزار نعمتوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں، اگلے دن لالہ انوپ سنگھ گوئلا کی رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ لیلا کو بنارس لے چلنا چاہئے مناسب سمجھا جائے گا تو وہاں کے ودھوا آشرم میں داخل کر دیا جائے گا، لیکن بنارس پہنچنے کے بعد رائے بدل گئی، لیلا نے اپنے حسنِ عمل اور اپنے اطوار و خصائل سے دونوں میاں بیوی کے دل میں گھر کر لیا، اولاد سے محروم تھے لیلا کو خدا کی دین سمجھ کر بہت محبت اور پریم سے رکھنے لگے۔

(۳)

راج کشور نے گھر سے باہر قدم رکھا تو دنیا اُس کی نظر میں تیرہ و تار تھی اُسے کبھی خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا کہ کوئی ایسا دن بھی آنے والا ہے جب مجھے اپنے باپ سے زیادہ عزیز بابو شیام نرائن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑے گا، کسی ایسے وقت کا تصوّر اُس کے امکان میں نہ تھا جب لیلا کی بھولی بھولی صورت اور پیاری پیاری باتوں سے اُس کی آنکھیں اور کان محروم ہو جائیں گے،

انہیں خیالات میں غرق راج کشور بلا کسی ارادے اور قصد کے اسٹیشن پر پہنچ گیا، کسی گاڑی کا وقت نہ تھا بہت دیر تک اسٹیشن پر ٹہلتا رہا، تھوڑی دیر کے بعد ریل آ گئی۔ راج کشور ایک درجہ میں جا کر بیٹھ گیا اُس کے پاس کچھ دام ضرور تھے لیکن ٹکٹ خریدنے کا خیال نہ آیا اور خیال کیونکر آتا کسی خاص مقام تک پہنچنے کا ارادہ ہو یا کم سے کم یہی معلوم ہو کہ یہ گاڑی کس طرف جا رہی ہے تو ٹکٹ کا خیال آئے، راج کشور پر اُس وقت بے خودی طاری تھی، اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں کہاں جا رہا ہوں، اُس پر صرف ایک خیال کا غلبہ تھا، دنیا کیسی ناحق شناس اور ظالم ہے، بلا کسی حقیقت کے بلا کسی بنیاد کے کیا کیا طوفان اُٹھائے گئے ہیں، کیسی کیسی تہمتیں لگائی گئی ہیں، بہتان بھی کس قدر سخت

ظلم ہے، یہ وہ الزام ہے جس کا فیصلہ ملزم کی عدم موجودگی میں بلا کسی جوابدہی کے، بلا کسی صفائی کے صادر کردیا جاتا ہے جس کا کوئی رد نہیں کوئی جواب نہیں کوئی اپیل نہیں،

ریل کے اسی درجہ میں ادھیڑ عمر کے ایک شریف صورت شخص راج کشور کے برابر ہی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے راج کشور کے رنگ ڈھنگ اور طرز و انداز سے معلوم کرلیا کہ کسی شریف کا لڑکا ہے اور پریشان حال ہے یہ بھی خیال آیا کہ شاید کسی بات پر ناراض ہوکر گھر سے بھاگ آیا ہے، بیچارے رحم دل اور خدا ترس آدمی تھے باتوں باتوں میں راج کشور سے تمام حالات معلوم کرکے اُسے مجبور کیا کہ اُن کے ہمراہ کانپور اُتر جائے۔ یہاں انہوں نے راج کشور کو اپنے ایک دوست کے پریس میں کام سیکھنے کے لئے بھیج دیا اور برائے نام کچھ تنخواہ بھی مقرر ہوگئی راج کشور نے بہت محنت اور تن دہی سے کام کیا اور چند ہی ماہ میں ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کا بہت اچھا کمپوزیٹر بن گیا، رفتہ رفتہ پریس کے متعلق اور بھی کام سیکھ لئے اور تنخواہ میں سے ایک خاص رقم پس انداز بھی کرلی، اسی عرصہ میں بنارس کے ایک پریس میں منیجر کی جگہ خالی ہوئی، راج کشور نے بھی عرضی بھیجی اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر منیجر مقرر ہوگیا، بنارس میں اُس کی مہارت اور بڑھ گئی اور اُس نے ملازمت ترک کرکے خود اپنا پریس قائم کرلیا، اس پریس کو رفتہ رفتہ اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف یوپی، بلکہ ہندوستان میں اس کے مقابلے کے پریس کم ہیں۔ کامیابی اور خوش نصیبی، استقلال اور محنت کے ہمرکاب رہتی ہے۔

راج کشور لیلا کو بھولا تو نہ تھا لیکن اُس کو بھولنے اور اُس کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکالنے میں اُس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جب ذرا تنہائی میں بیٹھتا وہ نظروں کے سامنے موجود ہوتی، جب کسی خوش رُو حسین لڑکی کو دیکھتا بیتابانہ لیلا کا خیال آتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُس کے بہی خواہ اُس کے دوست احباب اُسے شادی کے لئے مجبور کرتے تو وہ وحشت زدہ سا ہو جاتا اور اُن کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکتا۔

اپنے کاروبار سے جو وقت راج کشور کو ملتا اُس کا زیادہ حصہ وہ ہندوؤں کی سوشل اصلاح میں صرف کرتا تھا خصوصًا بدھوا بواہ کا وہ بڑا حامی اور کمسنی کی شادی کا بدترین دشمن تھا، اور ان مقاصد کو جہاں تک ہو سکے عملی جامہ پہنانے کے لئے اُس نے بہت سا روپیہ بھی صرف کیا، بنارس کے ودھوا آشرم کی کامیابی میں اُس کا بڑا حصہ تھا، غرض انہی اوصاف کی بدولت آج راج کشور کا نام بنارس کے بچے بچے کی زبان پر تھا،

آخر ایک دن اُس کے احباب نے بہت مجبور کیا اور کہا کہ اصلاح کی سب سے بہتر صورت عمل ہے، تم اگر بدھوا بواہ کے حامی ہو تو خود کسی بدھوا سے شادی کرو، مثال کا جو اثر ہوتا ہے وہ خالی الفاظ کا نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے

کہ اب سے پہلے راج کشور نے اپنی شادی کے مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا تھا، جب کبھی اس کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کی اُس کے دماغ نے کام نہ دیا اور خیالات میں کچھ ایسا ہیجان برپا ہوا کہ اُسے فوراً اپنی توجہ کو کسی اور طرف مبذول کر دینا پڑا لیکن آج جس صورت سے یہ مسئلہ پیش کیا گیا اُس نے راج کشور کو اپنے احباب کی تجویز پر راضی ہو جانے کے لئے مجبور کر دیا، خیالات اور جذبات کا طوفان آج بھی عقل و ہوش کو بہائے لئے جاتا تھا لیکن اصلاح کی خواہش اور خلقِ خدا کے ایک بے زبان اور مظلوم ترین طبقہ کی خیر طلبی اس کی مقتضی تھی کہ وہ اس معاملہ میں اپنے جذبات کو حائل نہ ہونے دے اور شاہراہِ عمل پر گامزن ہو جائے،

قسمت دیکھئے راج کشور کی شادی کے جس قدر پیغام آئے اُن سب میں لالہ انوپ سنگھ گوئلا کے یہاں کا پیام سب سے زیادہ بہتر تصور کیا گیا اور پھیرے پھرنے کے بعد راج کشور نے جب پہلی مرتبہ لیلا کو دیکھا تو اُس کی حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا بے اختیار زبان سے نکلا "لیلا" "لیلا" اور چکر کھا کر زمین پر آ رہا، اِدھر لیلا پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور سارا مجمع اِس عجیب و غریب واقعہ پر مبہوت ہو کر رہ گیا۔

جب دن پھرتے ہیں تو بعض اوقات ایسی خلاف توقع اور بعید از قیاس باتیں ظہور میں آجاتی ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا، محبت کے جذب و کشش کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جن دلوں کو یہ نعمت نصیب ہوئی ہے دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں رکھ سکتی۔

حامد اللہ افسر

نوائے راز

خودی کا دور گیا اور ہوشیار ہوا
میں پی کے جامِ محبت شرمسار ہوا

نظر نواز ہر اک سمت حسنِ یار ہوا
نگاہِ شوق پہ اب مجھ کو اعتبار ہوا

ضیائے حسن نے روشن کیا نگاہوں کو
میں آج شاہدِ معنی سے ہمکنار ہوا

سبب ہے زیست کا بے قراریِ دل ہی
قیامت آئے گی دل کو اگر قرار ہوا

اب اپنے حسنِ نظر کا کرے نہ کیوں ماتم
وہ کم نگاہ جو شرمندۂ بہار ہوا

گناہگار غلط ہیں گناہگار نہیں
کہ جبر و قدر پہ کب مجھ کو اختیار ہوا

پہنچنا منزلِ مقصود پر تھا کیا مشکل
نظر فریب مگر حسنِ رہ گزار ہوا

تڑپ کے اہلِ نظر سجدے میں گرے فوراً
کچھ اس ادا سے نمودار حسنِ یار ہوا

بہ فیضِ مشقِ سخن ہے کہ رازؔ محفل میں
مرے کلام پہ ہر اک کو اعتبار ہوا

ابو الفاضل رازؔ چاندپوری

اعجازِ سخن

جان دی میں نے دل لگی ہی تو ہے
آپ کا رونا بھی ہنسی ہی تو ہے

دل میں ہے جستجوئے نقشِ قدم
کیا کہیں تم سے بے خودی ہی تو ہے

پی گیا ہے سمجھ کے زمزم شیخ
کیا ہوا آخر آدمی ہی تو ہے

ہو گئی شام دور ہے منزل
سو گئے پاؤں بے کسی ہی تو ہے

دل ادھر پھر گیا ادھر آنکھیں
نہ بنی اُن سے دوستی ہی تو ہے

ہے قفس میں بھی آشیاں کا خیال
حرفِ پرواز بے کسی ہی تو ہے

بت بھی اب بولنے لگے منہ سے
کر لیا رام بندگی ہی تو ہے

نہیں آنکھوں میں اشکِ خوں آلود
یہ بھی اک رنگِ مفلسی ہی تو ہے

خاک ہونا ہے ایک روز تپشؔ
نقشِ ہستی بھی فانی ہی تو ہے

عبداللطیف تپشؔ

غزل

کیف نہ مجھ تک آسکا بادہ چکاں نگاہ سے
جلووں نے جان توڑ دی دُور ہی جلوہ گاہ سے

سجدہ نہ اُن کو کر سکا شوق بھری نگاہ سے
ذوقِ تباہ ہو گیا وسوسۂ گناہ سے

دَیر سے کچھ ہوئے شروع کچھ درِ خانقاہ سے
مِل گئے سب یہ راستے عشق کی شاہراہ سے

عشق نے لیں ہر ہمتیں حسن نے کیں جو کوتہیں
عشوۂ بے دریغ سے غمزۂ بے پناہ سے

حسن بھی تھا لطیف تر رنگ بھی غازۂ سحر
پھر بھی تجلّیوں کا بار اُٹھ نہ سکا نگاہ سے

خانہ خرابیوں میں اک رنگ سے دوڑنے لگا
کس کی نگاہ لڑ گئی میرے دلِ تباہ سے

کرلی چمن میں منضبط ایک کتابِ معرفت
چُن لئے میں نے کچھ حروف ہر ورقِ گیاہ سے

اُن کے ستم جتائے کیوں بن کے طبیب آئے کیوں
درد کچھ اور بڑھ گیا طعنۂ داد خواہ سے

ماحصلِ فغاں کہاں، جان سے ناامید ہوں
دل بھی تباہ ہو گیا گرمیٔ اشک و آہ سے

آپ کو کس خطا پہ ہم مستحقِ عطا کریں
پُوچھ رہی ہیں رحمتیں ساغرِ بے گناہ سے

ساغر نظامی

سنیاسی

(۱)

کھوہ کے کنارے

سنیاسی۔ لیل و نہار کا اختلاف میرے لئے نہیں۔ نہ گردشِ ماہ و سال میرے لئے ہے۔ وقت کا دریا جس کی لہروں پر دنیا برگ و گیاہ کی طرح رقصاں ہے میرے لئے ساکن ہے۔ میں اپنی ذات میں مستغرق، اکیلا اس تاریک غار میں بیٹھا ہوں۔ ابدی رات اُس کوہستانی جھیل کی مانند جو اپنے عمق سے آپ ہی خائف ہو خاموش ہے۔ پانی پہاڑ کی دراڑوں سے رس رس کر ٹپک رہا ہے اور نالیوں میں بوڑھے مینڈک تیر رہے ہیں۔ میں بیٹھا نیستی کے نغمے گنگناتا ہوں۔ عالم کی حدود ایک ایک کر کے مٹ رہی ہیں۔ ستارے وقت کی سندان سے اڑی ہوئی چنگاریوں کی طرح افسردہ ہیں اور میری مسرت رشو کی مسرت ہے جو اُس کو اُس وقت ملتی ہے جب وہ خواب کی ابدیتوں سے بیدار ہو کر اپنے تئیں بے پایاں لاہوت کے قلب میں تنہا پاتا ہے۔ میں آزاد ہوں، میں احدِ اکبر ہوں، اے ہستی! اے مایا! جب میں تیرا غلام تھا تو نے میرے دل کو خود اُس کا دشمن بنا دیا اور اُس کی دنیا میں خودکشی کی خوفناک جنگ برپا کر دی۔ خواہشات نے جن کا انجام باہمی پیکار اور حریصانہ گرسنگی کے سوا کچھ نہ تھا مجھے مجنون کر دیا۔ میں دیوانہ وار اپنے سایہ کے تعاقب میں ہر طرف دوڑتا تھا۔ تو نے اپنی لذات کے تازیانہ ہائے برق پاش سے مجھے آسودگی اور اطمینان کی حدود سے باہر بھگا دیا۔ شہوات جو تیرا جال ہیں ہمیشہ مجھے بے انت اکال میں لے گئیں جہاں، کول و مشرب خاک اور بخارات میں بدل جاتے تھے ——— آخر میری دنیا آنسوؤں سے اور خاک سے آلودہ ہوئی اور میں نے قسم کھائی کہ اے بے پایاں شہود ——— اے فریبِ مسلسل میں تجھ سے انتقام لوں گا۔ میں نے حصارِ ابدیت میں پناہ لی اور تیری فریب بھری روشنی سے متواتر جنگ کی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے اور بے بس ہو کر میرے قدموں میں گر پڑی ——— اب جب کہ میں خوف اور شہوات سے آزاد ہوں، جب کہ تیرگی غائب ہو چکی ہے، میرا گیان پاکیزہ اور منور ہے، میں اطمینان اور ثبات کے ساتھ فریب اور دغا کی مملکت کے قلب میں جاتا ہوں، اب وہ مجھ پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔

(۲)

راہ کے کنارے

سنیاسی۔ کس قدر تنگ ہے یہ زمین مسلسل افقوں سے محدود اور محبوس۔ درخت، مکان، بے حساب چیزیں میری نگاہوں پر اژدہام کر رہی ہیں۔ روشنی نے ایک قفس کی طرح تاریک ابدیت کو قید کر رکھا ہے۔ لمحے اس کی حدود میں محبوس پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے اور چلاّتے ہیں ——— لیکن یہ غوغائی لوگ کیوں امڈے چلے آرہے ہیں۔ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ وہ کسی شے کے نقصان سے ہمیشہ خائف نظر آتے ہیں ——— کسی ایسی شے کے نقصان سے جو کبھی انہیں دستیاب نہ ہوگی۔

ہجوم گذر جاتا ہے گاؤں کا بڈھا آدمی اور دو عورتیں آتی ہیں

پہلی عورت۔ مجھے تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

دوسری عورت۔ لیکن کون کہتا ہے تم بوڑھی ہو؟

بڈھا۔ بیوقوف لوگ ظاہر کو دیکھ کر رائے قائم کرتے ہیں۔

پہلی عورت۔ ہم تو بچپن سے تمہارے ظاہر کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ سالہا سال گذر گئے لیکن اس میں تو کوئی تغیر نہیں ہوا

بڈھا۔ صبح کے آفتاب کی مانند

پہلی عورت۔ ہاں صبح کے آفتاب کی مانند اُس کی عریاں درخشندگی میں۔

بڈھا۔ تم حد سے زیادہ منطقی ہو۔ غیر ضروری چیزوں کا خیال کرتی ہو۔

دوسری۔ انگا۔ ان فضول باتوں کو چھوڑ، چل گھر چلیں۔ میرا شوہر خفا ہوگا۔

پہلی عورت۔ اچھا، رخصت، کچھ مضائقہ نہیں، آپ ہمارے ظاہر کو دیکھ کر ہی رائے قائم کیجئے۔

بڈھا۔ اس لئے کہ تمہارا کوئی قابلِ ذکر باطن نہیں ہے (چلے جاتے ہیں)

تین دہقان آتے ہیں

پہلا دہقان۔ اچھا میری ہتک؟ ناہنجار! دیکھنا وہ پچھتائے گا۔

دوسرا دہقان۔ اس کو سبق تو دینا چاہئے، اور اچھی طرح۔

پہلا دہقان۔ ایسا سبق جو تا دمِ مرگ یاد رہے۔

تیسرا دہقان ۔ ہاں دل مضبوط کرلو اب اس پر ۔ مہلت نہ دینا ۔

دوسرا دہقان ۔ موٹا کس قدر ہوگیا ہے ۔

پہلا دہقان ۔ اب پھٹنے کو ہے ۔

تیسرا دہقان چیونٹی کی موت آتی ہے تو اُس کے پر نکل آتے ہیں ۔

دوسرا دہقان ۔ لیکن کوئی ترکیب بھی سوچی ؟

پہلا دہقان ۔ ایک کیا ہزاروں ہیں اس کے گھر پر ہل چلادوں گا ۔ منہ کالا کر کے گدھے پر چڑھا کر شہر میں نہ پھرایا تو بھی زندگی دوبھر کردوں گا (چلے جاتے ہیں)

دو طالب علم آتے ہیں

پہلا ۔ مجھے یقین ہے کہ پروفیسر م ـــــ مقابلے میں کامیاب رہے ۔

دوسرا ۔ نہیں ، پروفیسر ج ـــــ کامیاب تھے ۔

پہلا ۔ پروفیسر م ـــــ آخر تک اپنے دلائل پر قائم رہے انہوں نے بتایا کہ لطافت کثافت سے مشتق ہے ۔

دوسرا ۔ لیکن پروفیسر ج ـــــ نے قطعی طور پر ثابت کردیا تھا کہ کثافت کا مصدر لطافت ہے ۔

پہلا ۔ ناممکن !

دوسرا ۔ روز روشن کی طرح ظاہر !

پہلا ۔ بیج درخت سے لگتا ہے ۔

دوسرا ۔ درخت بیج سے نکلتا ہے ۔

پہلا ۔ سنیاسی ان میں کون سا خیال صحیح ہے ، کثافت ابدی ہے یا لطافت ؟

سنیاسی ۔ کوئی بھی نہیں ۔

دوسرا ۔ کوئی بھی نہیں ! یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

سنیاسی ۔ آغاز انجام ہے اور انجام آغاز ۔ یہ ایک دائرہ ہے ۔ کثافت اور لطافت کا امتیاز تمہاری جہالت ہے ۔

پہلا ۔ یہ بالکل واضح ہے ۔ میرا اُستاد بھی یہی کہتا تھا ۔

دوسرا ۔ یقیناً میرے استاد کا خیال اس سے زیادہ متفق ہے (چلے جاتے ہیں)

سنیاسی - یہ پرندے الفاظ سے پیٹ بھرتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں جب ان کو چند ایسے خوش آیند اور بے معنی الفاظ مل جائیں جن سے وہ باتیں بنا سکیں۔

دو نوخیز مالنیں گاتی ہوئی آتی ہیں

تھکا دینے والے لمحے گذر گئے۔ وہ پھول جو آغوشِ نور میں شگفتہ ہوئے تھے مرجھا کر تاریکی میں گر پڑے۔ میں کہتی تھی اپنے محبوب کے لئے صبح کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہار گوندھوں گی لیکن صبح گذر گئی۔ پھول ابھی تک اکٹھے نہیں ہوئے اور میرا محبوب چلا گیا۔

راہ گیر - میری پیاری۔ یہ تاسف کیوں۔ جب ہار ہونگے پہننے والے بھی مل جائیں گے۔

پہلی - اور تکمیل بھی تیار ہو گی۔

دوسری - ارے اتنا کیوں بوکھلایا ہے؟ سر پر چڑھا آتا ہے۔ اندھا ہوا ہے کیا؟

راہ گیر - میری جان۔ یہ بے فائدہ جھگڑا کیوں ہے؟ ہمارے درمیان سے تو ہاتھی گذر سکتا ہے۔

دوسری - اچھا۔ تو میں کیا کوئی بلا ہوں جو تم قریب آتے تو تمہیں ہڑپ کر جاتی؟ (ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

ایک بوڑھا فقیر آتا ہے

دولت والو۔ غریب پر بھی رحم کرو۔ خدا تمہارے اقبال میں ترقی دے اپنے خزانوں میں سے ایک مٹھی فقیر کو بھی دو۔

ایک سپاہی آتا ہے

چلتا بن یہاں سے۔ دیکھتا نہیں وزیر صاحب کا لڑکا آ رہا ہے۔

سنیاسی - دوپہر کا عالم ہے۔ آفتاب تیز و روشن ہو رہا ہے۔ آسمان تانبے کا ایک سرخ پیالہ نظر آتا ہے۔ زمین آتشین آہیں بھر رہی ہے۔ ریگ کے متحرک مرغولے پاس سے رقص کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ آہ۔ کیا کیا انسانی مناظر میں نے دیکھے ہیں؟ کیا اب پھر میں ان کی طرح ادنیٰ ہو سکتا ہوں؟ نہیں میں آزاد ہوں۔ یہ دنیا ——— یہ زنجیر اب میرے پاؤں میں نہیں۔ میرا مسکن بے پایاں تنہائی ہے۔

ایک لڑکی اور ایک عورت آتی ہیں

عورت - کیا تو رگھو کی بیٹی ہے تجھے اس رستے سے دُور رہنا چاہئیے۔ جانتی نہیں یہ راستہ مندر کو جاتا ہے۔

وسنتی - میں تو ایک طرف ہوں۔

عورت ۔ شاید میرا آنچل تجھ سے چھو گیا ہے میں اپنے چڑھاوے دیوی کے سامنے لے جا رہی ہوں ـــــ یہ نجس تو نہیں ہوئے۔
وسنتی ۔ ہرگز نہیں ۔ تمہارا آنچل مجھ سے نہیں چھوا ۔ (عورت چلی جاتی ہے) میں وسنتی ہوں رگھو کی بیٹی تیرے پاس آجاؤں بابا!
سنیاسی ۔ کیوں نہیں ؟ بچی !
وسنتی ۔ لوگ کہتے ہیں میں نجس ہوں ۔
سنیاسی ۔ وہ سب نجاست اور آلودگی ہیں وہ ہستی کی ناک پر لٹکتے ہیں، پاکیزہ اور منزہ صرف وہ ہے جس نے اس دنیا کو فراموش کر دیا ہے ۔ بیٹی تو نے کیا کیا ہے ؟
وسنتی ۔ میرے باپ نے جو اب مر چکا ہے، اِن کے قوانین اور دیوتاؤں کی نافرمانی کی اور ان کی رسوم پوری نہیں کیں ۔
سنیاسی ۔ تو مجھ سے دور کیوں کھڑی ہے ؟
وسنتی ۔ کیا تو مجھ سے چھوئے گا ؟
سنیاسی ۔ ہاں، کیونکہ مجھے حقیقی طور پر کوئی چیز نہیں چھو سکتی ۔ میں ہمیشہ دور کی بے پایانیوں میں رہتا ہوں ۔ تو چاہے تو یہاں بیٹھ سکتی ہے ۔
وسنتی (سسکیاں بھرتے ہوئے) ایک بار اپنے پاس بلا کر پھر مجھ سے نہ کہنا کہ یہاں سے چلی جا ۔
سنیاسی ۔ بچی اپنے آنسو پونچھ ۔ میں سنیاسی ہوں ۔ نہ میرے دل میں محبت ہے نہ نفرت ۔ میں تجھے اپنا نہیں بنا سکتا اس لئے تجھ سے نفرت بھی نہیں کر سکتا ۔ تو میرے لئے نیلے آسمان کی مانند ہے ۔ تو ہے اور نہیں ہے ۔
وسنتی ۔ دیوتاؤں اور انسانوں دونوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے ۔
سنیاسی ۔ میں نے بھی دیوتاؤں اور انسانوں دونوں کو چھوڑ دیا ہے ۔
وسنتی ۔ تیری ماں ہے ؟
سنیاسی ۔ نہیں ۔
وسنتی ۔ نہ باپ ؟
سنیاسی ۔ ہاں ۔
وسنتی ۔ نہ کوئی رفیق ؟
سنیاسی ۔ ہاں ۔
وسنتی ۔ تو میں تیرے ساتھ رہوں گی تو مجھے چھوڑے گا تو نہیں ۔

سنیاسی ۔ میں "مہ چھوڑنا" ترک کرچکا ہوں ۔ تُو میرے پاس آسکتی ہے لیکن مجھ سے قریب نہیں ہو سکتی ۔
وسنتی ۔ بابا میں تیری بات نہیں سمجھتی ۔ دنیا بھر میں میرے لئے کہیں پناہ نہیں ہے ؟
سنیاسی ۔ پناہ! کیا تُو نہیں جانتی یہ دنیا ایک اتھاہ غار ہے ۔ انبوہِ خلائق فنا کے روزن سے پناہ کی تلاش میں نکلتا ہے اور خلا کے فراخ منہ میں جاکر کھو جاتا ہے ــــــ تیرے سامنے جھوٹ کے پیکر ہیں ان کی بضاعت واہمہ ہے ۔ یہ تیری آرزوؤں کو دھوکا تو دیتے ہیں لیکن ان کو سیر نہیں کرسکتے ۔ آجا ــــــ میری بچّی یہاں سے آجا ۔
وسنتی ۔ لیکن بابا وہ تو بہت خوش نظر آتے ہیں ۔ ہم ان کو راہ کے کنارے سے بھی نہ دیکھیں ؟
سنیاسی ۔ افسوس وہ نہیں سمجھتے ۔ وہ نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا ایک ابدی موت ہے ۔ یہ ہر لمحہ مرتی ہے لیکن فنا کبھی نہیں ہوتی ۔ اور ہم اِس دُنیا کی مخلوق، موت سے پرورش پاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں ۔
وسنتی ۔ بابا، تو نے مجھے خوف زدہ کردیا ! (ایک مسافر آتا ہے)
مسافر ۔ یہاں آس پاس کہیں بسیرے کی جگہ ہے ؟
سنیاسی ۔ بسیرے کی جگہ ! میرے بچے تیرے نفس کی تہ میں ہے ۔ اور کہیں بسیرے کی جگہ نہیں ۔ اس کو تلاش کر ۔ اگر تُو نجات چاہتا ہے تو اس پر ثابت رہ ۔
مسافر ۔ لیکن میں تھکا ہوا ہوں ۔ میں ٹھکانا چاہتا ہوں ۔
سنیاسی ۔ آ ۔ میری کُٹی یہاں سے دُور نہیں ۔ آ ۔
مسافر ۔ لیکن تُو کون ہے ؟
وسنتی ۔ کیا تم ضرور معلوم کروگے ؟ میں رگھو کی بیٹی ہوں ۔
مسافر ۔ ہری ہری ۔ میں یہاں نہ ٹھہروں گا ۔ (چلا جاتا ہے)

کچھ آدمی کسی کو چارپائی پر اُٹھائے ہوئے لاتے ہیں

ایک ۔ اب تک بے خبر سو رہا ہے ،
دوسرا ۔ اور بوجھل کتنا ہے مردود !
ایک راہگیر ۔ تم کسے لے جا رہے ہو ؟
تیسرا ۔ بندی جلاہا اس طرح سو رہا تھا جیسے مر گیا ہے اور ہم اسے اٹھا لائے ۔
دوسرا ۔ لیکن بھائی میں تو تھک گیا ہوں ۔ آؤ ذرا اسے جھنجھوڑ کر جگا دیں ۔

بندی (جاگتا ہے) ای-آ-اُو

تیسرا- یہ کیا شور ہے؟

بندی- میں کہتا ہوں تم کون ہو؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ (چارپائی کندھوں سے اتار کر نیچے رکھ دیتے ہیں)

تیسرا- شریف مُردوں کی طرح تم سے خاموش نہیں رہا جاتا۔

دوسرا- ہٹ دیکھو اِس کی! مر کر بھی چپ نہیں رہتا۔

تیسرا- تمہارے لئے یہی بہتر تھا کہ تم خاموش رہتے۔

بندی- افسوس مَیں نے آپ کو مایوس کیا- آپ کو غلطی ہوئی ہے مَیں مرا نہیں تھا بلکہ گہری نیند سو رہا تھا۔

دوسرا- میں تو اس کی ہوشیاری کی داد دیتا ہوں- صرف مرا ہی نہیں بحث بھی کرتا ہے۔

تیسرا- سچی بات تو یہ کبھی مانے گا ہی نہیں- چلو اس کی تجہیز و تکفین تو کریں۔

بندی- آپ کے سر کی قسم میں آپ کی طرح زندہ ہوں (وہ قہقہے لگاتے اُس کو لے جاتے ہیں)

سنیاسی- لڑکی اپنا بازو ننھے سے سر کے نیچے رکھ کر سو گئی ہے- اب وقت ہے کہ اِس کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں- بزدل! ـــــــ کیا تُو بھاگ جائے گا؟ اور اس ننھی مخلوق سے بھاگے گا؟ نہیں- فطرت کے عنکبوت کے یہ جالے بھنگوں کے لئے باعثِ خطر ہو سکتے ہیں- مجھ جیسے سنیاسی کے لئے نہیں۔

وسنتی (نیند سے چونک کر) بابا کیا تُو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہے؟ بھاگ گیا ہے

سنیاسی مَیں تیرے پاس سے کیوں چلا جاؤں؟ مجھے کیا خوف ہے؟ کیا میں ایک سائے سے خائف ہو جاؤں گا؟

وسنتی- بابا کیا تجھے رستے پر شور سنائی دیتا ہے؟

سنیاسی- لیکن میری روح میں سکون ہے۔

ایک جوان عورت اور اُس کے پیچھے چند آدمی آتے ہیں

عورت- جاؤ پیچھا چھوڑو میرا- مجھ سے محبت کا ذکر نہ کرو۔

پہلا آدمی- مگر کیوں؟ میرا جرم کیا ہے؟

عورت- تم مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں۔

پہلا آدمی- غلط- اگر ہمارے دل پتھر کے ہوتے تو کام دیوتا کے تیر وہاں گھاؤ نہ ڈال سکتے۔

ایک اور آدمی- مرحبا- خوب کہا۔

دوسرا آدمی - ہاں ہاں اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے ؟

عورت - جواب! تم سمجھے ہو کہ تم نے کوئی بڑی لاجواب بات کہی ہے ؟ نہیں ! یہ ایک لغو بات ہے -

پہلا آدمی - صاحبو میں اسے تمہارے فیصلے پر چھوڑتا ہوں - جو میں نے کہا وہ یہ تھا کہ اگر ہمارے دل پتھر کے ہوتے تو ـــــ ؟

تیسرا آدمی - ہاں ہاں - اس کا تو جواب نہیں، لاجواب ہے -

پہلا آدمی - مَیں انہیں سمجھاتا ہوں انہوں نے کہا " مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں - کہا ہے نا انہوں نے ؟ اچھا - میں نے جواب دیا کہ اگر ہمارے دل واقعی پتھر کے ہوتے تو کام دیتا کہ تیر وہاں گھاؤ نہ ڈال سکتے ـــــ سمجھے ؟

دوسرا آدمی - میاں چوبیس سال سے مَیں شہر میں راب بیچتا ہوں تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری بات نہیں سمجھتا ؟

(چلے جاتے ہیں)

سنیاسی - میری بچی تو کیا کر رہی ہے ؟

وسنتی - بابا مَیں تیری چوڑی ہتھیلی کو دیکھتی ہوں - میرا ہاتھ ایک پرندہ ہے ننھا سا جو اپنا آشیانہ یہاں بناتا ہے - تیری ہتھیلی فراخ ہے، ارضِ بسیط کی طرح فراخ، جس میں ہر شے موجود ہے یہ خطوط دریا ہیں یہ پہاڑ (اپنا رخسار اُس پر رکھ دیتی ہے)

سنیاسی - نیز المس ملائم ہے میری بیٹی لمس خواب کی طرح - مجھے معلوم ہوتا ہے اِس لمس میں کچھ وہ عظیم تاریکی ہے جو عصائے ابد کے ساتھ آدمی کی روح کو چھوتی ہے ـــــ بچی تو دن کے نور کی تیتری ہے تیرے لئے پرندے پھول اور کھیت ہیں - تو مجھ میں کیا پا سکتی ہے ؟ مجھ میں، جس کا مرکز تو "احد" ہے لیکن محیط کہیں نہیں -

وسنتی - مَیں کچھ نہیں چاہتی میرے لئے تیری محبت بس ہے -

سنیاسی - نادان لڑکی سمجھتی ہے مَیں اسے پیار کرتا ہوں ـــــ کتنی سادہ دل ہے ! وہ اس خیال سے خوش ہے ہونے دو - یہ دنیا فریب میں پرورش پاتی ہے اس کے اطمینان کے لئے فریب ہی چاہیئے -

وسنتی - بابا گھاس پر پھیلی ہوئی یہ نازک بیل جو کسی درخت کی تلاش میں ہے کہ اپنے تئیں اُس کے گرد لپیٹ لے میری بیل ہے - مَیں نے اِس کی پرورش کی ہے اور اِس کو پانی دیا ہے ـــــ اُس وقت سے جب اِس کی دو ننھی ننھی پتیاں ایک بچے کی روئی آواز کی طرح ہوا میں نمودار ہوئیں - یہ بیل میں ہوں ـــــ یہ راستے کے کنارے آگی ہے اور آسانی سے پائمال ہو سکتی ہے ـــــ تو یہ ننھے ننھے پھول دیکھتا ہے نافرمانی رنگ کے، سینوں میں سفید سفید داغ لئے ہوئے - یہ سفید داغ اِن کے خواب ہیں - آمیں آہستہ آہستہ ان پھولوں سے تیری پیشانی کو سہلاؤں - میرے

لئے حسین اشیا کلید ہیں اُس تمام کائنات کی جس کو مَیں نے نہ دیکھا ہے نہ جانا ہے۔

سنیاسی ۔ نہیں نہیں، حسین اشیا سب مایا ہیں - جاننے والے کے لئے پھول اور خاک برابر ہیں لیکن یہ کیا کیفیت ہے جو میرے خون میں سرایت کر رہی ہے اور جس نے قوسِ قزح کے تمام رنگوں سے باریک غبار کا پردہ میری نظر کے سامنے تان دیا ہے؟ کیا یہ فطرت ہے جو میرے حواس کو ناکارہ کرکے اپنے خوابوں کا جال میرے گرد بُن رہی ہے؟ ریکا یک بیل کو اکھاڑ دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے) بس بس یہ تو موت ہے۔ مجھ سے یہ تیرے کھیل کیا ہیں، نادان بچی؟ میں سنیاسی ہوں میں نے تمام علائق کو قطع کر دیا ہے میں آزاد ہوں - بس بس - یہ آنسو بس - آہ مَیں ان کو برداشت نہیں کر سکتا لیکن یہ سانپ ــــــ یہ غصہ میرے دل میں کہاں مخفی تھا - جو اپنے نہاں خانہ سے پھنکارتا ہوا نکل آیا۔ نہیں نہیں یہ ابھی سرد نہیں ہوئے - اتنی ریاضت کے بعد بھی زندہ ہیں - آہ! یہ جہنمی مخلوق، جب ان کی مالکہ وہ ساحرہ، اپنی سحرکار بنسری کو بجاتی ہے، میرے دل میں ناچتی اور اپنے ڈھانچوں کو کھڑکھڑاتی ہے۔ مت رو - میری بچی - میرے پاس آ - تُو میرے لئے آوارہ ستارے کے نغمے کی طرح گم شدہ عالم کی آواز ہے - تُو میرے دل میں وہ شے لائی ہے جو اِس فطرت سے لاانتہا طور پر زیادہ ہے ــــــ زیادہ ہے آفتابوں سے، زیادہ ہے ستاروں سے، عظیم ہے تاریکی کی مانند۔ مَیں اسے پہلے نہ جانتا تھا - اس سے ڈرتا تھا - جا واپس جا - جہاں سے تُو آئی ہے وہاں جا - اے نامعلوم کی قاصدہ -

وسنتی ۔ بابا مجھے چھوڑ کر نہ جا - تیرے سوا میرا کوئی نہیں۔

سنیاسی ۔ میں ضرور جاؤں گا - میرا خیال تھا میں جانتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا، تاہم میں ضرور جاؤں گا - مَیں تیرے پاس سے جاتا ہوں، اِس لئے کہ جانوں کہ تُو کون ہے؛

وسنتی ۔ بابا اگر تُو چلا جائے گا تو میں مر جاؤں گی۔

سنیاسی ۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے مجھے مت چھُو، مَیں ضرور آزاد ہونگا (بھاگ جاتا ہے)

(۳)

سنیاسی ایک پہاڑی راستہ پر ایک چٹان پر بیٹھا ہے ایک چرواہے کا لڑکا گاتا ہوا گذرتا ہے:-

"میری پیاری اپنا منہ نہ پھیر - بہار نے اپنا سینہ عریاں کر دیا - پھولوں نے اپنا راز چپکے سے تاریکی میں افشا کر دیا - جنگل کے پتوں کی سرسراہٹ رات کی سسکیوں کی طرح اُس پار سے آرہی ہے - میری محبوبہ آ، مجھے اپنا رخ دکھا"

سنیاسی ۔ طلائے شام نیلگوں سمندر کے قلب میں تحلیل ہو رہا ہے - پہاڑ کا جنگل، دن کے نور کا آخری ساغر نوش کر رہا ہے -

گاؤں کے مکانات میں دیئے روشن ہو چکے ہیں اور وہ درختوں میں سے یُوں دکھائی دے رہے ہیں جیسے ایک نقاب پوش ماں اپنے خوابیدہ بچوں کی نگرانی کر رہی ہو۔ فطرت تو میری غلام ہے۔ اس وسیع ایوان میں جہاں میں تنہا ایک بادشاہ کی طرح بیٹھا ہوں تو نے اپنا بوقلموں قالین بچھا دیا ہے اور میں تجھے تیرے ستارہ گون ہار کے ساتھ جو تیرے سینے پر جگمگا رہا ہے رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

چرواہوں کی لڑکیاں گاتی ہوئی گذرتی ہیں

"موسیقی دریائے ظلمات کے اُس پار سے آ کر مجھے بلاتی ہے۔ مَیں گھر میں اطمینان سے تھی لیکن بانسری کی آواز رات کی خاموش فضا میں گونجی اور درد نے میرے دل کو چھید دیا۔ مجھے راستہ بتا او جاننے والے مجھے اُس کا راستہ بتا — مَیں اُس کے پاس اپنا ننھا سا پھول لے جاؤں گی اور اُسے اُس کے قدموں میں رکھ دوں گی اور اُس کو بتا دوں گی کہ اُس کی موسیقی اور میری محبت ایک ہیں"۔

سنیاسی۔ میرا خیال ہے، ایسی شام میرے تمام جنموں میں صرف ایک بار آئی تھی۔ پھر اُس کا پیالہ محبت اور موسیقی سے لبریز ہو کر چھلک گیا۔ مَیں کسی کے ساتھ جس کے رخ کی یاد شام کے اِس غروب ہونے والے ستارے کو دیکھ کر تازہ ہوتی ہے بیٹھا تھا — لیکن میری ننھی لڑکی کہاں ہے۔ اپنی سیاہ اور غمگین آنکھوں کے ساتھ جو آنسوؤں سے لبریز تھیں —؟ کیا وہ وہیں ہے؟ اور اپنی کٹی کے باہر بیٹھی ہوئی شام کی اس ناپید اکنار تنہائی میں سے شام کے اس ستارے کو تک رہی ہے؟ — لیکن آہ اس ستارے کو غروب ہونا ہے شام اپنی پلکوں کو رات کے وقت جھپکا دے گی۔ آنسو تھم جائیں گے اور سسکیاں خواب میں خاموش ہو جائیں گی — نہیں میں ہرگز واپس نہ جاؤں گا۔ دنیا کے خواب اپنے پیکر اختیار کرتے ہیں، میں اِن کی روش میں مخل ہو کر تصوّرات کی تخلیق نہ کروں گا۔ میں دیکھوں گا سوچوں گا اور جان لوں گا۔ (ایک لڑکی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی آتی ہے)

لڑکی۔ بابا، تُو یہاں ہے؟

سنیاسی۔ آ، بیٹا، میرے پاس بیٹھ۔ کاش میں تیری اِس پکار کو اپنا سکتا۔ مجھے کسی نے ایک دفعہ بابا کہا تھا۔ وہ آواز تیری آواز سے ملتی تھی۔ بابا تو اب جواب دیتا ہے لیکن آہ اب وہ پکار کہاں ہے؟

لڑکی۔ تو کون ہے؟

سنیاسی۔ میں سنیاسی ہوں۔ بیٹا مجھے بتا تیرا باپ کون ہے؟

لڑکی وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہے۔

سنیاسی ۔ اور تیری ماں ہے؟
لڑکی ۔ نہیں ۔ مَیں چھوٹی سی تھی کہ وہ مرگئی ۔
سنیاسی ۔ تجھے اپنے باپ سے محبت ہے؟
لڑکی ۔ مجھے اُس سے دنیا کی ہر شے سے زیادہ محبت ہے ۔ میرا اور کوئی نہیں ـــــ وہی ہے ۔
سنیاسی ۔ مَیں سمجھ گیا ۔ لا اپنا ننھا ہاتھ ، مَیں اس کو اپنی ہتھیلی میں رکھوں، اپنی اس فراخ ہتھیلی میں ۔
لڑکی ۔ سنیاسی تُو ہاتھ دیکھتا ہے؟ میرا ہاتھ دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟
سنیاسی ۔ مَیں سمجھتا ہوں ، مَیں بتا سکتا ہوں مگر بہت نہیں تھوڑا ۔ ایک دن میں سب کچھ جان لوں گا ۔
لڑکی ۔ اب مَیں اپنے باپ کے پاس جاتی ہوں ۔
سنیاسی ۔ کہاں؟
لڑکی ۔ جہاں راستہ جنگل کو جاتا ہے ۔ اگر اُس نے مجھے وہاں نہ پایا تو اُسے بڑی پریشانی ہوگی ۔
سنیاسی ۔ اپنا سر میرے قریب لا بیٹا مَیں تجھے جانے سے پہلے برکت کے لئے بوسہ دوں ۔ (لڑکی جاتی ہے)

ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ آتی ہے

ماں ۔ مسری کے بچے کیسے تندرست و توانا ہیں ، دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے ۔ ایک تم ہو جتنا تم کو کھلاتی پلاتی ہوں دن بدن سوکھ کے کانٹا ہوئے جاتے ہو ۔
ایک لڑکی ۔ لیکن اماں آپ ہمیں کیوں الزام دیتی ہیں ۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے بھلا ۔
ماں ۔ کس قدر سر پٹکتی ہوں تم سے کہ نچلے بیٹھے رہا کرو ، لیکن تم ہو کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگے پھرتے ہو ۔
لڑکی ۔ اماں ، کام تو آپ ہی کے بناتے ہیں ۔
ماں ۔ اچھا! اب برابر کا جواب دینے لگ گئیں؟
سنیاسی ۔ بچی تُو کہاں جا رہی ہے؟
عورت ۔ بندگی مہاراج ہم گھر جاتے ہیں ۔
سنیاسی ۔ گھر میں کتنے آدمی ہو تم؟
عورت ۔ میری ساس ، میرا خاوند اور دو بچے اور ہیں ۔
سنیاسی ۔ تمہارے دن کیسے کٹتے ہیں؟

عورت۔ میں نہیں جانتی دن کیسے کٹ جاتے ہیں۔ میرا خاوند کھیت میں جاتا ہے، میں کام کاج کرتی ہوں، جب شام ہوتی ہے بڑی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر چرخا کاتتی ہوں (لڑکیوں سے) اری لڑکیو سنیاسی کے پاؤں کو چھوؤ۔ انہیں آسیس دو مہاراج (جاتی ہے)

دو شخص آتے ہیں

پہلا۔ میرے دوست جاؤ، واپس جاؤ، تم بہت دُور آگئے۔

دُوسرا۔ آہ، میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں دوست قسمت سے ملتے ہیں اور قسمت ہی ہمیں کچھ دُور ایک ساتھ لئے چلتی ہے، آخر مفارقت کی گھڑی آتی ہے اور ہم جُدا ہو جاتے ہیں۔

پہلا۔ لیکن ہم کیوں نہ وصال کی امید پر جدا ہوں؟

دوسرا۔ ہماری ملاقاتیں اور ہماری جدائیاں دنیا کے تمام تصرّفات سے ایک تعلق رکھتی ہیں۔ ہماری قسمت کے ستارے ہماری امیدوں کے ہمنوا کبھی نہیں ہوتے۔

پہلا۔ مگر سلام ہو اُن ستاروں پر جنہوں نے ہمیں ملا دیا۔ خواہ یہ وصال ایک لمحہ ہی کے لئے تھا پھر بھی بہت تھا۔

دوسرا۔ اس سے پہلے کہ تم جاؤ ایک لمحہ کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھو۔ کیا تاریکی میں پانی کی وہ مدھم سی چمک تمہیں نظر آتی ہے اور "کاسوارینا" کے وہ درخت دریا کے ریتیلے کنارے پر؟ ہمارا گاؤں تاریک سایوں کا ایک انبار بن رہا ہے۔ صرف چمکتی ہوئی بتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کیا تم پہچانتے ہو ہمارے گھر کی بتیاں کونسی ہیں؟

پہلا۔ ہاں ——— میرا خیال ہے پہچانتا ہوں۔

دوسرا۔ وہ ——— ہاں وہی روشنی ہماری اس جدائی پر گذرے ہوئے ایام کی الوداعی نظر ہے۔ لیکن آہ ——— کچھ دُور چل کر اس کی بجائے بھی تاریکی کا ایک دھبا رہ جائے گا۔ (چلے جاتے ہیں)

سنیاسی۔ رات تاریک اور سنسان ہوگئی ہے۔ وہ ایک بے یار و مددگار عورت کی طرح بیٹھی ہے۔ تاریک تارے اُس کے آنسو ہیں جو آگ بن گئے ہیں۔ اے میری بچّی! تیرے ننھے دل کے غم نے ہمیشہ کے لئے میری زندگی کی تمام راتوں کو درد سے معمور کر دیا ہے۔ تیرے پیارے ہاتھ کی تھپک آج رات اس ہوا میں ہے۔ میں اسے اپنی پیشانی پر محسوس کرتا ہوں۔ یہ تیرے آنسوؤں سے نمناک ہے، میری پیاری بچّی ——— تیری سسکیاں جنہوں نے میرے فرار ہونے پر میرا تعاقب کیا تھا میرے دل میں اتر گئیں ——— میں اُن کو مرتے دم تک ساتھ رکھوں گا۔

(۴)

گاؤں کی پگڈنڈی پر

سنیاسی ۔ میرا سنیاس جاتا ہے تو جائے ۔ میں اپنا سونٹا اور چنبل توڑتا ہوں ۔ یہ پُر شکوہ جہاز ـــــ یہ دنیا جو وقت کے سمندر کو عبور کر رہی ہے آج میں پھر اس پر سوار ہوتا ہوں ۔ ایک بار پھر جاتریوں میں شامل ہوتا ہوں ۔ کس قدر حمق ہے وہ شخص جو چاہتا ہے کہ اِس سمندر کو تنہا عبور کر جائے ، جو آفتاب اور ستاروں کے نُور سے روگردانی کر کے اپنے بے بضاعت چراغ کی روشنی میں راستہ ڈھونڈتا پھرے ـــــ پرندے فضا میں اڑتے ہیں اس لئے نہیں کہ خلا کے اُس پار چلے جائیں بلکہ اس لئے کہ پھر ارضِ بسیط پر لوٹ آئیں ۔ میں آزاد ہوں میں نیستی کی غیر مادی زنجیر سے آزاد ہوں ۔ شواہد ، صور اور اغراض کے درمیان ہوں اور آزاد ہوں ـــــ محدود ہی حقیقی لامحدود ہے ۔ اور محبت حقیقت سے ہم کنار ہے ـــــ میری بچّی تو موجودات کی روح ہے ۔ میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا ۔ (گاؤں کا ایک بوڑھا آتا ہے)

سنیاسی ۔ بھائی تجھے پتا ہے رگھو کی بیٹی کہاں ہے ؟

بوڑھا ۔ وہ اس گاؤں سے چلی گئی ہے ۔ ہم خوش ہیں ۔

سنیاسی ۔ کہاں چلی گئی ہے ؟

بوڑھا ۔ کہاں گئی ہے ؟ جہاں بھی جائے اُس کے لئے برابر ہے (چلا جاتا ہے)

سنیاسی ۔ میری بچّی گئی ہے کہ خلا کے لامکان میں مکان تلاش کرے ۔ وہ ضرور میرے پاس آئے گی ۔ (گاؤں کے لوگوں کا ایک ہجوم گذرتا ہے)

ایک آدمی ۔ آج رات راج کنور کی شادی ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ بیاہ کی کیا ساعت ہے ؟

تیسرا آدمی ۔ بیاہ کی ساعت دولہا دلہن کے لئے ہے ہمیں اس سے کیا ؟

ایک عورت ۔ لیکن برات کی خوشی میں وہ ہمیں روٹیاں نہیں دیں گے ؟

پہلا آدمی ۔ روٹیاں ؟ باولی ہوئی ہے ۔ میرا چچا شہر میں رہتا ہے ـــــ میں نے اُس سے سنا ہے کہ دہی اور بھنے ہوئے چاول تقسیم ہونگے ۔

دوسرا آدمی ۔ چین ہے پھر تو !

چوتھا ۔ لیکن دہی میں پانی زیادہ ہوگا خاطر جمع رکھو ۔

پہلا آدمی ۔ تم بھی عجب احمق ہو راج کمار کی شادی اور دہی میں پانی !

چوتھا آدمی ۔لیکن ہم تو راج کنور نہیں ہماری قسمت سے دہی بھی پانی بن جاتا ہے ۔

پہلا آدمی ۔اور دیکھنا یہ کوئلے کی بھٹی کا بچہ آج بھی کام میں لگا ہوا ہے ہم تو یہ نہ ہونے دیں گے ۔

دوسرا آدمی ۔ باز نہ آیا ۔تو جلا کر اس کا بھی کوئلہ نہ بنایا تو سہی ۔

سنیاسی ۔تم میں سے کسی کو پتا ہے رگھو کی بیٹی کہاں ہے ؟

عورت ۔ وہ تو چلی گئی ہے ۔

سنیاسی ۔کہاں ؟

عورت ۔ یہ نہیں معلوم ۔

پہلا آدمی ۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ہمارے راج کنور کی دلہن نہیں ہے (ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں ۔ ایک عورت ایک بچہ لئے ہوئے آتی ہے)

عورت ۔ بندگی مہاراج ۔میرے بچے کو اپنے پاؤں چھونے دو ، یہ بیمار ہے اس کو اسیس دو ۔

سنیاسی ۔لیکن میری بچی اب میں سنیاسی نہیں ہوں ۔ایسی باتوں سے میرا ٹھٹھا نہ اڑاؤ ۔

عورت ۔ پھر تم کون ہو ؟ تم کیا کرتے ہو ؟

سنیاسی ۔میں ڈھونڈتا ہوں ۔

عورت ۔ ڈھونڈتے ہو ؟ کس کو ؟

سنیاسی ۔ اپنی گم شدہ دنیا کو ڈھونڈتا ہوں ـــــ تم رگھو کی بیٹی کو جانتی ہو ؟ وہ کہاں ہے ؟

عورت ۔ رگھو کی بیٹی ؟ وہ مر گئی ۔

سنیاسی ۔ وہ مر نہیں سکتی ۔نہیں ، ہرگز نہیں ۔

عورت ۔لیکن تمہیں اُس کی موت سے کیا ؟

سنیاسی ۔صرف میری نہیں یہ ہر ایک کی موت ہوگی ۔

عورت ۔میں نہیں سمجھی تم کیا کہتے ہو ؟

سنیاسی ۔وہ کبھی نہیں مر سکتی !

(ٹیگور)

محمد حنیف

غزل

اگر آنکھ کو دل سے آنسو ملے | تو آنسو میں جلوہ فگن تو ملے
یہ دیر و حرم میں کہاں پھنس گئے | اُسے ڈھونڈنا کیا جو ہر سُو ملے
مقولہ ہے گم ہونے والوں کا یہ | "اُسے چاہئے کیا جسے تُو ملے"
بھٹکتی ہیں نظریں مری ہر طرف | خدا جانے کس بھیس میں تُو ملے

نہ افسرؔ ہو کیوں شام کا رنگ فق
اچانک اگر وہ لبِ جُو ملے

حامد اللہ افسر

پتّھر کی چٹانیں

کشاکشِ الم زندگی سے تنگ آ کے | جنوں کے خوفِ غمِ بے کسی سے گھبرا کے
بساطِ دہر کو اک خارزار کہتا ہؤا | حیات کو ستم کردگار کہتا ہؤا
چلا جو گھر سے میں بہلانے اپنا قلبِ حزیں | نظر کے سامنے پتّھر کی کچھ چٹانیں پڑیں
پسند آئیں نہ یہ صورتیں سکوں کی مجھے | نگاہ پھیر لی اک بار میں نے گھبرا کے
کہاں سکون کہاں آہ بیقراریٔ دل | کہاں جمود کہاں اُف طپیدنِ بسمل
وہ خامشی سے مگر اپنا درس دینے لگیں | ہٹانا چاہتا تھا دور جس کو قلبِ حزیں
بہت تھا غصّہ مگر کان بند کر نہ سکا | سنائی دیتی تھی رہ رہ کے دور کی سی صدا
"ہماری طرح اگر تُو ہو سنگ سرتا پا | ستائے کوئی نہ غم تجھ کو زندگانی کا"

"مثالِ سنگ سکوت و ثبات و بے جگری
علاجِ دردِ وغمِ زیست ہے اگر تو یہی"

جگر بریلوی

خان بہادر لال خاں۔ آداب عرض، قادر، انور بھئی میں نے تم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ مگر اس خیال سے نہ رکا کہ میرے خوشامدی ساتھیوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ میرے بے تکلف دوست کس قماش کے لوگ ہیں۔ اس لئے انہیں میلے کو روانہ کر کے اور بہانہ بنا کر ادھر آ گیا۔ کہو خیریت تو ہے۔ بڑی مدت کے بعد ملنا نصیب ہوا۔ آؤ یار انور گلے تو ملو۔

قادر۔ لالی یہی بات تو ہے۔ پہلے ہم بھی جھجک گئے تھے۔ آخر رہ نہ سکے اور جب تم ساتھیوں سے ہنستے بولتے آگے نکل گئے تو مجبوراً آواز دی۔ خیال تھا کہ شاید تم اراداتاً ملنا نہیں چاہتے اور گریز کرتے ہو، کیونکہ اب ماشاءاللہ بڑے آدمی ہو، رئیسوں سے میل جول ہے اور وضع قطع سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

لال خاں (قادر کو زور سے گلے لگا کر) کیوں بناتے ہو۔ میں اور تم سے گریز؟ میں تمہیں بھول سکتا ہوں؟ مدت العمر ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ ہاں آؤ گھر کو چلیں۔ انور کہو کیا حال ہے۔ اور یہ تو بتاؤ تم دونوں یہاں کس مار پر تشریف لائے ہو۔

انور۔ پہلے تم بتاؤ۔ کہ تم امیر کیسے بن گئے۔ کمال کر دیا۔ میں پیر بنا۔ قادر خاں لیڈر بنے۔ مگر ہمارے پاس اتنا روپیہ کبھی جمع ہوا نہ ہو سکا۔ آخر وہی چور کے چور۔ تم نے تو غضب کر دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ کہیں جیل میں ہو گے یا عدم آباد، مگر تم تو ساہوکار ہو۔

قادر۔ لالی یہ مکان کس کا ہے؟ کیسا عالی شان ہے۔

لالی۔ تمہارا ہی ہے۔ آؤ اندر چلیں۔

انور (قہقہہ لگا کر) آپ کا ہے۔ ہمارا ارادہ تو رات کو یہیں قسمت آزمانے کا تھا۔

لالی۔ خوب بہت خوب! آؤ پھر دن کو قسمت آزما لو، رات کے کہاں منتظر رہو گے۔

شریف او شریف! دروازے کھول دے اور چائے تیار کر کے فوراً بھیج دے ——— انور یہاں بیٹھو میرے پاس، قادر اِدھر آؤ ادھر، یہاں بیٹھو۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔

قادر۔ اُس روز چوری کو گئے۔ کیا نام تھا اُس کا ——— اور تمہیں پہرے پر کھڑا کیا۔ اُس روز سے ایسے غائب ہوئے کہ آج ملے۔ کیا کوئی خزانہ مِل گیا تھا؟

لالی۔ آہ خزانہ مِلا اور ایسا مِلا کہ عُمر بھر ناداری کا احساس رہے گا۔ جہاں تم نے پہرے پر کھڑا کیا تھا میرے قریب کے کمرے میں دو نوجوان انسان نما حسین وجمیل فرشتے تھے۔ ایک لڑکی اگر میں اُسے لڑکی کہہ سکوں۔ ایک لڑکا اگر اُسے لڑکا ہی کہا جائے، دونوں ایک دوسرے سے محبت اور پیار کی باتیں کر رہے تھے، میرا دل دھڑک رہا تھا میں نے ذرا آگے بڑھ کر اُن کے الفاظ سننے چاہے تاکہ تمہیں فوراً اطلاع کرسکوں کہ گھر والے جاگ رہے ہیں مگر وہ دونوں ہماری موجودگی سے بالکل بے خبر تھے۔ نہیں وہ ایک ایسی دنیا میں تھے جسے عشق پاکیزگی اور حسن کے عناصر سے بنایا گیا ہو۔ اُن کے چند فقرے سنے اور میں بھی اپنے آپ سے بے خبر تھا، بلکہ تم سے بھی۔ محبت کی اُس شراب کا اثر مجھ پر بھی ہوگیا جو وہ پی رہے تھے میں ایسا مخمور ہوا کہ کایا پلٹ گئی۔ مجھے کچھ یاد نہیں ———

"شریف چائے اور پھل وغیرہ یہاں رکھ دو اور تم جاؤ۔ خانساماں سے کھانا تیار کرنے کو کہو، ہم آج جلدی ہی کھانا کھائیں گے۔ میں نے شریف کو خود بھیج دیا ہے، تم سے تو کوئی تکلّف نہیں، میں نہیں چاہتا کہ نوکر ہمارے رازوں سے واقف ہوں ——— ہاں تو مجھے معلوم نہیں کہ میں کب اور کیسے وہاں سے نکلا۔ میرے خیال میں وہ دونوں دولہا دلہن یا منگیتر تھے۔ اُس روز سے میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ میں بھی اس دولت کو حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے پاس چوری اور جوئے کا تمہارا دیا ہوا حصّہ پانچ ہزار کی رقم تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ رقم اتنی کافی نہیں کہ کسی شریف اور معزز گھرانے سے رشتہ ہو سکے۔ یقین جانو کہ میں نے اس دولت کو بڑھانے کی ہر ممکن طریق سے کوشش کی۔ میرے نزدیک جائز و ناجائز کا سوال کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں زر و مال سے محبت کو پالوں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں جائز ذرائع سے کمانے سے محض ناواقف تھا اور کوئی قابلیت بھی نہ تھی، اس لئے میں ہر طریق سے دولت حاصل کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اُس پانچ ہزار کو میں نے اس طرح خرچ کیا کہ بہت جلد خوشحال ہوتا چلا گیا۔ جس افسر کو دو ہزار دے کر دس ہزار مِل سکتا تھا ملا تامل دے دیا، جہاں پانچ دے کر پچاس مِل سکے فوراً سودا کرلیا اور اِس طور پر علاوہ دولت مند ہونے اور خطابات حاصل کرنے کے میں نامور اور بارسوخ بھی ہوگیا۔ میں نے اس عزت سے بھی فائدہ اٹھایا۔ غرضکہ جب ہر طرف سے فراغت پاچکا تو ثروت سے محبت کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ میں نے اِسی لئے کہا تھا کہ میں اب بھی نادار ہوں کیونکہ میں محبت کو پانے میں ناکام رہا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ چاندی سونے یا دنیاوی عزت سے محبت نہیں خریدی جاسکتی۔ آخر میں مصنوعی الفت کا خریدار

بنا اور بازار میں اس جنس کی تلاش شروع کی۔ انور، بھائی مٹھائی بھی لو، کوئی چوری کا مال تو ہے نہیں۔ آج کل کے زمانے کے مطابق خالص حلال کی کمائی ہے۔

انور۔ یہ تو بتاؤ کہ آج تمہارا قصبہ خالی کیوں ہے؟ بازار سنسان پڑے ہیں۔ صرف ایک لکڑیاں بیچنے والا فقیر گٹھڑ سا پر سر رکھے تمہارے مکان کے سامنے بیٹھا ہے۔

لالی۔ یہ میلہ ہر تین سال کے بعد ہوتا ہے اور سب زن و مرد میلے میں شریک ہونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ میں نے ایسے موقعوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں کہاں رہے۔ مدت کے بعد ملے ہیں اپنی اپنی سرگذشت تو سناؤ۔

شریف۔ حضور تار والا آیا ہے۔

لالی۔ اُسے یہاں بھیج دو اور منشی جی کو بلا لاؤ ---- ادھر لاؤ تار۔ آگے آجاؤ ---- منشی جی یہ تار دیکھئے کیسا ہے کہاں سے آیا ہے ---- بتائیے۔ بتائیے۔ یہ میرے بھائی ہیں۔ جو کچھ بھی ہے بیشک بتائیے۔

منشی۔ آپ کا تمام روپیہ ضائع ہوگیا ہے ---- کاروبار میں سخت نقصان ہؤا ہے۔

لالی۔ بہت اچھا۔ یہ تار مجھے دے دو ---- اور ---- تم جاؤ۔

قادر۔ لالی ہمارا آنا ہی منحوس ثابت ہؤا۔

لالی۔ نہیں بلکہ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔

انور۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم سب کے دن منحوس آرہے ہیں ---- کھڑکی کے پاس حیران کیوں کھڑے ہو۔ آؤ بیٹھو۔

لالی۔ تم جانتے ہو میں روپے کے ملنے یا ضائع ہو جانے سے خوش یا غمگین نہیں ہؤا کرتا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ فقیر جو سامنے بیٹھا ہے، اس میں اور مجھ میں اب کیا فرق ہے۔ سنا ہے کہ یہ فقیر بڑا دولت مند اور تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ مگر اُس نے خود کسی خاص وجہ سے اپنی تمام دولت لٹا دی اور فقیر ہو گیا۔ جب مجھے پہلے پہل یہ معلوم ہؤا، میں سمجھا کہ یہ بدنصیب اور بیوقوف آدمی ہے۔ زر سے کیا نہیں مل سکتا۔ ایک ایسی دنیا میں ایک ایسے زمانے میں جب کہ نادار کا زندہ رہنا دشوار ہے جب کہ شرافت و عزت کا معیار محض دولت ہے یہ اپنی جائداد وغیرہ لٹا کر فقیر ہو گیا۔ آج میں اپنے آپ میں اور اس فقیر میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ اگر ہے تو صرف یہ کہ اُس کے پاس مال ہے اور گاہک نہیں اور میرے گاہک موجود ہیں مگر اب میرے پاس مال نہیں۔ میلے میں ایک کمبخت ہماری منتظر کھڑی ہوگی "آج پیارا گلے سے لگائے گا" اور ہماری یہاں دنیا ہی بدل چکی ہے۔

شریف۔ حضور کھانا تیار ہے۔

لالی۔ دستر خوان چن دو ـــــــ یارو خوب سیر ہو کر کھاؤ۔ خدا جانے اب یہ کس کا مال ہے۔ اس وقت تم میرے مہمان نہیں نہ میں تمہارا میزبان۔ بس یہی سمجھو کہ ہم سب کسی سود خوار کے بن بلائے مہمان ہیں۔ ہم پھر ایک بار مل گئے ہیں۔ شاید ہمیں پھر گزشتہ داستان کو دھرانے کے لئے ملایا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ کھانا کھا کر سب کچھ اُس کے مالک کے لئے چھوڑ ہمیں چپ چاپ جنگل کی طرف چلے جانا چاہئے۔ میری جیب میں چند روز کے گذارے کے لئے ایک معقول رقم ہے۔ ہاں آہنی صندوق میں بھی کچھ روپیہ رکھا ہے کچھ عرصے کے لئے کافی ہوگا۔ آج شام کی خوراک بھی ساتھ ہی لے چلیں گے اور وہاں اطمینان سے بیٹھ کر فیصلہ کریں گے کہ اب کس جانب رخ کرنا ہے۔ شریفانہ ڈاکے یا مجرمانہ چوریاں؟

آسمان پر برسے ہوئے بادل گھبرائے ہوئے مسافروں کی طرح واپس جا رہے ہیں۔ کالی گھٹائیں رات کی تاریکی کو بڑھا دیتی ہیں، روزِ روشن کی تیز زرد روشنی کو بھی مدہم کر دیتی ہیں۔ مگر دن آخر دن ہے اور رات رات تینوں شریف چور سہمے ہوئے جنگل کی طرف جا رہے ہیں۔

قادر۔ شریف بدمعاشوں کی زندگی بھی کس قدر احتیاط چاہتی ہے۔ ایک امیر تنگدست کو اپنے وطن سے نکلنا کس قدر دشوار ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا ہے۔

لالی۔ ہم قصبہ سے دو میل اور میلے سے تین میل کے قریب دُور آ گئے ہیں۔ اب ہمیں کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں۔ اور ہو بھی کیوں ہم کوئی چور تھوڑا ہی ہیں۔ یہ تو محض شرافت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لوگوں کو حیرانی و تشویش میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا ـــــــ خیر میرے حالات تو تھوڑے بہت تم سُن اور دیکھ چکے، کہو یار قادر خاں اور انور تمہاری کیسے گذری؟ قصّے کہانیاں ہی کہتے چلیں۔ سنتے ہیں سفر آسان کٹتا ہے۔ آج یہ چار میل بھی دشوار ہیں۔ شرفا کو دس قدم چلنا دوبھر ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ پھر دس دس میل دوڑنے بھاگنے کی عادت ہو جائے گی۔ عمدہ سے عمدہ کھانے اور اعلیٰ سے اعلیٰ پوشاکیں بجائے طاقت دینے کے خدا جانے کاہل اور سست کیوں بنا دیتی ہیں۔ یا سستی اور کاہلی ہی امارت ہے۔

قادر۔ قوتِ ہاضمہ اور معدے کا بگڑ جانا ہی امارت ہے۔ ہماری کیا سنتے ہو ـــــ روزمرّہ رات جاگنا، ڈر ڈر کر چوری کرنا اور دن کو چھپے رہنا تکلیف دہ تھا۔ آخر اس مشکل کو آسان کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ میں لیڈر بن گیا۔ موسم خوشگوار تھا

حالات موافق تھے۔ بے دھڑک اور نڈر تو یار تھے ہی چند دنوں میں سکّہ بٹھالیا اور دورے شروع کر دیئے حسنِ اتفاق کہئے ایک لائق خوش رُو جوشیلا نوجوان مددگار مل گیا۔ امیر آدمی تھا اُس کی مدد سے ہمارے ایثار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی چندوں کے انبار لگ گئے۔ کھانے پہننے کی طرف سے تو پہلے ہی اُس نیک خصلت و پاک طینت آدمی کے گھر پر رہنے کی وجہ سے بےفکری تھی اور پھر تو ماشاء اللہ بنکوں میں ہمارے اپنے نام پر روپیہ جمع ہو گیا مگر آخر کار یہ بھروپ رنگ لایا۔ ایک روز ہم اپنے دوست کی غیر حاضری میں چھپ کر اُس کی بے حد حسین و پارسا بیوی کو دیکھ رہے تھے کہ وہ اچانک آنکلا۔ ہماری اس حرکت پر سخت خفا ہوا، مگر نہ اتنا جتنی کہ ہمیں امید تھی، کیونکہ وہ ہمارے غبن وغیرہ سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا اور ہمیں گھر سے نکالنے کی فکر میں تھا۔ اس واقعہ سے صرف اتنا فرق پڑا کہ پہلے بیک بینی و دوگوش نکلوائے جاتے اور اب وہ پابدستِ دیگرے دست بدستِ دیگرے ہمیں حوالۂ پولیس کرنے کی فکر میں تھا۔ چار و ناچار وہاں سے آنکھ بچا دیوار پھاند رفوچکر ہوئے۔ اُس جواں ہمت شیر نے اس پر بس نہیں کی بلکہ تمام زمانے میں ہمارے اعمال مشتہر کر دیئے اور ہمیں پھر چور بننا اور رنڈوں کی محنت مزدوری کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ غرض کہ لیڈر بننے سے پہلے ہم صرف چور تھے اور اب چور کے ساتھ نامراد عاشق بھی۔ اب انور صاحب کی سنیئے یہ ہم دونوں کے استاد ہیں اِن کی کیسے گذری؟

لالی۔ سناؤ یار جنگل قریب آگیا ہے۔ پھر آئندہ کے لئے کوئی اور تدبیر سوچیں گے۔

انور۔ سنیے ایک تھا بادشاہ۔ میرا تمہارا خدا بادشاہ۔

قادر۔ تم بچوں کو کہانیاں سنانے لگے۔ ارے بھئی آپ بیتی کہو آپ بیتی۔

انور۔ کاش میں بچہ ہوتا اور آپ بیتی کہنے کی بجائے جگ بیتی سن سن کر حیران ہوتا۔ میں سمجھا تھا صرف راستہ کاٹنے کی فکر ہے۔ ہے تو ہماری داستان بچوں ہی کی ایک کہانی، مگر خیر سنیے۔ جب آپ دونوں کی دید سے ناامید ہو گئے۔ تو تنہا چوری یعنی اس شریفانہ فعل کا مزا جاتا رہا۔ آخر کار ایک تدبیر سوجھی کہ ہم پیر بن گئے۔ جہاں جاتے تنخواہ دار چیلے اور چیلیاں پھیلا دیتے اور اپنا اُلّو سیدھا کر کے آگے چل دیتے۔ عیش سے گذرنے لگی۔ شاید بادشاہوں کو بھی یہ لطف و راحت میسر نہ ہو۔ مفت کے غلام اور لونڈیاں سواری کے جانور وغیرہ وغیرہ۔ ایک رئیس کی نوعمر بیوہ سے علاوہ عقیدتمندی کے راہ و رسم ہو گئی۔ ایک روز اُس کے بھائی نے ایک لڑکی کے لئے ہم سے تعویذ مانگا۔ یاروں نے بہت لیت و لعل کے بعد تعویذ رئیس کے حوالے کیا۔ انہوں نے چلتے چلتے ایک فقرہ کہہ دیا کہ حضرت اگر یہ تعویذ درست ثابت ہوا تو آپ کا عمر بھر غلام رہوں گا ــــ اور اگر میرا مطلب بر نہ آیا تو آپ کی خیر نہیں۔ مجھ سے زیادہ کوئی بُرا نہ ہوگا ــــ ہم حیران تھے کہ

ایسے اکھڑ آدمی کا کیا علاج کیا جائے۔ آخر دوسرے روز ایک چیلی کے حوالے زہر کیا اور اُسے اُس لڑکی کو کھلا دینے کے لئے مقرر کیا تاکہ مرید صاحب کی عقیدتمندی میں فرق نہ آنے پائے اُس لڑکی کو زہر دے دیا گیا اور وہ مرگئی۔ ایک لڑکا میرا مرید تھا۔ وہ نہایت لائق، شریف خدا پرست نوجوان تھا اُس نے کبھی بحث میں مجھے تنگ نہ کیا تھا۔ بہت فرمانبردار تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ جس لڑکی کو زہر دیا گیا ہے وہ اُس فرشتہ سیرت کی بیوی تھی۔ میں میاں بیوی کی محبت سے واقف تھا۔ سچ یہ ہے مجھے خود اُس لڑکی سے عشق تھا مگر اُس لڑکے کی وجہ سے مجھے اُس لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ خود لڑکی شرافت لیاقت اور حسن کا مجسمہ تھی۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے اُس مرید کو میرے زہر دلوانے کا پتہ چل گیا ہے۔ میں وہاں سے بھاگا مجھے کامل یقین تھا کہ اگر میں وہاں رہا تو وہ لڑکا مجھے کچا ہی کھا جائے گا۔ کیونکہ اُس غیرت مند کی بیوی ایسی ہی تھی کہ کھو دینے پر وہ یہاں تک دیوانہ ہو جاتا۔ اس موت سے قرب وجوار میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اور میرے بھاگ جانے سے لوگوں پر یہ راز افشا ہو گیا۔ ناچار پھر وہی چوری اور وہی یار۔

لال خاں۔ میرے دونوں دوست معزز ہیں۔ دونوں عزت و دولت سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اور محبت کا زخم بھی کلیجے میں رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں درختوں کے اس جھنڈ کے دوسری جانب چل کر بیٹھنا چاہیئے۔ اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے چور کونسل کا باقاعدہ اجلاس ہونا چاہیئے۔

قادر۔ یہ سائیں مولا ہماری جانب آرہے ہیں۔ کہیں "خفیہ" کے آدمی تو نہیں۔

لال خاں۔ نہیں نہیں یہ تو وہی ہمارے گاؤں کا فقیر ہے ٹھہرو پہلے اس سے مل کر اسے کسی طرف بھیج دیں۔ شاید ہمیں ملنا چاہتا ہے ——— آیئے آیئے۔ سائیں مولا ——— کیسے آنا ہوا۔

فقیر۔ سکھی رہو بابا۔ کدھر کو جانا ہے۔ بندہ اِس لئے حاضر ہوا ہے ——— میرے ذمہ آپ کا کچھ قرض ہے، نہیں بلکہ فرض ہے۔ کیا آپ اُس کو ادا کرنے کا موقع دیں گے ——— موقع قدرت نے خود ہی دے دیا ہے۔ کیا آپ فقیر کے مہمان رہیں گے ——— آیئے آیئے۔ فقیر آپ کا ممنون ہوگا ——— آپ کے کھانے کے لئے میرے جھونپڑے میں کچھ نہ کچھ میسّر آجائے گا امرا دعوتوں کے شوقین ہوتے ہیں ——— فقیر کی دعوت کا بھی لطف اُٹھایئے گا ——— ٹھنڈا میٹھا پانی ہوگا۔ میں خود ایک چشمے سے لاتا ہوں جو پھولوں میں سے ہو کر آتا ہے، میرے جھونپڑے کے قریب ہی ہے۔ ٹھنڈا میٹھا شفاف وصاف پانی ——— آپ کو زیادہ دُور نہیں جانا ہوگا ——— بس وہ جہاں سفید سی تربت ہے۔ ندی کے اُس کنارے۔ پہاڑی سبزہ کے آگے کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے تھوڑی دُور غریب کی جھونپڑی ہے ——— آیئے آیئے ——— مہربانی نوازش ——— یہ تربت جیسی اچھی ہے ——— ایسی ہی اچھی وہ لڑکی تھی جو ایک مرتبہ انسانوں کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اور انسان اُس کی قدر نہ کر

سکے ۔۔۔ آپ تینوں نے اُسے دیکھا ہے ۔۔۔ آہ ۔۔۔ انسان کو جب ہوش آتا ہے دولت اُس کی کل آرزوؤں کا مرکز بن جاتی ہے۔ اُسے حاصل کر لینے کے بعد عزت کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ پھر اُس کے بعد ہوس حسن کا جادو سامنے آ آتی ہے۔ دولت عزت ۔۔۔ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ پھر پھر ۔۔۔ کسی کو ۔۔۔ آہ بچہ چاند کو دیکھ کر اچھلتا ہے اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ مٹی کے کھلونوں پر رضامند ہو جاتا ہے۔ نادان لوگ پتھر مٹی کے کنکرے کر بچھاسے معصوموں سے چاندی سونا چھین لیتے ہیں اور اس کا نام عقلمندی قرار پاتا ہے ۔۔۔ نادان بے سمجھ آدمی ۔۔۔ بدمنی کا بیج بوتا ہے ۔۔۔ اور راحت کا پھل پانا چاہتا ہے ۔۔۔ بچے سے زیادہ نادان ۔۔۔ بچے سے زیادہ بے سمجھ ۔۔۔ بچے سے زیادہ بُری چیز پر مائل ہوتا ہے ۔۔۔ دکھ دینے والی چیزوں پر جان دیتا ہے ۔۔۔ مادی اور فانی چمک کی چکاچوند اُس کو اندھا کر دیتی ہے ۔۔۔ اور اور ۔۔۔ آہا یہ پیاری زاہدہ کی تربت ہے ۔۔۔ زاہدہ ۔۔۔ زاہدہ ۔۔۔ زاہدہ ۔۔۔ میری پیاری ۔۔۔ چوروں کی پیاری زاہدہ! پیر انور شاہ صاحب اِزہر دے کر فرشتوں کو اُسے مارنا چاہیئے جو زندہ بھی کر سکے ۔۔۔ جس کے ضمیر پر سیاہی چھا جائے انسانیت کے نزدیک وہ بھی مردہ ہوتا ہے ۔۔۔ مولانا قادریار صاحب تربت کا پردہ حائل ہو جانے سے آپ اُس مجسمۂ حسن کو نہیں دیکھ سکتے جس کے دیکھنے کو کبھی دیوانے ہو گئے تھے ۔۔۔ مگر میں دیکھ سکتا ہوں ۔۔۔ جب آنکھیں ظاہر کو دیکھنا چھوڑ دیں تو کچھ پوشیدہ نہیں رہتا ۔۔۔ خانصاحب محبت خریدی نہیں جا سکتی محبت کے لئے دو پاکیزہ دل چاہئیں ۔۔۔ آپ بڑے خوش نصیب تھے کہ کم از کم آپ کو محبت سچی محبت کی ایک جھلک تو دیکھنا نصیب ہوئی ۔۔۔ دوستو مجھ پر فرض ہے کہ اُن نیکیوں کے صلے میں جو آپ نے مجھ سے کی ہیں آپ کو کچھ تحفہ دوں ۔۔۔ کیسا تحفہ ۔۔۔ ظالمانہ انتقام ۔۔۔ نہیں ہرگز نہیں ۔۔۔ بلکہ ایسا تحفہ جو لازوال دولت ۔۔۔ لازوال عزت ۔۔۔ لازوال حسن کے خزانوں سے مالا مال ہو ۔۔۔ خانصاحب زاہدہ مجھے کس قدر پیار کرتی تھی ۔۔۔ چور چوری بھول جاتے تھے ۔۔۔ اب اُس سے بھی زیادہ پیار کرتی ہے ۔۔۔ اور ہمیشہ کرتی رہے گی ۔۔۔ مگر اب اُس عفت مآب کو گوارا نہیں ۔۔۔ کہ معز زپیروں، شریف لیڈروں، امیر ڈاکوؤں کی وارفتہ ہوس پرست نگاہیں اُسے دیکھ سکیں ۔۔۔ آپ میری معلومات پر حیران نہ ہوں خدا کے توکل کا علم اَور ہے ۔۔۔ دنیائے فانی کے جھگڑے اَور ہیں۔

سورج غروب ہو چکا ہے شفق کی سرخی لحظہ بلحظہ شوخ اور تیز ہو رہی ہے بادلوں کے کنارے سنہری ہو گئے ہیں۔

فقیر۔ زاہدہ پیاری تمہیں تو انہیں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دینا چاہیئے تھا مگر تمہاری پیاری پیاری مسکراہٹ میں رحم اور افسوس کیوں شامل ہے۔ نہیں نہیں۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا خالد کم ظرف نہیں ۔۔۔ وہ اپنا فرض پہچانتا ہے ۔۔۔ وہ تمہارا غیرفانی اشارہ سمجھتا ہے ۔۔۔ میں ہر اندھے کو آنکھیں دوں گا ۔۔۔ ہر بھوکے کو کھانا ۔۔۔ گم کردہ راہوں کو راستہ دکھاؤں گا

ــــ بیشک پیاری تمہاری راہنمائی میرے لئے بہت مبارک ہے ــــ مگر ابھی نہیں ــ فوراً نہیں ــ انسانی حسیات خواہشات بن جاتی ہیں ــــ اور خواہشات فوراً گناہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں ــــ چند روز اور انہیں فانی خواہشوں کو مٹانے میں صرف کرنے ہونگے ــــ اور پھر تجھے دیکھیں گے ــــ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر بول نہیں سکتیں ۔ زبان بولتی ہے اور اُس نے دیکھا نہیں ۔ میں انہیں بولنے والی آنکھیں اور دیکھنے والی زبانیں دوں گا ــــ یہ ابھی اُس دنیا سے آئے ہیں جہاں حُسن کو دیکھ لینے کے بعد گلے لگانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ــــ ابھی نہیں ــــ پیاری ابھی نہیں ــــ ابھی محبت کا یہی فانی پودا دنیا کی بنجر زمین سے اکھاڑ کر دوام کی بہشت میں لگانا ہے ، جہاں اُس کے کانٹوں سے پھول حاصل ہوں ، جہاں سوکھی لکڑیوں کی بجائے میٹھے پھل پیدا ہوں جو دوامی زندگی بخشیں ــــ چلو میرے پیارے دوستو ، جھونپڑے میں چلیں ۔ تم تھک گئے ہو گے فقیر تمہاری بہت خدمت کرے گا ۔ جھونپڑے میں وہ سوسائٹی نہیں ہو گی جو اشرف المخلوق کو معصوم انسانوں کو چور ، قاتل اور مجرم بننے پر مجبور کرتی ہے ۔

خزاں کا موسم آیا اور گزر گیا ۔ سوکھے پتّے بہار کے پھولوں کی یاد میں تالیاں بجاتے رخصت ہو گئے ۔ پاکباز دلہن (زاہدہ) کی تربت پر میلہ ہے ۔ لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں ۔ تربت خوشبودار اور رنگا رنگ پھولوں سے لدی ہوئی ہے ۔ پاس ہی قوالی ہو رہی ہے ۔ سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہے ۔ قوال گا رہے ہیں " پریت کا کام کٹھن ہے ساجن " ۔ قوالوں کے سامنے تین بزرگ بیٹھے ہیں جن کی نورانی داڑھیوں پر آنسوؤں کے موتی تار باندھے ہوئے گر رہے ہیں ۔ قوال جب یہ گا چکے تو تھوڑی دیر بعد انہوں نے سُر اور تال بدل کر

ہمیں شانِ خدائی کا جلوہ دکھایا دکھایا فقیر نے ہمیں شیدا رسولِ عرب کا بنایا بنایا بنایا فقیر نے

گانا شروع کیا ۔ اُن تینوں مقدس ہستیوں کی حالت دگرگوں ہو گئی ۔ ابھی دوسرا مصرعہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ حق حق ہو ہو کے نعرے ایک مرتبہ بلند ہوئے اور وہ تینوں تڑپنے لگے ۔ دو نے اسی حالت میں تڑپتے ہوئے جانیں اُس کے مالک کے سپرد کر دیں ۔

ایک سیہ پوش فقیر نقاب رخ پر ڈالے خلقت کے ہجوم کو ہٹا کر آگے آیا ۔ اُس نے دونوں لاشوں کو سیدھا لٹا کر پھولوں کے ہار اُن کے گلوں میں ڈال دیئے ۔ اور دو آدمیوں کو اشارے سے پاس بلا کر نہایت آہستہ اور دھیمی آواز میں کہا کہ اِن دو بے صبر شہیدوں کو انہیں کے کپڑوں میں ندی کے کنارے دفن کر دو ۔ اور تیسرے بے ہوش بزرگ کو جو خان بہادر لال خان تھے اُٹھا کر گلے سے لگایا اور اپنے ہمراہ جھونپڑے کی طرف لے گیا ۔

عبدالرحمٰن اعجاز

شاعر اور شبو

شاعر

جس جگہ دن کو تھا شب بھی ہو گئی تجھ کو وہیں
ہے وہی صحنِ گلستاں ہے وہی سطحِ زمیں
دن کو جو ملتی رہی تجھ کو ہوائے جاں فزا
شب کو بھی ہے تو اُسی موجِ صبا میں جھومتا
باغباں نے صبح جس پانی سے سینچا تھا تجھے
آبِ صافی شام کو بھی ہے وہی پہنچا تجھے
رنگ دیتی ہیں شعاعیں سب کو جس خورشید کی
شام تک پرتو فگن رہتا ہے تجھ پر بھی وہی
ہیں وہی اشجار تیرے گرد گلشن ہے وہی
پاس تیرے سبزہ و ریحاں کا مسکن ہے وہی
ہے وہی پھولوں کی صحبت اور وہی ہے انجمن
ہے وہی چمپا، چنبیلی، ہے وہی جوہی، سمن

پر یہ کیا ہے شام ہونے تک تو کچھ نکہت نہ تھی
رات ہوتے ہی کہاں سے تجھ میں خوشبو آ گئی

شبو

شب کو جب ہوتی ہے عالم کی فضا ساری خموش
نخل بھی ہوتے ہیں ساکت اور طائر بھی خموش
دہر کی ہر چیز محوِ خواب ہو جاتی ہے جب
موج بھی آغوش میں ساحل کے سو جاتی ہے جب
چھاؤں میں تاروں کی مثلِ برق آتا ہے کوئی
لہر بن کر میری رگ رگ میں سماتا ہے کوئی
یہ شمیمِ روح پرور ہے اُسی دلدار کی
پھوٹتی ہے جو یکایک پتی پتی سے مری
بے خودی سی مجھ پہ اک رہتی ہے طاری رات بھر
کب چلا جاتا ہے وہ، یہ بھی نہیں مجھ کو خبر

روز رہتا ہے یہی عالم وصالِ یار کا
روز ہوتا ہے یونہی نکہت فشاں دامن مرا

میر سعادت حسین نجیب

ایلا ویلر ولکاکس

کچھ عرصہ ہوا نئی دنیا امریکا، والوں نے اخلاق، نفسیات اور ادبِ لطیف کے امتزاج سے ایک نئے ادب کی طرح ڈالی اور اس کا نام "فکرِ جدید" رکھا۔ بخلاف غیر خوش آئند خشک اخلاقیات کے اس کو دنیا میں انتہا درجہ کی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور وہی بات جو ناصح کی زبان سے سن کر لوگوں کو ناگوار ہوتی تھی، "فکرِ جدید" کی کتابوں کے ذریعہ سے اُن کے اخلاق وعادات میں داخل ہوگئی۔ اس ادب کے سب سے بڑے علم بردار کیپٹن ڈی لارسن، جیمز ایلین، فرنیک کرین، رچرڈ ٹرنگ، سویٹ مارڈن وغیرہ ہیں۔ ان سب نے فکرِ جدید کو نثر میں لکھا ہے۔ انہیں میں ایک شاعر خاتون ایلا ویلر ولکاکس بھی تھیں جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ یہ "فکرِ جدید" کو نظم میں بھی لکھتی تھیں۔ انہوں نے زندگی کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور پھر دوسروں کی زندگیوں میں کیف و موسیقی پیدا کرنے کے لئے وہ لطیف نغمے گائے تھے جن میں سے چند ایک کا ترجمہ نثر میں ہم یہاں درج کرتے ہیں:۔

شاعر

"اے وہ جو میرے ان نغموں کو پڑھتا ہے جو میں نے گائے ہیں تو اُس روح کی تہ تک نہیں پہنچ سکا جہاں سے یہ نغمے پیدا ہوتے۔

کیا تجھے یہ خیال ہے کہ شاعر نے اپنے دل کے راز کو سامعین کے ہجوم کے سامنے بلند آہنگی سے کہہ دیا ہے؟

اگر تو ساحل پر سے سیپیاں اور گھونگے چُن لے تو اُن کے رنگ اور چمک کے سوا تجھے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔

یہ تجھے اُن پُر اسرار پہنائیوں کی کہانی نہ بتا سکیں گے جو سمندر کے عمقِ عمیق میں پوشیدہ ہیں۔

ہمارے نغمے بھی سیپ اور گھونگے ہیں جنہیں خیالات کی موج نے ساحل پر پھینک دیا ہے ان کو چُن لے مگر یہ نہ سمجھ کہ تو موجوں کی سطح کے نیچے کے حالات سے بھی واقف ہوگیا ہے جہاں مونگے اور مرجان کے غار ہیں"

چاند کا پیغام

آسمان کی رفعت پر آج صبح مجھے چاند نظر آیا،

اگرچہ اُدھر آفتاب بھی اپنا نور بکھیر رہا تھا

میری روح کو اُس نے پیغام دیا:

"رات آنے والی ہے!"

انعام

تقدیر مجھ سے بُری طرح پیش آئی،
میں نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا،
تاکہ کوئی نہ جان سکے کہ میں نے کیسا تلخ جام نوش کیا ہے۔
مسرت آئی اور جہاں میں بیٹھا تھا میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی،
وہ کہنے لگی میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم کس بات پر ہنس رہے ہو۔

تقدیر کی ہوائیں

ایک جہاز مشرق کی طرف رواں ہے تو دوسرا مغرب کی طرف۔
اُسی ایک ہوا سے جو چل رہی ہے،
یہ بادبانوں کا رخ ہے جو انہیں بہائے لئے جاتا ہے،
ہواؤں کا رخ نہیں۔
تقدیر کی ہوائیں بھی سمندر کی ہواؤں کی مثال ہیں جب ہم بحرِ زیست پر سفر کرتے ہیں
تو یہ روح کی رَو ہوتی ہے جو ہمیں منزلِ مقصود کی طرف بہائے لئے جاتی ہے،
امن و سکون یا جدوجہد کی فضا نہیں ہوتی۔

بچّوں کا معلّم

بچوں کے معلم، تیرا کام کتنا عظیم ہے،
تو اُن دھاگوں کو لیتا ہے جن کو والدین کے بے احتیاط ہاتھوں نے الجھا دیا ہو
اور پوری توجہ اُن پر صرف کر کے ایک نفیس، مضبوط اور خوبصورت کپڑا تیار کر دیتا ہے۔
جس کام کو خدا نے ناتمام چھوڑا ہے وہ تجھے پورا کرنا ہے ـــــــ
اپنے دل میں عزم اور ہمت پیدا کر۔

منصور احمد

محفلِ ادب

تاروں بھری رات

وقفِ سکوں ہوا ہے ہر اک شے کا اضطراب　　ہر نقش زندگی کا بنا نقشِ سطحِ آب
تاریکیوں میں ڈوب گیا جامِ آفتاب　　پھونکا شبِ سیاہ نے ایسا فسونِ خواب
سب زندگی کی شورشیں خاموش ہو گئیں
آنکھیں شرابِ خواب سے مدہوش ہو گئیں

جلوہ فشاں ہے وادیٔ اخضر میں بوستاں　　پیشِ نظر ہے منظرِ فردوس کا سماں
داماں گلفروش ہے دامانِ کہکشاں　　کیا دلفریب چرخ کی ہیں زرنگاریاں
افشاں جبینِ شب پہ نمودار ہو گئی
سطحِ فلک تمام سمن زار ہو گئی

تارے فضائے عرش میں ہیں جگمگا رہے　　آویزے یا ہیں ماہ جبینانِ خلد کے
روشن ہوئے ہیں محفلِ بالا کے قمقمے　　یا ڈل میں پھول ہیں یہ کنول کے کھلے ہوئے
حورانِ خلد شب کے لئے بے نقاب ہیں
یا بحرِ نیلگوں کے طلائی حباب ہیں

گلشن میں طائروں کے ہوئے آشیاں خموش　　صحرا میں ہو گئے جرسِ کارواں خموش
کوہِ گراں خموش ہے بحرِ رواں خموش　　بزمِ جہاں خموش ہے کون و مکاں خموش
شاعر کا ساز زمزمہ پرداز ہے ابھی
اس کا خیال مائلِ پرواز ہے ابھی

گو چشمۂ حیات نمودِ سراب ہے　　گو اپنی زیست صورتِ شکلِ حباب ہے
گو نقش ہر امید کا اک نقشِ آب ہے　　گو ذکرِ ہست و بود فسانہ ہے خواب ہے

لیکن یہ بزم گلکدۂ رنگِ حسن ہے
عالم تمام جلوۂ از رنگِ حسن ہے
تاروں سے چرخ ہے ورقِ زرنگارِ حسن گویا کھلی ہوئی ہے فلک پر بہارِ حسن
ہے بادہ ریز جلوۂ رنگیں عذارِ حسن جامِ جہاں ہے جامِ مئے خوشگوارِ حسن
پی اور بے ثباتئ عالم کو بھول جا
ناکامیوں کی سوزشِ پیہم کو بھول جا

"نورجہاں"

ہجومِ یاس

گوتم نے اپنے صحرائی دارالہجرۃ سے اپنے باپ کو یہ پیام بھیجا:-

"میں جو اس طرح اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکل گیا ہوں تو اس واقعہ پر کوئی ماتم نہ کیجئے۔ یکجائی، خواہ وہ کتنی ہی طویل ہو، دائمی نہیں ہوسکتی ...... جو قانونِ مفارقت اس قدر ہمہ گیر اور قدیم العہد ہے اُس کے خلاف چند روزہ بقا کا کیا چارہ ہے؟ میرے لئے ماتم کرنا بے محل ہے اس لئے کہ میں نے اپنے پیچھے جس رنج و غم کو چھوڑا ہے وہ ایک عارضی صدمہ ہے ...... جب یہ نقشِ محبت ماند پڑ جائے گا تو زخمِ غم بھی مندمل ہوجائے گا ...... اگر میں اپنے شوقِ آزادئ روح میں اپنی بشری محبت کے تقاضے سے آپ لوگوں سے برابر وابستہ رہتا تو جو علیحدگی میں نے اس وقت دانستہ اختیار کی ہے وہ ایک دوسرے طریقے سے عارض حال ہوتی، یعنی موت یہ کام انجام دیتی! غور کیجئے وہ میری والدۂ محبوب جس کی آغوشِ رحم میں میں نے پاؤں پھیلائے تھے اور جس کے لئے میں اس طرح کتنے شدید درد و کرب اور تشنگی و تکلیف کا باعث ہوا تھا، اس وقت کہاں ہے؟ اُس کے سارے مصائب و شدائد بے ثمر ثابت ہوئے! میں اُس کے کیا کام آیا؟ ...... جس طرح لکہائے ابر اپنی متواتر گردش و حرکت میں چند لمحوں کے لئے باہم بغل گیر ہوجاتے ہیں میری نظر میں تو اہلِ زمین کے فانی اتحاد و وصل کی یہی تعبیر ہے! (بدھا کارتیا، ۶، ۱۶)

"اپنے اعزہ و اقربا کی یہ جدائی کونسا دل ہے جس میں ہوک نہ پیدا کرے گی! لیکن آہ! اس جدائی سے تو بہرحال مفر نہیں، پس میں انجام کو آغاز میں خود ہی انگیز کئے لیتا ہوں اور اپنے عاشق باپ کے ظلِ شفقت کو خیرباد کہتا ہوں!"
(ایضاً، ۹، ۳۲)

"ہماری جتنی مرغوبات و مالوفات ہیں اگر وہ لازوال بنائی جاسکتیں اور تغیر و مفارقت کے خطرے سے بالاتر ہوسکتیں تو یہی دنیا بہشت بن جاتی اور ہم کو اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر ہی دار القرار مل جاتا! لیکن آہ آسمان کے نیچے یہ چیز کہاں"! (فوشوہنگ سان کنگ ۱۸۶۳)

"میں نے آپ لوگوں کو پہلے ہی جتا دیا ہے کہ ناموسِ فطرت کا منشا یہ ہے کہ جو چیزیں آج باہم بغل گیر ہیں اُن کا رشتۂ مواصلت ایک وقت منقطع ہو کر رہے گا۔ پس عشق و محبت کی ریشمی ڈوریاں بھی شکستنی ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جامِ الفت کے اس بادہ خوار کمبخت دل کو سینے سے نکال کر پھینک دیا جائے"! (ایضاً ۱۸۶۱)

"اگر دنیا کی چیزیں مجھ کو قیام و دوام کی ضمانت دیتیں اور ہم لوگ کمزوری و عمر رسیدگی، بیماری و موت کے خمیازوں سے آزاد ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ میں بھی ساغرِ محبت کی، شکم سیر ہو کر جرعہ نوشی کرتا اور اِس بزمِ عیش سے کبھی بھی نہ اکتاتا"! (ایضاً ۳۰۳)

"جامعہ"

انقلاب

دائمی شباب کا میں ہی راز ہوں، میں ہمیشہ سے زندگی کا بیمہ کرنے والا ہوں، جہاں میں نہیں ہوں وہاں موت طوفان پیدا کرتی ہے، میں مظلوموں کی امید، خوشی اور خواب ہوں جو کچھ قائم ہے میں اُسے تباہ کر دیتا ہوں۔ لیکن اُس ٹیلے سے جہاں میں اترتا ہوں، نئی زندگی بہنے لگتی ہے۔ میں تمہیں موت کی آغوش سے آزاد کردوں گا، اور تمہاری عروق میں ایک نئی زندگی بھردوں گا، زندگی کی دائمی شرط یہ ہے، کہ جو کچھ قائم ہے وہ تباہ ہوجانا چاہئے، اور میں اسی قانون کو پورا کرکے ایک تازہ اور نئی زندگی معرضِ ظہور میں لاتا ہوں، میں اِس نظام کو جس میں تم بستے ہو بنیادوں سے لے کر تمام کا تمام نئے سرے سے بناؤں گا، کیونکہ یہ نظام گناہ کا بیٹا ہے، اس کا پھول تنگی ہے اور اس کا پھل جرم ہے، دانہ پک چکا ہے اور میں اس کا کاٹنے والا ہوں، میں ہر ایک بھرم کو جو بنی نوعِ انسان پر اقتدار رکھتا ہے، اڑا دوں گا، میں زندوں پر سے مُردوں کی حکومت ہٹا دوں گا، آزاد آدمی ہی مقدس ترین آدمی ہے، اُس سے بڑھ کر کوئی چیز مقدس نہیں۔"

جرمن "کرتی"

صحرا کے جفاکش

مصروف دنیا سے گھبرا کر اور متمدن عالم سے پریشان ہو کر میں صحرا کی طرف جا نکلا، میں یہاں سکون تلاش کر رہا تھا

اور اطمینان کی جستجو میں تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ انسانی دماغ اور انسانی آنکھ کے لئے یہاں بھی کوئی سکون نہیں ہے اور متمدن دنیا سے زیادہ یہاں زندگی کی کشاکش موجود ہے۔

آسمان سے باتیں کرنے والے اونچے اونچے درخت فضا میں جنبش کھا رہے تھے اور میری آنکھ نے دیکھا کہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اُن کو بھی فضا سے جنگ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اس کے بغیر اُن کی زندگی ناممکن ہے۔

میں نے دیکھا کہ گلشن میں پھول کھلتے تھے، مرجھا جاتے تھے۔ درختوں پر ثمر نمایاں ہوتے تھے لیکن کچھ مدت کے بعد درختوں کو اس نعمت سے موسم کی تبدیلیاں محروم کر دیتی تھیں اور اُن کو میں اپنی دولت کے کھونے پر متاسف پاتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ جنگل کے درندے اِدھر سے اُدھر اپنے شکار کی فکر میں بے چین پھر رہے تھے اور جب اُن کا قابو چل جاتا تھا تو وہ کمزور جانوروں کو اپنی غذا بنا لیتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے حقیر جانور بھی زندگی کے قیام کے لئے انتہائی جفاکشی سے کام لے رہے تھے اور اُن کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین میسّر نہ تھا۔

صحرا کے جفاکشوں کی زندگی کا میں نے مدتوں گہری نگاہ سے مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جفاکشی زندگی کے قیام کے لئے ضروری اور لازمی ہے یا یوں کہئے کہ جفاکشی زندگی کا دوسرا نام ہے۔

اے انسان اے راحت کے طالب انسان تُو راحت چاہتا ہے تُو آرام چاہتا ہے اور سکون چاہتا ہے لیکن سالہا سال کے تجارب کے بعد میں تجھ سے کہتا ہوں کہ جفاکش بن اسی میں راحت ہے اور اسی میں اطمینان ہے اور یہی تیری زندگی کا مقصد ہے وہ جنہیں تو ناکام پاتا ہے سمجھ لے کہ اس نعمت سے محروم ہیں اگر تو نے اس نعمت کو چھوڑ دیا تو تیرا وجود بھی آلام سے لبریز نظر آئے گا۔

"دین و دنیا"

عربی

رحم و ہمدردی

"پانی اگرچہ ایک حقیر سی شے ہے لیکن گھاس کی جان بچانے کے لئے خود کو مٹا دیتا ہے اسی طرح ایک خدا ترس آدمی دوسروں کے مصائب کم کرنے میں چاہے اپنی جان قربان کر دے، اُس کو ایک معمولی بات سمجھتا ہے (۲) پانی ایک انچ آگے نہیں بڑھتا تاوقتیکہ وہ اپنے راستے کے چھوٹے چھوٹے نشیب کو پُر نہ کر دے، پس ایک دردمند شخص ایک قدم آگے نہیں بڑھتا جب تک مصیبت زدوں کے آلام کو دور نہ کر دے (۳) کانٹا پاؤں میں چبھتا ہے مگر اُس کی کھٹک روح تک پہنچتی ہے، اسی طرح خدا ترس کا دل غم زدوں کے رنج سے بھر آتا ہے"۔

سیتا

"وہ اِس قدر نازک اندام تھی کہ معلوم ہوتا تھا، چاند کی کرنوں سے اُس کا بدن چھلنی ہو جائے گا، اور کنول اُس کے مقابلے میں سخت تھا۔ اُس کے اعضا آسمان سے بھی زیادہ لطیف چیز کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے (۲) اُس کے چھونے سے تمام اعضا اور دماغ میں ایک پھریری سی پیدا ہوتی تھی اور اُس کے خوبصورت نظارے سے جو انبساط ہوتا تھا اُس کے سامنے امرت کی شیرینی کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ اُس کے چہرے پر نظر ڈالنے سے آنکھوں پر خوشی کے مارے وجد طاری ہوتا تھا، وہ اُس کے چہرے پر جمی رہتی تھیں اور کسی دوسری چیز کو دیکھنے سے حظ نہیں پاتی تھیں۔ (۳) اُس کے حسن کی دیدہ سر مقاومت پر فتح پاتی تھی اور حسن کی ایسی تکمیل یافتہ شکل کہیں اور نظر نہ آسکتی تھی"۔

ایمان و یقین

(۱) چاہے مجھے کھانا میسّر نہ آئے، اولاد میسّر نہ ہو، لیکن اُس کی رحمت مجھ پر ضرور ہونی چاہئے، یہی میرے ضمیر کا تقاضا ہے اور یہی نصیحت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ چاہے میرے جسم کی توہین ہوا کرے اور میں بیتا میں پڑا رہوں۔ لیکن نارائن میرے من سے جدا نہ ہو۔ کیونکہ تمام دنیوی سامان عارضی ہیں اور صرف وہی اکیلا ابدی ہے"۔

(۲) "اے خدا تجھے معلوم نہیں کہ تُو اپنے پرستاروں کو کیسی کیسی خوشیاں بخشتا ہے۔ کنول کا پھول اپنی خوشبو کو نہیں جانتا لیکن شہد کی مکھی اُس سے لطف اُٹھاتی ہے۔ گائے صرف گھاس کا مزا جانتی ہے لیکن بچھڑا دودھ کی لذت سے بھی واقف ہے۔ سیپی کے اندر موتی ہوتا ہے لیکن اُس کے پہننے کا لطف دوسرے اٹھاتے ہیں"۔

"بچہ اگر اپنی ماں کو لحظہ بھر نہ دیکھے تو بے چین ہو جاتا ہے، گو بہت سے لوگ اُسے بہلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ اپنی ماں ہی کے پاس رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کی باتوں میں اُس کا جی ہرگز نہیں لگتا۔ میرا خدا میری ماں ہے اور میرا جی کسی اور چیز میں نہیں لگتا"۔

"اردو" مرہٹی

مطبوعاتِ جدیدہ

آئینۂ حقیقت نما - جلد دوم۔ یہ کتاب اسلامی ہندوستان کی اُس تاریخ کا دوسرا حصہ ہے جس سے ناظرین "ہمایوں" اکتوبر ۱۹۲۶ء میں متعارف ہو چکے ہیں۔ پہلی جلد محمد بن قاسم کے عہد سے شروع ہو کر خاندانِ خلجی تک ختم ہوتی تھی۔ اِس دوسری جلد میں سلطان غیاث الدین تغلق سے لے کر سلطان علاؤالدین کی وفات اور بہلول لودی کے قبضۂ دہلی تک کے حالات درج ہیں۔ یہ تاریخ اس نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنے محکوموں سے کیسا روادارانہ اور منصفانہ سلوک روا رکھا۔ کتاب کے مصنف مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ایک مستند اور معتبر تاریخ دان ہیں۔ اُن کی قابلیت مسلمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کتاب کا پہلا حصہ چھپا تو بے حد مقبول ہوُا اور دوسرے حصہ کی اشاعت کے لئے ہزاروں خطوط مولانا کے پاس پہنچ گئے۔ یہ جلد بھی بے حد دلچسپ اور پُر از معلومات ہے حجم ۲۳۱ صفحے اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب ایڈیٹر "عبرت" نجیب آباد سے طلب فرمائیے۔

تین ترک جاسوس مصنفہ جناب ملک عبدالقیوم صاحب بی اے علیگ بیرسٹر ایٹ لا۔ یہ کتاب انقلابِ ترکی اور جنگِ فرنگ کے اُن حیرت انگیز انکشافات پر مشتمل ہے جن سے عام طور پر دنیا ناواقف ہے۔ اِن معلومات کا ماخذ عام مغربی اخبارات اور کتب نہیں بلکہ وہ بیانات ہیں جن کا علم بقولِ مصنفِ موصوف اُن کو سیاحت ترکی کے دوران میں معتبر ذرائع سے ہوُا۔ یہ فوق العادت اور فوق القیاس واقعات ترکوں کی بے نظیر شجاعت الوالعزمی اور قوم پرستی کا ایک بے حد دلچسپ بیان ہیں جسے پڑھ کر انسان کے دل میں ہمت و ایثار کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ حجم پونے تین سو صفحات اور قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے شیخ محمد اسمٰعیل صاحب مینیجر العدل بک ایجنسی گوجرانوالہ سے مل سکتی ہے۔

لطیفیات - یہ شیخ محمد حسن صاحب لطیفی بی اے کے اشعار و مضامین کا مجموعہ ہے۔ جناب لطیفی علی گڈھ یونیورسٹی کے درجہ ایم اے میں تعلیم پاتے ہیں اور بہت ہونہار اور قابل نوجوان ہیں۔ لطیفیات ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم نے سرسری نظر سے اس مجموعۂ کلام کو دیکھا ہے۔ اشعار پاکیزہ معلوم ہوتے ہیں، البتہ فارسی کا رنگ زبان پر ضرورت سے زیادہ غالب ہے۔ یہ چند اشعار ہمیں خاص طور پر پسند آئے:-

ہر گام پہ ہوتا ہے گماں حدِ عدم کا ‌‌ ‌ شاید مجھے دنیا سے گزرنا نہیں آتا

ربطِ باہم سے دل آویز ہیں اجزائے بہار ورنہ یہ گلکدہ بیگانۂ رعنائی ہو

منتِ گوش سے سبک جنبشِ لبِ بے نیاز ایک صدائے بے صدا پردہ کشائے راز ہے

کتاب با اعتبار کتابت و طباعت و کاغذ غرض کہ ہر طرح سے اچھی ہے مصنف کی تصویر بھی شامل ہے قیمت فی جلد ایک روپیہ۔ شیخ محمد حسن صاحب لطیفی، بی، اے، ایس ایس ایسٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے منگایئے۔

مرقع انشا۔ حصۂ اول، مصنفہ جناب سید محسن شاہ صاحب ترمذی۔ یہ کتاب درجاتِ وسطانیہ کے طلبا کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں اردو مضمون نویسی کی نہایت موزون مثالیں جمع کی گئی ہیں اور ان مثالوں کے بعد اسی صنف کے موضوعات کے خاکے بنا کر مشق کرائی گئی ہے مضامین عموماً بیانیہ اور ذکریہ ہیں جو وسطانی درجوں کے طلبا کی ذہنیت کو مدنظر رکھ کر آسان اور سلیس پیرایہ میں لکھے گئے ہیں۔ حجم ۲۶ صفحات، قیمت آٹھ آنے ہے۔ پتہ۔ دفتر ایجوکیشنل گزٹ جالندھر۔

بچوں کی دیکھ بھال۔ مصنفہ مجیب الدین صاحب ایل ایم پی قیمت آٹھ آنے۔ ۴۶ صفحات کی مختصر لیکن نہایت اہم اور کار آمد کتاب ہے، جس میں بچوں کی پرورش اور اُن کی تربیت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ بچوں والے ہر گھر میں ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے، جو یہ بتائیں کہ بچوں کو کس قسم کی غذا دینی چاہئے اور اس کی مقدار کیا ہونی چاہئے۔ معمولی عوارض کا علاج کیسے کرنا چاہئے اور ان میں کس قسم کی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں بڑی حد تک یہ باتیں درج ہیں۔ ہمدرد پریس دہلی سے طلب فرمایئے۔

مسلم انڈیا۔ انگریزی زبان کا ایک سیاسی اور ادبی ہفتہ وار اخبار ہے جو لاہور سے مولوی فضل کریم خاں صاحب درّانی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مولوی صاحب ایک نہایت قابل اور آزادہ رو شخص ہیں اور اس لئے ہمیں امید ہے کہ اُن کا اخبار مفید ہونے کے ساتھ ہی کامیاب بھی ثابت ہوگا۔ اس اخبار کا پہلا نمبر ہم دیکھ چکے ہیں اور ہماری رائے ہے کہ یہ اپنے مقاصد کو بہ حسن و خوبی پورا کر رہا ہے سالانہ چندہ دس روپے ہے اور ایک پرچہ کی قیمت چار آنے۔ ملنے کا پتہ، مینجر مسلم انڈیا، ۷ پارک لین، ٹمپل روڈ۔ لاہور۔

سروش۔ ماہوار ادبی رسالہ ہے۔ پہلا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ نظم و نثر کے انتخاب اور ترتیب میں کافی محنت کی گئی ہے۔ نثر کے مضامین میں "بزمِ آخر"، اور "اردو شاعری کی موجودہ روش" اور "ابو علی الحسن" بہت عمدہ ہیں اور نظموں میں "قطرہ و دریا" اور "عہدِ وصال کی یادیں" اچھی ہیں۔ حجم ۴۸ صفحے ہے اور سالانہ قیمت تین روپے رکھی گئی ہے مینجر رسالہ "سروش" کسان بلڈنگ لاہور سے طلب فرمایئے۔

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵ — بابت ماہِ مارچ ۱۹۲۹ء — نمبر ۳

تصویر:- آمدِ افلاس

جہاں نما

چین

"مجلۂ چین" میں ملک کی موجودہ سیاسی حالت پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے:-

وہ خطرناک خانہ جنگی جسے ملک کو پارہ پارہ کرتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا آج ختم ہو چکی ہے اور اگرچہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ بعض علاقوں میں ابھی پوری طرح سے امن قائم نہیں ہؤا، اور پیشین گوئیاں بھی ہو رہی ہیں کہ پھر جلد ہی آتشِ جنگ مشتعل ہو گی تاہم ہمیں ملک کے طول و عرض میں رجائیت کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ آخر اُن کا وطن اُس درد و کرب سے نجات پا چکا ہے جسے اس نئی جمہوریت کی پیدائش پر اُسے برداشت کرنا تھا اور اُن کا ملک اب قومی، سیاسی اور صنعتی ترقی کے دور میں داخل ہو رہا ہے جس کی بدولت وہ جلد سے جلد اُس مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں وہ بجا طور پر دوسری ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکیں گے۔

۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد شاید پہلی مرتبہ ملک کینے کو ایک حکومت کے ماتحت آیا ہے اور گو حکومت کو ابھی بہت سا کام انجام دینا ہے اور اُس کو اس میں بہت سی مشکلات بھی پیش آئیں گی لیکن پھر بھی بڑی حد تک کام سرانجام ہو چکا ہے اور ملک مبارکباد کا مستحق ہے کہ اُس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔

موجودہ صورتِ حالات میں ہمیں مستقبل کے لئے بڑی بڑی امیدیں نظر آتی ہیں اور جب تک موجودہ حکومت تجارت، صنعت، اندرونی سیاسیات اور بیرونی تعلقات کو قائم کرنے میں اپنی مساعی کو سرگرمی سے انجام دے رہی ہے ہم دل و جان کے ساتھ اُس کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ اگر وہ جن کے ہاتھ میں طاقت ہے اپنے اختلافات اور خواہشات کو مٹا کر اُن بہت سے مشکل مسائل کو مل کر باہمی مشوروں سے حل کریں جو اس وقت ہمیں درپیش ہیں تو کوئی شک نہیں کہ چین پر حقیقت میں امن و فلاح کا زمانہ آ جائے۔

آخر خدا نے عیسائیوں ہی کو امن و محبت کا منصب دے کر زمین پر نہیں بھیجا، چین کے حکما و عقلا ہمیں بھی یہ سبق دے گئے ہیں، اور ہم اُن سے جن کے ہاتھوں میں ملک کی قسمت کی باگ ڈور ہے یہ کہیں گے کہ وہ اپنے آبا کی تعلیم کی طرف راغب ہوں اور علم و عرفان کے اُن سرچشموں میں سے قومی عظمت کے رازوں کو سیکھیں۔

آمد افلاس

Good
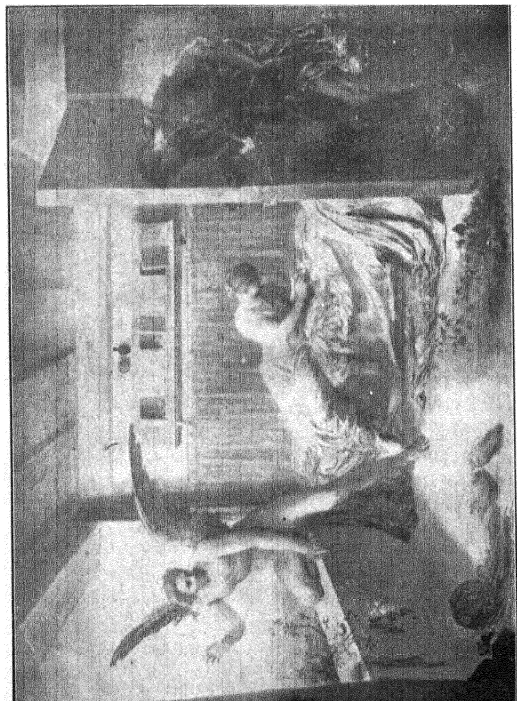
CALCUTTA
ART PG. WORKS,
LAHORE

تعلیم میں آزادی

۱- آزادی تعلیم کا مقصد ہے۔ آزادی کا تعلق انسان کی روحانی فطرت سے ہے اور روحانی فطرت ہی کی بدولت اُس کو وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جو روح اور جسم دونوں کو آزاد کردیتی ہے۔ انسان اپنی روحانی اور فطری حیثیت ہی سے آزاد پیدا ہُوا ہے اور آزادی اس میں بالقوۃ موجود ہے وہ اسے اپنی پیدائش ہی سے ساتھ لاتا ہے انسان کا بچہ صرف اسی لحاظ سے آزاد ہے اور آزاد کہلاتا ہے کہ اس کی فطرت ہی میں روحانیت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اُسے بالکل آزادی کے ساتھ اُس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ جب تک ہم اپنی فطرت سے خائف ہیں اور جب تک ہم خود کو یعنی اپنے روحانی وجود کو پہچاننے کی جرأت نہ کریں گے اُس وقت تک ہم بجا طور پر مسئلۂ تعلیم پر بحث کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے روحانی معلومات کی روشنی ہی میں ہم تعلیم اور زندگی کے بہترین نتائج کی امید کرسکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ روحانیت کی تحقیقات کے بارے میں ہم ہر قسم کی سعی اور کوشش کا خیر مقدم کریں اور ہمیں اس کے نور کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ خواہ وہ کسی ذریعہ اور وسیلہ سے ہو۔

اب ہم کو اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ زندگی کے روحانی معنی کے معلوم کرلینے اور آزادی کی حقیقی روحانی قدر و قیمت کے سمجھ لینے کے بعد تعلیم کے مسئلہ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور اُس کے کیا کیا عملی نتیجے رونما ہوسکتے ہیں۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں ہمیں مطلق تامل نہ ہونا چاہئے کہ بچہ ایک متبرک ہستی ہے۔ اِس لئے اُس کی ہستی اور وجود کا مطالعہ کرکے اُس کی اس طرح مدد کرنی چاہئے کہ وہ اپنی اصل نوعیت ہی میں ترقی کرے۔ نہ یہ کہ اُس کو مٹا کر اُس کی بجائے ایک فرضی اور محض مصنوعی چیز بنا کر اپنے سامنے رکھی جائے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر بچے میں ایک روحانی ہستی اور ایک قوتِ حیات ہے۔ اِس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اُس کی جی جان سے حفاظت کریں اور اُس میں بے جا مداخلت کرنے سے اجتناب کریں۔ بچہ طبعاً آزاد ہے اِس لئے ہم پر بھی واجب ہے کہ ہم اسے فطری اور انسانی اور ماحول کی بندشوں سے آزاد کردیں۔ اگر واقعی ہمارا یہ مقصد ہے کہ وہ آزاد اور خوددار ہستی ہو کر رہے تو اُسے نہ صرف اپنے فطری ذوق سے بلکہ اپنی غلطیوں سے بھی زندگی بسر کرنے اور صحیح اور صالح عمل پیدا کرنے دینا چاہئے۔

مدرسہ حقیقی آزادی کی راہ میں ایک بہت ہی ضروری منزل ہے کیونکہ یہی وہ منزل ہے جو اُس کے "گھر" اور وسیع دنیا کے درمیان واقع ہے۔ اور اسی منزل اور اسی مکان سے گزر کر وہ اس بڑے مکان میں پہنچتا ہے۔ ایسے مدرسوں میں جن

کو تمام انتظامی حقوق دے دیئے گئے ہیں یہ پایا گیا ہے کہ مدرسہ کی باقاعدگی کے لئے ایک عام خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہر فرد پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

۲- آزادی ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے۔ دنیاوی زندگی روحانی بصارت کی محتاج ہے اور ہمارا نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ ہم اپنے بچوں کے لئے ایسے ذریعے اور وسیلے پیدا کریں جن سے اُن میں حقیقی بیدار مغزی پیدا ہو اور وہ اپنی حیات کے ہر لمحہ میں بہتر اور زیادہ کامل ہوتے جائیں۔ بچوں کو اس امر کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حیات کو کس کس طرح استعمال کرنا چاہئے اور اس سے کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں تاکہ وہ ایک کامل انسان کی حیثیت پیدا کر سکیں لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی صحیح طریقہ پر راہنمائی کریں تاکہ وہ زندگی کی اصل ماہیت اور قدر و قیمت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔

"آزادی" کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم پوری طرح سے اس صداقت کو تسلیم کر لیں کہ انسانی زندگی کا دار و مدار روحانیت پر ہے۔ کیونکہ جب تک ہم اس صداقت کے معتقد نہ ہونگے حقیقی تعلیم کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہو سکتا۔

انسان ایک پیچیدہ ہستی ہے اگر امن اور ہم آہنگی مقصود ہو تو اُس کے افراد میں اشتراکِ عمل ہونا چاہئے محض یہی بات اِس امر کی مقتضی ہے کہ فضا و عمل آزاد ہو۔

ایک بچّہ کے جسم اور ذہن کا حقیقی نشو و نما صرف آزاد فضا ہی میں ممکن ہے اس لئے بچوں کی ماہیّت ہی میں روحانیت داخل ہے۔ بچے جب بغیر کسی قسم کی روک ٹوک کے کام کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں نیک خیالات کے آثار موجود ہیں اور یہیں سے فنونِ لطیفہ میں اُن کے عملی ذوق و شوق کی ابتدا ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن نتائج پر وہ پہنچتے ہیں وہ نوجوانوں سے زیادہ صحیح اور درست ہوتے ہیں۔

یہ خیال کہ مدرسہ ایک خود دار منتظم جماعت ہے اب ہر طرف مقبول ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مدرسہ اور جماعت دونوں کے اندرونی انتظامات اور اُن کی تنظیم اور ترتیب خود طلبا کے ہاتھ میں بہت سرعت کے ساتھ منتقل ہو رہی ہے۔ اور اس طرزِ عمل سے نہایت ہی تشفی بخش نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ جہاں کہیں لڑکے اور لڑکیاں پوری طرح ذمہ دار کر دی جاتی ہیں وہاں قواعد عموماً بہت سخت ہوتے ہیں اور عدولِ ضابطہ کی سزا بھی سخت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی حالت ایسے مدرسوں سے بہتر ہوتی ہے جہاں استاد اور اُستانیاں مدرسہ کی ذمہ دار ہوں۔ اور اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ضرورت کے اصلی معنی سمجھے جا چکے ہوں وہاں کسی طرح

بھی قاعدہ اور ضابطہ کی خلاف ورزی کا احتمال نہیں ہوسکتا۔ کم سن طبائع کو جس چیز سے خاص نفرت ہے وہ یہی ہے کہ اُن کی آزادی میں کسی طرح کی دست اندازی ہو۔

۳۔ ترقی کے مدارج۔ انسان کے مدارجِ ارتقا کے متعلق اب تک جو خیال عام طور پر رائج ہے وہ بہت کچھ مبہم اور غلط سمجھا جا رہا ہے۔

جب ہم ایک عملی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مدارجِ ارتقا کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد جسمانی، دماغی اور قلبی قوتوں کی ترقی سے ہوتی ہے اور ہمارا منشا وہ تدریجی ترقی ہوتا ہے جس سے ہماری شخصیّت اور خودی آگے بڑھتی اور تقویت حاصل کرتی ہے۔

ہم ذیل میں مدارجِ ارتقا کی تشریح کرتے ہیں۔ مگر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس تشریح میں ذہنی ترقی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے:۔

سات سال کی عمر سے قبل چھوٹے بچوں کو صرف اپنے عملی تجربوں سے سبق حاصل کرنے دینا چاہیئے۔ اگر بچے کو یہ سکھانا مقصود ہے کہ وہ اپنے حواس کو آزادی کے ساتھ کس طرح استعمال کرسکتا ہے تو اس عمل کا بہترین زمانہ اُس کے لیئے وہی ہے جب کہ ذہن اور حواس کے قوٰی ترقی کے مدارج طے کر رہے ہوں۔

میڈم مون ٹیسوری کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ لڑکوں کے لئے پند آموز اسباب مہیا کئے جائیں اور وہ براہِ راست انہیں سے تعلیم حاصل کریں۔ سات برس سے کم عمر کے بچوں کو بہت کثرت سے عقلی تجربے کرنے چاہئیں اور اس کے لیئے یہ ضروری ہے کہ اُن کے سامنے جس قدر اشیا ہوں وہ سب "زندہ" حالت میں موجود ہوں۔ ایک چھوٹا بچہ ایسی ضروری اشیا کا محتاج ہوتا ہے جن سے وہ اپنے آپ کو مصروف رکھے اور اُس کا ماحول ایسا ہو کہ وہ اپنی معلومات بغیر مزاحمت کے حاصل کرسکے۔ اگر چھوٹے چھوٹے بچوں کو مشغول رکھنے کے لئے کافی سامان مہیا ہو تو کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح تکلیف دہ یا شریر ہوں۔ اسی لئے یہ ضرورت ہے کہ اُن کو بالکل شخصی آزادی دی جائے۔

والدین کا یہ سوال ہوتا ہے کہ بچے کو کب پڑھانا چاہیئے؟ اور جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ عمر کا تعیّن نہیں کیا جاسکتا تو اُنہیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اُس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ بچے میں تعلیم پانے کا احساس از خود پیدا نہ ہو۔ بہت کم عمر میں پڑھنا شروع کرا دینے سے ہمیشہ نقصان کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے ابتدائی سال تو محض ماحول کے مطالعہ کے لئے مخصوص کردیئے جائیں اس کے بعد مناسب وقت کا انتخاب کیا جائے۔ لکھنے کے متعلق بھی یہی ہونا چاہیئے۔ لکھنا نقشہ کشی سے پہلے شروع کیا جائے۔ اور یہ دونوں یعنی لکھنا اور نقشہ کشی۔

پڑھنے سے پہلے۔

بچپن ہی سے حفظ کرنے کی ترغیب نہ دی جائے۔ ایک ایسا زمانہ آتا ہے جو سات سے بارہ سال تک محدود ہے جب کہ حفظ کرنا نہ صرف آسان بلکہ مناسب بھی ہوتا ہے۔ یہ امر بچوں کی فطرت کے قطعی خلاف ہے کہ جب وہ جماعت میں ہوں تو حفظ کریں۔ کسی کھلے مقام پر جہاں چلا پھرا جاسکے، (یا باغ میں حفظ کیا جائے تو بہتر ہے) اس لئے کہ اس طرح حفظ کرنے میں نہ صرف آسانی ہوتی ہے بلکہ اس کا جسمانی ترقی پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ ہمیں کسی بچے کی ترقی میں مزاحم نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے اُسکی رفتار پر چھوڑ کر بالغ ہونے دینا چاہیئے تاکہ اُس کے حقوقِ طفلی قائم رہیں

یہ ظاہر ہے کہ کسی ایسے استاد کا کام جو طلبہ کے لئے راہِ آزادی کی بنا ڈالنا چاہتا ہے آسان نہیں اُس کے لئے علم ہمدردی فہم اور ہر ایک طرح کے خلقی اور خوش آیند عمل کی ضرورت ہے تاکہ ہر ایک بچے کی ترقی کی حالت کا کامل احساس وادراک ہو سکے اور کوئی رُخ باقی نہ رہ جائے۔

نو سال کی عمر سے سن بلوغ کے پہنچنے تک بچے کو اپنی شخصیت کی جداگانہ ہستی کا خیال پیدا ہونے لگتا ہے کچھ زندگی کا خوف اور کچھ یہ احساس کہ وہ تنہا ہے اور رہنمائی کا محتاج - وہ کسی پیشوا کی ہدایتوں کا طالب رہتا ہے - سن بلوغ کے ساتھ ہی اُس میں جذبات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ حیا بڑھ جاتی ہے اور بعض اوقات اس کی غیر معمولی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت نوجوانوں کو ایسے معتمد دوست کی بے حد ضرورت محسوس ہوتی ہے جس سے وہ مشورہ کرسکیں۔

والدین اپنے اور لڑکے لڑکیوں کے تعلقات کی اہمیت کو جو بارہ برس کی عمر کے بعد سے بتدریج بدلتے رہنے چاہئیں نہ سمجھ کر بہت نقصان اُٹھاتے ہیں۔ نوجوانوں کے لئے اُن کے بہترین دوست اُن کے والدین ہونے چاہئیں۔

فہم وادراک کے ارتقائی مدارج جو ۱۱ سے ۱۵ سال کے درمیان واقع ہوتے ہیں نہایت ہی اہم ہیں۔ ہر قسم کی تحصیلِ علم کا جو ذوق شوق اس دور میں ہوتا ہے وہ یقیناً پھر کبھی نہیں ہوتا اس موقع پر طلبا کو قواعد اور اصول کے تنہا مطالعہ اور غور کا پابند کرانا سخت غلطی ہے۔ زندگی کا وہ پہلو جو بڑھنے والے جذبات سے متعلق ہے ایک ایسے مناسب سرچشمہ کا محتاج ہے جو علمِ ادب سے مخروج ہے سوائے اچھی ادبی کتابوں کے مطالعے کے اور کوئی شے جذباتی زندگی کی رہنمائی صحیح اصول پر نہیں کرسکتی۔ تاریخ وادب کی مناسب تعلیم نہایت ہی اچھی ہے اور اُس میں خوشگوار نتائج مضمر ہیں۔ ناصحانہ اور بلاواسطہ اخلاقی تعلیم غیر مرغوب ہوتی ہے۔ لیکن مناظرہ اور مباحثہ جس میں بہ نسبت استاد کے طالب علم بہت زیادہ تقریر کرتا ہے خیالات کی صفائی اور باہمی تفہیم میں نہایت بیش بہا

اضافہ کرتے ہیں۔ خصوصاً لڑکپن کے آخری سالوں میں جب جسم و دماغ کے تدریجی ارتقا کے ساتھ سچی روحانیت اپنا عمل کرتی ہے تو یہ چیز نوجوانوں کے لئے اہمیت رکھتی ہے تاکہ وہ آزادی کی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھ سکیں۔

اگر ہر منزل کے مناسب عملوں کو تمام قید و بند سے آزاد کر کے ترقی دیں اور اپنی زیرِ نگرانی کرلیں اور اگر ہم بچے کے لئے کلیدِ علم بھی مہیا کردیں جس سے اچھائی کی طرف اُس کی آنکھیں کھل جائیں تو سمجھ لیجے کہ اس عمل سے ہم نے اُسے تحصیلِ روحانیت کے لئے آزاد راستہ پر چلنے کے لئے آزادی دے دی۔

اِس کے بعد ایک اور درجہ شعورِ ذات کا آتا ہے جب کہ کسی گہری مناسبت کا پیدا ہونا ممکن ہوجاتا ہے لفظ "مناسبت" میں ہر جائز محبت اور ہمدردی جو ہم سنوں یا مختلف العمر لوگوں میں ہو شامل ہے۔ جیسے استاد و شاگردمیں دوستی کا ہونا۔ دوستی کی ضرورت اِس قدر شدید ہے کہ مصنوعی رکاوٹیں اس ارتباط کے درمیان حائل کرنا خلافِ عقل ہے۔ ظاہراً نامناسب دوستی کا قیام والدین اور اُستاد کے لئے ہمیشہ تفکّر اور پریشانی کا باعث ہؤا کرتا ہے مگر عموماً ہر فرد ایسے موقع پر اپنی ضرورت کو بہتر جانتا ہے۔ اور نامناسب و ناموزوں دوستی ہو تو دوست فطرتاً جدا ہوجاتے ہیں۔ ایک اور امر ایسا ہے کہ جس کا ہم صرف سرسری ذکر کرسکتے ہیں اور وہ یہ کہ اصناف کا اختلاف ترقی پر کہاں تک اثر کرتا ہے۔

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے بہت جلد ذہنی پختگی حاصل کرلیتی ہیں۔ اور اُن کے عمل کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ایک معینہ مدت میں بمقابلہ لڑکوں کے زیادہ دماغی کام کرسکتی ہیں۔ مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ کئی گھنٹوں تک کام نہیں کرسکتیں۔ اگر وہ مسلسل کام کرتی ہیں تو زیادہ تھک جاتی ہیں یا محض تحفظِ ذات کی غرض سے لاپروائی سے کام کرتی ہیں اور اپنی پوری قوت سے کام نہیں لیتیں۔ یہ عادت اُن میں مستقلاً پیدا ہوجاتی ہے اور اُن کی آئندہ زندگی میں نقصان دہ اثرات پیدا کردیتی ہے جسمانی و دماغی قویٰ کا صرف حسبِ ضرورت پوری قوت سے استعمال کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اِس سے بہت سا وقت آرام اور فرصت کے لئے فراہم ہوسکتا ہے۔ بہترین دماغی نتائج حاصل کرنا مقصود ہوں تو لڑکی کو موقع دیا جائے کہ جب تک اُس کی طبیعت تازہ اور موزوں رہے جس قدر ممکن ہو کام کرے اور اس دوران میں کبھی کبھی دم بھی لیتی جائے۔

معلم کی آزادی۔ فی زمانا استاد کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ اساتذہ کی استعداد ناکافی ہے اور اُن کی قابلیتیں بالکل متغائر ہیں۔ تدریس اس زمانہ میں بھی نہایت مناسب پیشہ سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی اور کام حاصل ہونا ممکن ہو تو بہت کم تعداد اس پیشہ میں داخل ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر یہ قول سننے میں آتا ہے کہ جب دوسرے پیشے میسّر نہیں

ہوتے تو ہم ہمیشہ تعلیم کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اساتذہ کا میدانِ عمل تنگ اور آزادی بہت کم ہے اور یہی وہ امر ہے جو اعلیٰ درجہ کے مردوں اور عورتوں کو اس پیشہ کی طرف راغب کرنے میں حارج ہوتا ہے۔ صرف انفرادی کوششوں سے مالی توقعات بہت کم ترقی کی گنجایش رکھتی ہیں۔ تنخواہوں کے درجے اور ضابطے اور سخت سخت قوانین تعلیمی خدمات کے محاصل کو محدود کر دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ تعلیمی پیشہ میں ایسی بہت سی مخالفانہ رکاوٹیں مثلاً رائے عامہ، آدابِ ملازمت وغیرہ بھی موجود ہیں۔ ہم ہمیشہ اس امر کو بھول جایا کرتے ہیں کہ استاد کا بہترین عمل خلقی ہے، اور ہم یہ تصوّر نہیں کر سکتے کہ ایک خلقی صناع اپنا کام اچھی طرح نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اُس کو پوری آزادی حاصل نہ ہو۔

ہم کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ استاد حسبِ ضرورت اپنی تمام معلومات اور فراست سے کام لے سکتا ہے مگر اُسے اس امر کا موقع دیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی معلومات اور فرزانگی کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق فراہم اور استعمال کر سکے۔ مگر ہم کو اساتذہ پر اتنا ہی بھروسا ہے جتنا کہ طلبا پر اور اسی لئے ہم اُن کو آزادی دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہماری بہت سی تعلیمی مشکلات کی بنیاد یہی باہمی بے اعتمادی ہے۔

تعلیمی پیشہ کی طرف عموماً اُن لوگوں کی توجہ ہوتی ہے جو کلیہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور بجائے اس کے کہ کسی فنِ لطیف یا کسی خلقی کام کو اختیار کریں اس پیشہ کو ذریعۂ کسبِ معاش بنا لیتے ہیں۔ مقررہ روزانہ کام کی قید و بندکی دیواریں، نصاب کا نظم الاوقات، امتحانات، ضوابط اور طریقِ تعلیم یہ سب چیزیں اُن نوجوان شوقینوں کو محصور کر دیتی ہیں جو تعلیم کو اپنا پیشہ بناتے ہیں حتیٰ کہ والدین بھی زندگی کی سرگرمیوں کو اندر ہی اندر ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آزاد خلقی مشاغل اور عمل کی تحریک سے بے حس ہو جاتے ہیں۔

ہماری امیدِ مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ایسے اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کریں جو کسی حد تک اندرونی اور بیرونی آزادی حاصل کر سکیں اور ہمیں فکر یہ ہو کہ جس طرح ممکن ہو ہم اُن کے کام کو فروغ دیں۔

تعلیم اساتذہ۔ ایک استاد کی تعلیم کا نصاب نہ صرف مطالعۂ نظریات تاریخِ تعلیم اور اسالیب تعلیم کے جو تعلیمی عمل کے ساتھ ہوں سیکھنے پر منحصر ہو بلکہ بہت زیادہ زور تدریس کے فن پر دینا چاہیئے۔

بسا اوقات فن اور عمل کو مخلوط کر دیا گیا ہے کبھی فن کو عمل ہی سمجھ لیا گیا ہے جس کے ساتھ بعض تعلیمی طریقے اور تعلیمی امدادیں شریک ہیں جو امر عیاں طور پر ہمیں اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ تعلیم نہ صرف ایک فن ہے بلکہ فنِ لطیف ہے۔ اسی لئے تعلیم کا بہت کچھ مدار طریقِ عمل کی بہ نسبت بصیرتِ صحیحہ پر ہے۔ استاد کی ذات بھی بہ نسبت

اُس کی قابلیت کے اس سے زیادہ متعلق ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صحیح تعلیم کا مدار بھی فطرت انسانی کے درست علم پر ہے
صرف درس اور علمی تعلیم کے مواقع ہی نصابِ تعلیم کے بہت اہم اور قیمتی اجزا نہیں ہو سکتے بلکہ جو کچھ کہ
ایک طالب علم اپنے لئے اپنی ذات پر آزادانہ عمل سے اپنے اور دوسروں کے (جو اسی قسم کی مساعی میں مشغول
ہوں) مقابلہ سے باہمی اشتراکِ عمل سے حاصل کرتا ہے وہی اہم اجزا ہیں۔

جب درس ذہن سے فراموش ہو جائے تو درس دینے کی مشق بھی صرف اسی حد تک اس کی معین ہو سکتی
ہے کہ وہ مدارس میں اپنی ذات پر اعتماد کر کے داخل ہو۔ لیکن اگر وہ خود کو سمجھ لے اپنے ذہن و قلب کی خصوصیات کو
پہچان لے اور حقیقی طور پر اپنی پوشیدہ قوتوں کو ترقی دینے لگے تو اُس وقت جو زمانہ تربیت و تعلیم پر صرف ہوگا وہ
یقیناً مستقل ثمرہ پیدا کر سکتا ہے۔

اگر آزادی کو بحیثیت منشائے تعلیم اور ذریعۂ تعلیم قابلِ تمنا تصور کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ نہ
صرف یہ امر اہم ہے کہ استاد خارجاً جس قدر ممکن ہو سکے آزاد ہونا چاہیئے بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ امر ہے کہ وہ
باطنی آزادی بھی رکھتا ہو جس کے باعث کامل ترقی اور پختگی حاصل ہو سکتی ہے۔

یاد رکھئے صرف وہ لوگ جو بذاتِ خود آزاد ہیں دوسروں کی بھی آزادی کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں!

سیّد محمد حفیظ

رات اندھیری ہے اور تیری نیند میرے وجود کی خاموشی میں غرق ہے۔
جاگ اے دردِ محبت! جاگ کہ میں دروازہ کھولنا نہیں جانتا اور میں باہر کھڑا ہوں۔
گھڑیاں انتظار کرتی ہیں۔ تارے پاسبانی کر رہے ہیں۔ ہوا خاموش کھڑی ہے۔ خاموشی میرے
دل میں بوجھل ہو رہی ہے۔
جاگ اے محبت! جاگ میرے خالی پیالے کو لبالب بھر دے اور گیت کی ایک سانس سے
رات کو بیدار کردے۔

گلچیں

رباعیات

(۱)

بدنام ہوں اک صہبائے مستی کیلئے
رسوا ہوں جنوں کی تیز دستی کیلئے
دل حسن و جمال کا صنم خانہ ہے
مشہور جہاں ہوں بت پرستی کیلئے

(۲)

دولت نہ سہی فریبِ دولت ہی سہی
عشرت نہ سہی سرابِ عشرت ہی سہی
امید سے بزمِ عشق بیچین تو ہے
امید کا خواب خوابِ حسرت ہی سہی

(۳)

زہراب ہے ساغرِ مئے ناب نہیں
سیلاب جنوں ہے آبِ پایاب نہیں
میرے لئے آرام کے اوقات میں بھی
میرے لئے کوئی چیز شاداب نہیں

(۴)

دشوار ہیں یہ عاشقی کی راہیں ساقی
بے سود ہیں یہ درد و غم کی آہیں ساقی
لا بادہ دل گداز و اندوہ ربا
ساغر کو ترس گئیں نگاہیں ساقی

عابد

جالینوس

یہ عجیب بات ہے کہ جالینوس[1] کو یونانی حکما میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ یونانی نہیں کیونکہ تمام مورخین خواہ وہ انگریز ہوں یا عرب، اِس امر پر متفق ہیں کہ اُس کی جائے پیدائش ایشیائے کوچک ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس کے آبا و اجداد اصلاً یونانی تھے لیکن اہلِ یونان کے علمی سیاسی اور تمدنی انحطاط کے زمانہ میں جب کہ رومیوں کی ترقی کا عہدِ شباب تھا وہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر پرگامس[2] میں آکر آباد ہو گئے۔ اسی سرزمین کو اس یگانۂ روزگار حکیم کا وطن ہونے کی عزت حاصل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس خاندانی انتساب پر وہ یونانی مشہور ہو گیا ہو ورنہ حقیقت میں ایسا سمجھنا ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب ہے۔ بہرحال ۱۳۱ء میں جب وہ پیدا ہوا اُس کا باپ نیکن فضل و کمال میں شہرۂ آفاق تھا یعنی ہندسہ اور ریاضی اور مساحت میں متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق اور ہیئت میں اُسے کافی دستگاہ حاصل تھی۔ ایسے باپ کا بیٹا جس کی ذات میں قدرت نے ابتدا ہی سے غیر معمولی قابلیتیں ودیعت کر دی تھیں۔ بہترین تعلیم و تربیت سے کیوں محروم رہتا۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی نیکن نے اُس کو علوم ریاضیہ کی تعلیم دینی شروع کی جس کا وہ خود امام وقت تسلیم کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جالینوس بہت ذہین واقع ہوا تھا۔ اُس کو اپنا روزانہ سبق ایک ہی مرتبہ پڑھ لینے سے حفظ ہو جاتا تھا۔ اُس کے وہ ہم سبق طلبا جن میں کچھ سلونے کے بچپن اور ہونہاری کی نشانیاں پائی جاتی تھیں، اپنی ان تھک محنت سے اُس کو زک دینے کی کوشش کیا کرتے لیکن کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ اسی غیر معمولی ذہانت نے نیکن کو اُس کی تعلیم و تربیت کی طرف بہت زیادہ متوجہ کر دیا وہ خود تعلیم دینے کے علاوہ اُسے شہر کے علما و فضلا اور ماہر اساتذہ کی خدمت میں بھی بھیجا کرتا۔ غرض باپ کی تعلیم و تربیت فضلائے عصر کا فیضِ صحبت اور خود اُس کی خداداد قابلیت نے اُس کی عمر کے پندرھویں ہی برس میں اُسے تمام علوم ریاضیہ کا استاد بنا دیا۔

اس کے بعد نیکن نے اپنے لائق بیٹے کو فلسفہ کی تعلیم دلانی شروع کی فلسفہ کی تحصیل میں دو ہی برس گذرے تھے کہ یکایک نیکن نے اُسے علم طب کی تحصیل کے لئے مجبور کر دیا[3]۔ گو ابتدا میں اُسے اِس فن میں کچھ دلچسپی نہ ہوئی لیکن

---

[1] انگریزی میں اسے گیلن Galen یا گیلی نس Galenus کہتے ہیں۔
[2] اس کا جدید نام سمرنا ہے اور اہلِ عرب کے ہاں اس کا قدیم معرب نام فرغاموس ہے۔
[3] اس انقلاب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نیکن نے خواب میں اپنے بیٹے کو بحیثیت طبیب کے مراتب جلیلہ حاصل کرتے دیکھا تھا۔

جوں جوں اُس میں بصیرت پیدا ہوتی گئی اُس کے خیالات میں بھی ایک نمایاں انقلاب نظر آنے لگا۔عنفوانِ شباب ہی سے ترکِ خواہشاتِ دنیوی کو اُس نے اپنا شعار بنا لیا لیکن اُس کی طبیعت میں سب سے بڑا انقلاب اِس احساس نے پیدا کیا کہ کائنات کی عظمت و وسعت کے مقابلہ میں انسان کی ہستی نہایت حقیر اور محض بے حقیقت ہے۔ ۱۴۹ء میں جب اُس کی عمر انیس سال کی تھی، جالینوس اپنے نوجوان احباب کے ساتھ فواکہات کی ایک پُر تکلف ضیافت میں شریک ہُوا تو اصولِ صحت کے برخلاف مجبوراً خوب میوے کھا گیا جس کے باعث وہ کچھ عرصہ کے بعد سخت بیمار ہو گیا۔اور ابھی پوری طرح تندرست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُسے ایک اور صدمۂ روح فرسا سے سابقہ پڑا، یعنی اُس کے باپ کا سایۂ عاطفت اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ذہنی انقلاب نے پہلے ہی سے اس غریب کو نفس کُش اور مرتاض بنا رکھا تھا، یہ نئی مصیبت اُس کی جانِ ناتواں پر ایک اور قیامت ڈھا گئی۔تحصیلِ علم کے علاوہ اب فکرِ معیشت بھی دامنگیر ہوئی اور اسی سبب سے اُس کی صحت روز بروز خراب ہونے لگی۔چنانچہ آٹھ سال کے عرصہ تک وہ مختلف بیماریوں کا شکار رہتا رہا لیکن یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ تحصیلِ علم کی راہ میں گو مصائب کا ایک بہت بڑا پہاڑ حائل تھا مگر اُس کی ہمتِ بلند نے کبھی پستی کا منہ نہ دیکھا اور وہ اس دورانِ پریشانی میں بھی برابر اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا رہا۔خدا خدا کر کے اٹھائیس برس کی عمر میں جب اُس نے علمِ طب سے فراغت پائی تو اُس کی مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

جالینوس دو برس تک اپنے وطن ہی میں طبابت کو فروغ دیتا رہا۔اس کے بعد سنہ ۱۶۰ء میں اس نے روم کا سفر اختیار کیا۔ان دنوں روم ترقی و تہذیب اور فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا؛ اطرافِ عالم سے اہلِ علم و کمال کھنچے کھنچے اس شہر میں چلے آتے تھے۔زوال پذیر خطۂ یونان کے تمام کاملانِ فن ایک ایک کر کے اسی علم آباد کی زینت ہو چکے تھے۔پس اگر جالینوس جیسا فردِ فرید اس سرزمین کو اپنے کمالات کی جولانگاہ نہ سمجھتا تو کیا کرتا۔جب یہ رومۃ الکبریٰ میں وارد ہُوا اور ےلیوس انطونی نوس سریر آرائے حکومت تھا چونکہ پہلے ہی سے اس نوجوان حکیم کا آوازۂ کمال بلند ہو چکا تھا اس لئے اہلِ روم نے تپاک کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا۔اُس کے بعد جالینوس نے مسلسل کئی دن تک عام جلسوں میں علمِ تشریح الاعضا پر تقریریں کیں۔اُس کی غیر معمولی قوتِ تقریر، فصاحت و بلاغت اور علمِ تشریح کے انوکھے اندازِ بیان نے عام طور پر وہ قبولیت حاصل کی کہ تمام رومیوں نے بالاتفاق اُس کو "معجز بیان"[۱] کا خطاب دیا۔

ایک مرتبہ اکابرِ روم اور حاذق اطبائے یونان اُس کی تقریر سننے کے لئے کسی جلسہ میں بیٹھے تھے۔تقریر کرتے

---

[۱] رومی زبان کا اصلی لفظ "Paradoxologus" ہے جس کا انگریزی ترجمہ Wonder Speaker ہے۔

کرتے اُس نے کچھ پرندے طلب کیئے۔ کسی پرندہ کی کچھ رگیں کاٹ دیں اور کسی کا پیٹ چاک کر کے لمبے اندرونی آلائش سے پاک کیا پھر ایک ایسے انداز کے ساتھ جس میں ادعا کا رنگ جھلکتا تھا اُس نے اطبا سے سوال کیا کہ "کون ایسا طبیب ہے جو ان کٹی ہوئی رگوں اور اس بے ترتیب آلائش کو اپنی اصلی حالت میں مرتب کرسکتا ہے"؟ جب کسی نے بھی اس صلا پر لبیک نہ کہی تو خود اُس نے ان پرندوں کو کچھ اس طرح ٹھیک کر دیا جیسے وہ پہلے ہی سے صحیح و سالم تھے۔ اس واقعہ کا عام لوگوں پر اور عہدہ داران سلطنت پر بہت اثر ہوا۔ چنانچہ ایک عہدہ دار نے اُسے کسی فوجی دواخانہ کی مہتممی پیش کی۔ جالینوس نے اسے بہ طیب خاطر قبول کیا اور اس خوش اسلوبی سے مفوضہ خدمت کو انجام دینے لگا کہ سینکڑوں مایوس مریض شفا پانے لگے۔ اِس حسنِ کارگزاری نے چند ہی دنوں میں اُسے صدر فوجی دواخانہ کا مہتمم بنا دیا۔ یہاں بھی اُس نے اپنی کاردانی کا اس قدر سکہ بٹھا دیا کہ روم سے شام تک اُسی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

حسنِ قبول اور شہرتِ عام خدا کی دی ہوئی نعمت تھی، تعجب تھا اگر یہ اُسے شہنشاہِ وقت کے دربار میں نہ پہنچا دیتی۔ چنانچہ اس اعزاز سے مفتخر ہونے کے بعد وہ شہزادگانِ والاتبار کا معالجِ خاص مقرر ہوا۔ اور یہ وہ خدمت تھی جس کی آرزو میں نامور اور حاذق اطبا اپنی عمریں صرف کرتے تھے۔

شاہی قرب گو جاہ پسندوں کے نزدیک کتنا ہی بامِ منزلت پر پہنچانے والا کیوں نہ ہو لیکن ایک ایسے حکیم کے لئے جو دنیا کی دل لبھانے والی چیزوں پر ایک عرصہ تک غور کر کے انہیں بے حقیقت سمجھ چکا ہو اس کی کیا حیثیت تھی طوعاً وکرہاً وہ کچھ دنوں تک تو اس خدمت کو انجام دیتا رہا اور خود اُس کے الفاظ میں یہ مدت گویا اُس کی آزاد طبیعت کے لیئے قیدِ سخت سے کسی طرح کم نہ تھی، لیکن اس کے بعد بڑی دشواریوں کے ساتھ واپسیٔ وطن کی اجازت چاہ کر یہاں سے چل کھڑا ہوا۔ وطنِ مالوف کی خدمت کا شوق، اور طلبِ علم کا ذوق عرصہ سے دل میں موج زن تھا، اب اسے پورا کرنے کا سامان ہاتھ آیا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دو مشہور باکمال شخص روم میں قیام پزیر تھے۔ ایک شخص پیلاپ نامی تھا جو فنِ طب میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا اور دوسرا البینس، جو فلسفہ کا عالم مانا جاتا تھا۔ دراصل انہیں کاملانِ فن سے مستفید ہونے کی خاطر جالینوس نے روم کا سفر اختیار کیا تھا۔ لیکن اُس کی ہر دلعزیزی اور اعزازِ شاہی نے اُسے اس امر کا موقع نہ دیا۔ اب جو ان علائق سے فرصت ملی تو کچھ عرصہ کے لیئے ان بزرگوں کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا[۱]۔ اسی طرح اتھینز اسکندریہ اور مصر میں باکمالوں کی خبر پاکر اُن سے خوشہ چینی کی اور کچھ عرصہ کے بعد وطن چلا گیا۔

جالینوس نے اب ارادہ کر لیا کہ مدت العمر اہلِ ملک کی خدمت اور حصولِ کمال میں صرف کر دوں گا۔

---

[۱] بعض مورخین کا قول یہ بھی ہے کہ جالینوس نے شہرِ روم میں وارد ہوتے ہی پیلاپ Pelop اور البینس سے استفادہ کیا ہے۔

ارادے تو بہت کچھ ہوا کرتے ہیں لیکن اُن کی تکمیل قدرت کے اختیار میں ہے، اور انسان کی زندگی میں اسی فسخ عزائم کی وجہ سے جو زبردست تغیرات برپا ہو جاتے ہیں اُن کی ذمہ دار یہی قدرت نیرنگ نواز ہے۔ بیچارہ وطن میں آ کر سستانے بھی نہ پایا تھا کہ دفعۃً قیصرِ روم کا فرمانِ قضا شیم اُس کی طلبی میں آ پہنچا "پا بدستے دگرے دست بدستے دگرے"۔ اب حاضرِ دربار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دربار میں حاضر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد ملک کے اندر ۱۶۷ء میں وبا شروع ہو گئی۔ جالینوس کو اس دوران میں بہت کچھ سرگرمیاں دکھانی پڑیں۔ اس کے بعد جب قیصرِ روم کشور کشائی کے نشہ میں جھومتا ہوا شہر روم سے نکلا تو حکم ہوا کہ جالینوس میدانِ جنگ میں صدر طبیب کی خدمت انجام دے۔ لیکن جالینوس نے اپنی کسی منت کا بہانہ کر کے جو روم کے مندر میں خاص انہیں دنوں میں پوری کی جاتی تھی، اجازت چاہی۔ قیصرِ روم نے واپس آنے تک شہزادہ کامودس کے معالج رہنے کی شرط پر اُس کو جانے کی اجازت دے دی۔ قیصرِ روم کی واپسی پر وہ پھر اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ طلبِ علم و کمال کے شوق نے اُس کو وطن میں بھی نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ یہاں سے اس کی بقیہ عمر سیر و سفر ہی میں بسر ہو گئی۔ اس مدت میں اُس نے بیسیوں مشہور اہلِ کمال سے اکتسابِ فن کیا۔ بالآخر یہ شہیدِ علم و کمال سنہ ۲۰۰ء میں جب کہ وہ جزیرۂ سائپرس میں مقیم تھا، اپنی حیاتِ مستعار کی ستر منزلیں طے کر کے اِس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

بڑے لوگوں کی موت حقیقت میں موت نہیں ہوتی بلکہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ بڑائی کیا ہے؟ انسان کا کمالات اور پاکیزہ صفات سے متصف ہونا۔ یہی چیز ہے جو اُس کو عزت و شہرت کے پر لگا کر اڑاتی اور بقائے دوام کے دربار میں لا بٹھاتی ہے۔ ایسے ہی باکمال بزرگوں کے نقشِ قدم ہوتے ہیں جو شمعِ ہدایت بن کر بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ آج دنیا اٹھارہ سو برس دُور نکل آئی ہے، لیکن جالینوس کی بزرگی اور ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ آج بھی عوام اُس سے اُسی طرح مستفید ہو رہے ہیں جس طرح قدما اُس کی ضیائے کمال سے روشن دماغ بن گئے تھے۔

اگر جالینوس کو یونانی حکما میں شریک کیا جائے (جیسا کہ ہوتا آیا ہے) تو اُس کا نمبر ان مشہور و معروف حکمار میں بحیثیتِ زمانہ گو سب سے آخر ہے، لیکن باعتبار صاحبِ کمال ہونے کے وہ ان سے کسی طرح پیچھے نہیں بلکہ نقل اور اپنے فن میں مجتہدانہ نظر رکھنے کی بنا پر اُسے اُن میں سے اکثر پر فوقیت حاصل ہے۔ زمانہ حال میں طبِ جدید کی ترقی نے یونانی طب کا بازار ایک عرصہ سے سرد کر رکھا ہے اور ان دونوں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ یونانی طب میں زیادہ تر ظن و قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے طبِ جدید بغیر تجربہ کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتی لیکن جالینوس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ فنِ طب میں تمام عمر اُس کا مسلک جزئیات

تک میں تجربات پر مبنی رہا۔ اُس کا قول تھا کہ طب میں میری ہر ایک رائے گویا ایک تجربہ ہے، علمِ تشریح الاعضا (اناٹمی) میں جو معلومات اُس کو حاصل تھے اور غیر معمولی اضافہ کے ساتھ اس نے جس طرح اس علم کو مدون کیا ہے وہ تمام حکمائے یونان میں اسی کا اور صرف اسی کا حصّہ ہے۔

جالینوس کو جو شہرت اور مقبولیت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرا اور سلاطین کی اس کو مجبوراً در باداریاں کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن ایسی پابندیاں اُس کی آزاد طبیعت پر بڑی شاق گزرتی تھیں۔ وہ ہر وقت اُن کی صحبت سے پہلو بچانے کی فکر میں رہتا۔ اسی بنا پر اُس نے بہت کچھ تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بادشاہوں نے اُسے بزورِ حکومت اپنا پابند بنانا چاہا، اور اُس نے فرار ہو کر مدتِ مدید تک شہر شہر کی خاک چھانی ہے۔ اُس کا طرزِ زندگی حکیمانہ اصول پر مبنی تھا۔ کثرت سے مطالعۂ کتب کیا کرتا تھا۔ سونا اور کھانا تو بہت کم لیکن بولتا بہت زیادہ تھا۔ ہر چیز میں صفائی اور پاکیزگی کا بہت اہتمام کیا کرتا تھا۔ دو چیزیں دل سے مرغوب تھیں، خوشبو اور موسیقی۔ موسیقی میں اُسے خود بھی کچھ دخل تھا اس لئے عموماً گایا بھی کرتا تھا۔ سیر و تفریح کا بہت شائق تھا اور مناظرِ قدرت کی دلفریبیوں سے بے حد حظ حاصل کرتا تھا۔ خوش مزاجی، خندہ پیشانی اور خلق و مروت کی مجسم تصویر تھا۔

جالینوس ایک ہمہ گیر لیاقت کا انشا پرداز تسلیم کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی تصانیف خواہ وہ کسی فن میں ہوں قطعاً عالمانہ اور مجتہدانہ ہیں۔ اپنے وقت میں علمِ منطق کا وہ ایک منفرد عالم مانا جاتا تھا اور اس علم میں اُس نے جو کچھ اضافے کئے ہیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور قدیم علمِ منطق کی تاریخ میں اُس کا یہ کارنامہ وقیع ترین حیثیت رکھتا ہے۔ رومۃ الکبریٰ کے شاہی کتب خانہ میں اُس کی بے شمار تصانیف محفوظ کر لی گئی تھیں لیکن افسوس کہ اس لاجواب کتب خانہ کو آگ لگ گئی اور تمام علمی ذخیرہ خاک میں مل گیا۔ اس پر بھی اُس نے اپنی تصانیف سینکڑوں کی تعداد میں یادگار چھوڑیں[1] لیکن آج اُس کی بہت کم کتابوں کا وجود دنیا میں ہے۔ زیادہ تر اُس کی تصانیف کا موضوع قواعد اخلاقیات اور منطق رہا ہے۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو غلط طور پر اُس کی طرف منسوب ہو گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ بہر حال تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ صرف تراسی رسالے شائع شدہ کتابوں میں ایسے ہیں جنہیں یقینی طور پر جالینوس کی تصانیف کہا جاسکتا ہے۔

احمد عارف

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے کہ جالینوس کی کل تصانیف کی تعداد ۵۰۰ ہے۔

پیپل کے پتّے

پیپل کے سبز پتّے جو لہلہا رہے ہیں
بادِ صبا سے مل کر کیا سرسرا رہے ہیں

کس سے جدا ہوئے ہیں کیوں تلملا رہے ہیں
کس نام کا وظیفہ یہ گنگنا رہے ہیں

کس کا جلال ان کی آنکھوں نے دیکھ پایا
کیوں کانپتے ہیں اتنا کیوں تھرتھرا رہے ہیں

کس کی صدائے دلکش سُن کر یہ کیفیت ہے
سر دُھن رہے ہیں دل کو بیخود بنا رہے ہیں

جکڑے گئے ہیں کیسے کتنے بندھے ہوئے ہیں
ہستی کی قید میں ہیں پر پھڑپھڑا رہے ہیں

بکھرا پڑا ہے گویا یہ معرفت کا دفتر
رودادِ حسن وحدت ہم کو سنا رہے ہیں

پیوستہ ہیں شجر سے اور متفق ہیں باہم
روئے زمین پہ یوں سب مل مل کے چھا رہے ہیں

تھامے ہوئے ہیں گویا دینِ ہدیٰ کا رشتہ
"لاتفرقوا" کا نعرہ مل کر لگا رہے ہیں

پابستہ بھی ہیں بے شک اور سخت نارسا بھی
اپنے قدم کو پھر بھی آگے بڑھا رہے ہیں

ح - ب

دُعا

انسان فطرتاً کمزور واقع ہؤا ہے۔ اس کارگاہِ عالم میں، جہاں حوادث کی آندھیاں اُس کے پائے ثبات کو ڈگمگا دینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں، اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے وہ کسی ایسی ہستی کی اعانت کا محتاج ہے جو اُس سے زیادہ طاقتور، زیادہ مضبوط اور زیادہ ذرائع کی مالک ہو۔ مذہب نے یہ ضرورت پوری کر دی ۔ خدا پر غیر متزلزل اور محکم ایمان، اُس کی صفات پر پورا پورا اعتقاد انسان کو بہت سی پریشانیوں سے بچائے رکھتا ہے ۔ وہ لوگ جو کام سے مطلب رکھتے ہیں "کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کہاں ہے؟ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں؟" کی دوراز کار الجھنوں میں نہیں پڑتے۔ جو اپنے پروردگار کی بھیجی ہوئی چیزوں کو بطیب خاطر قبول کر لیتے ہیں عموماً مطمئن اور خوش زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وہ ناخواندہ اور جاہل شخص جو تکلیف کے وقت سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، جس کا دعا پر پختہ یقین ہے اور جو اس بات کو مانتا ہے کہ خدا چاہے تو اُس کی مصیبت دم بھر میں کھو دے اُس عالم سے زیادہ طمانیتِ قلب کا مالک ہے جس نے اپنے تئیں فلسفہ سائنس اور مابعد الطبیعات کی بھول بھلیاں میں کھو دیا ہو۔ مذہب کا دوسرا نام دُعا ہے ۔ مذہب نام ہے اُس شاہراہ کا جس پر چل کر انسان اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملتا ہے۔ مذہب ایک طریقہ ہے جس سے عابد براہِ راست معبود سے تعلق پیدا کر سکتا ہے ۔ اور یہ سب امور دعا سے حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسا کوئی مذہب نہیں جس نے اپنے پیروؤں کو دعا کی تلقین نہ کی ہو۔ باوجود اس مذہبی انتشار و افتراق کے جو ہمیں ہر طرف نظر آتا ہے صرف دعا ایک مسئلہ ہے جس پر سب مذاہب متفق ہیں۔ دعا مانگنے سے انسان کا اضطراب رفع ہو جاتا ہے ۔ اُس کے مضطرب اور کھولتے ہوئے دماغ پر گویا برف کی سی ٹھنڈک پڑ جاتی ہے ۔ اُس کے قلبِ پریشاں میں اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کوئی بھاری بوجھ جو اُس کے وجود کو بُری طرح اپنے اندر دبائے ہوئے تھا اُس سے زیادہ بلند، زیادہ بااعتبار اور زیادہ قابلِ وثوق ہستی کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عاشق بٹالوی

پہلی پیشی

(ایک مختصر پرلسکٹ[1])

ارکان

جان . . . . ایک نوآموز وکیل

جین . . . . جان کی بہن

لوقس . . . . ایک سوداگر

جولیا . . . . جان کی والدہ

صوفیہ . . . . خادمہ

(مقام لاہور۔ عہدِ حاضر۔ جان کی تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ اُس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ماں نے لاکھ جتنوں سے اُسے ایل ایل بی تک تعلیم دلا کر وکالت کی سند دلائی۔ ایک طرف قرض خواہوں کا تقاضا عدالت کی ڈگری تک جا پہنچا، دوسری طرف جان نے بہتیرا سر ٹپکا، مگر کسی نے اُسے بھنی تک نہ کرائی۔ یہ تھی اس گھرانے کی حالت جب یہ ڈراما شروع ہوتا ہے)

پہلا سین

(جان کے مکان کا ایک کمرہ۔ فرنیچر پرانا ہے مگر ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غربت کے آثار پر قرینہ کا لباس چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جولیا ایک ہاتھ سے منہ کو سہارا دیئے اداس سی بیٹھی ہے۔ جین ایک ٹرنک کی موجودات لے رہی ہے)

جولیا۔ یہ مکان نیلام ہو جائے گا! ہول پر ہول آتا ہے اِس خیال سے، یہ مکان جس میں پل کر جوان ہوئی اور جس میں رنڈاپا کاٹ ڈالا ہاتھ سے نکل جائے گا! اسی کمرے کو لو کتنی یادگاریں اس میں مدفون ہیں۔ اسی کمرے میں میری پہلی گڑیا ٹوٹی۔ اسی کمرے میں مجھے بھیّا نے کاٹا، پیٹا، بیمار پڑا اور اسی کمرے میں مر گیا۔ اسی کمرے میں مجھے جان کے ابا نے شادی کی دعوت دی۔ لوگو! صرف اس ننھی سی خطا پر گھر سے بے گھر ہو رہی ہوں کہ اس نگوڑی کمینی کے

---

[1] ایک قسم کا مضحکہ آمیز ڈراما۔

جسے کیوں خرید بیٹھی جس کو بجلی کی طاقت سے بُوٹ صاف کرنے کا کارخانہ کھولنا تھا۔ تین مہینے کی مہلت! اس میں پانچ ہزار روپیہ پیدا کرنا انھونی سی بات ہے۔ مکان کے رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ (رومال آنکھوں پر)

جین (ٹرنک میں کپڑے ڈالتے ہوئے) اس ٹھیکرے کو رو رہی ہو؟ جاتا ہے تو جانے دو۔ تھا کس کام کا؟ آئے دن کی مرمت ہلکان کئے رکھتی تھی کل کا جاتا آج جائے میں تو کہوں بھلا ہوا میری مالا ٹوٹی، رام جپن سے چھوٹی۔ اس لئے یہ فکر تو بے کار ہے۔ میری سنو امیں تو کہیں آنے جانے جوگی نہ رہی۔

جولیا۔ ہائے ہائے کیا بنی میری بچی پر۔

جین۔ (منہ بسورتے ہوئے) چیتھڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ (ٹرنک کی طرف اشارہ کرکے) حرام ہے جو کوئی چیز پہننے کے لائق ہو۔ اُدھر بلاوے پر بلاوا آرہا ہے۔ (دعوتی رقعوں کا ایک بنڈل میز پر پھینک دیتی ہے)

جولیا۔ یہ جلسے اور پارٹیاں بے کاروں کا کھیل ہیں۔ مجھے تو اس ناچ سے وہ نفرت ہے کہ کیا کہوں۔

جین۔ ہاں جسم ہی ایسا ملا ہے کہ ایک گت میں ہانپنے لگو۔

جولیا۔ ادب سیکھو۔

جین۔ امی! اِس عمر میں ادب۔ بے جوڑ سی بات ہے۔ ابھی میرا سن ہی کیا ہے۔

جولیا۔ سن کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ مرتی مرجاؤ پر اُسے نہ بڑھنے دینا۔

جین۔ بچری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ اکیسویں میں قدم رکھا اور لڑکی بننے کا زمانہ گیا۔

جولیا۔ میں تو اکیس کی ہو کر بھی پانچ سال تک میٹھا سال ہی بتاؤں۔

جین (گلے میں ہاتھ ڈال کر) یہ گُر نہ بتاؤ گی تو ماں کون کہے گا۔

(جان آتا ہے)

جولیا۔ ہنستے آرہے ہو۔ مِل گیا نا آخر مقدمہ۔

جان۔ توبہ کرو۔ اس زندگی میں تو ملتا نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک بات ہے اُس پر عمل کرو تو شاید عدالت کی شکل دیکھ لوں۔

جین۔ کہو تو سہی۔

جان۔ دُور کی کوڑی لایا ہوں۔ داد دینا۔ لوقس کو جانتی ہو نا جس کی دکان ٹھنڈی سڑک کی نکڑ پر ہے۔

جین۔ دیکھا تو ہے۔ پھر؟

جولیا۔ ابھی وکالت شروع نہیں کی پہیلیاں پہلے کہنے لگے۔ صاف کہو جو کہنا ہے۔

جان۔ تو اُس سے شادی کرو۔

جولیا۔ شاباش! بیٹا شاباش۔ اب بڈھی میا کا بیاہ رچاؤ گے کیا؟

جان۔ خواہ مخواہ! میں تو جین سے کہہ رہا ہوں۔

جین۔ بیاہ کرے اپنی کسی ہوتی سوتی سے۔

جان۔ کاتا اور لے دوڑی۔ پہلے کسی کی سن تو لو، پھر جواب دینا۔ کون کہتا ہے کہ سچ مچ اُس کی بیوی بن جاؤ۔ یونہی دو ایک دن کے لیے منگنی سی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

جین۔ جی ہاں، میں خوب جانتی ہُوں تمہاری باتیں۔ میں شادی سے انکار کروں گی تو ساری عمر کا پھندا میرے سر رہے گا۔

جان۔ یہی تو عورتوں کو مرض ہے کہو کچھ سمجھتی کچھ ہیں۔ یہ تو سب ایک کھیل ہے تھیئٹر یا سینما کا تماشا سمجھ لو۔ بس دنیا کو یہ دکھانا ہے کہ لوئس کی ہمارے یہاں ایک مدت سے آمد و رفت تھی اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، جسے آخر اماں نے اور تم نے قبول کر لیا۔ پس پردہ یہ کرنا ہے کہ جب وہ یہاں آئے تو ہم سب کھسک جائیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب وہ شادی کا پیغام دے تو تم لجا شرما کر اُسے قبول کرو۔ ایک ہفتہ یونہی گذر جائے۔ اُس کے بعد میں اُسے بتاؤں کہ تمہارا مزاج ذرا تیز ہے بعض لوگ تمہیں چڑچڑی خیال کرتے ہیں۔ پھر گھر کی نوکرانی اس سے علیحدہ ملے اور یہ حاشیہ چڑھائے کہ تم پھوہڑ، بدمزاج اور سدا کی روگی ہو۔ اور دو ایک محلہ دار اس کی تائید کر دیں۔ وہ ڈر کر ناتا توڑ دے۔ تم نقضِ معاہدہ کی نالش داغ دو اور دس ہزار روپیہ ہرجانہ "دلا پانے" کا دعویٰ کرو۔ بس پھر کیا ہے۔ میری آواز سے عدالت گونج اُٹھے گی۔ سارے شہر میں دھاک بیٹھ جائے گی۔ روپیہ ملے گا۔ قرض کا دلدر دور ہو گا۔ مکان پر آنچ نہ آئے گی اور ساتھ ہی میری وکالت چمک اُٹھے گی۔

جولیا۔ بیٹا۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہو۔ جیتے رہو۔ جب خدا دینے پر آتا ہے تو یوں چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

جین۔ بے ڈھنگی سی بات ہے مگر خیر خاندان کی ناک رکھنے کے لیے جو کہتے ہو کر گزروں گی۔

جان۔ شاباش! آخر کس ماں کی بیٹی ہو۔ میں اسے کہہ آیا ہوں۔ آیا سمجھو اسے۔

جین۔ مگر کچھ جان پہچان تو ہو پہلے۔

جان۔ اس کی فکر بے کار ہے۔ وہ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ بیسیوں دفعہ منتیں کر چکا۔ آج

تو میرے یار نے ہاتھ جوڑ دیئے اور جھٹ ٹوپی پاؤں پر رکھ دی۔

(صوفیہ آتی ہے)

صوفیہ۔ کوئی مردوا صاحب کو سلام دیتا ہے۔ باہر سے تو نرا گدھا ہے۔ اندر کا حال خدا جانے۔

جولیا۔ صفیہ۔

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

جولیا۔ تو صوفیہ ایسی واہی تباہی ہمارے سامنے نہ بکا کرو۔

(لوقس آتا ہے)

لوقس۔ مزاج تو اچھے ہیں آپ سبھوں کے۔

جان۔ آپ کی عنایت۔ یہ میری والدہ اور یہ میری بہن۔

لوقس۔ شرفِ نیاز حاصل کر کے بہت مسرت ہوئی

جولیا۔ ملاقات سے جی خوش ہو گیا۔ جیسا سنا تھا ویسا پایا۔

لوقس (کورنش بجا لا کر) ذرّہ نوازی ہے۔ قدر افزائی ہے۔ آپ نے موری کی اینٹ کو چوبارے پر پہنچا دیا، اور کیا عرض کروں۔

(اس محاورے کے استعمال پر سب مسکراتے ہیں)

جولیا۔ اجی تکلف برطرف۔ ہاں اجازت ہو تو گھر کا کام دھندا ذرا دیکھ آؤں۔ خانہ واحد ہے۔

لوقس۔ شوق سے۔

(جولیا جاتی ہے)

جان۔ پچھلے سنیچر شاید میں نے آپ کو تھیئٹر میں دیکھا تھا۔

لوقس۔ جی ہاں۔ جب کوئی کام نہ ہو تو وہیں جا بیٹھتا ہوں۔

جان (لوقس سے علیحدہ) آج تو کمال کر رہے استاد۔ بس اسی طرح رنگ جمائے جاؤ (بلند آواز سے) کل ایک مقدمہ ہے۔ کہئے تو ذرا اُس کے کاغذات دیکھ آؤں۔ عجیب مقدمہ ہے۔ ایک خاوند نے بیوی سے کہا ذرا بوٹ تو صاف کر دینا۔ اس نیک بخت نے اُٹھ کر اُس کے منہ پر سیاہی مل دی۔ امید ہے آپ معذور خیال فرمائیں گے۔

لوقس۔ یقیناً (علیحدہ) خدا کے لئے مجھے اکیلے نہ چھوڑ جانا۔

جان - اجی گھبراتے کیوں ہو۔ مرد بنو۔ جہاں رک جاؤ وہاں کہہ دینا معلوم نہیں۔ اچھے گواہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

(جان جاتا ہے لوقس اور جبین رہ جاتے ہیں)

جبین - آپ اس سے پہلے کیوں نہ آیا کرتے تھے؟

لوقس - اس کی دو وجوہ ہیں۔

جبین - فرمائیے۔

لوقس - میرا مطلب یہ ہے کہ ....

جبین - جی میں متوجہ ہوں۔

لوقس - ڈرتا تھا۔

جبین - ڈرنے کی ایک ہی کہی، مگر اس کی وجہ؟

لوقس - یہ تو مجھے معلوم نہیں (علیحدہ) اب میں کوئی بات شروع کروں (مخاطب ہو کر) آپ کو پلاؤ پسند ہے؟

جبین - بے حد۔

لوقس اور کباب؟

جبین - وہ بھی۔ (علیحدہ) یہ بک کیا رہا ہے (مخاطب ہو کر) میں سمجھی نہیں۔

لوقس (ہنستا ہے) آپ نہیں سمجھیں؟ شاعرانہ بات پیدا کی ہے پلاؤ اچھی چیز، کباب اچھی چیز، مگر آپ اس قدر اچھی ہیں کہ دونوں کا مجموعہ کہنا چاہئے آپ کو۔

جبین - اچھی تعریف ہو رہی ہے میری۔

لوقس - تعریف نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔

جبین - پھر کیا ہوا۔

لوقس - یہ تو مجھے معلوم نہیں۔

جبین (علیحدہ) یہ اول جلول آخر کب تک برداشت کرنا ہے۔ (مخاطب ہو کر) یہ ہوئی ایک ـــــ اور دوسری وجہ!

لوقس - وہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر یہ کہئے کہ میں آپ کو جبین کہہ سکتا ہوں

جبین - میرا کیا حرج ہے۔

لوقس - کیا آپ میرا خاوند، میرا مطلب ہے بیوی بننا گوارا فرما سکتی ہیں؟

جین۔ اتنی جلدی کیا کہوں۔
لوقس۔ کہہ ڈالیئے۔ جو جی میں آئے کہہ ڈالئے۔
جین۔ تو ہاں کہہ ڈالتی ہوں۔ (لفظ کہہ ڈالتی پر زور)

(جولیا آتی ہے)

جولیا۔ کہیں اکتا تو نہیں گئے آپ؟
لوقس۔ خوب گذری۔ اور ــــ اور شادی کا وعدہ بھی ہو گیا۔ اب آپ ....
جولیا۔ میں خوشی سے منظور کرتی ہوں جین کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے۔ صفیہ، اری صفیہ!"

(صوفیہ آتی ہے)

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔
جولیا۔ ہاں صوفیہ۔ ذرا لپک کر جاؤ اور جان کو بھیج دو۔

(صوفیہ جاتی ہے اور جان آتا ہے)

جولیا۔ جان کچھ سُنا؟ یہ دونوں شادی کیا چاہتے ہیں!
جان۔ سچ؟ لوقس تم تو بڑے سیدھے سادے دکھائی دیتے تھے، مگر ایک چالیا نکلے۔ اچھا مبارک ہو۔

(لوقس سے ہاتھ ملاتا ہے دونوں ہنستے ہیں)

جولیا۔ اب میں دعا دوں تمہیں۔

(بہت رد و بدل کے بعد یہ صورت بنتی ہے کہ درمیان میں جولیا کھڑی ہوتی ہے، اس کے ایک طرف جین اور دوسری طرف لوقس دو زانو ہو جاتے ہیں۔ جولیا کے عقب میں جان ایک سٹول پر کھڑا ہوتا ہے اور رومال منہ میں ٹھونس کر ہنسی کو ضبط کرتا ہے۔ اس اہتمام کے بعد)

جولیا۔ میرے بچو! میں تمہیں دعا دیتی ہوں۔

دُوسرا سین

(وہی کمرہ)

صوفیہ۔ کہتے ہیں، لوقس ملے تو اسے یہ کہوں کہ مس جین بدمزاج ہے اور اس کے عوض ماہانہ دگنا ہو جائے گا نرالی بات ہے۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ گھر کا گھر ہی نرالا ہے۔ آوے کا آوا بگڑا ہے۔ عجب بے ڈھنگے لوگ ہیں۔

اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ۔ ان کے گُن کہاں تک گاؤں ۔ دیکھو نا! صوفیہ تک ۔ کہنا نہیں آتا ۔ بڑے سے چھوٹے تک جب کہیں گے صفیہ، اور مجھے ٹھہری چڑ، چوٹی سے ایڑی تک آگ لگ جاتا ہے ۔ اچھا بھلا ماں باپ کا رکھا ہوا نام بگاڑنے والے یہ کون ؟ نوکری کی ہے ، بڑوں کی عزت نہیں بیچی!

جولیا ۔ (پس پردہ) صفیہ ۔ اری صفیہ ۔

صوفیہ ۔ پھر وہی صفیہ ۔ (ہاتھ جوڑ کر) حضور میرا نام صوفیہ ہے ۔

(جاتی ہے)

(جان اور جین آتے ہیں)

جان ۔ تو ابھی تک سب داؤں پٹ رہے ہیں ؟

جین ۔ مگر کبھی کبھی گھبرا جاتا ہے ۔

جان ۔ چٹھیاں تو احتیاط سے رکھی ہیں نا ؟

جین ۔ سب رکھی ہیں ۔ کہنے کی دیر تھی اور اُس نے ایک ایک دن میں چار چار لکھنی شروع کردیں ۔ وہ بے سروپا باتیں لکھی ہیں کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے ۔ خاصہ پابند ہو گیا ہے ان کا ۔

(صوفیہ آتی ہے)

صوفیہ (جینی سے) حضور لوقس صاحب آئے ہیں ۔ پوچھتے ہیں گھر ہی ہیں آپ ۔ مَیں نے کہا ہیں تو سہی مگر سرکار کا مزاج بگڑا ہوا ہے ۔ سیدھے منہ بات کے بھی روادار نہیں ۔

جان ۔ شاباش ۔ آج تو بڑا کام کیا صفیہ ۔

صوفیہ ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے ۔

(جاتی ہے ۔ لوقس آتا ہے)

جان ۔ یار لوقس ۔ اب تو دونوں شکل نہیں دکھاتے ۔ کدھر رہتے ہو ؟

لوقس ۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں ۔

جان ۔ (رازدارانہ انداز سے) میں جاتا ہوں مگر ذرا سنبھل کر ۔ آج ذرا ذرا سی بات پر آگ ہو رہی ہے ۔

(جاتا ہے)

لوقس (علیحدہ) اس کی شکایت ہی کیا ۔ بدمزاجی تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے (مخاطب ہو کر) جین پیاری ۔

جین (منہ چڑاکر) لوقس پیارے۔
لوقس ۔ میرے خیال میں تمہیں میرا منہ چڑانا مناسب نہیں۔
جین ۔ ابھی سے یہ پابندیاں؟ نہ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا ۔ یہ جان لو میں نہ تمہارے خیال کی پابند ہوں نہ ہوسکوں گی اور نہ کبھی ہونگی۔
لوقس ۔ (علیحدہ) اس سے برسرآنا مشکل ہے۔ کوئی عذر رکھ کر منگنی ہی توڑے دیتا ہوں (مخاطب ہوکر) سنتا ہوں کل تم بغیر شکر اور دودھ کے چائے پی گئیں۔
جین ۔ تو پھر اس میں کسی کے باوا کا کیا گیا۔
لوقس ۔ تو میں ایسی بدذوق عورت سے شادی نہیں کرسکتا جو شکر اور دودھ کے بغیر چائے پیے۔
جین ۔ منگنی توڑ دو پھر۔
لوقس ۔ اور کرہی کیا سکتا ہوں؟
جین ۔ مشکل ہے۔
لوقس ۔ آسان ہے ۔ ایلو توڑ دی بس۔

(جین چیخ مار کر بے ہوش ہوجاتی ہے، جان جولیا اور صوفیہ گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں)۔

جولیا ۔ (جین کا سر زانو پر رکھ کر) صفیہ۔
صوفیہ ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔
جولیا ۔ چنگی بھلی ہنستی کھیلتی چھوڑ گئی ۔ ہؤا کیا اسے؟
لوقس ۔ کچھ نہیں ۔ یونہی سی آپس میں جھوڑ ہوگئی۔

(جین جھٹ ہوش میں آجاتی ہے)

جین ۔ منگنی توڑنا چاہتا ہے۔
جولیا ۔ لے ہے یہ غضب، یہ قہر، یہ اندھیر ۔ دیکھوں تو کس طرح توڑتے ہو ۔ دو دن میں ایسی کونسی خطا کی نگوڑی نے جو اسے قبل از وقت رانڈ کئے دیتے ہو۔
لوقس ۔ خالی چائے پی جاتی ہے شکر تک نہیں ملاتی ۔ کون کرے ایسی سے شادی۔
جولیا ۔ سنیں اس مردوے کی باتیں صفیہ!

صوفیہ - جی ہاں! مگر حضور میرا نام صوفیہ ہے۔
جولیا - چائے میں شکر کیوں نہیں ملاتی - میرا سر گھوم رہا ہے۔
(بے ہوش ہو جاتی ہے)

لوقس - اچھا تو میں چلتا ہوں۔
جان - ٹھہرو - پہلے اِس کے معصوم ارمانوں کا جنازہ اٹھاؤ، پھر اپنی قبر بنانے کے لئے قدم اٹھاؤ۔ لوقس! تم نے میرے غصے کے شیر کو بیدار کر دیا - سنبھلو! بچو! اب تمہاری خیر نہیں، تم ایک مشہور وکیل کی آبرو کے لاگو ہوئے ہو مگر یاد رکھنا تمہاری دکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا - تلاش کر کے چھوڑوں گا - اتنے بڑے خاندان سے بگڑ کر الجھنا کھیل نہیں - تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس خاندان کے کسی رکن کو سرنگوں ہونا پڑا - میرے لئے یہ پہلا موقع ہے کہ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا (دوسری طرف منہ کر کے ہنستا ہے۔)
لوقس - ٹھہرو - ذرا دم لو۔
جان - چپ رہو - یہ میری حماقت تھی جو تجھ سے اٹھائی گیرے کو گھر لایا - ہمارے کنبے میں بچے، بوڑھے اور عورتیں چھوڑ کر ایک ہزار ایک سو ایک شخص ہیں - اور تم نے اپنی اس حرکت سے ایک ہزار ایک سو ایک ناک کاٹ ڈالی ہے - اُن کے غصے سے بچو! اُن کے طیش سے گھبراؤ - اور انہیں دیکھتے ہی گر پڑو! ورنہ جانتے ہو کہ کس قدر خوفناک، ہولناک، ہیبتناک نتیجہ ظاہر ہو گا۔
لوقس - یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان ایک ہزار ایک سو ایک مردوں کے ساتھ عورتیں بچے اور بوڑھے بھی شامل ہو کر میری دکان کے گاہک بن جائیں پھر بھی میں ایسی بدمزاج ایسی پھوہڑ ایسی کلّہ دراز عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔
جان - یہ اڑان گھائیاں کسی اور کو بتاؤ - ایک ہائی کورٹ کا وکیل ایسے دم جھانسوں میں نہیں آئے گا - جہیز کے لالچ میں منگنی کی - جب کچھ ملتا نظر نہ آیا تو توڑ دی۔
لوقس - یہ سراسر بہتان ہے (بھاگ جاتا ہے)
جان - جین مبارک ہو تو کامران ہے۔
صوفیہ - اِس خوشی کے صدقے میں یہ بھی یاد رکھئے کہ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

تیسرا سین

(عدالت کا کمرہ - جج، جان، جین، جولیا، لوقس، اور صوفیہ)

جج - جین حاضر ہے ؟

جین - ہاں حضور -

جج - اور لوقس ؟

لوقس - وہ بھی حاضر ہے -

جج - (جھڑک کر) غائب کے صیغے میں جواب دیتے ہو عدالت کو ؟ وکیل دوں حوالات میں تو کیسی رہے ؟ ہم نرمی کرتے ہیں، تم لوگ گستاخ ہوتے جاتے ہو -

لوقس - حضور والا معاف فرمایئے بندہ حاضر ہے -

جج - معافی دی جاتی ہے آیندہ احتیاط رکھنا - ہاں مدعیہ کا فاضل وکیل اپنا مقدمہ بیان کرے -

جان - حضور والا - جذبات اور حسیات سے لبریز دل کے ساتھ اس عظیم الشان عدالت کے روبرو یہ ہیچمدان کج مج زبان بصد عجز و نیاز یہ گزارش کرنے کی ـــــ اجازت چاہتا ہے - اس درد انگیز، دلشکن، اور جگر سوز مقدمہ کے واقعات تو عرض کرتا ہوں مگر مدعا علیہ کی عیاری، مکاری، دغا بازی اور چالاکی بیان کرنے کے لئے فرہنگ آصفیہ تہی دامن نظر آتی ہے - ادھر بیچاری مدعیہ کی حالت زار کسی تشریح کی محتاج نہیں - اس کی زندگی برباد اور مستقبل تاریک ہوگیا -

لوقس - (ہاتھ اٹھا کر) ایک سوال -

جج - چپ رہو -

جان - مدعا علیہ کے حلیے پر نظر ڈالئے - ایک ایک عضو شاہد ہے کہ یہ کس بلا کا بد باطن ہے اور اس کا آزاد پھرنا امن عامہ کے کس قدر خلاف ہے - جناب والا ۱۸ - دسمبر کو مدعا علیہ نے مدعیہ کو شادی کا پیغام دیا اور گھر والوں کے کہنے سننے پر اس بیچاری نے قبول کر لیا مگر اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہ ہؤا تھا کہ مدعا علیہ نے یہ عذر رکھ کر معاہدہ فسخ کر دیا کہ مدعیہ نے چائے میں شکر اور بالائی کیوں نہیں ڈالی - غریب پرور عدالت کی اجازت سے اب میں اُن سینکڑوں چٹھیوں میں سے صرف ایک بطور مشتے نمونہ از خروارے عدالت کو سناتا ہوں جن سے ظاہر ہوگا کہ بیچاری مدعیہ کو دھوکا دینے کی کس قدر گہری سازش کام کر رہی تھی -

لوقس - (ہاتھ اٹھا کر) ایک سوال -

جج - چپ رہو -

جان (ایک چٹھی اٹھا کر پڑھتا ہے) میری بلبل ہزار داستان! تیرا اللہ نگہبان! جس وقت سے آیا ہوں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ متاسف ہوں کہ آیا کیوں۔ تمہارے پاس ہوتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہیں تمہارا دل نہ بھر جائے۔ غرض نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا نقشہ ہو رہا ہے۔ کروں تو کیا کروں اور نہ کروں تو کیا نہ کروں۔ خط لکھتا ہوں تو روتا ہوں اور روتا ہوں تو خط لکھتا ہوں۔ کثرتِ استعمال سے تمہاری تصویر کا پیراہن کاغذی اُڑ گیا ہے۔ ایک اور کاپی ارسال فرمائیں تو میرے باپ دادا بلکہ سارے خاندان پر احسان رہے۔ دکان خوب چل رہی ہے مگر سیمنٹ کا بھاؤ گر گیا ہے۔ میری محبت کی وسعت الفاظ کے دائرے میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے اس محبت نامے کو ختم کرتا ہوں اور اپنی لازوال محبت کا یقین دلاتا ہوں۔

جج۔ اچھا اب مدعا علیہ اور گواہان سے پوچھو۔

جان۔ لوقس تمہارا کیا نام ہے؟

لوقس۔ مردِ خدا! خود ہی تو میرا نام لے رہے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو؟ اسی کو شاید تجاہلِ عارفانہ کہتے ہیں؟

جج۔ صرف سوال کا جواب۔ زیادہ مت بولو۔ صاف بتاؤ نام کیا ہے چھپانے سے کیا مل جائے گا۔

لوقس۔ مگر جناب . . . .

جج۔ اگر مگر کچھ نہیں۔ نام بتاؤ نام۔

لوقس۔ حضور میرا نام لوقس۔

جان۔ کیا تم نے مدعیہ کو شادی کا پیغام دیا؟

لوقس۔ تو اس بارے میں عرض ہے . . . , , , , ...

جج۔ عرض ورض نہیں چاہیئے۔ ہاں کہو یا نہیں۔

لوقس۔ ہاں جناب۔

جان۔ کب؟

لوقس۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔

جان۔ پھر انکار کیا۔

لوقس۔ ہاں۔

جان۔ کیوں؟

لوقس - وہ بدمزاج نکلی -

جان - کوئی گواہ -

لوقس - کوئی نہیں -

جان - مسز جولیا جان!

(جولیا آتی ہے)

جان - عدالت کو بتاؤ - لوقس نے منگنی کیوں توڑ ڈالی -

جولیا - حضور کو شاید باور نہ آئے مگر مسٹر لوقس نے منگنی اس بنا پر توڑی کہ جین نے بلا شکر چائے کیوں پی -

جان - بس - جاؤ -

جولیا - مگر میں اور کہنا چاہتی ہوں -

جان - ضرورت نہیں -

جولیا - مگر مجھے تو ضرورت ہے -

جان - عدالت اتنا ہی سننا چاہتی ہے -

جولیا - مگر میں تو اور سنانا چاہتی ہوں -

جان - بک بک جھک جھک سے فائدہ ؟

جولیا - اب معلوم ہوا کہ تمہیں آج تک کسی نے وکیل کیوں نہیں کیا -

جج - بوڑھیا ہٹتی ہے کہ میں ہٹواؤں -

(جاتی ہے)

جان - صفیہ!

صوفیہ - حضور میرا نام صوفیہ ہے -

جان - تمہارا نام ؟

صوفیہ - عرض کر چکی ہوں -

جان - پھر بتاؤ -

صوفیہ - فائدہ ؟ جج صاحب بہت باتیں پسند نہیں کرتے -

جج - اے عورت! بتا اور جلد بتا کہ تیرا نام کیا ہے -

صوفیہ۔ بندی کو صوفیہ کہتے ہیں۔

جج۔ مگر دراصل تیرا نام کیا ہے؟

صوفیہ۔ صوفیہ

جج۔ تو نام ہوا صوفیہ المعروف صوفیہ (لکھتا ہے)

جان۔ مدعا علیہ نے منگنی کیوں توڑی۔

صوفیہ۔ اس لیئے کہ مدعیہ بدمزاج ہے۔

جان۔ دیکھنا حلف لیا ہے

صوفیہ۔ اسی لئے تو سچ کہہ رہی ہوں۔

جج۔ تمھیں یہ کس طرح معلوم ہوا؟

صوفیہ۔ جان صاحب نے کہا کہ میں لوقس صاحب سے کہوں کہ مس صاحبہ بدمزاج ہیں تو انعام ملے گا۔ بات بھی سچ تھی میں نے کہہ دیا۔

(عدالت میں ہنسی چھا جاتی ہے)

جان۔ اسے نمک حرامی کہتے ہیں۔

جج۔ خاموش رہو۔ مسٹر جان نے ایسا کیوں کہا؟

صوفیہ۔ تاکہ مسٹر لوقس منگنی توڑ دے اور وہ ہرجانہ وصول کریں۔

جان۔ بڑی مکارہ ہے۔

جج۔ تمھیں کس طرح معلوم ہوا؟

صوفیہ۔ حضور ان کانوں سے سنا۔

جج۔ کمرے میں تھی تو؟

صوفیہ۔ نہیں جناب باہر روزن سے کان لگائے کھڑی تھی۔

جان۔ صفیہ تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

صوفیہ۔ حضور میرا نام صوفیہ ہے۔

لوقس۔ اور جو کل صوفیہ لوقس ہو جائے گا۔

جلوۂ سحر

خاموش فضا میں وقتِ سحر جذبات کا دریا جاری ہے
اک کیف کا طُوفاں اُمڈا ہے اک وجد کا عالم طاری ہے

وہ چاک ہُوا دامانِ سحر وہ ظلمتِ شب کافور ہوئی
عالم عالم پُرنور ہُوا دنیا دنیا مسرور ہوئی

وہ کرنیں نور کی نکلی ہیں خورشید کے زرّیں ساغر سے
وہ بادۂ سرخ جھلکتا ہے پھولوں کے رنگیں ساغر سے

وہ بادِ صبا مستانہ چلی وہ پتلی شاخیں ہلنے لگیں
وہ پتے آ گئے جنبش میں وہ نازک کلیاں کھلنے لگیں

خاموشئ شب تحلیل ہوئی چڑیوں کی ترنم ریزی میں
شبنم کی نظر افروزی میں پھولوں کی شمیم انگیزی میں

ہر شاخ میں رنگا رنگی ہے ہر پھول میں بوقلمونی ہے
ہے ایک تناسب ہر شے میں ہر چیز میں اک موزونی ہے

ہے "جنتِ گوش" اک اک نغمہ ہر منظر ہے "فردوسِ نظر"
پہلو میں دل گھنٹوں رقصاں احساس کا ہو کچھ ذوق اگر

اس وقت عروسِ فطرت کی زیبائش دید کے قابل ہے
ہر غمزہ اُس کا ظالم ہے ہر عشوہ اُس کا قاتل ہے

ہر سُو ہے سعادت کی تابش ہر سمت ہے بارش رحمت کی
تنویرِ سحر ہے ایک ضیا رخسارِ عروسِ فطرت کی

موسم نہیں خوابِ غفلت کا موقع نہیں سہل انگاری کا
اُٹھ اے غافل بیدار ہو اب ہے وقت یہی بیداری کا

کافر ہے وہ دل اس وقت بھی گر جس دل میں خدا کی یاد نہیں
ملحد بھی اگر دیکھے یہ سماں سجدے میں جھکا دے اپنی جبیں

"پیغامِ عمل" پھر لائی سحر پھر دنیا اپنے کام میں ہے
سرگرم ہے کوئی طاعت میں اور کوئی شغلِ جام میں ہے

کچھ میری نہ پوچھو اے رندو اک گوشۂ باغ میں بیٹھا ہوں
"خمخانۂ فطرت" میں ہر دم "صہبائے مسرت" پیتا ہوں

ہر سُو ہیں شگفتہ لالہ و گل پُر کیف ہوائے گلشن ہے
اک ہاتھ میں جامِ صہبا ہے اک ہاتھ میں اُس کا دامن ہے

ولی الرحمن ولی

پھُول

دوپہر کے بعد سے شام تک میں گلیوں میں گھومتا رہا۔ فضا میں سے برف کے بڑے بڑے گالے آہستہ آہستہ گرتے رہے ——— اور اب میں اپنے گھر میں ہوں۔ میرا لیمپ جل رہا ہے۔ میں نے سگار سلگا لیا ہے اور میری کتابیں میرے پاس پڑی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں مجھے حاصل ہیں جو تسکینِ خاطر کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ سب بے کار ہیں۔ میرے دماغ میں تو صرف ایک ہی خیال سما سکتا ہے۔

لیکن کیا میرے لئے وہ مدتوں سے مر نہیں چکی تھی؟ ——— ہاں، مر چکی تھی، یا جیسا کہ میں فریب خوردگی کے طفلانہ جوش میں کہا کرتا تھا "مُردوں سے بدتر تھی"۔ اور اب جب کہ میں جانتا ہوں کہ وہ "مُردوں سے بدتر" نہیں، بلکہ صرف "مُردہ" ہے بہت سے دوسروں کی طرح خاک کے نیچے ہمیشہ کے لئے سوتے ہیں ——— اس دنیا میں واپس آنے کی امید کے بغیر ——— بہار ہو یا تپتی دھوپ یا برف باری ہو رہی ہو، جیسی کہ آج ہو رہی ہے + اب میں نے جانا ہے کہ وہ میرے لئے اُس وقت سے ایک لمحہ بھی پیشتر نہ مری تھی جب وہ باقی دنیا کے لئے مری۔ غم؟ ——— نہیں یہ تو محض وہ عام خوف ہے جسے ہم اُس وقت محسوس کرتے ہیں جب کوئی ایسی ہستی جس کی جگہ ہمارے دل میں موجود ہوتی ہے اور جس کا وجود کلیتہً اور صراحتہً ہمارے خیال میں محفوظ ہوتا ہے قبر میں جا سوتی ہے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے تو مجھے سخت رنج ہوا۔ مگر اس رنج کے ساتھ بہت سی اور چیزیں بھی تھیں۔ غصہ اور فوری نفرت، زندگی سے وحشت اور ——— آہ ——— غیرت کی شکست ——— غم تو بعد میں آیا! لیکن اس وقت یہ دلجمعی تو تھی کہ وہ بھی میری ہی طرح مضطرب ہوگی + وہ تمام اب تک میرے پاس ہیں اور میں جب چاہوں اُن کو پڑھ سکتا ہوں ——— اُن بیسیوں خطوں کو جن میں اُس نے نہایت عاجزی سے معافیاں مانگی ہیں! ——— اور میں اپنی چشمِ تصور سے اب بھی اُسے دیکھ سکتا ہوں ——— اُسی طرح اُسی سیاہ لباس میں گلی کے ایک کونے پر، جب میں شام کے وقت اپنے مکان سے باہر نکلا اور وہ مجھے حسرت زدہ نظروں سے تک رہی تھی ——— اور میرے خیال میں اُس آخری ملاقات کی یاد اب تک تازہ ہے جب اُس کی وہ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں میرے سامنے تھیں جو اُس کے گول بچپن کے سے چہرے میں ہیروں کی طرح جڑی تھیں ——— وہ چہرہ جس پر اب زردی چھا گئی تھی۔ اور جو اب مرجھا گیا تھا ——— اور جب وہ جانے لگی ——— جب وہ آخری مرتبہ جانے لگی تو میں نے اُس کے لئے اپنا ہاتھ تک نہ بڑھایا ——— اور پھر اپنی کھڑکی

میں دیرتک اُسے گلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے غائب ہوگئی ——ہمیشہ کے لئے ——اوراب وہ کبھی واپس نہ آسکے گی......

مجھے اُس کی موت کا علم اتفاقاً ہی ہؤا، ورنہ شاید ہفتوں اور مہینوں مَیں بےخبر رہتا۔ ایک دن صبح کے وقت مجھے اُس کا ماموں ملا۔ میں نے اُسے کم ازکم ایک سال کے بعد دیکھا ہوگا، کیونکہ وہ دیا ناکبھی کبھی آتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں اُس سے بس دو یا تین مرتبہ ملا ہوں گا۔ ہماری پہلی ملاقات آج سے تین سال قبل ہوئی تھی اس موقع پر وہ بھی موجود تھی اور اُس کی ماں بھی۔ اور پھر آنی گرمیوں میں مَیں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا اور ہمارے ساتھ کی میز پر اُس کا ماموں چند اور آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ سب خوش بخوش تھے اور اُس نے میرا جامِ صحت پیا۔ جانے سے پہلے وہ میرے پاس آیا اور رازداری کے لہجہ میں کہنے لگا کہ میری بھانجی کو تم سے بڑی محبت ہے!——اور اپنی نیم مخموری کی حالت میں مجھے یہ بات بڑی مضحکہ خیز اور عجیب معلوم ہوئی کہ آخر اس قسم کی گفتگو کا یہ کونسا محل تھا اور پھر مجھ سے بہتر اس حقیقت کو اور کون جانتا تھا جس کی آنکھیں اُس کی محبت کے آخری جام سے ابھی سرشار تھیں۔ اوراب، آج صبح! میں اُس کے پاس سے گزر رہی چلا تھا کہ میں نے ازراہِ دلچسپی نہیں بلکہ ازراہِ اخلاق اُس کی بھانجی کے متعلق دریافت کیا۔ اب میں اُس کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ مدت ہوئی اُس سے نامہ وپیام کا سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔ صرف پھول وہ مجھے بھیجتی تھی۔ ہمارے مسرورترین دنوں کی یادگار! مہینے میں ایک مرتبہ وہ آتے تھے، اُن کے ساتھ کوئی پیغام نہ ہوتا تھا، محض خاموش، نیاز آگیں پھول ——جب میں نے اُس سے سوال کیا تو وہ حیران رہ گیا: "تمہیں معلوم نہیں وہ بیچاری تو ایک ہفتہ ہؤا مرگئی"۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ پھر اُس نے مجھے اور باتیں بتائیں: "وہ مدت سے بیمار تھی مگر بستر پر وہ بمشکل ایک ہفتہ رہی ہوگی!" اور اُس کا مرض؟ "سودا ——خفقان ——مالیخولیا۔ لیکن ڈاکٹر بھی اُس کی صحیح تشخیص نہ کرسکے"۔

وہ چلا گیا مگر میں دیر تک وہیں سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا۔ میں اتنا ناتوان ہوگیا تھا جیسے کسی جان جوکھوں میں سے گزرا ہوں ——اوراب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج میری زندگی کا ایک دور ختم ہوگیا ہے۔ کیوں ——کیوں؟ یہ محض ایک خارجی بات تھی۔ میرے دل میں اُس کے لئے اب کوئی جذبہ نہ تھا۔ درحقیقت مجھے اب شاذونادر ہی اُس کا خیال آتا تھا۔ مگر اب بھی جب کہ میں یہ سب کچھ لکھ چکا ہوں میں اپنی حالت کو بہتر پاتا ہوں۔ میرا دل مطمئن ہے اور مجھے اپنے گھر کا چین اور آرام محسوس ہو رہا ہے ——حقیقت میں اب اس کے خیال کو دل میں جگہ دینا نادانی ہے اور دکھ خریدنا ہے ——یقیناً دنیا میں ہزاروں ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ دکھی ہیں۔

میں سیر کر کے آیا ہوں۔آج موسمِ سرما کا ایک شاندار دن ہے۔آسمان زیادہ نیلا، زیادہ سرد اور زیادہ دور معلوم ہو رہا ہے ——— اور میں اپنے آپ میں سکون پاتا ہوں۔اُس کے بوڑھے ماموں سے میں ابھی کل ملا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس واقعے کو ہفتوں گذر گئے ہیں۔اور جب میں اُس کا خیال کرتا ہوں تو وہ مجھے بالکل صاف نظر آتی ہے۔صرف ایک چیز کم ہوتی ہے: وہ غصہ جو ہمیشہ اُس کے خیالات کے ساتھ شامل ہؤا کرتا تھا۔اس بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں کہ وہ اب تنہا قبر میں سو رہی ہے اور صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ——— مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔دنیا آج مجھے زیادہ پُرسکون معلوم ہوئی ہے۔ایک دفعہ صرف ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ محسوس ہؤا کہ نہ تو راحت ہی کا کوئی وجود ہے اور نہ رنج کا، رنج و راحت ہماری تصویرِ حیات کے دو رخ ہیں، ہم ہنستے ہیں اور ہم روتے ہیں، لعو ہماری روح اُن کیفیات کو محسوسات کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔میں اب اطمینان سے بیٹھ کر دقیق علمی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوں اور اُن کے عمیق نکات سمجھ لینے کی مجھ میں تاب پیدا ہوگئی ہے۔میں اُن قدیم تصاویر کے سامنے کھڑا ہو کر اُن کے حقیقی حسن کو دیکھ سکتا ہوں جن کے آج سے پہلے میری نگاہ میں کوئی معنی ہی نہ تھے ——— اور جب میں بعض اُن دوستوں کا خیال کرتا ہوں جو مر چکے ہیں تو میرا دل اتنا غمگین نہیں ہوتا جتنا وہ کبھی ہؤا کرتا تھا ——— موت سے میں کچھ مانوس سا ہو چکا ہوں، موت ہم پر مسلط ہے لیکن وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔

برف، بلند سفید برف ہر چیز پر محیط تھی۔گرٹیل آئی اور اُس نے کہا آؤ ذرا برف کی سیر کریں۔ہم ایک ثلج گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے باہر نکل گئے۔گاڑی پھسلوان سڑک پر گھنٹیاں بجاتی ہوئی اڑی چلی گئی۔آسمان ایک نیلگوں زمرد کی طرح بن رہا تھا۔گرٹیل میرے کندھے سے سہارا لگائے طویل سڑک کو اپنی مسرور آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ہم ایک سرائے میں آگئے جسے ہم گرمی کے زمانے سے جانتے تھے۔انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس قدر گرم تھی کہ ہمیں اپنی میزوں سے سرکانی پڑی۔کیونکہ گرٹیل کا ایک رخسار اور کان آگ کی مانند سرخ ہو رہے تھے۔مجھے اُس کے دوسرے زرد رخسار پر رہ رہ کر پیار آ رہا تھا۔اِس کے بعد شام کے قریب جب شفق پھُولی ہوئی تھی ہم واپس گھر آگئے۔گرٹیل میرے قریب بیٹھی تھی اور میرے دونوں ہاتھ اُس کے ہاتھوں میں تھے ——— پھر اُس نے کہا "آخر میں نے پھر تمہیں پا لیا ہے۔" اُس نے یوں بلا تکلف وہ شیریں نغمہ چھیڑ دیا تھا جو حقیقت میں میری مسرت کا تنہا کفیل تھا۔لیکن شاید یہ سرد و صاف ہوا کا اثر بھی ہے کہ میرے خیالات ہر قید سے آزاد ہو رہے ہیں، کیونکہ میں گزشتہ چند دنوں کی بہ نسبت زیادہ اطمینان محسوس کر رہا ہوں۔

تھوڑی دیر گزری جب میں اپنے بستر پر اونگھ رہا تھا مجھے پھر ایک عجیب خیال آیا۔ مجھے اپنا دل سخت اور سرد محسوس ہونے لگا۔ اس طرح جیسے کوئی اپنے کسی محبوب کی قبر پر کھڑا ہو اور اُس کی آنکھیں خشک ہوں اور سینہ جذبات سے خالی، اس طرح جیسے کوئی اتنا بے حس ہو گیا ہو کہ وہ موت کے خوف سے بیگانہ ہو گیا ہو ــــ بیگانہ، ہاں بیگانہ۔

رفت و گزشت ہو چکی! زندگی، مسرت اور تھوڑی سی محبت نے اُس ساری حماقت کو محو کر دیا۔ اب میں پھر لوگوں سے آزادانہ ملتا ہوں۔ میں اُن سے مانوس ہو چلا ہوں۔ وہ بے ضرر ہیں۔ وہ ہر قسم کے خوش آئند موضوعات پر گفتگوئیں کرتے ہیں اور گرٹیل کیسی پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ جب وہ میری کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے اور سورج کی کرنیں اس کے سنہری بالوں پر چمکتی ہیں تو وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ــــ آج وہ دن ہے جب وہ ہمیشہ پھول بھیجا کرتی تھی۔ اور پھول پھر آ گئے جیسے ــــ جیسے کوئی تبدیلی ہی واقع نہیں ہوئی۔ وہ پہلی ہی ڈاک میں آئے اور ایک لمبے، تنگ اور سفید ڈبے میں بند تھے ابھی صبح ہوئی ہی تھی اور ابھی میری آنکھیں خواب آلود تھیں۔ مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میرے سامنے ایک سنہرے دھاگے سے نفاست کے ساتھ بندھے ہوئے کاسنی اور گلابی پھول تھے ــــ اس طرح جیسے وہ کسی تابوت میں پڑے ہوں اور جب میں نے اُنہیں ہاتھ میں لیا تو میرا دل کانپ گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ آج پھر کیسے آ گئے۔ جب وہ بیمار ہوئی ہو گی یا شاید جب اُس نے موت کو قریب پایا ہو گا تو اُس نے حسبِ معمول گلفروش سے پھول بھیجنے کو کہہ دیا ہو گا تاکہ میں اُس کی توجہات کو کھو نہ بیٹھوں۔ یقیناً اس کی یہی توضیح ہو سکتی ہے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن دل اس سے متاثر ضرور ہوتا ہے ــــ وہ ابھی میرے ہاتھ میں تھے، وہ پھول اور انہوں نے سرہلانا اور کانپنا شروع کیا، اُس وقت باوجود عقل و فراست اور قوتِ ارادہ کے مجھے اُن سے ڈر آنے لگا۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ اُسی کے پاس سے آئے ہیں، جیسے یہ اُس کا تحفہ ہیں ــــ جیسے وہ ہمیشہ ــــ اس حال میں بھی کہ وہ مر چکی ہے مجھ پر اپنی محبت جتانا چاہتی ہے ــــ اپنی مست جنا مر وفا۔ آہ، ہم موت کو نہیں سمجھتے، ہم اُسے کبھی نہ سمجھ سکیں گے۔ حقیقت میں کوئی شخص اُس وقت مرتا ہے جب وہ سب جو اُسے جانتے ہیں دنیا سے چل بستے ہیں۔ معمول کے خلاف ان پھولوں پر میری گرفت کا انداز آج مختلف تھا مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری ذرا سی بے احتیاطی بھی انہیں زخمی کر دے گی ــــ جیسے ابھی اُن کی روحیں ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگیں گی۔ اور اب جب کہ وہ میرے سامنے میری میز پر ایک ہلکے سبز رنگ کے تنگ سے گلدان میں پڑے ہیں وہ مجھے ماتم انگیز تشکر میں

اپنے سرہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بے حاصل آرزو کا ایک بادل سا دردبن کر اُن پر سے اُٹھتا ہے اور مجھ پر چھا جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں اگر اُن چیزوں کے علاوہ جو بولتی ہیں ہم تمام زندہ چیزوں کی زبان جانتے تو وہ مجھ سے ضرور کچھ کہتے۔

میں اب احمق نہ بنوں گا۔ وہ محض پھول ہیں۔ وہ عہدِ ماضی کا ایک پیغام ہیں۔ قبر سے بلاوا یقیناً نہیں۔ وہ وہ بس پھول ہیں۔ کسی گل فروش نے اُن کو ایک جگہ باندھا، روئی کا ایک ٹکڑا اُن کے اردگرد لپیٹا، پھر ایک سفید ڈبے میں رکھ کر ڈاک کے حوالے کر دیا ـــ اور اب کہ وہ یہاں رکھے ہیں، کیوں مجھے اُن کا خیال نہیں چھوڑتا۔

میں گھنٹوں کھلی ہوا میں گزار دیتا ہوں اور طویل اور تنہا سیریں کرتا ہوں۔ جب میں لوگوں کے درمیان ہوتا ہوں تو میری طبیعت اُن سے نہیں ملتی۔ اور میں اس کو اُس وقت محسوس کرتا ہوں جب وہ حسین و جمیل لڑکی میرے کمرے میں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتی ہے اور مجھے خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ جب وہ جا چکتی ہے تو ایک لمحہ بھی نہیں گزرتا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مجھ سے میلوں دُور ہے، جیسے لوگوں کا سیلاب اُسے بہا کر لے گیا ہے اور اُس کا کوئی نشان پیچھے نہیں چھوڑ گیا۔ اب اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو شاید مجھے بالکل تعجب نہ ہو۔

پھول لمبے سبز گلدان میں ہیں۔ اُن کی ڈنڈیاں پانی میں ہیں اور اُن کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی ہے۔ خوشبو ابھی تک اُن میں موجود ہے ـــ باوجودیکہ انہیں میرے پاس ایک ہفتہ ہو گیا ہے اور وہ مرجھا گئے ہیں۔ اور میں اُن تمام فضولیات پر یقین رکھتا ہوں جن پر کبھی ہنسا کرتا تھا؛ مجھے یقین ہے کہ میں بادلوں اور بہاروں سے نامہ و پیام کر سکتا ہوں؛ اور میں منتظر ہوں کہ پھول ابھی بولنے لگیں گے۔ لیکن نہیں مجھے تو یقین ہے کہ وہ ہر وقت بولتے ہیں، اب بھی وہ بول رہے ہیں۔ وہ ہر لحظہ بولتے ہیں اور میں اُن کی زبان کو بڑی حد تک سمجھ لیتا ہوں۔

میں خوش ہوں کہ موسم سرما ختم ہو چکا ہے! ہواہیں مجھے بہار کی، سانس چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھ میں پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ میرے وجود کی حدیں وسیع ہو رہی ہیں۔ کل کا گزرا ہوا دن مدتِ مدید معلوم ہوتا ہے اور پچھلے چند دنوں کے واقعات بھولے بسرے خواب نظر آتے ہیں۔ جب گرٹیل

مجھ سے رخصت ہوتی ہے تو اب بھی مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، خصوصاً جب اُسے ملے کچھ روز گزر جاتے ہیں تو ہماری محبت ایک پارینہ داستان معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ دور، بڑی دور سے آتی ہے! ــــــ لیکن جب وہ باتیں شروع کرتی ہے تو پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اُس وقت مجھے موجودہ زمانے کا صاف صاف احساس ہوتا ہے۔ پھر اُس کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے اور اشیا کے رنگ تیز و تلخ نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ چلی جاتی ہے تو اُس کے ساتھ ہر چیز رخصت ہو جاتی ہے۔ میرے تصور میں کوئی تصویر کوئی یاد باقی نہیں رہتی۔ اور پھر میں ہوتا ہوتا ہوں اور یہ پھول۔ یہ اب مرجھا گئے ہیں، بالکل مرجھا گئے ہیں۔ اب ان میں قطعاً خوشبو نہیں رہی۔ گرٹیل نے ان کو اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن آج جب اُس کی نظر ان پر پڑی تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ ان کے بارے میں مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن یکایک کسی پُراسرار خوف نے اُس پر غلبہ پالیا! ــ اُس کی زبان پر مہرِ سکوت لگ گئی اور وہ اسی وقت مجھ سے رخصت ہو گئی۔

پنکھڑیاں آہستہ آہستہ گر رہی ہیں۔ میں نے کبھی ان کو ہاتھ نہیں لگایا، اگر میں لگاتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ اُن کو مرجھائے ہوئے دیکھ کر میرا غم بڑھتا ہے۔ میں نہیں جانتا کیوں اس نادانی کا خاتمہ کرنے کی جرات مجھ میں نہیں ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔ میں اُن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا اور میں باہر نکل جاتا ہوں۔ گلی میں پہنچ کر اُن کی حفاظت کی خلش مجھے بے قرار کر دیتی ہے اور میں لوٹ آتا ہوں۔ اور اُن کو اسی لمبے سے سبز گلدان میں پژمردہ اور غمگین پاتا ہوں۔ کل شام میں اُن کے سامنے روتا رہا جیسے کوئی کسی قبر پر روتا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ بھی میرا خیال اُن کے بھیجنے والے کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ شاید میں غلطی پر ہوں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گرٹیل بھی محسوس کرتی ہے کہ میرے کمرے میں کوئی اجنبی چیز موجود ہے۔ وہ اب ہنستی نہیں۔ وہ اب بلند آواز سے نہیں بولتی ــــ اُس صاف، حیات انگیز آواز سے جسے میں نے اکثر سنا ہے۔ اور اب میں اُس طرح اس کا استقبال نہیں کرتا جس طرح پہلے کیا کرتا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات میرے لئے کتنے درد و کرب کا موجب ہونگے۔

وہ اکثر اپنا سینا پرونا یہیں لے آتی ہے۔ اور اگر میں ابھی کتابوں میں منہمک ہوتا ہوں تو وہ بھی میز پر آکر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے کام میں لگی رہتی ہے، اور بڑے صبر سے انتظار کرتی ہے، یہاں تک کہ میں اپنا کام ختم کر کے کتابیں

ایک طرف رکھ کے اُس کے پاس آتا ہوں اور سوئی دھاگا اُس کے ہاتھ سے لے لیتا ہوں۔ پھر میں سبز سائے کو لیمپ پر سے اتار لیتا ہوں اور کمرے میں سفید روشنی کا ایک سیلاب آجاتا ہے۔ مجھے تاریک کونے اچھے نہیں لگتے۔

بہار! میری کھڑکی چوپٹ کھلی ہے۔ گزشتہ شام جب رات کا سایہ بڑھ رہا تھا گرٹیل اور میں باہر گلی کی طرف جھانک رہے تھے۔ ہوا نرم اور خوشگوار تھی۔ اور جب گلی کے کونے پر میری نظر پڑی، جہاں لمپ اپنی ہلکی سی روشنی پھیلا رہا تھا تو یکایک مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے اُسے دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں، لیکن میری نظریں پلکوں میں سے گزر گزر کر اُس پر پڑنے لگیں۔ لمپ کی زرد روشنی میں وہ بیچارگی کی حالت میں کھڑی تھی، اور میں نے اُس کے چہرے کو صاف طور پر دیکھا، جیسے یہ زرد روشنی سورج کی روشنی تھی۔ اور مجھے اُس کے زرد اترے ہوئے چہرے میں اُس کی بیمار آنکھیں بھی نظر آگئیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا اور اپنی میز کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ شمع ہوا میں جھلملانے لگی۔ اور میں بے حرکت بیٹھا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بیچاری وہیں کونے میں منتظر کھڑی ہے اور اگر میں نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہاتھ لگانے کی جرات کی تو بے اختیار میں انہیں گلدان میں سے نکال کر اُس کے پاس لے جاؤں گا۔ یہی میں نے سوچا اور سچے دل سے سوچا، تاہم میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب نادانی ہے۔ اب گرٹیل بھی کھڑکی سے ہٹ کر میری کرسی کے پیچھے آکھڑی ہوئی، جہاں وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھہری، میرے بالوں کو اُس نے اپنے ہونٹوں سے چھوا اور پھر چلی گئی۔ میں تنہا رہ گیا۔

میں پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب مٹے جارہے ہیں۔ صرف سوکھی ہوئی بے برگ شاخیں باقی ہیں۔ وہ مجھے بیمار اور دیوانہ کئے دیتی ہیں۔ اور یہ ایک ظاہر بات ہوگی ورنہ گرٹیل مجھ سے ضرور پوچھتی، لیکن وہ بھی اسے محسوس کرتی ہے۔ اب وہ بھاگ گئی ہے، یوں جیسے میرے کمرے میں روحوں کا بسیرا ہے۔

روحیں! ہاں، ہاں روحیں! مردہ چیزیں، زندوں سے کھیلتی ہوئیں! اور اگر مرجھائے ہوئے پھولوں کی خوشبو ہمیں آتی ہے تو یہ اُن گزرے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی ہے جب وہ تازہ اور شگفتہ تھے۔ اور جو مر چکے ہیں وہ ہمارے پاس اُس وقت تک آتے رہتے ہیں جب تک ہم اُنہیں بھول نہیں جاتے۔ کیا ہوا اگر اب وہ بول نہیں سکتے ـــ میں اُن کی آواز سن سکتا ہوں! وہ اب نظر نہیں آتی لیکن میں اُسے دیکھ سکتا ہوں! میرے کمرے کے باہر کی بہار، اور وہ

دھوپ جو میرے کمبل پر پڑ رہی ہے، اور پھولوں کی وہ خوشبو جو باغیچہ سے آرہی ہے، اور وہ لوگ جو میرے مکان کے نیچے سے گزر رہے ہیں اور مجھے جن سے کوئی دلچسپی نہیں، کیا یہی حیات ہیں؟ اگر میں پردے کھینچ ڈالوں تو آفتاب بے نور ہوجائے۔ اگر ان لوگوں کا خیال میں دل سے نکال دوں تو میرے لئے وہ مردہ ہیں۔ اگر میں کھڑکی کو بند کردوں تو پھولوں کی خوشبو منقطع ہوجائے اور بہار مردہ۔ میں سورج سے، لوگوں سے، بہار سے زیادہ طاقتور ہوں لیکن گزرے ہوئے دنوں کی یاد مجھ سے بھی زیادہ طاقتور ہے کیونکہ وہ جب چاہتی ہے آتی ہے اور اُس سے کوئی مفر نہیں۔ اور یہ خشک تیلیاں زیادہ طاقتور ہیں پھولوں کی اس مہک سے اور بہار سے۔

میں ان صفحات پر دماغ سوزی کر رہا تھا جب گرٹیل داخل ہوئی۔ وہ اتنی سویرے کبھی نہ آئی تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دہلیز پر رُکی اور میں اُسے خاموش دیکھتا رہا۔ پھر وہ مسکرائی اور میرے پاس آگئی۔ اُس کے ہاتھوں میں تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ تھا وہ کچھ نہ بولی اور اُس نے گلدستہ کو میز پر رکھ دیا۔ دوسرے لمحے میں اُس نے خشک تیلیوں کو گلدان سے نکالا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دل نکال لیا ہے! ــــ لیکن میں کوئی آواز نہ نکال سکا۔ اور جب میں نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اُس نے مسکرا دیا۔ پھولوں والے ہاتھ کو سر سے اونچا کئے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور اُس نے اُن کو نیچے گلی میں گرا دیا۔ مجھ کو یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اپنے آپ کو اُن کے پیچھے گرا دینا چاہتا ہوں، لیکن اب گرٹیل پلٹ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اُس کے سر پر دھوپ، روشن دھوپ پڑ رہی تھی اور بہار کے پھولوں کی خوشبو کھڑکی سے اندر آرہی تھی۔ اور میں نے خالی سبز گلدان پر ایک نگاہ ڈالی: ــ مجھے یقین تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اُس وقت آزاد محسوس کیا، ہاں، آزاد پھر گرٹیل میرے پاس آئی اُس نے اپنا گلدستہ اٹھایا اور تروتازہ سفید پھولوں کو میرے منہ کے قریب کر دیا۔ آہ کتنی روح پرور اور جاں بخش خوشبو تھی، نرمی اور خنکی سے لبریز! میں نے چاہا کہ میں اپنے چہرے کو اُن میں دفن کر دوں۔ ہنستے ہوئے سفید خوبصورت پھول! ــــ اور میں نے محسوس کیا کہ آسیب رخصت ہو چکا ہے۔ گرٹیل میرے پیچھے کھڑی تھی اور اپنی انگلیوں کو میرے بالوں میں سے گزار رہی تھی "نادان لڑکے" اُس نے کہا۔ کیا وہ جانتی تھی کہ اُس نے کیا کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کو پکڑ کر چوم لیا۔

شام کے وقت ہم باہر گئے ــ وسعت میں، بہار میں۔ ہم ابھی ابھی واپس آئے ہیں! میں نے بتی روشن کر لی ہے۔ ہم نے بڑی لمبی سیر کی ہے اور گرٹیل اتنی تھک گئی ہے کہ کرسی ہی میں اُس کی آنکھ لگ گئی ہے۔ آہ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے جب یوں نیند میں مسکراتی ہے!

میرے سامنے تنگ سبز گلدان میں تازہ سفید پھول ہیں۔ نیچے گلی میں ــــ نہیں، وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ ہوا اُن کو دوسرے خس و خاشاک کے ساتھ اُڑا کرلے گئی ہے۔

(شنزلر) منصور احمد

آجانا

تنِ تنہا ہوں میں اے میرے تنہا دوست آجانا
محبت کی سُریلی راگنی مجھ کو سنا جانا

جدائی میں تری پردہ پڑا ہے دل پہ ظلمت کا
ذرا آنا مری جاں اور یہ پردہ اُٹھا جانا

ہوئی مدت کہ راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہوں میں
صداقت کی مجھے دنیا میں سیدھی رہ دکھا جانا

وفا کی پیار کی ایثار کی تصویر بن بن کر
قیامت ہے کسی کا دل میں آنا اور سما جانا

محبت کیا ہے اک شعلہ سا سینے میں بھڑک اُٹھنا
وفا کیا ہے مگر اک خود بخود دل کا کھچا جانا

محبت کو مرے دل نے خدا کی جلوہ گہ پایا
محبت کے سوا ہر شے کو میں نے ماسوا جانا

محبت میں کسی کی میں نے جس دن سے خودی چھوڑی
حقیقت کو تری اُس دن سے میں نے اے خدا جانا

نسیم اُلفت کا خادم ہے مگر اُلفت کی کلفت میں
ذرا کمزور سا ہے حوصلہ اُس کا بڑھا جانا

نسیم

پیتل کا سرطان

موسم گرما کی ایک شام کو سندھ کے بالائی حصہ میں "آتش شادمانی" کے سامنے چار آدمی اپنے خیمہ کے باہر بیٹھے کرسمس کی تعطیل نہایت مسرورانہ گذار رہے تھے۔ اُن میں تین انگریز اور ایک ہندوستانی میر قادر خان تھے۔ یہ سب حکومت ہند کے ملازم تھے اور آپس میں غدر کے زمانہ کی اُن مقتول انگریز خواتین اور اینگلو انڈین کرنلوں کے مروجہ قصّے بیان کر رہے تھے جن کی روحیں اُس میدان میں جہاں وہ قتل کئے گئے تھے، پھر بھوتوں کی شکل میں رونما ہونے لگی تھیں۔ یہ عجیب و غریب بھوت پیپل کے درختوں پر رہا کرتے تھے اور مسافروں کو ستایا کرتے تھے۔ غرضکہ سب اسی قسم کے بہت سے قصے بیان کرتے رہے۔ آخرکار بروڈرک نے کہا "میں آپ لوگوں سے ایک سچا قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے"۔ تینوں ساتھیوں نے نہایت شوق سے پورا قصہ سننے کے لئے آمادگی ظاہر کی اور بروڈرک نے نہایت اطمینان سے آرام کرسی پر لیٹ کر بیان کرنا شروع کیا۔

چند سال گذرے جب میں گجرات کے ایک ضلع کا حاکم تھا۔ میرے پاس پیتل کا بنا ہوا ایک بڑا سا سرطان تھا جو میں نے بمبئی سے خریدا تھا اور جو ٹوکیو کا بنا ہوا تھا۔ یہ سرطان جاپانی صناعی کا ایک مکمل نمونہ تھا اور اصلی سرطان سے بہت بڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اُس بڑے سرطان کا نمونہ تھا جو صرف جاپانی مجمع الجزائر کے شمالی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بالکل بے عیب تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ایک جاندار سرطان ہے اور پہلی نظر میں وہ نہایت خوفناک معلوم ہوتی تھیں پیتل کے کام کی صفائی دیکھ کر غیر ممکن تھا کہ یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اُس کی آنکھیں یا ٹانگیں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ میں نہایت آزادانہ کہتا ہوں کہ میں اور میرے مرہٹہ ملازمین اکثر اوقات اُس سے ڈر جاتے تھے میں نے اُس کو اپنی لکھنے کی میز پر رکھ دیا تھا۔ اور میں اُس سے پیپر ویٹ کا کام لیا کرتا تھا۔ اپنے ہندوستانی مہمانوں سے میں اکثر اُس کے متعلق گفتگو کرتا۔ جب پہلے پہل میں اس سرطان کو بمبئی سے گجرات لایا تو چپراسی اُس سے خوف زدہ ہوئے لیکن پھر بہت زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ گجرات میں جو احباب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اس سرطان کو دیکھ کر بہت تعریف کرتے تھے۔ میرے ملنے والوں میں سے ناسک کے ایک برہمن بھی تھے۔ اُن کو اس پیتل کے سرطان سے غیر معمولی دلچسپی ہو گئی تھی وہ عموماً کسی معمولی سے کام کا بہانہ کر کے میرے پاس آجایا کرتے تھے لیکن اُن کا اصلی مقصد صرف سرطان کو

دیکھنا اور اُس کو چھونا ہی ہوا کرتا تھا۔ آخر میں اُن کی آمد سے تنگ آگیا اور میں نے کنایتہً یہ ظاہر کر دیا کہ میں بہت زیادہ مصروف ہوں اور آپ کے آنے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ انھوں نے اس کو محسوس کر کے میرے پاس آنا ترک کر دیا۔ اس واقعے کے دو دن بعد میرا لباس پہنانے والا خادم نہایت اضطراب کی حالت میں میرے پاس آیا۔ پہلے تو وہ خاموش کھڑا رہا لیکن چند منٹ کے بعد اُس نے کہا "آج صبح میری روپوں کی تھیلی کھو گئی تھی۔ تلاش کرنے پر خیمہ کی کرمچی دیوار کے پیچھے پڑی ہوئی ملی۔ اُس کے قریب ہی سرطان بھی پڑا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہی اس تھیلی کو چرا کر لایا ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے" پہلے تو میں اُس کی باتوں پر ہنسا اور اُس سے کہا بیوقوف نہ بنو۔ مگر جب میں نے اُس کے الفاظ پر غور کیا تو دو باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ اول تو جب سے میں اس سرطان کا مالک ہوا تھا میرا خادم ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہتا تھا اور اس سے بالکل نہیں ڈرتا تھا دوسری بات یہ تھی کہ آخر سرطان کا خیمہ کی دیوار کے نیچے کیا کام تھا۔ وہ ہمیشہ میری لکھنے کی میز پر رکھا رہتا تھا میں نے سمجھا تو یہی سمجھا کہ شاید ناسک کا برہمن اُس کو چرانا چاہتا ہے۔ اس لئے ابھی تو اُس نے اُسے کسی مناسب جگہ پر چھپا دیا ہے اور موقع پا کر اٹھا لے جائے گا۔ میں اپنے خیمہ کی دیوار کے پاس گیا اور سرطان کو وہاں پڑا پایا۔ میں نے اس کو پھر اٹھا کر لکھنے کی میز پر رکھ دیا۔ اُس کی آنکھوں پر غور کرنے سے مجھے اُن میں پہلے سے زیادہ چمک معلوم ہونے لگی مگر میں نے اس پیتل کے کھلونے پر غور و فکر کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اُسی روز شام کو میں اپنی خواب گاہ سے دفتر والے خیمہ میں آیا تو میں نے سرطان کو میز پر رینگتے ہوئے دیکھا۔ جب میں اُس کے قریب پہنچا تو وہ ٹھہر گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خادم کی بات پر یقین ہو گیا۔ دوسرے روز علی الصباح جب میں سو کر اُٹھا تو میری جیب میں بٹوا موجود نہ تھا۔ بہت دیر کی جستجو کے بعد وہ مجھے دری کے نیچے ایک سوراخ میں چھپا ہوا ملا۔ یہ سوراخ سرطان ہی کا بنایا ہوا معلوم ہوتا تھا اور مٹی سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سرطان کی پچھلی ٹانگوں سے باہر پھینکی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سرطان کے پنجوں کے نشانات بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نظارہ کو دیکھ کر میرے ملازمین حواس باختہ ہو گئے۔ اگر سچ پوچھئے تو میں بھی شک میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے خوردبین سے سرطان کو دیکھنا شروع کیا۔ اُس کی آنکھیں ہی خوفناک نہ تھیں، بلکہ اس کی ٹانگوں میں بھی ریت کے ذرے نظر آ رہے تھے۔ اُس رات کو میں دفعتہً چونک کر اُٹھ بیٹھا اور میں نے سرطان کو بالکل اسی طرح اپنے خیمہ کے پاس کسی چیز کی جستجو کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ اس وقت آپ تینوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نظارہ کو دیکھ کر مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ مجھ میں بستر سے اُٹھنے کی ہمت بھی نہ رہی اس کے بعد میری آنکھ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ جھپکی۔

"خوش قسمتی سے کلکٹر ہیری سن جو چند سال گزرے انتقال کر چکے ہیں، میرے قریب ہی خیمہ زن تھے۔ انہوں نے صبح کے کھانے پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ ایک قابل قدر عالم اور ایک رحمدل انسان تھے۔ میں نے اُن سے تمام واقعہ بیان کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ جب دن اچھی طرح نکل آیا تو میں لکھنے کی میز پر گیا۔ سرطان اپنی جگہ پر موجود تھا اُس کی آنکھوں میں اب وہ خوفناک قوت باقی نہ رہی تھی، بلکہ اب اُن پر ایک غم چھا رہا تھا۔

"وقتِ مقررہ پر ہیری سن کھانا کھانے کے لئے میرے خیمہ میں آ گئے پہلے تو ہم اپنے دفتر کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے سرطان کا قصہ چھیڑا۔ اول اول تو وہ اس کو محض مذاق سمجھتے رہے لیکن کچھ دیر کے بعد ہمہ تن شوق بن کر اُس کو دیکھنے کی غرض سے میرے ساتھ دفتر والے خیمہ میں چلے آئے۔ یہاں آ کر ہم نے دیکھا کہ سرطان میز پر رینگ رہا ہے اُس نے اپنی حرکت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ قلمدان سے کاغذوں تک پہنچا اِس کے بعد پھر قلمدان کے پاس آ گیا۔ ہیری سن پہلے تو دیکھتے رہے اُس کے بعد بولے "ارے یہ تو لکھ رہا ہے ـــــ یہ تو مرہٹی لکھ رہا ہے"۔ میں نے بھی قریب آ کر دیکھا تو واقعی سرطان لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ یہ کام بسخت مشکل سے کر رہا تھا کیونکہ قلم کی بجائے وہ اپنے پنجے کو روشنائی میں ڈبو ڈبو کر کاغذ پر گھسیٹ رہا تھا۔ ہیری سن نے جیب سے پنسل نکال کر اُس عجیب و غریب جانور کو دی۔ اُس نے نہایت مسرورانہ انداز میں پنسل کو چھین لیا۔ اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے آہستہ آہستہ لکھنا شروع کر دیا۔ قصہ مختصر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد سرطان نے مرہٹی زبان میں اپنی زندگی کے حالات لکھ دیئے ہیری سن اور میں دونوں بخوبی مرہٹی جانتے تھے اس لئے نہایت آسانی سے ہم اس تحریر کا مطلب سمجھ گئے۔ وہ یہ تھی:-

"میں ناسک کا ایک برہمن دشاستر ہوں اور رامچندر کے مندر کا پجاری ہونا میری قسمت میں لکھا تھا۔ ایک مرتبہ میں دریائے نربدا کی جاترا کے لئے گیا۔ وہاں پر چند سنیاسیوں سے میری ملاقات ہو گئی۔ یہ لوگ پاربتی دیوی کے معتقد تھے جس کو وہ کالی دیوی کہتے تھے۔ وہ میرے دوست ہو گئے اور انہوں نے مجھ کو رام چندر کا مندر چھوڑ دینے کی رائے دی کیونکہ اس میں مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں کالی دیوی کے پرستاروں کی جماعت میں شریک ہو گیا۔ جہاں عزت و دولت میرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ لوگ روح کو منتر کے ذریعہ سے کسی دوسرے جسم میں بھی منتقل کر لیتے تھے۔ اگرچہ اس تعلیم کا حاصل کرنا نہایت اہم کام تھا، تاہم میں نے اس علم کو سیکھ لیا، جس کے ذریعہ سے فوراً روح جسم سے جدا ہو کر کسی دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی تھی۔ اِس علم کو حاصل کرنے کے لئے مجھے بہت زیادہ نفس کشی کرنی پڑی۔ تمام موسم گرما آگ کی بھٹیوں کے سامنے بیٹھ کر گذار دیا اور سردی کا تمام زمانہ برفانی چشمہ کے تیز پانی میں دن رات کھڑے رہ کر بسر کر دیا۔ اب رہا غذا کے متعلق تو وہ بھی صرف زندہ رہنے کے لئے برائے نام کھا لیا کرتا تھا۔ جب میری حالت بہت زیادہ ابتر ہو گئی تو میرے گرو نے کہا "اب تم منتر سیکھنے کے قابل ہو گئے ہو" انہوں نے میرے کان میں کچھ خوفناک الفاظ کہے اور مجھ کو اُن کے دُہرانے کا حکم دیا۔ اُسی وقت میرے دل میں چوہا بننے کا خیال پیدا ہوا۔

چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے میرے گرو نے فوراً ایک چوہا پکڑ کر مار ڈالا۔ میں نے اُس منتر کو پڑھا، اور میری روح فی الفور چوہے کے جسم میں منتقل ہو گئی۔ چوہا ہو جانے سے مجھے بھوک کی بہت زیادہ تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ اس لئے میں نے پھر منتر پڑھا اور میری روح اپنے اصلی جسم میں واپس آ گئی۔ اس سے سنیاسی مطمئن ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ اب میں ابتدائی تعلیم میں بالکل پختہ ہو گیا ہوں فوراً انہوں نے میرے سامنے چیتے کی لاش لا کر ڈال دی اور مجھے ایک خونخوار درندہ ہو جانے کے لئے حکم دیا۔ چیتا ہو جانے کے بعد میں نے ایک برات پر حملہ کیا اور جواہرات سے آراستہ دلہن کو اٹھا کر ایک مقررہ جگہ پر لے آیا۔ اور اُسے پھاڑ کر کھا گیا۔ سنیاسیوں نے برات کا تمام روپیہ اور جواہرات اکٹھے کر لئے۔ چیتے میں منتقل کرنے سے پہلے مجھے ایک قسم کی شراب پلا دی گئی تھی جس سے میرا اصلی جسم چند ماہ تک سڑنے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ پھر میں گجرات کے امرا کا شکار کرنے کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت سی زیور اور جواہرات سے آراستہ لڑکیوں اور دولت مند تجار کو مار ڈالا، اور اُن کی لاشوں کو اُس جگہ لے آیا جہاں لانے کی میرے استاد نے ہدایت کی تھی۔ ہر تیسرے مہینے منتر کے ذریعہ سے میں اپنے انسانی جسم میں واپس آ جایا کرتا تھا یہ اس لئے کرنا پڑتا تھا کہ کہیں شراب کا اثر زائل ہو جانے سے میرا انسانی جسم سڑ نہ جائے۔ دیوی کے معتقدین کی جماعت میں ایک یا دو دن رہنے کے بعد میں پھر چیتے ہی کے جسم میں منتقل ہو گیا۔

ایک دفعہ گجرات کے چند اضلاع میں لوگوں پر حملے کر کے میں ریگستان میں گھس رہا تھا کہ چند انگریز افسر مجھے مارنے کے لئے پہنچ گئے۔ یہ لوگ شاہراہ کے درختوں پر بیٹھے ہوئے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اتفاقاً میں ایک روز شام کو اُن کی تدابیر سے بالکل بے خبر دیوی کے خیالات میں منہمک اُن کی گھات کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اُن میں سے کسی نے بندوق چلائی اور گولی چیتے کے جسم میں گھس گئی۔ دیوی کے لطف و کرم سے مجھے بچنے کا موقع مل گیا اور خون جاری ہونے سے پہلے ہی میں اپنے اصلی جسم میں منتقل ہو گیا۔ میں نے اپنے گرو سے قصہ بیان کیا اور بتایا کہ کس صفائی سے میں بچ گیا۔ انہوں نے یہ کہہ کر میری ہمت بڑھائی کہ "تم بہت سے جوہر دکھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ اور دوسرے جنم میں یقیناً تم ایک خوش قسمت انسان ہو گے"۔ چند ہفتے گذر جانے کے بعد میرا خوف رفع ہو گیا اور میں ایک گھڑیال کی لاش میں منتقل ہونے کے لئے راضی ہو گیا۔ جس کو میرے گرو نے پہلے ہی سے محفوظ کر رکھا تھا۔ مجھے دریائے نربدا کے اندر زندگی بسر کرنے کا حکم ہوا۔ جہاں میں اُن دہقانی عورتوں اور لڑکیوں کی گھات میں رہتا تھا جو مقدس دریا میں اپنے گھڑے بھرنے کی غرض سے آیا کرتی تھیں۔ کئی مہینہ تک یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ اتفاقاً ایک روز سطح آب پر مجھے گوشت کا ایک ٹکڑا بہتا ہوا نظر آیا میں نے بیوقوفی سے اُس کو نگلنے کی کوشش کی لیکن میرے جبڑوں میں ایک آہنی کانٹا چبھ گیا۔ میں اُس کی تکلیف سے سخت پریشان ہوا اور میں نے اپنے آپ کو کنارے کی طرف کھنچتے ہوئے محسوس کیا، جس سے مجھے یہ معلوم

ہوگیا کہ کوئی کینہ پرور دہقان مچھلی کی طرح مجھے بنسی سے کھینچ رہا ہے ۔ بہرحال میرے لئے اُس سے بچنا بہت آسان تھا ۔ اپنے بچنے کے لئے اگر کچھ تدبیر میں کر سکتا تھا تو وہ صرف پانی سے باہر نکل کر ممکن تھی ۔ کیونکہ انسانی روح میں منتقل ہونے کے لئے ہوا کی ضرورت ہے ۔ پانی سے نکلتے ہی میں نے منتر پڑھا اور اپنے اصلی جسم میں منتقل ہوگیا ۔ انسانی جسم میں منتقل ہوجانے کے بعد میں نے اپنے گرو سے رخصت کی درخواست کی ۔ حقیقتاً اب میں اس کا مستحق بھی تھا کیونکہ میں نے اُن کے واسطے بہت کافی دولت جمع کردی تھی جس کو انہوں نے نہایت بے دردی سے اپنی تفریحات میں صرف کرنا شروع کردیا تھا ۔ جب میں اپنا زمانۂ رخصت نہایت آرام سے گزار رہا تھا ایک صاحب بہادر مع اپنے پیتلی سرطان کے تشریف لے آئے ۔ سرطان اگرچہ دھات کا بنا ہوا تھا لیکن میرے دل میں اُس کے اندر منتقل ہوجانے کی خواہش پیدا ہوئی وہ نہایت صفائی سے بنایا گیا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل اصلی معلوم ہوتی تھیں جیسی کہ اب بھی دکھائی دے رہی ہیں ۔ صاحب بہادر کو یہ بات تو یاد ہوگی کہ میں اکثر سرطان کو اٹھا کر اچھی طرح دیکھا کرتا تھا کیونکہ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا مقصد حل ہونے کے لئے اس میں کوئی سوراخ بھی ہے یا نہیں ۔ آخر کار میں اپنی جستجو میں کامیاب ہوگیا اور مجھے اُس کے پنجے میں ایک سوراخ دکھائی دیا جو کمانی کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا تھا ۔ میں نے فوراً سرطان میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا ۔ یہ محض امتحاناً تھا اس لئے پہلے کی طرح میں نے شراب نہیں پی اب میرا ارادہ وہ ایک روز میں اپنے ہی جسم میں منتقل ہوجانے کا ہے کیونکہ مجھے اپنے استاد سے مشورہ کرنا ہے ۔ میں نہایت آسانی سے سرطان میں منتقل تو ہوگیا لیکن میں اپنی آرزو میں کامیاب نہ ہوسکا ۔ یہ صحیح ہے کہ میں دیکھ سکتا ہوں ، لیکن سن نہیں سکتا ، کیونکہ سرطان کے کانوں میں سوراخ نہیں ہیں ۔ ٹانگیں اگرچہ نہایت خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں ، لیکن اصلی نہ ہونے کی وجہ سے میں صرف رینگ سکتا ہوں ۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ پہلے تو دو ایک پہر اگر کسی جگہ چھپا رہوں گا اُس کے بعد اپنے جسم میں واپس آکر اُن کو اپنے گرو کے پاس لے جاؤں گا ۔ وہاں پہنچنے پر جو کچھ وہ میرے متعلق فیصلہ کریں گے اُس پر عمل کروں گا ۔ اگر وہ اس پیتل کے سرطان میں دوبارہ منتقل ہونے کا حکم دیں گے تو اُس کی تعمیل کروں گا ، ورنہ کسی اور جانور کی شکل میں رونما ہو جاؤں گا ۔ افسوس میں اپنی تدابیر میں ناکام رہا ، کیونکہ صاحب بہادر اور اُن کے خدام میری پوشیدہ جگہ سے بخوبی واقف ہوگئے اور انہوں نے اپنا روپیہ بھی برآمد کرلیا ۔ اب میرا یہ ارادہ ہے کہ فوراً اپنے اصلی جسم میں منتقل ہوجاؤں ۔ صاحب لوگ میرے خوف کا بخوبی اندازہ کرلیں گے جب کہ انہیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ سوراخ جس میں سے میری روح سرطان کے اندر داخل ہوئی ہے بند کردیا گیا ہے اور اسپرنگ دار چٹخنی صرف باہر کی طرف کھل سکتی ہے یوں اب میں اپنے آپ کو اس پیتل کے سرطان کے اندر ایک قیدی سمجھتا ہوں ۔ چند گھنٹے میں میرا جسم سڑ جائے گا اور جلا دیا جائے گا ۔ پھر اگر میں سرطان کے اندر سے نکل بھی جاؤں تو میرے لئے کوئی ٹھکانا نہیں ہے ۔ سوائے اس کے کہ میں اپنی زندگی ہمیشہ کے لئے کسی پیپل کے درخت پر گذار دوں ۔ میں نے صاحب بہادر کو تمام قصے سے اس لئے آگاہ کردیا ہے ،

کہ اگر اُن کو رحم آگیا تو مجھے یقیناً چھٹکارا مل جائے گا۔"

سرطان کی ناقابلِ یقین سرگزشت پڑھنے کے بعد میں نے ہری سن سے کہا کیا اس بدمعاش برہمن کو آزاد کر دینا چاہیئے"
ہری سن نے کہا نہیں ہم کو اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے ذرا ان خطرناک واقعات پر تو غور کرو جو اس ذلیل برہمن نے دیوی کی پرستاری میں کئے۔ اگر ہم اس کو آزاد کر دیں گے تو پھر وہی مہیب کام انجام دے گا۔ ہم کو اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہیئے جیسا سلیمان علیہ السلام نے اُن جنات کے ساتھ کیا جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم کو یہ چاہیئے کہ اس برہمن کو ہمیشہ کے لئے اسی سرطان کے اندر بند کر دیں، اور اس کو کسی ایسی جگہ پھینک دیں جہاں سے اس کو کبھی چھٹکارا نصیب نہ ہو سکے"۔ یہ کہہ کر ہری سن نے لاکھ پگھلائی اور سرطان کے پنجہ والے اسپرنگ پر ڈال دی۔ پھر ہم دونوں نے اپنی انگوٹھیوں کی مہریں اس پگھلی ہوئی لاکھ پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا اسمِ گرامی پڑھتے ہوئے ثبت کر دیں۔

اس کے بعد ہری سن نے میرے سرطان کو خیمہ کے قریب والے کوئیں میں پھینک دیا۔ کوئیں کی دیواریں اس قدر چکنی اور سپاٹ تھیں کہ اصلی سرطان بھی اُن پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اس طرح پر ہم برہمن کی روح کی طرف سے تو مطمئن ہو گئے لیکن ابھی اُس کے جسم کا فکر دامنگیر تھا۔ دو تین روز کے بعد ہم کو اطلاع ملی کہ ایک برہمن کی لاش پولس کو پڑی ہوئی ملی ہے جس سے قتل کا شبہ ہوتا ہے۔ پولس والوں نے معمولی تحقیقات کے بعد ایک سنیاسی کو گرفتار کر لیا۔ جس کے پاس سے مردہ برہمن کا مال برآمد ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی تحقیقات صحیح تھی کیونکہ سرطان کے جسم میں منتقل ہونے سے پہلے برہمن نے اپنا تمام مال و متاع اسی سنیاسی کو دے دیا تھا۔ مسٹر ہری سن کلکٹر ہونے کے علاوہ ضلع کے مجسٹریٹ بھی تھے اس لئے انہوں نے مقدمہ کو اپنی عدالت میں منتقل کرا لیا اور پولس سپرنٹنڈنٹ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے سنیاسی کو رہا کر دیا۔"

اتنا کہنے کے بعد بروڈرک دفعتہً خاموش ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کے سوال کرنے سے پہلے ہی سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ بروڈرک کے چلے جانے کے بعد کارٹرائٹ نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا مارنکس کیا آپ اس قصہ کو لفظ بلفظ صحیح تصور کرتے ہیں؟

جواب دینے سے قبل مارنکس میر قادر خاں سے مخاطب ہو کر بولے، "میر صاحب آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟"

اس سوال سے میر قادر خاں کچھ متحیر ہوئے اور کہنے لگے "میں تو اس کو بالکل سچ سمجھتا ہوں۔ الحمد للہ، تمام صاحب لوگ جن سے میری شناسائی ہے ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور بروڈرک صاحب کو تو میں ہمیشہ سے اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مجھے قصداً کبھی دھوکا نہیں دیا۔

اس کے بعد میر قادر خاں محفل کے کندھوں سے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خوابگاہ کی طرف چلے گئے۔

کارٹرائٹ صاحب اور مارنکس صاحب نے بھی نہایت دانشمندی سے میر صاحب کی پیروی کی، کیونکہ اب کوئی قصہ گو موجود نہیں تھا۔

مشہود زائر

محفلِ ادب

نواہائے راز

دامن پہ زخمِ دل کا لہو لالہ کار ہے — آئے نہ آئے فصلِ بہار اب بہار ہے
اُس بے وفا نے ترکِ وفا کا کیا ہے عہد — لے وائے اُس کا عہد اگر استوار ہے
کس کس کی بزمِ عیش نہ برہم ہوئی یہاں — روتا ہے کیا، یہ قاعدۂ روزگار ہے
کج بازیٔ سپہر سے میری بلا ڈرے — دو دن کا کھیل زندگیٔ مستعار ہے
میرا چراغِ زیست فروزاں سہی مگر — روشن تر اُس سے بھی مری شمعِ مزار ہے
یا تابشِ شرار سے دل وقفِ سوز ہے — یا سوزِ دل ہی غازۂ روئے شرار ہے
پایا ہے جب سے بار تری جلوہ گاہ میں — اقرارِ حسنِ غیر مجھے ناگوار ہے
پروانہ سے یہ رنج کہ مرتا ہے شمع پر — بلبل سے یہ ملال کہ گل پر نثار ہے
کب تک حجابِ غیر میں یہ کم نگاہیاں — حالانکہ عرش و فرش میں تو جلوہ بار ہے

افسردگیٔ شمع سے پروانہ ہے خجل
انجامِ گل سے سر بگریباں ہزار ہے

"نورجہاں"

سعدی کا پیرایۂ بیان

سعدی کی جس چیز کو ہم پسند کرتے ہیں، وہ صرف اُس کے معتدل، معقول اور ہمدردانہ نصائح اور شیریں و تبسم آمیز حکمت ہی نہیں ہیں، بلکہ اُس کا دلکش پیرایۂ بیان اور بامزہ تشبیہات و استعارات وکنایات بھی ہیں جو اُس نے اپنے پند و نصائح میں اختیار کئے ہیں اور نیز مناظرِ قدرت کا ذوق جن کا بیان اُس نے نہایت نزاکت و دلبستگی کے ساتھ کیا ہے، جس طرح کہ کوئی اپنے زیبا اور عزیز محبوب کا کرے گا۔ ذیل میں ایک حمد نقل کرتا ہوں، جو ایک گیت ہے جس میں خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم کو مناظرِ قدرت کے اندر دکھایا ہے۔ یہ نظم فراخ و باوسعت ہے جس میں ساتھ ہی ایک

قسم کی نزاکت و صفائی ہے اور پھر محکم و دل نشین بھی ہے۔

"کمالاتِ ایزدی کو کون شمار کر سکتا ہے۔ اُس کی بے شمار نعمتوں میں سے کسی نے ایک نعمت کا بھی پُورا شکر ادا کیا ہے؟ اُس نے سراپردۂ عالم کو کھڑا کیا اور مختلف و دلفریب رنگ اس میں پھیلا دیئے۔ زمین، سمندر، جنگل، سورج چاند، ستارے سب اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اُس کی بے نہایت فیاضی نے تمام عالم کو گھیر رکھا ہے اور آسمان کا گنبد اُس کے فضل کے سامنے گرد ہے۔ نازک اور آسانی سے ٹوٹ جانے والی لکڑی میں خوشنما پھول لگاتا شاخِ گلاب میں شکر بھرتا اور قطرۂ آب سے لولوئے درخشاں پیدا کرتا ہے۔ پہاڑوں کو زمین پر بطور میخوں کے قائم کر رکھا ہے تاکہ پانی پر زمین ٹھہری رہے۔ سورج کے عمدہ اثر سے وہ زمینِ شور کو سبزہ زار بناتا ہے اور صحرا کو نرگس و گلاب کا باغ۔ بادلوں کے سینے سے وہ بارانِ بے حساب برساتا ہے، جو مردہ پودوں کو از سرِ نو زندہ کرتی ہے، اور فصلِ بہار میں وہ برہنہ شاخوں کو سبز اور چمکتا ہوا لباس پہناتا ہے۔ ایسا کون سا انعام ہے، جس کا انسان نے کبھی پُورا پورا شکریہ ادا کیا ہے۔ وہ اپنے انعامات بے دریغ بخشتا ہے لیکن سب سے بڑا، سب سے زیادہ نہ مٹنے والا انعام یہ ہے کہ اُس نے ہمارے دلوں میں خوش بخشانہ زندگی کی امید پیدا کر دی ہے۔"

بوستان کے آٹھویں باب میں شکرِ الٰہی پر مندرجہ بالا اقتباس کے مضمون کو مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

"رات، دن، مہِ روشن اور مہرِ گیتی افروز تیری آسائش کے لئے بنے ہیں۔ آسمان فراش کی طرح تیرے لئے بساطِ بہار بچھاتا ہے۔ باد و برف اور باران و میغ، رعدِ غراں اور برقِ درخشندہ سب کارپرداز و فرمانبردار ہیں، جو تیرے تخم کو خاک میں پالتے ہیں۔ اگر تو پیاسا ہے تو تکلیف سے مت گھبرا کہ سقائے ابر تیرے لئے اپنے کاندھے پر پانی لائے گا۔ . . . . . خاک سے رنگ، بو اور طعام پیدا کرتا ہے جو آنکھ دماغ اور حلق کے لئے تماشا گاہ ہیں۔ مکھی کے ذریعے سے شہد اور ہوا سے من پہنچاتا، اور درختِ نخل سے خرما اور گٹھلی سے نخلِ خرما پیدا کرتا ہے۔ تمام نخلبند حیرت سے ہاتھ ملتے ہیں کہ ایسا نخل کسی نے نہیں بنایا۔ سورج، چاند اور پروین تیرے لئے ہیں اور تیرے مکان کی چھت کی قندیلیں ہیں۔ تیرے لئے خار سے گل، نافے سے مشک، کان سے زر اور چوبِ خشک سے برگِ تر پیدا کیا ہے۔ اے خدا! میرا دل خون ہو گیا اور آنکھیں زخمی ہو گئیں کہ بیان سے بڑھ کر تیرے انعامات دیکھتا ہوں . . . . . .

آ اے سعدی اپنا دفتر بند کر اور ہاتھ کو روک۔ ایسے راستے ہیں کہ جس کی انتہا نہیں مت دوڑ۔"

"اُردو"

جنّتِ ارضی

سوچو تو سہی، تمہاری زمین ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے۔ ایک جنت ہے، دیوتاؤں کے رہنے کے قابل، اگر صرف انسانوں میں مہر و محبت ہو۔۔۔ اسی مطمح نظر کو سامنے رکھ کر مصروفِ عمل ہو جاؤ اور اپنی زندگی کی تکمیل کر کے اس معراجِ کمال کو پالو۔

اپنے لئے کسی ایسی چیز کی آرزو نہ کرو جو کسی دوسرے کی امیدوں اور خوشیوں کا خاتمہ کر دے۔ کسی کو عسرت و محنت کی مصیبت میں اس لئے مبتلا نہ کرو کہ تمہیں وہ عیش و آرام ملے جس کے تم مستحق نہیں۔ بھوکے خادم کے پیٹ پر اس لئے پتھر نہ بندھواؤ تاکہ تمہارے مست مہمان تمہاری روٹیاں کھا کر موٹے ہوں۔

نیکی کو دوست دشمن سب میں تلاش کرو، اپنی تحسین و آفرین کو انہیں کے لئے مخصوص نہ رکھو جو تمہارے منظورِ نظر ہیں۔ اور کمزور ترین گنہگار کو بھی موقع دو کہ وہ تمہاری کوشش سے ناقابلِ عبور بلندیوں تک پہنچ سکے۔

سمجھو کہ تمہاری زمین ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے۔۔۔ ایک جنت دیوتاؤں کے رہنے کے قابل، اپنے قلب میں الوہیت کو بیدار کرو اور اپنی وسیع محبت کی مثال لوگوں کے سامنے پیش کر دو۔ سب انسان دراصل سوئے ہوئے دیوتا ہیں! اُٹھو تاکہ تمہاری ہی آواز اُن کو اس ناسزا نیند سے بیدار کرنے والی ہو۔

"نورجہاں"

مرّیخ

کیا وہ محبت کا نازک ستارہ ہے؟ عشق اور تخیل کا تارہ؟

نہیں اس نیلگوں ڈیرے سے ایک سپاہی کا زرہ چمک رہا ہے اور جب میں دُور اس سرخ تارے کی پُر پناہ کو شب کے نیلے آسمان پر دیکھتا ہوں تو میرے دل میں جذبات کا ہجوم اُٹھتا ہے۔

اے طاقت اور قوت کے تارے! تو میرے درد پر مسکراتا ہے لپنے دستِ سپاہیانہ سے اشارہ کرتا ہے، اور مجھ میں پھر نئی قوت آجاتی ہے۔

"نظام کالج میگزین"

نئی کتابیں

جہد للبقا مصنفہ خواجہ کمال الدین صاحب مبلغ اسلام۔ یہ کتاب سورۂ فاتحہ کی ایک حکیمانہ تفسیر ہے اس میں قرآن مجید کی اس سب سے اہم دعا کے انسانی معاشرت اخلاق اور روحانیات پر اثرات ظاہر کئے گئے ہیں۔ عمل کو دعا کی قبولیت کے لئے ضروری بتایا ہے اور انسان کی معاشری، منزلی، مجلسی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کو مذہب کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ فاضل مفسر نے ثابت کیا ہے کہ ترقی کے تمام امکانات کو خدا نے انسان کے قبضۂ قدرت میں رکھ دیا ہے، صرف اُس کا علم محدود ہے اور یہ دعا علم و عرفان ہی کی دعا ہے۔ کتاب کا حجم ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہے اور چونکہ اس کی فروخت سے کوئی تجارتی غرض وابستہ نہیں اس لیئے قیمت صرف ۸؍ رکھی ہے پتہ مینیجر مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور

بقائے دوام مصنفہ ایم اسلم صاحب۔ اس کتاب میں حیات بعد الممات کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ بقائے دوام کا علم انسان کو سب سے پہلے مذہب کے ذریعہ سے ہوا لیکن اب اُس کے مشاہدات سائنس کی مدد سے بھی ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ مغربیوں نے ارواح کو مادہ کا لباس پہنا کر زندہ انسانوں سے ملا دیا ہے مصنّف نے اس مضمون کو مذہب سے بالکل الگ رکھا ہے اور صرف اہل مغرب کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا چند اہم ابواب یہ ہیں:۔ بقائے دوام، روح، وجود اثیری، موت اور روح، وقت، حیات بعد الممات اور حکما کے اقوال حجم ۲۱۵ صفحے اور قیمت ایک روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ مینیجر نسیم بک ڈپو، بارود خانہ بازار لاہور۔

طرۂ امیر۔ مولفہ جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے کاکوری ضلع لکھنؤ۔ اس میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کی مختصر سوانح عمری اُن کا منتخب کلام اور اُن کی شاعری پر تبصرہ ہے۔ تبصرہ میں داغ اور امیر کے کلام کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اور گو فوقیت امیر کو دی گئی ہے لیکن یہ بھی مانا ہے کہ "بعض خیالات کے نظم کرنے میں امیر کو کمال حاصل ہے اور بعض جذبات کا اظہار صرف داغ ہی کر سکتے ہیں"۔ کلام کا انتخاب بہت اچھا ہے حجم ۲۸۴ صفحات و قیمت ایک روپیہ ہے۔ کتاب مولف موصوف سے مل سکتی ہے۔

مضامین چکبست۔ پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم کے بیس مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر تنقیدی ہیں اور بڑی قابلیت سے لکھے گئے ہیں۔ چکبست مرحوم اردو زبان کے مسلم ادیب تھے۔ اُن کا انداز تحریر نہایت دلکش تھا اور زبان پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی اُن کے مضامین کا یہ مجموعہ ادب اردو کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہے اور ہمیں ناشرین کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اسے یوں محفوظ کر دیا۔ بعض عنوان یہ ہیں:۔ پنڈت دیا شنکر کول نسیم، پنڈت رتن ناتھ در سرشار، داغ، گلزار نسیم، منشی سید محمد سجاد حسین، اردو شاعری، دادا بھائی نوروجی، تاریخ۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ کتاب کا حجم ۲۴۴ صفحے ہے اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے منگائیے۔

لنگڑا ماموں۔ ۲۰ صفحے کا ایک مختصر افسانہ ہے جسے بچوں کی سہل اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں چوری، جھوٹ، دغا اور فریب کی برائیاں بڑے موثر پیرایہ میں بتائی گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں بچوں کے عادات و اخلاق کو سنوارنے کے لئے اس قسم کے افسانے نہایت مفید ہو سکتے ہیں لکھائی چھپائی، کاغذ، سرورق خوبصورت ہیں۔ کتاب تین آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ کی جاتی ہے۔ پتہ ایم عبد المجید وزیر آبادی، مالک کتب خانہ ناصر العلوم لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۵ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء

تصویر:- فرشتوں کے حلقے

نکات

(۱)

کچھ جوش میں رمیدہ آہو تو نہیں؟
اس عشق میں کیا کوئی غم کا پہلو تو نہیں؟
آنکھوں میں ہے کچھ شرارِ عشرت غلطاں
ڈرتا ہوں کہ اس بھیس میں آنسو تو نہیں

(۲)

دل ہوتا ہے اور آہ کا ہے کا ہے
رو لیتے ہیں پھر بھی آہ کا ہے کا ہے
ہر ذرے سے کہتی ہے یہ تری زبانِ خدا
لیتے ہیں ہم اور گناہ کا ہے کا ہے

(۳)

ہر صورت سے ایک پیام اپنے دل میں
ہر سانس ہے دورِ جام اپنے دل میں
ہستی ہے خلافِ عقل میں بھی جوشؔ
وہ شیخ ہے بنا امام اپنے دل میں

(۴)

طوفان کے عفریت کو اب بس کر دے
اس برقِ جہاں سوز کو پھر بس کر دے
ہنگامہ بپا ہے عالم میں اے معبود!
یہ جبہ اتقیا کو واپس کر دے!!

جوشؔ
ملیح آبادی

فرشتوں کے حلقے

CALCUTTA
ART PG. WORKS
LAHORE

عشق اور حقیقت

افسانہ نویس عام طور پر اپنے ہیرو اور ہیروئن کی باہمی شادی تک کے واقعات قلمبند کر کے قصہ ختم کر دیتے ہیں تاکہ کتاب سے رخصت ہوتے وقت زردہ اور فرنی کی مٹھاس پڑھنے والے کے منہ میں اور باجے کے سہانے سر کانوں میں باقی رہ جائیں۔ شادی کے بعد کے حالات جن میں اس خوش آئند واقعہ کے اصل مزے یا بدمزگیاں ہوتی ہیں بیان نہیں کئے جاتے ہم فطرتِ انسانی کی حقیقت کے طلبا ہیں اس لئے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ وہ فقرہ یا مفہوم جس پر واقعی یا اشارۃً افسانے کو ختم کیا جاتا ہے یعنی "اس کے بعد وہ عیش و خوشی میں زندگی بسر کرتے رہے" کہاں تک سچائی لئے ہوئے ہے۔

ہم یورپ یا امریکہ کے باشندے نہیں ہیں اور نہ ان ممالک کے باشندوں یا اُن کے مقلدین سے مخاطب ہیں اس لئے ہندوستان کے درمیانی طبقہ کے حالات پر غور کریں گے جن میں شادی کے معنی محض گرجا میں چند احباب کے سامنے زیادہ تر منافقانہ قول و قرار کسی ہوٹل کے انتظام سے ایک مختصر سا ڈنر اور اس کے بعد طویل ماہ العسل یا ہنی مون ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے ملک کے حالات اور طرزِ معاشرت کے مطابق زندگی کے بہت سے شعبوں میں کھلبلی اور اُن کے نئے سرے سے ترتیب دیئے جانے کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ خود دولہا دلہن اور اُن کے گھر والوں کی شادی کے بعد کیا حالت ہوتی ہے۔ نزدیکی عزیز بیچارے جن کے ساتھ عام طور پر دولہا بھی شامل ہوتا ہے کئی دنوں اور راتوں کی متواتر تگ و دو سے کوفتہ و بجنتہ ہو کر نستعلیق سے شکستہ کی صورت اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ والدین غریب کچھ حسبِ حیثیت کچھ اپنے زیادہ بالغ البال اعزہ و احباب کی دیکھا دیکھی کچھ ضرورتاً کچھ ناک کٹنے کے خوف سے غیر ضروری مصارف کے بار سے سائیدہ و مالیدہ ہو کر مہینوں برسوں بلکہ بعض اوقات عمر بھر میں سبکدوش ہونے کی فکر لگا رہے ہوتے ہیں۔ دولہا اگر برسرِ کار ہے تو خیر، ورنہ دست نگری کی وجہ سے اپنے والدین کی جا و بے جا فرمانبرداری اور بیوی کے حقوق کی حفاظت کا جوڑ ملانے کی ادھیڑ بن میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور دلہن جس نے پیدا ہونے کے دن سے آج تک صرف ایک ہی ماں باپ کو دیکھا تھا اب یکلخت دوسرے ماں باپ بنانے اور ایک تیسری اجنبی ہستی کو اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے نزدیک تر اور عزیز تر بنا سکنے کی ممکنات پر غور کر رہی ہوتی ہے۔

چند دن اسی طرح گذر جاتے ہیں اور اس نئے گھرانے کا ہر فرد بشر نئے حالات اور تعلقات کا مطالعہ کرتے

ہوئے رفتہ رفتہ اپنی نئی حیثیت کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اس حالت میں کہ ہر فرد دنیا کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر ایک کافی حد تک سمجھدار ہو۔ ورنہ وہی پرانا قصہ چھڑ جاتا ہے۔ یعنی ماں چاہتی ہے کہ بیٹا میرا ہو کر رہے، بہنوں کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی رائے کے مقابلہ میں بھائی کسی اور کی رائے کو مقدم نہ سمجھے، بیوی قدرتی طور پر اُس کو جس کے لئے اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کو چھوڑ کر آئی ہوتی ہے اپنی اور صرف اپنی واحد ملکیت خیال کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دولھا میں سب کو اپنی اپنی جگہ رکھنے اور ایک دوسرے کے حقوق پائمال کرنے سے روکنے کا مادہ قدرتی طور پر موجود نہ ہو تو اس کشمکش میں محبت کے نازک رشتے زخمی ہو کر کچھ عرصہ کے لئے بالکل ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں زن و شو کے باہمی رشتہ کو خورد بینی نگاہ سے مطالعہ کرنا ہے۔ اب اسے ہماری خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی فی الحال ہندوستان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الفت، محبت، عشق، ہجر و فراق، وفا و جفا وغیرہ کے مراحل طے کرنے کا یہی وقت ہے۔ یورپ والے اس سے پہلے ایک نہیں کئی کئی مرتبہ ان دشوار گذار منزلوں کو عبور کر چکے ہوتے ہیں اور شاید یہ منازل اُس آب و ہوا میں دشوار گذار بھی نہیں ہوتیں۔ لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے پہلی مرتبہ اس لق و دق صحرا میں قدم رکھنا ہوتا ہے جس میں خال خال چشمہ ہائے شیریں اور بہشتی مرغزاروں کے دوش بدوش لاتعداد خارِ مغیلاں سے (جن کو ڈاکٹر بوس کی تحقیقات نے راہِ عشق پر چلنے والوں کے پاؤں کے جاندار اور اس لئے عمداً دشمن ثابت کر دیا ہے) سابقہ پڑتا ہے۔

اب اگر معاملہ "یا کسی کا ہو کر رہے، یا کسی کو اپنا کر لے" تک رہا تو غنیمت ہے، اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر ایسے جوڑے ہی سب سے زیادہ خوش رہتے ہیں جن میں بیوی یا خاوند دوسرے کی کامل اطاعت اختیار کر لے ـــــــ پرانے دستور اور احکامِ مذاہب میں تو بیوی کی اطاعت کو لازمی قرار دیا گیا تھا لیکن نئی روشنی کے مذہب نے دونوں کو برابر کا درجہ دے دیا ہے ـــــــ ورنہ اگر بد قسمتی سے زن و شو میں بجلی کا بٹن دبانے سے روشنی ہو جانے کی طرح فوراً یا یونانی حکما کے طرزِ علاج کی طرح بتدریج عشق کا مرض پیدا ہو گیا تو گویا اُن کے خوشی سے زندگی بسر کرنے کی امید اُس روز سے منقطع ہو گئی۔ عشق کے دیوتا کو چوری چوری آنکھ مچولی کھیلنے میں مزا آتا ہے۔ جہاں اُس نے دیکھا کہ دونوں کے ملنے ملانے میں کوئی زیادہ رکاوٹ کا سامنا نہیں ہے تو تاک میں رہا اور کسی روز چپکے سے اپنی کمان سنبھال ترکش کندھے پر ڈال فرار ہو گیا۔ تاکہ کسی اور بھولے بھالے دل کو زخمی کر کے اُس کے تڑپنے اور تلملانے کا مزا دیکھے۔

اصل بات یہ ہے کہ جہاں باہمی محبت اعتدال سے زائد ہوتی ہے وہاں ہر ایک دوسرے کو محاسن کا خزانہ اور معمولی انسان، سے جو خطا اور نسیان، کا پتلا ہے بہت کچھ بالاتر سمجھتا ہے۔ دوری ہجر اور جدائی میں اس خیال کو تقویت

ہوتی رہتی ہے۔ لیکن گھر کی بے تکلف زندگی میں ہر وقت اکٹھا رہنے سے دونوں طرف کے عیوب اور خامیوں کا اظہار ہونے لگتا ہے جس سے پہلا خیالی چمکدار ملمع رفتہ رفتہ دور ہو کر اصلیت نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ اصلیت اُس دماغی تصویر سے جو پہلے دل میں تھی اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ اگر انسان سمجھ دار اور پختہ مغز نہ ہو تو پہلی محبت کا فوراً اسی قدر نفرت سے بدل جانا تعجب کی بات نہیں۔

اب گھر کے نظام کی صرف ایک شکل باقی رہ گئی۔ یعنی جہاں یورپ کی طرح میاں بیوی دونوں خود مختار ہوتے ہیں، گویا برٹش گورنمنٹ اور سوراج مخلوط۔ اپنا اپنا پروگرام اپنی اپنی کمائی اور اپنا اپنا ٹائم ٹیبل۔ بات بات پر جوتی پیزار ـــــ یا شاید مجھے بوٹ گرگابی (اونچی ایڑی والی) کہنا چاہیئے ـــــ ہو جانا معمولی بات۔ ضابطہ کی زندگی۔ سچی محبت اور دلی انس کے جذبات کا خون۔ گو یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب دونوں کی حیثیت برابر ہے تو روزمرہ کے معاملات میں عورت کو ترجیح کیوں دی جاتی ہے۔ یعنی عورت باہر سے آئے تو مرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جگہ تنگ ہو تو عورت کو بٹھایا جاتا ہے مرد کھڑا رہتا ہے۔ باہمی طلاق کے بعد مرد کا قصور ہو تو اُس پر عورت کے گذارے کے لئے رقم مقرر کر دینا لازم آتا ہے وغیرہ۔ یہ کیوں؟ یہ تو اُن پرانے وقتوں کے رواج ہیں جب عورت صنفِ نازک کہلاتی تھی۔ اب وہ برابر کے حقوق رکھتی ہے۔ پہلے صرف مرد عورت کو طلاق دے سکتا تھا۔ اب ٹرکی میں عورت مرد کو طلاق دے سکتی ہے۔ اس لئے جب عورت کا قصور ہو تو اُسے مرد کو ہرجانہ دینا چاہیئے۔ ہندوستان اور اسلامی ممالک میں مہر کی بجائے حقوقِ زوجیت دونوں کی طرف سے ہونا چاہئیں۔ مجلسہائے واضعِ قوانین کو اس امر کی طرف ابھی سے توجہ کی ضرورت ہے ورنہ آئندہ جب ان میں کثرت رائے اناث کی ہو گئی تو قوانین کی تبدیلی ایک مشکل امر ہو جائے گا۔

اس لئے ہم اپنے ملک کے نوجوان طبقہ ذکور و اناث کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں جو کچھ بھی چاہیں کریں لیکن شعرا کی باتوں پر ہرگز اعتبار نہ کریں۔ روزانہ اخبارات کا ضرور مطالعہ کیا کریں اور سیاسی امور میں ہر موقع پر حفظِ امن کی پالیسی مدِ نظر رکھنے کے ممکنات و ذرائع پر غور کریں تاکہ آئندہ آنے والی گھر کی گورنمنٹ کے اسی قسم کے مسائل کو حل کرنے میں زیادہ دقت نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ گھر کی عملداری میں خواہ عورت ہوم گورنمنٹ ہو خواہ مرد فریقِ ثانی کے لئے اول تو اطاعت اور یہ نہ ہو سکے تو ڈومینین سٹیٹس سے بہتر کوئی طرزِ حکومت نہیں۔ مکمل آزادی گھر ہو یا ہندوستان اول تو حاصل کرنا مشکل ہے اور اگر حاصل ہو بھی گئی تو نباہنا ناممکن۔

عطاء الرحمٰن

الٰہی تری جستجو ہے مسرّت

نہ آبِ رواں تو نہ کوہِ گراں تو نہ صحرا نہ وادی نہ بحرِ رواں تو
زمیں بھی نہیں ہے نہ ہے آسماں تو نہ سورج نہ تارا نہ ہے کہکشاں تو

بتا اپنے مسکن کا ہم کو نشاں تو
کہاں تجھ کو ڈھونڈیں ملے گا کہاں تو

نہ تو ابرِ تر ہے نہ برقِ تپاں تو نہ سروِ چمن ہے نہ ہے گلستاں تو
نہ گل ہے نہ غنچہ نہ بادِ وزاں تو کہاں تجھ کو ڈھونڈیں کہاں ہے نہاں تو

سنا ہے تو پنہاں بھی ہے اور عیاں ہے
سنا ہے مکاں بھی ترا لامکاں ہے

قیامت سے پہلے قیامت ہے یارب چھپی ہم سے کیوں تیری صورت ہے یارب
ترے بن ہمیں جو مصیبت ہے یارب نہیں اس کے سہنے کی طاقت ہے یارب

زمانہ یم غم میں بہتا ہے دن بھر
تڑپتا ہے بیتاب رہتا ہے دن بھر

ترے واسطے بے قراری ہے دن بھر زمانے میں اک آہ و زاری ہے دن بھر
گھٹا غم کی ہر دل پہ طاری ہے دن بھر فضول اک تگ و دو سی جاری ہے دن بھر

مسرت کو کتنا چھپایا ہے تو نے
نشاں اس کا کیسا مٹایا ہے تو نے

کسی کو تلاش اس کی علم و ہنر میں کسی کو تلاش اس کی لعل و گہر میں
کوئی ڈھونڈتا ہے اسے مال و زر میں کوئی ڈھونڈتا ہے اسے سیم و بر میں

کوئی ڈھونڈتا ہے اسے جامِ جم میں
کسی کو تلاش اس کی روئے صنم میں

ہمیشہ رہی سب سے پنہاں مسرت — رہی سب سے اکثر گریزاں مسرت
چھپا لے گئی روئے خنداں مسرت — ہوئی آگے آگے خراماں مسرت

سبب اصل یہ ہے کہ تُو ہے مسرت
الٰہی تری آرزو ہے مسرت

طلب ہے تری ایک کانِ مسرت — رضا تیری صد گلستانِ مسرت
تری آرزو ہے نشانِ مسرت — تری جستجو اک جہانِ مسرت

ہمیں تُو اِسی جستجو میں مٹا دے
سبق ہم کو صبر و رضا کا پڑھا دے

ح - ب

تاثرات

مجھے پروا نہیں گر ہے مخالف آسماں اپنا — میں اپنے دل کے اندر دیکھتا ہوں اک جہاں اپنا
فلک پر ماہ و انجم سُن رہے ہیں میری باتوں کو — بنایا تھا ازل سے میں نے جن کو رازداں اپنا
نہیں اس کی ہمیں خواہش کہ ہو گلشن میں آرائش — مٹایا دل ہی جب ہم نے تو پھر کیا گلستاں اپنا
کبھی رنج و الم کی قید سے آزاد جو دل تھا — وہ دل اب ہو چکا ہے مٹ کے بے نام و نشاں اپنا

میں کیونکر صورتِ پروانہ جل کر خاک ہو جاؤں
ابھی ہونا ہے دنیا میں بہت کچھ امتحاں اپنا

ر - ب

تین سائے

میں نے نظر اٹھائی اور تمہاری آنکھیں دیکھیں
تمہارے بالوں کے سائے میں
جیسے ایک مسافر چشمہ کو دیکھتا ہے
جنگل کے سائے میں
اور میں نے کہا میرا افسردہ دل ترستا ہے
آہ! وہاں آرام کرنے کو اور خوب سیراب ہو کر سو جانے کو
اس خوشگوار تنہائی میں۔

میں نے نظر اٹھائی اور تمہارا دل دیکھا۔
تمہاری آنکھوں کے سائے میں
جیسے کوئی جویا سونا دیکھتا ہے۔
چشمے کے سائے میں
اور میں نے کہا "آہ! کونسی حکمت ہے
جو اس فانی خزانے کو فتح کرے
جس کی احتیاج زندگی کو سردا ور بہشت کو ایک کھوکھلا خواب بنا سکتی ہو۔

میں نے نظر اٹھائی اور تمہاری محبت دیکھی
تمہارے دل کے سائے میں
جیسے ایک غوطہ خور موتی کو دیکھتا ہے
سمندر کے سائے میں
اور میں نے اپنے چڑھتے ہوئے سانس میں آہستہ سے کہا؛
"آہ! تم محبت کرسکتی ہو، نیک لڑکی!
کیا تمہاری محبت میرے لئے ہے؟"

(روزیٹی)

محسن

خدمتگار

بہادر سردار فلسطین سے مقدس لڑائی لڑکر واپس آرہا تھا۔ اُس کے نوجوان خدمتگار کا گھوڑا اُس کے پیچھے پیچھے تھا، وہ دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار اس طرح خاموش سر جھکائے ہوئے جا رہے تھے جیسے کوئی زاہد تسبیح میں مشغول ہوکر آس پاس کی تمام چیزوں کو فراموش کرچکا ہو۔

دفعتہً سردار نے اپنے گھوڑے کی رفتار ہلکی کردی۔ یہاں تک کہ اُس کے خدمت گار کا گھوڑا بالکل اُس کے قریب پہنچ گیا۔ سردار نے گردن پھیر کر اُس کو مخاطب کیا اور کہا "اے نوجوان! تیری شرافت اور شجاعت میرے دل پر گہرا نقش کرچکی ہے۔ اس عرصہ میں کئی بار تُو نے میرے لئے اپنی پیشانی کو خون آلود کیا۔ تُو اپنے سنہرے بال خاک و خون میں آلودہ کرنے سے کبھی نہیں گھبرایا۔ تین بار تو نے مجھے قاتلانہ حملوں سے بچایا، ایک دفعہ خیمے میں جب دشمن کی ناپاک تیغ میری زندگی کو ختم کرنے کے لئے جھک چکی تھی اور دو دفعہ میدانِ جنگ میں جب میری ڈھال ٹوٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ہو رہی تھی"۔

خدمتگار نے اپنا جھکا ہُوا سر اوپر کو اٹھایا اور کہا "بہادر آقا! ہم نے جب سے اپنے گھروں کو چھوڑا ہے اور جب سے میدانِ جنگ میں آئے ہیں یہی کشت و خون کا ذکر ہماری زبان پر رہا ہے۔ لیکن اس سبزہ زار کی پُر سکون فضا میں جہاں ہمارے جذبات بھی سکون پذیر ہوچکے ہیں یہ ذکر بالکل ہی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا لشکر ابھی ہم سے بہت دُور ہے۔ اور جنگل کی یہ خاموشی مجھے بالکل نئی معلوم ہو رہی ہے۔ شبنم گرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں محسوس کرتا ہوں کہ دُور بہت دُور آسمان کے نازک اور شفاف پردوں کو چیر کر نور کے کسی جھمجھاتے ہوئے چشمہ سے میری روح پر ایک ابدی ایک ہمیشہ رہنے والی رحمت نازل ہو رہی ہے۔ آسمان کے یہ سنہرے اور گلابی رنگ اور سبزہ زار کا یہ حسن میرے خیال کو انگلستان میں لے جاتا ہے۔ وہاں کے درخت اور مرغزار مجھے یاد آ رہے ہیں، اور فلسطین کی وہ چڑیاں جو درختوں پر بیٹھی ہوئی ہماری خون آلود تلواروں کی جھنکار سنا کرتی تھیں۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا عرش میری بات سننے کے لئے جھک رہا ہے"۔

خدمتگار نہایت دلجمعی اور اطمینان سے بول رہا تھا اُس کی گفتگو ایک تہذیب یافتہ اور ذکی الحس انسان کے مانند تھی۔ شاید وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت کے وسیع دل میں اس وقت خود اُس کے دل کو بھی کتنی آزادی حاصل ہے۔

سردار نے نگاہ اوپر کو اُٹھائی اور اُس کے چہرے کی طرف [illegible] کر مسکرایا اور کہا "اچھے نوجوان! معاف کرنا اس وقت

میری گفتگو کا مقصد یہ نہ تھا کہ قتل وخون کی باتیں کر کے تمہارے شاعرانہ جذبات کو پامال کروں۔ میں جنگ کی باتیں کر کے تمہارے دل کی لطیف کیفیات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتا۔ لیکن یہ تم بھی جانتے ہو کہ ایک نائیٹ خواہ کہیں بھی ہو اُس کے حالات کیسے ہوں، خزاں ہو یا موسم بہار، جنگل کی گھاس خشک ہو کر اُس کے گھوڑے کے سموں تلے روندی جا چکی ہو یا سرسبز و شاداب جھاڑیاں اور جنگلی پھول پتے اُس کا راستہ روک کے کھڑے ہوں۔ ایک نسوانی چہرے کا ذکر ضرور کر سکتا ہے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ جب میری بیوی تمہارا خیر مقدم کرے گی تو اُس کا چہرہ ایک ایسی مسرت سے چمک رہا ہوگا جو سراپا تمہارے احسان کے شکر و سپاس سے معمور ہوگی۔ جس طرح ایک جنگجو کی بیوی کا چہرہ اپنے شوہر کے وفادار اور بہادر خادم کو دیکھ کر جگمگا اُٹھتا ہے اُسی طرح اُسی مسرت کے نور سے اُس کا چہرہ بھی منور ہوگا۔ اور اگر وہ تمہیں دیکھ کر مسرور نہ ہوئی تو وہ میری بیوی ہی نہ رہے گی۔

"لیکن مجھے خطرہ ہے کہ شاید تم اُس کے گھر کو پسند نہ کر سکو گے۔ خیمے میں بھی اور میدانِ جنگ میں بھی جہاں تک میں نے تم کو دیکھا تم بہت ہی کم گفتگو کرتے رہے۔ تمہاری خاموش اور رنگین زبان شاید عورت کی متجسسانہ اور باتونی فطرت کو اتنا خوش نہ کر سکے جتنا تمہارے ہاتھ ایک سنگین بھالے کو اٹھا کر ایک جنگجو کو خوش کر سکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ ممنونیت کے انداز میں خادم نے اپنا سر جھکا لیا اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پنہاں مسکراہٹ جھلک اُٹھی لیکن اس مسکراہٹ نے دفعتہً اُس کے گالوں کو سرخ کر دیا یہ سرخی ایک گھر میں رہنے والی دوشیزہ کے چہرے کی سرخی سے بھی فزوں تر تھی۔ پھر اُس نے دھیمی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا "مہربان آقا! آپ کی بیگم کا کاشانہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوگی اور وہ مجھے بہت ہی پسند آئے گا۔"

دریا کے اُس پار تقریباً ایک میل کے فاصلے پر سینٹ میری کے گرجے سے ماتمی راگ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ لیڈی ایبس مر چکی تھی اور گرجے کی راہبہ عورتیں مل کر ایک افسردہ اور ماتم خیز آواز میں گا رہی تھیں۔

"اے خدا اے قادرِ مطلق! مرنے والوں پر تیری رحمت ہو"

یہ آواز دریا کی تیز رَو موجوں پر تیرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی اور سبزہ زار کی خاموش فضا میں ایک مبہم سی افسردگی کو چھوڑ کر گم ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دریا کے اُس پار کی ہوا اس آواز کے ساتھ ہی سینٹ میری کے گرجے کی قربان گاہ کی پچاس ماتمی شمعوں کو اور کمسن سال راہبہ کے تابوت کو اور خود اُن نوجوان راہبہ عورتوں کو بھی چشم تصور کے سامنے لا رہی ہے جنہیں آج سے ایک ہفتہ پہلے وہ برکت دیا کرتی تھی۔ گانے والیوں کی آواز میں ایک خاص اثر تھا لفظا کے الم انگیز تاثرات میں شاید وہ لاش کو بھلا چکی تھیں اور اُن کے خیالات موت و زیست کے دشوار گزار ساحل سے ٹکرا رہے تھے۔

متواتر اور آہستہ آہستہ اُن کے گانے کی پرمتین اور افسردہ آواز اُٹھتی تھی:

"اے خدا، اے قادرِ مطلق! مرنے والوں پر تیری رحمت ہو"

اور یہ تمام الم انگیز نقشہ جس کو صرف آواز آنکھوں کے سامنے لا رہی تھی ہوا پر تیرتا ہوا آتا تھا کبھی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھتا اور کبھی پھر پیچھے ہٹ جاتا۔

دریا کے کنارے، جھکے ہوئے درختوں کی چوٹیوں پر سورج کی سرخ اور تیز کرنیں اپنے فطری سوز کا آخری پرتو ڈال رہی تھیں جب ایک ڈوبتی ہوئی آواز پھر سطحِ آب سے اوپر اُبھری:

"مرنے والوں پر تیری رحمت ہو"

ابھی تک نوجوان خدمتگار کے چہرے پر ہلکی سی سرخی موجود تھی۔ سردار نے یہ سب کچھ سنا لیکن خدمتگار کچھ نہ سُن سکا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنے آقا سے کہا "جناب گو آپ ایک معزز سردار ہیں اور میں ایک خادم لیکن اگر میں نے کبھی آپ کی کوئی خدمت کی ہے تو میں اُس کے معاوضے میں آپ سے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، میرے لئے یہ آپ کی بیش بہا عنایت ہوگی"۔ سردار نے اُسے سوال کرنے کی اجازت دی۔

خدمتگار نے کہا "کیا آپ کی بیگم کا چہرہ حسین ہے؟ کیا اُس کا چہرہ پیارا ہے؟ یا معمولی عورتوں کی طرح اُس میں کوئی بھی حسن نہیں"۔

دفعتہً سردار کے چہرے پر تاریکی چھاگئی ایک لمحہ تک وہ بالکل خاموش رہا اور اس ایک لمحہ میں خدمتگار کے چہرے پر عجیب اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ لیکن پھر سردار نے اُسے مخاطب کر کے کہا "تم نے بیٹوں کی طرح میری خدمت کی ہے اگر تمہاری بجائے کوئی اور شخص مجھ سے یہ سوال کرتا تو میں کبھی اس کا جواب نہ دیتا۔ لیکن اس وقت جو کچھ تم پوچھتے ہو اُس کے بتانے کے لئے چاہئے تھا کہ میں اُس عورت سے محبت کر چکا ہوتا یا کم از کم اُسے پہلے سے جانتا ہی ہوتا۔ مگر اب یہ ایک بہادر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بخشش کا وعدہ کر چکا ہو اور پھر اُسے پورا نہ کرے جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم سے کہنے میں دریغ نہ کروں گا۔

سنو! میں نے دل اور جان کا وہ گراں بہا ہدیہ نہایت خاموشی کے ساتھ ادا کر دیا جس ہاتھ نے مجھ سے یہ ہدیہ طلب کیا تھا اُس نے میرے باپ کی عزت کو بچایا تھا اور میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس نے یہ ہدیہ بجا طور پر حاصل کیا۔ ارل والٹر میرے مرحوم باپ کا دوست ایک ضعیف العمر اور شریف الطبع شخص تھا۔ میں جس زمانے میں جنگ وجدل کی تیاریوں میں مصروف تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے ایک گستاخ نے میرے مرے ہوئے باپ پر

کوئی بہتان باندھا اور اُس کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کئے۔ میرا باپ سنگِ مزار کے نیچے خاک ہوچکا تھا البتہ اُس کی قبر پر سنگ مرمر کا بُت ابھی تک دعا مانگ رہا تھا۔

اُس گستاخ نے سراسر جھوٹ بولا اور بہتان باندھا۔ اس لئے کہ میرے باپ کی تلوار اب پتھر کی ہوچکی تھی اور اُس کے قوی ہاتھ کی بجائے سرمر کے ایک بے حس مجسمہ کے ہاتھ میں تھی۔

ارل والٹر میرے باپ کی حمایت کے لیئے اٹھا، والٹر کی تلوار ابھی خود اُس کے بہادر ہاتھ میں تھی پتھر کی نہیں بلکہ فولاد کی چمکتی ہوئی تلوار جس نے گستاخ دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن افسوس بہادر ارل زخم کھا کھا کر بالکل ناتوان ہوچکا تھا۔ دفعتہً اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور آن کی آن میں اُس کا بے جان جسم دشمن کی لاش پر گرا ہوا تھا۔

آہ! کاش یہ لڑائی میرے ہی ہاتھوں لڑی جاتی، کاش میری ہی تلوار دشمن کے خون سے رنگین ہوتی اور وہ تمام زخم میرا ہی جسم برداشت کرتا جن سے ہمارا دوست جان بر نہ ہوسکا۔ ایک دوست کی ہلاکت اور جبری شادی کی انگشتری پہننے سے یہ کہیں بہتر ہوتا کہ میری لاش دشمن کی لاش کے ساتھ خاک و خون میں تڑپتی ہوتی۔

ارل والٹر کے گھر میں ماتم کا شور برپا تھا لیکن اُس کی نیک دل بیوی کی آنکھ سے کوئی آنسو نہ نکلا۔ اُس کی زبان بالکل خاموش تھی مگر اُس کی یہ حسرتناک خاموشی نالہ و بکا سے کہیں بڑھ کر جگر دوز تھی۔

اُس کے شوہر کا جنازہ تیار ہوچکا تھا آخر وہ بولی "جاؤ جس قدر جلد تم جا سکتے ہو اور اُس کے بیٹے کو، میرے شوہر کے دوست کے بیٹے کو، جہاں کہیں بھی وہ ہو بلا کر لے آؤ۔ میرے شوہر کی لاش میرا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن میری بچی کا خیال آہ! وہ مجھے جانے سے روکتا ہے"!

جب مَیں اُس کے سامنے حاضر ہوا اُس نے کہا تمہارے پیارے باپ کی عزت کو بچانے کے لئے جب تم یہاں نہیں تھے میرے شوہر نے جان دے دی۔ اب میں خود بھی مر رہی ہوں اُس کی روح میری روح کو اُن پُراسرار زنجیروں سے اپنی طرف کھینچتی ہے جن کا ہر حلقہ محبت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا لیکن مرنے سے پہلے میں تم سے ایک اقرار لیتی ہوں تمہارے باپ کے ننگ و نام کی حفاظت کے لئے ایک لڑکی یتیم ہوگئی میرے بعد وہ بالکل بے کس و تنہا ہوگی تم اُس سے شادی کر لو اور جب وہ تمہاری بیوی ہو جائے گی تو میں اطمینان سے جان دے سکوں گی۔

میں نے کہا میرا گھوڑا میرے انتظار میں قلعے کے نیچے ہنہنا رہا ہے اور میری کشتی دریا کے کنارے پانی میں ہل رہی ہے میں مقدس لڑائی لڑنے کی قسم کھا چکا ہوں اور اب اس عہد کو توڑ نہیں سکتا۔ مجھے واپس جانے کی جلدی ہے۔

بہت جلد انگشتری لائیے اور پادری بھی بلوایا جائے اور لڑکی [illegible] ـــــ جب میں فلسطین کے میدانِ جنگ میں لڑ رہا ہوں گا وہ میرے محل اور قلعے کا انتظام کرے گی۔

لڑکی ایک ایسے کمرے میں تھی جس کی دھندلی سی روشنی کو تاریکی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اے نوجوان! تُو جانتا ہے کہ میں وہاں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا اور اُس وقت میرے تمام خیالات پر صرف جنگ کا شوق محیط تھا۔ میرا گھوڑا کئی بار ہنہنایا اور پادری اب نکاح پڑھ کر جلد جلد دعا مانگ رہا تھا۔ اُس کی ماں مسکرائی اور یہ دائمی مسکراہٹ تھی جیسے زندگی کی کوئی تلخی اب اُس کے لبوں سے جدا نہ کرسکتی تھی۔ دلہن نے آہستہ آہستہ اپنی مری ہوئی ماں کے پلنگ پر جُھک کر اُس کا منہ چوما۔"

سردار نے مڑ کر اپنے خدمتگار کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور گھبراہٹ کے لہجے میں کہا "میرے خدمتگار میرے اچھے خدمتگار! انہیں کیا تکلیف پہنچی کہ تمہاری آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔

خدمتگار نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آہ میرے آقا! بالکل اسی طرح میری بہن کی سرگذشت بھی ہے لیکن اُس نے اپنا عروسی جوڑا اتار دیا اور خدمتگار کے بھیس میں اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئی۔" خدمتگار رونے لگا لیکن سردار بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا "تمہاری بہن کے لئے شاید یہ درست ہو لیکن یہ بات ایک نائیٹ کی بیوی کے شایانِ شان نہیں۔ کم ازکم میں کبھی گوارا نہ کرسکتا کہ میری بیوی ایک ذرا سی بات پر بزدلی کرکے اپنی نسوانیت کو یوں چھوڑ دیتی۔ جو عورت اپنی نسوانیت کو چھوڑ دے خواہ وہ خوبصورت ہو خواہ بدصورت میں اُسے اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتا۔"

خدمتگار ایک خشک ہنسی ہنسا اور اُس نے کہا "شاید آپ کی دانست میں نسوانیت یہی ہے کہ زرتار لباس اور جگمگاتے زیور پہن لیے جائیں۔ لیکن نسوانیت محض رنگین لباس اور سنہرے زیور پہن لینا نہیں۔ نسوانیت سچی محبت، وفا، اور جاں سپاری کا نام ہے۔ نسوانیت یہ ہے کہ انسان دوسرے کے لئے اپنی جان سے گذر جائے۔"

پھر اُس کے آنسو اُس کی آنکھوں میں جذب ہوگئے اور وہ کرخت ہنسی اُس کے ہونٹوں سے غائب ہوگئی۔ چند لمحوں تک وہ خاموش رہا اور پھر بالکل متین آواز میں یوں کہنے لگا "جب خیمے میں سب سوئے ہوتے وہ عورتوں ہی کی طرح راتوں کو جاگ کر اپنے شوہر کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی اور اُس وقت عورتوں ہی کی طرح اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے جو اُس کی نسوانیت کو اور زیادہ پاکیزہ کردیتے تھے۔ میدانِ جنگ میں جب وہ اپنے شوہر کو دشمن کی فوج میں گھرا ہُوا دیکھتی تو عورتوں ہی کی طرح فکر و تشویش کے مارے اُس کا رنگ اپنے خود کے نیچے زرد پڑ جاتا تھا۔"

سردار نے کہا "تم نے بہت اچھا افسانہ سنایا اگر اس قصہ کو ایک افسانہ سمجھ کر سنا جائے تو یہ نہایت ہی دلچسپ

افسانہ ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں خود اپنی بیوی کے [illegible]ئی شخص اس قسم کا خیال بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ تمہاری بہن شاید اسی کو بہترین وفاداری سمجھتی ہو۔ لیکن میں اپنی بیوی کی وفاداری، بہادری اور خدمت گذاری سب اسی میں سمجھتا ہوں کہ وہ گھر میں رہ کر میرے لئے دعا مانگے۔ اور میری محبت میں اُس کا چہرہ زرد ہو نہ کہ میدانِ جنگ میں مجھے دشمن کے ساتھ نبرد آزما دیکھ کر۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کے نسوانی آنسو سپاہیانہ خودی کی بجائے نسوانی نقاب ہی میں بہیں۔ اور اُس کا نسوانی غرور کبھی اُسے گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دے۔"

خدمتگار نے کہا "اچھا فرض کیجئے آپ کی بیوی آپ کے مزاج سے ناواقف ہوتی اور اس طرح بھیس بدل کر آپ کے پیچھے چلی جاتی اور جب اُسے معلوم ہوتا کہ آپ اُس کی اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تو وہ آپ کے پاؤں پر گر جاتی اور اپنے قصور کی معافی چاہتی۔ جس طرح ایک مجرم جاں بخشی کے لئے التجا کرتا ہے وہ بھی اپنا قصور معاف کرانے کے لئے آپ سے التجا کرتی تو کیا آپ اُسے معاف کر دیتے؟"

سردار نے کہا "ہاں میں اُسے ضرور معاف کر دیتا لیکن پھر کبھی اُس سے اپنی بیوی کی حیثیت سے محبت نہ کرسکتا۔ میں اُس سے محبت کرتا لیکن ویسی ہی محبت جیسی ایک آقا اپنے وفادار غلام سے کرتا ہے۔" پھر سردار نے نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا جہاں آسمان پر ایک سفید اور چمکیلا بادل تیر رہا تھا۔ اُس نے کہا "دیکھو وہ سفید اور تنہا بادل آسمان پر کس قدر خوشنما اور پیارا معلوم ہوتا ہے اسی طرح بلند، اسی طرح پاکیزہ، اور اسی طرح الگ تھلگ عورت کی عزت ہونی چاہیئے۔"

خدمتگار نے نظر اُٹھا کر دیکھا بادل واقعی سفید اور چمکیلا تھا لیکن اُس کی نظر کے سامنے غم کا ایک تاریک بادل حائل ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں اور پھر پہاڑی کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس نے دل میں کہا یہ کیا ہے؟ لیکن جلد ہی وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ عرب سوار بڑھے چلے آرہے تھے۔ اُس کے آقا نے کچھ نہ دیکھا اور نہ وہ کچھ سمجھ سکا۔

خدمتگار نے نہایت مطمئن اور ہلکی آواز میں کہا "میرے آقا! اپنے گھوڑے کو ذرا زیادہ تیزی سے چلایئے اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے آپ کو منزل پر پہنچ جانا چاہیئے ذرا تیز تیز چلیئے۔" سردار نے کہا "ہاں اور تم بھی ذرا تیزی سے چلو اب تاریکی بڑھ رہی ہے۔"

خدمتگار نے کہا "آپ چلیئے میں ذرا اپنے خود کو ٹھیک کر کے باندھ لوں، یہ ڈھیلا ہوگیا ہے اور بار بار گھوڑے کی پیٹھ کو لگتا ہے۔ دوسرے میں اس جگہ دعا مانگنا چاہتا ہوں ایک ایسے شخص کے لئے جسے میری دعا کی بے انتہا ضرورت ہے اور میں اُس سے وعدہ کر چکا ہوں۔ آپ اپنے گھوڑے کو تیز لے جایئے، رات ہونے سے پہلے میں بھی آپ سے آملوں گا۔

جس طرح وہ روحیں جنہیں مفارقت کی تاب نہ ہو محبت کی زنجیروں میں جکڑی اپنے محبوب کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں۔

سردار خدمتگار کی اس دل لگی پر ہنسا اور اپنا گھوڑا وادی میں تیز دوڑانا شروع کیا۔ اگر وہ اپنے خدمتگار کے چہرے کو دیکھتا تو اُسے وہاں کوئی مسکراہٹ نظر نہ آتی اور وہ اُسے یوں تنہا چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ اگر وہ مڑ کر ایک نظر بھی اس محزوں چہرے پر ڈال دیتا تو وہ ضرور واپس لوٹ آتا۔

نوجوان کے چہرے پر شدید غم والم طاری ہو گیا تھا اُس کی ایک ایک حرکت سے عجیب وحشت برستی تھی جب وہ اپنا خود وغیرہ زمین پر ڈال رہا تھا اور اپنے گھوڑے کو میدان میں کھلا چھوڑ رہا تھا۔

سردار کا گھوڑا آگے بڑھ گیا اور خدمتگار تنہا زمین پر بیٹھا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس نے اپنے ہاتھوں کو زور سے بھینچا شاید وہ اپنی سوچ کی تکلیف کو اسی طرح کم کرنا چاہتا تھا بے اختیار اُس کی زبان سے یہ جملے نکلنے لگے۔

"آہ میں نے اپنی نسوانیت کو تمہاری زوجیت پر قربان کر دیا۔ تمہاری یہ آخری جھلک مجھے نظر آ رہی ہے، اب میری آنکھیں اس زندگی میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔ جاؤ خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو اور تمہیں ایک ایسی ہی بیوی ملے جیسی تم چاہتے ہو جس میں نسوانی غرور بہت زیادہ ہو۔ خواہ وفا اُس سے آدھی ہو جسے تم پیچھے چھوڑ رہے ہو۔ اور خدا مجھے اپنی طرف اٹھا لے اگرچہ میں کبھی اُس سے اتنی محبت نہیں کر سکی جتنی میں نے ایک انسان سے کی ہے"!

زمیں پر ہر طرف اُسے مایوسی ہی مایوسی نظر آئی اور عجیب بے بسی کے عالم میں اُس کی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھ گئی۔ ابھی تک وہ بادل جس کا ذکر اُس کے شوہر نے کیا تھا۔ آسمان پر ویسے ہی تیر رہا تھا ویسا ہی تنہا، ویسا ہی الگ تھلگ ویسا ہی پاکیزہ۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اُس کی لمبی اور سیاہ پلکوں سے دو شفاف آنسو نکل کر اُس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اب قریب سے سنائی دے رہی تھی عرب نزدیک آ گئے تھے اور یہ آواز سن کر بے وفا خدمتگار جو اپنے آقا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکا تھا یا وفادار عورت جو اپنے شوہر پر اب اپنی زندگی کو بھی قربان کر رہی تھی بالکل خاموش ہو گئی وہ اُن کے درمیان بالکل ساکت وصامت کھڑی تھی۔

ایک دل جس کو محبوب نے توڑ دیا ہو خوفناک سے خوفناک دشمن کے مقابلے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔

ایک عرب نے بڑھ کر کہا "او نصرانی غلام! تیرے پاس بھیڑیں ہیں یا شراب پلا کر کھڑا ہے"!

اُس نے نہایت دلجمعی سے سکون آمیز آواز میں جواب دیا "میں اپنے آقائے نامدار کے لئے لڑنے اور جنگ کرنے

کے لئے تیار ہوں نہ کہ بیہودہ دعوتیں دینے کے لئے۔ اگر میرا بہادر آقا سر ڈرا ہیوبرٹ یہاں ہوتا میرا پیارا آقا! تو تمہیں کھڑے ہو کر سوال کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکتی۔"

عرب نے کہا "مغرور غلام تیرا آقا کہاں ہے جلد بتا تاکہ ہم اُس کی مشکیں کس لیں یا ہمارے برچھے ابھی تیری آنکھوں کے سامنے اُسے کیفرِ کردار کو پہنچا دیں۔"

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "ادھر اُدھر کہیں مرغزار میں ڈھونڈ لو اگر تم تلاش کر سکتے ہو تو کر لو۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ تمہارے کافر سردار اُس کے پیچھے بھاگنے سے اُس کے سامنے زیادہ تیزی سے بھاگتے ہیں۔"

عرب نے کہا "جھوٹے بے ایمان غلام چپ رہ تجھے جان سے مار ڈالیں گے۔"

اُس نے کہا "میری تلوار جو نیچے پڑی ہے اگر میرے ہاتھ میں ہوتی تو مجھ سے بھی اچھی طرح تمہاری بات کا جواب دیتی۔"

عرب ٹوٹ پڑے وہ اُس کے بال کھینچتے تھے اور اُسے مارتے تھے۔

فرشتوں کی سی بے لوث اور پاکیزہ محبت کرنے والی، خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔ ایک نیزہ چمکا اور ہلکی سی جھنکار سنائی دی۔ اُس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک نور جس سے مرتے وقت معصوم چہرے جگمگا اُٹھتے ہیں اُس کے چہرے پر نظر آیا ــــــ اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

سینٹ میری کے گرجے سے اب بھی ماتمی راگ کی آواز سنائی دے رہی تھی:۔

"تیرے لئے ہمارے دل اندوہ گین ہیں اور ہم تیرا ماتم کرتے ہیں، آہ ہم تیرا ماتم کرتے ہیں۔"

یہ متین اور افسردہ آواز دریا کی موجوں پر تیرتی ہوئی جنگل اور مرغزار کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی اور اس آواز کے ساتھ ہی سینٹ میری کے گرجے کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ رہا تھا۔ پچاس روشن ماتمی شمعیں اور خود بوڑھی راہبہ سیاہ کفن پہنے اپنے تابوت کے اندر پڑی تھی اور غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی راہبہ عورتیں گا رہی تھیں۔

یہ ماتمی راگ اُس عورت کے لئے گایا جا رہا تھا جس کی لاش کفن پہنے تابوت کے اندر پڑی تھی لیکن یہی راگ ہوا ایک بے گور و کفن خدمتگار یا وفا شعار عورت کی لاش تک پہنچا رہی تھی جس کی پیشانی پر شبنم کے قطرے گر رہے تھے۔

ہر طرف عجیب حسرت چھا رہی تھی اور دور و دراز کے فاصلے طے کرتی ہوئی ایک دھیمی پُرالم آواز آتی تھی۔

"تیرے لئے ہمارے دل اندوہ گین ہیں اور ہم تیرا ماتم کرتے ہیں، آہ ہم تیرا ماتم کرتے ہیں۔"

ترجمہ ز۔ب

کسی کے خیال میں

عرصۂ عالم پہ خاموشی سی چھا جاتی ہے جب — اور سو جاتا ہے مغرب کی لحد میں آفتاب
منہ چھپا لیتا ہے تاریکی کے پردے میں جہاں — اور پہن لیتی ہے دنیا ظلمتِ غم کی نقاب

اُس سکوتِ شام اُس خاموشیٔ پُر کیف میں — کرتی ہے آ آ کے تیری یاد دل کو بے قرار
تھام لیتا ہوں جگر کو کھینچ کر اک آہِ سرد — یاد پر کرتا ہوں تیری اشک کے گوہر نثار

آہ وہ میری محبّت اور وہ تیری سادگی — عشق اپنے حسن اپنے حال میں مستانہ تھا
عشق نوکِ خارِ بے تابی سے تھا نا آشنا — حسنِ بے پروا بھی مشقِ ناز سے بیگانہ تھا

یہ سرِ پُر شور تھا بیگانۂ جوشِ جنوں — اور دلِ وحشی کو شوقِ دشت پیمائی نہ تھا
تو بھی نا واقف تھا احساسِ نگاہِ شوق سے — مائلِ جور و جفا محوِ خود آرائی نہ تھا

دل میں پھر ہوتا ہے دریائے محبت موجزن — اور سرور و کیف کی موجوں میں کھو جاتا ہوں میں
چپکے چپکے یاد پھر کرتا ہوں تجھ کو بار بار
لب پہ تیرا نام ہوتا ہے کہ سو جاتا ہوں میں

اثر صہبائی

سرگوشیاں

ہماری کوتاہیوں پر دنیا ہمیں کیا شرمائے گی کہ غلطیوں کے اعتراف پر ہی ہماری محبت کا انحصار ہے!
خدا نہ کرے کہ ہم لغزشوں کی پردہ پوشی کئے جائیں، خدا نہ کرے کہ یوں ہماری محبت کی بیخ کنی ہوتی جائے،
خدا نہ کرے کہ ہم کہیں کچھ اور اور کریں کچھ اور!

اگر دنیا مجھے تجھ سے ملنے نہ دے گی تو میں اپنے جی کو اداسی سے بھرلوں گا!
میری نگاہیں آسماں کی طرف اٹھ جائیں گی اگر دنیا مجھے تجھ سے ملنے نہ دے گی!
اگر دنیا مجھے تجھ سے ملنے نہ دے گی تو میں دنیا میں ہر ایک سے ملنے کے لئے چل نکلوں گا!

اے خدا! ہمیں دکھ دے تاکہ ہم سکھ پائیں!
اے خدا! ہمیں رلا کہ ہم مسکرا سکیں!
اے خدا! ہمیں اک دوسرے سے جدا کردے تاکہ آخر کار ہم مل جائیں!

پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں جسم کانپ رہا ہے آہیں اٹھتی ہیں اور آنسو گرتے ہیں ——— محبت قوت چاہتی ہے اور میری کمزوریوں کی انتہا نہیں!
زندگی! اتو جو محبت کے لطف اٹھانا چاہتی ہے موت کے دکھ میں سے ہو گزر کہ تجھے محبت کی صورت نظر آجائے!

کروڑوں ساعتوں میں وہ ایک ساعت کس قدر مرغوب و محبوب ہے جب بچھڑے ہوئے دل اک دوسرے سے مل جائیں!
جدائی اپنے کروڑوں آنسوؤں سے وہ لعل تیار کرتی ہے جس کا نام دید دوست ہے!

جلیس

مرگِ حسرت

ستمبر کی ایک سرد اور تاریک رات کا ذکر ہے کہ ایک کنبہ انگیٹھی کے گرد بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف تھا۔ کمرہ خوب روشن اور گرم تھا۔ انگیٹھی میں وہ لکڑیاں ڈالی جارہی تھیں جو انہوں نے سہ پہر کے وقت ندی کے کنارے پر سے چنی تھیں۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ ماں اور باپ کے چہروں سے اطمینان و شادمانی کے آثار ہویدا تھے۔ بڑی لڑکی جس کی عمر سترہ برس کے قریب ہوگی مسرت کی ایک حقیقی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ بچوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ ان کی بوڑھی دادی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کو مسرور دیکھ کر خوش ہورہی تھی۔ غرض کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ اس قدر خوش اور مطمئن تھے۔ جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہے۔ وہ ایک ویران اور تنہا مقام پر رہتے تھے جو شہروں کی آبادی سے کوسوں دُور تھا۔ موسمِ سرما میں دن بھر پہاڑوں پر سے ہوا کے سرد جھونکے آآکر اُن کی جھونپڑی کو یخ کی طرح سرد بنا جاتے۔ ان کا مکان بہت خطرناک مقام پر تھا۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑے پہاڑ کے نشیب میں واقع تھا جس پر سے ہر وقت پتھر لڑھک لڑھک کر نیچے گرتے رہتے اور اکثر آدھی رات کے وقت بھی کوئی بڑا سا پتھر گرتا اور ان کی پُرسکون نیند میں خلل انداز ہوکر انہیں چونکا دیا کرتا۔

اثنائے گفتگو میں بڑی لڑکی نے کوئی مذاق کی بات کی جس پر سب ہنس پڑے۔ اس وقت پہاڑ پر سے ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور اُن کی جھونپڑی کے دروازے کو غم انگیز سرسراہٹ سے کھٹکھٹاتا ہوا گذر گیا۔

ایک لمحے کے لئے اُن سب کے دلوں پر افسردگی طاری ہوگئی۔ لیکن جلد ہی وہ پھر خوش ہوگئے۔ کیونکہ ایک شخص نے دروازہ کھولا جس کے قدموں کی چاپ وہ ہوا کی سسکیاں بھرتی ہوئی آواز کی وجہ سے نہ سن سکے تھے۔

اکثر تاجر اور مسافر وغیرہ جو دُور دراز کا سفر کرتے ہوئے آتے بعض اوقات ان کی جھونپڑی میں رات بسر کیا کرتے تھے۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو جانے والی گاڑیاں جب اُن کے مکان کے سامنے سے گذرتیں تو اکثر ان کے دروازے پر کسی ضرورت کے لئے رکا کرتی تھیں۔ وہ تنہا سفر کرنے والے مسافر جن کی رفیق صرف لکڑی کی ایک چھڑی ہوتی تھی اپنی تنہائی کی کلفت کو کم کرنے کے لئے چند گھنٹے اس خوش و خرم کنبے کے پاس گذار جاتے تھے۔ یہ لوگ بہت مہمان نواز تھے۔ اگرچہ وہ مسافروں سے اُن کے کھانے وغیرہ کا معاوضہ لے لیا کرتے مگر گھر کا ہر فرد اس تھوڑے سے معاوضہ کے بدلے میں نہایت خلوص اور تن دہی سے مہمان کی تواضع میں مصروف رہتا۔ اور اسے گھر سے بھی زیادہ آرام

پہنچایا جاتا۔

اس اجنبی کو دیکھ کر وہ سب اس طرح اُٹھ بیٹھے گویا پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ نوجوان کے چہرے پر سردی اور رات میں تنہا سفر کرنے کی وجہ سے افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ مگر اپنا پُرخلوص خیر مقدم دیکھ کر جلد ہی اس کے چہرے سے پژمردگی کے آثار دور ہو گئے۔ اسے یوں محسوس ہوُا جیسے اس کا دل خود بخود ان لوگوں کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔

لڑکی کی ایک خلوص آمیز نگاہ اور مسکراہٹ نے اُس کے لئے اجنبی کے دل میں ایک معصوم سی بے تکلفی پیدا کر دی۔ مسافر نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ آگ مجھے اس وقت بہت خوشگوار معلوم ہو رہی ہے۔ بالخصوص جب ایسے اچھے لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ صاحبِ خانہ نے ایک کرسی اس کے سامنے پیش کی۔ وہ بیٹھ گیا اور بولا میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں، باہر کی سرد ہوا میرے جسم میں خون کو جمائے دیتی تھی، اس لئے میں رات بسر کرنے کے لئے یہاں آگیا ہوں میں ساکوکو کی وادی کی طرف سے آرہا ہوں اور صبح اٹھ کر برلنگٹن کو چلا جاؤں گا۔"

اتنے میں باہر سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی سب نے اپنے سانس روک لئے کیونکہ وہ حقیقت سے آگاہ تھے۔ اجنبی نے بھی اُن کی تقلید کی۔ صاحبِ خانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "کہن سال پہاڑ نے ہم پر پتھر پھینکا ہے تاکہ ہم اسے بھول نہ جائیں، وہ کبھی کبھی یوں ہی سر ہلا کر ہمیں ڈرا دیا کرتا ہے۔ مگر خیر ہم نے بھی اس سے بچنے کے لئے ایک ایسا مقام تجویز کر رکھا ہے جہاں خطرہ کے وقت جا کر محفوظ ہو جاتیں۔"

اب اجنبی نے اپنا کھانا اور بھنا ہوا گوشت ختم کر لیا اور مسرت آمیز لہجہ میں ان سے گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بہت سے ملکوں کی سیر کی تھی اور تنِ تنہا دور دراز کے سفر کر چکا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایک تنہا زندگی بسر کر رہا تھا، اور ان لوگوں سے ہمیشہ الگ رہنے کی کوشش کرتا جو اُس کے بے تکلف دوست ہو سکتے تھے۔ اُس کی طبیعت میں بہت خودداری اور شرافت تھی۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کسی سے زیادہ بے تکلف نہ ہوتا مگر ان سیدھے سادے لوگوں میں خدا جانے وہ کون سی بات تھی جس نے اُس کے دل میں ان کی طرف سے ایک یگانگت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اُس نے ان سادہ دل پہاڑیوں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اور وہ لوگ بھی اپنے گھر کی باتیں نہایت بے تکلفی سے اس کے سامنے کرنے لگے۔ وہ یوں گفتگو کر رہے تھے جیسے برسوں کے دوست ہوں۔ نوجوان کو ان لوگوں میں ایک خاص شرافت نظر آتی تھی۔ یہ غالباً اُن تاثرات کا نتیجہ تھی جو انہوں نے ان پہاڑوں، غاروں اور آبشاروں سے مستعار لئے تھے۔

نوجوان کے حوصلے بہت بلند تھے اُس کی تمنا تھی کہ دنیا میں اس کا نام زندۂ جاوید ہو جائے۔ اور اسے کامل یقین تھا کہ وہ اپنے اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو کر رہے گا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی میں خواہ دنیا والے میری قدر

نہ پہنچا ئیں مگر میرے بعد وہ دن آئے گا جب لوگ میرا نام نہایت عزت واحترام سے لیں گے۔ اس خیال نے اس کے دل میں ایک امید پیدا کر دی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سفر ہی میں مجھ پر شہرت اور ناموری کا کوئی آفتاب طلوع ہوگا اور میری زندگی میں خواہ کوئی اس سے واقف نہ ہو مگر آئندہ نسلیں جب ماضی کی طرف نظر دوڑائیں گی تو انہیں میرے پائے رفتہ کے نقوش میں ایک ایسی روشنی نظر آئے گی جو بزم ہستی کو جگمگا دے گی اور انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں ایک شاندار اور قابل ہستی کبھی رہ چکی ہے۔ اس نے اپنے میزبانوں کے سامنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر میں اب مرجاؤں تو دنیا والے مجھے اتنا بھی نہ جانیں جتنا کہ آپ جانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ایک شخص رات کے وقت ساکو کی وادی کی طرف سے آیا تھا اور صبح برلنگٹن کو چلا گیا۔ مگر نہیں ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں اُس وقت تک ہرگز نہ مروں گا جب تک اپنا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا لوں۔ مجھے دنیا میں اپنی ایک زبردست بنیاد قائم کرنی ہے۔ اور مجھے پوری امید ہے کہ میں ضرور کامیاب ہوں گا۔

گھر کے سب آدمی حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے نوجوان کے اُن خیالات کو سن کر جوان کے لئے بالکل انوکھے تھے وہ سخت متعجب تھے کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ نوجوان یہ دیکھ کر بولا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ پر ہنسنے اور مجھے احمق خیال کرتے ہونگے۔ اور میری یہ باتیں آپ کو ایسی ہی معلوم ہوتی ہونگی جیسے کوئی یہ چاہے کہ میں رات کے وقت کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھوں اور جب وہاں برف اور سردی کی وجہ سے جم جاؤں تو لوگ مجھے دیکھیں اور میری تعریف کریں کہ میں کیسی بلند جگہ پر بیٹھا ہوں۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا میں تو اس پُرسکون اور پُرامن مکان میں آگ کے سامنے بیٹھنا زیادہ پسند کرتی ہوں خواہ مجھے کبھی کوئی نہ جانے۔

اس کا باپ بولا کچھ کچھ یہ نوجوان کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے۔ اگر میں اپنی طبیعت کو اس طرف متوجہ کرتا تو میرے دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے جو اس کے دل میں موجزن ہیں (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) اس لڑکے کی باتوں نے آج میرے دل میں بھی ایسے خیالات پیدا کر دیئے ہیں جن کے پورا ہونے کا ذرا بھی امکان نہیں "

وہ بولی "شاید ہو ہی جائے۔ کیا وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اگر میری بیوی مرجائے تو میں کیا کروں گا" اس کا شوہر اس بات سے بہت شرمندہ ہوا۔ اور بولا "نہیں نہیں وہ یہ نہیں کہہ تا تم اس کی بات کو نہیں سمجھیں۔ لیکن جب میں تمہاری موت کا خیال کرتا ہوں تو ساتھ ہی مجھے اپنی موت کا خیال بھی آجاتا ہے" اس کے بعد وہ بولا "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی ہمارا کوئی ایسا کھیت ہوتا جو خطرہ کی جگہ واقع نہ ہوتا۔ لوگ مجھے رئیس بلدہ کہتے اور میں شہر میں جا کر اپنے گاؤں کی نمائندگی

کیا کرتا اور جب میں بوڑھا ہو کر مرنے لگتا تو تم سب اس وقت میرے آس پاس ہوتے۔ اور میری قبر پر ایک پتھر نصب کر کے اُس پر میرا نام لکھا جاتا۔ خواہ وہ ایک معمولی پتھر ہوتا یا سنگ مرمر۔"

اجنبی بولا "دیکھا یہ بات انسان کی فطرت ہی میں داخل ہے کہ وہ ضرور دنیا میں اپنی یادگار باقی رکھنا چاہتا ہے خواہ لوحِ مزار پر خواہ انسانوں کے دلوں میں وہ اپنی عزت وعظمت کا غیر فانی نقش چھوڑ جانا چاہتا ہے۔"

یکایک عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ غمناک آواز میں بولی "آہ معلوم نہیں آج ہم سب کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ جب اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت آتی ہے۔" اُس کے شوہر نے گفتگو کا رُخ بدل دیا اور وہ سب چھوٹے بچوں کی باتیں کرنے لگے۔ سب بچے اپنے اپنے بستر میں لیٹ چکے تھے۔ وہ بھی آج اپنے بڑوں کی گفتگو سے متاثر ہو کر اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ ہم جب بڑے ہو جائیں گے تو کیا کیا کریں گے۔

ایک بچہ اپنے بھائی بہنوں کو چھوڑ کر اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولا "اماں اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ یہ اجنبی اور ہم سب گھر سے باہر نکل جائیں اور پہاڑ پر چڑھ کر اُس چشمے سے جو پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے کو بہتا ہوا آتا ہے پانی پی آئیں۔

بچے کی اس نرالی خواہش پر سب ہنس پڑے۔ جو اس روشن کمرے اور اپنے گرم بستر کو چھوڑ کر باہر تاریکی اور برف کی سی سرد ہوا میں جانے کا آرزومند تھا۔

باہر سے ایک گاڑی کے چلنے کی آواز آئی جو اُن کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ دروازہ کھول کر اُن سے دریافت کرے شاید وہ اسے بلا رہے ہیں۔ لیکن اُس نے جواب دیا اگر انہیں اندر آنا ہو گا تو خود ہی آجائیں گے۔ میں نہیں جاتا اس طرح وہ سمجھیں گے کہ میں اس بات کا حریصانہ طور پر خواہشمند ہوں کہ وہ ہمارے ہاں ٹھہریں۔ لیکن انہوں نے گھوڑے کو ایک چابک لگایا اور گاڑی آگے چلی گئی۔ وہ بچہ پھر بولا۔ اماں یہ گاڑی ہمیں چشمے پر لے جا سکتی ہے۔ سب اس بات پر ہنس پڑے مگر لڑکی پر یکایک افسردگی چھا گئی۔ بے اختیار اُس نے ایک سرد آہ بھری لیکن ساتھ ہی اُس کے چہرے پر شرم سے سرخی آگئی۔ کیونکہ وہ دوسروں سے اپنی آہ کو چھپانا چاہتی تھی۔ مگر نہ چھپا سکی۔ اس نے ندامت آمیز نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے سنا تو نہیں۔

اجنبی نے اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ ہنسی اور اُس نے جواب دیا کہ "کچھ نہیں۔ یوں ہی مجھے اس وقت تنہائی سی محسوس ہوئی تھی۔"

سادہ دل پہاڑی لڑکی اور مہذب اور شریف اجنبی کے دل میں جو وہاں صرف ایک رات گذارنے کے لئے آیا تھا اور صبح وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلا جانے والا تھا۔ شاید محبت کا ایک نہایت ہی لطیف اور پاکیزہ جذبہ پیدا ہو رہا تھا جس کی نشو و نما شاید جنت ہی کی فضا میں جا کر ہوتی۔ کیونکہ اُن کی شاہراہ حیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔

اتنے میں باہر زور سے ہوا چلنے لگی۔ اجنبی بولا "ہوا کی سائیں سائیں اس وقت یوں معلوم ہو رہی ہے جیسے اُن مرے ہوئے لوگوں کی روحیں جو کبھی ان پہاڑیوں میں رہا کرتے تھے مل کر گا رہی ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد کہیں دُور سے رونے کی آواز آنے لگی۔ جو ہوا کی غمناک راگنیوں کے ساتھ مل کر ایک وحشت ناک اور غم انگیز سماں پیدا کر رہی تھی۔

شاید کوئی جنازہ جا رہا تھا۔ اُن کے دلوں پر اس آواز سے ایک عجیب پژمردگی سی چھا گئی۔ انہوں نے انگیٹھی میں صنوبر کی لکڑیاں ڈالنی شروع کیں تاکہ اُن کے جلنے کی آواز ہی سے اداسی کچھ کم ہو جب لکڑیاں جلتی تھیں تو ان میں سے قسم قسم کی آوازیں اور چنگاریاں نکل نکل کر اوپر کو جاتی تھیں۔ بچوں کے معصوم اور پیارے پیارے چہرے اپنے اپنے بستر میں سے یہ تماشا دیکھنے کے لئے جھانک رہے تھے۔

ان کی بوڑھی دادی نے اپنے کام سے سر اٹھایا اور بولی "بوڑھوں کے خیال بھی الگ ہی ہوتے ہیں تم لوگوں کی باتوں سے میرے دل میں بھی عجیب خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور میں تمہیں بتاتی ہوں کہ موت کی منزل پر پہنچنے کے لئے جس کو ایک قدم ہی اٹھانا باقی رہ گیا ہو وہ کیا سوچتا ہے۔ اور اگر میں نے یہ بات ظاہر نہ کی تو مجھے سخت تکلیف ہوتی رہے گی"۔

سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ بولی "میں نے مرنے کے بعد پہننے کے لئے ایک نہایت عمدہ کپڑوں کا جوڑا بنا رکھا ہے جیسا کہ میں نے اپنی شادی کے دن کے بعد کبھی نہیں پہنا۔ اور جو شاید میرے عروسی جوڑے سے بھی بدرجہا اچھا ہے لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ جب مردہ کو دفن کر دیا جاتا ہے اگر اُسے لباس پہنانے میں ذرا سا نقص بھی رہ جائے تو مرنے والے کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور بار بار وہ لباس درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ باہر نکالتا ہے"۔

لڑکی کانپ اٹھی اور اس نے اپنی دادی کو منع کیا کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ بوڑھی عورت ہنس کر بولی "میرے بچو میں چاہتی ہوں کہ جب مجھے وہ کپڑے پہنا دیئے جائیں تو تم میں سے کوئی میرے سامنے آئینہ کر دے تاکہ میں بھی دیکھ سکوں کہ میرا لباس درست ہے یا نہیں"۔

بوڑھی عورت کی بات سننے میں سب اس قدر مستغرق تھے کہ کسی نے اُس خوفناک آواز کو محسوس نہ کیا جو لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر تمام گھر اور اُس کی بنیادیں زور زور سے کانپنے لگیں۔

دفعتہً سب کے چہرے زرد ہو گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے پر تشویش انگیز نگاہیں ڈالیں۔ ایک لمحہ تک وہ سہمے رہے پھر یکایک سب کے منہ سے نکلا "پہاڑ کا بہت بڑا تودہ نیچے آرہا ہے"! انہوں نے بچوں کو بستروں میں سے کھینچ کر باہر نکالا اور بدحواسی کی حالت میں بھاگتے ہوئے اُس جگہ جا چھپے جو انہوں نے پہلے سے مقرر کر رکھی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا الفاظ اُس کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں۔

افسوس وہ اپنے محفوظ مکان کو چھوڑ کر تباہی کے غار میں آپھنسے۔ پہاڑ کا وہ بڑا سا ٹکڑا شور کرتا ہوا نہایت تیزی سے اُن کے مکان کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچا تو ایک اور قیامت خیز گونج پیدا ہوئی پہاڑ درمیان سے پھٹ کر گرا اور آس پاس کے تمام علاقہ کو تباہ کر دیا لیکن اُن کے مکان کو ذرا سا صدمہ بھی نہ پہنچا۔

ابھی یہ دہشت ناک گونج بند بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ موت کا دردوکرب برداشت کر چکے تھے اور اُن کی بے گوروکفن لاشیں ہمیشہ کے لئے بے نشان ہو چکی تھیں۔

صبح کے وقت جھونپڑے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا اور انگیٹھی میں ابھی تک آگ سلگ رہی تھی۔ انگیٹھی کے اردگرد خالی کرسیاں پڑی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر کے رہنے والے ابھی ابھی اٹھ کر باہر کی ہولناک تباہی و بربادی کا نقشہ دیکھنے گئے ہیں۔

ان سب نے یادگار کے طور پر اپنا کوئی نہ کوئی نشان چھوڑا جس پر اُن لوگوں نے جو اس خاندان کے دوست تھے آکر آنسو بہائے۔ دور و نزدیک گھر گھر میں اس حادثہ کا چرچا ہوا۔ اور پہاڑی علاقے میں اب تک اُن کا نام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ رات کے وقت جب مائیں اپنے بچوں کو لے کر بستر میں لیٹتی ہیں تو وہ انہیں ستم زدہ لوگوں کی کہانی سنایا کرتی ہیں۔ شاعروں نے اس حسرتناک واقعہ کو شعروں میں لکھ لیا ہے۔

چند آدمیوں نے قرائن سے یہ خیال کیا کہ اس رات اس گھر میں کوئی اجنبی بھی موجود تھا جو اس تباہی و بربادی میں اُن کا شریک بنا۔ لیکن بعض لوگوں نے اس خیال کی مخالفت کی کہ اس بات کا ہمارے پاس کوئی پورا ثبوت نہیں ہے۔

افسوس ہے اُس بلند خیال نوجوان کی حالت پر جو دنیا میں غیر فانی ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر اُس کا انجام کس قدر حسرتناک ہوا کہ اب اُس کا نام اُس کے مقاصد، اور یہاں تک کہ اُس کی موت اور زندگی بھی مشکوک حالت میں ہیں۔

ظاہر ہے کہ موت کا دردوکرب اُس کے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوگا۔

(ماخوذ از انگریزی) ع ب

غزل

نوحۂ غم نہ سازِ عشرت ہے
ایسے جینے میں کوئی لذت ہے

جذبۂ عشق اک گناہ سہی
آپ کے حسن کی بدولت ہے!

راہِ مہر و وفا میں مر جانا
یہ بھی اک زندگی کی صورت ہے

دل بھی اشکوں میں بہ گیا ہوگا
ایک قطرے کی کیا حقیقت ہے!

عرصۂ حشر ہو کہ ہو دنیا
تم جہاں ہو وہیں قیامت ہے

جانے کیا قدرِ آشیاں صیاد
چار تنکے نہیں یہ دولت ہے

میرے مرنے میں ہوگا عالم کیا
میرا جینا ہی درسِ عبرت ہے

وہ تو سب کچھ ہیں اُن کا ذکر ہی کیا
ہم بھی کچھ ہیں یہی غنیمت ہے

اس طرف دل ہے کائنات اُدھر
کوئی کہہ دے یہ دل کی قیمت ہے؟

چشمِ تر اور گدازِ دل زیباؔ
دے جو اللہ ایک دولت ہے

زیباؔ
ردولوی

بقا

مدتیں گزریں جب دنیا ابھی کمسن تھی، اُس قدیم زمانے میں، جب صبح کے ستارے مل کر گاتے تھے تو اُن کے گیت صاف سنائی دیتے تھے کیونکہ دنیا بالکل خاموش تھی اور آسمانوں کی موسیقی میٹھے میٹھے سروں میں پہاڑیوں اور وادیوں میں سے ایک آبجو کی طرح بہتی ہوئی دنیا کو اپنے زمزموں سے بے کھٹکے سیراب کرتی تھی کہ ایک ننھے سے انسانی بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چلانے لگا۔ اُس نے دنیا کی طرف دیکھا اور حیران ہو گیا، اُس نے آسمان کی نیلی نیلی وسعتوں پر نگاہ دوڑائی اور اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ اُس نے چاہا کہ وہ کسی تاریک غار میں گھس جائے یا جنگل کے گھنے گھنے درختوں کے نیچے چھپ جائے، کیونکہ وہ ڈر رہا تھا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں ڈر رہا ہے۔

پھر خدا نے اس بچے کو آواز دی، اور وہ اب ڈرتا نہیں تھا، اور اُس کے دل میں تاریک غار یا گھنے جنگل میں چھپنے کی خواہش بھی اب نہ رہی تھی، لیکن اُس نے جواب نہ دیا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ جواب کیوں کر دیتے ہیں۔

اور خدا نے کہا،

"تجھے ایک سبق سیکھنا ہے۔ اپنا پہلا سبق پڑھ اور دن بھر اس کو یاد کرتا رہ، اور جب رات کے سائے اُس راہ پر پڑنے لگیں جس پر تُو گامزن ہو اور تُو تھک جائے اور چل نہ سکے تو میں تجھے سلا دوں گا۔ پھر تو دیر تک آرام کرتے رہیو، اور جب تو جاگے گا تو میں تجھے دوسرا سبق دوں گا۔"

بچے نے خدا کے ہاتھ سے سبق لے لیا اور یہ آسمان کے تاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو یہ ایک بابِ زریں کی طرح نظر آیا جو چوپٹ کھلا ہوا ہو، لیکن دُور، دُور، بہت دُور ـــــ اتنی دُور کہ کوئی ستارہ بھی اتنی دُور نہ ہو گا! اور اُس دروازے میں سے اُسے ایک اجلی اجلی روشنی نظر آئی، اور ایک عجیب و غریب طریقے سے بچے کے دل نے محسوس کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور وہاں پہنچ کر رہے گا۔ نظارہ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر سبق اُس کے پاس ہی رہا۔

اور وہ سبق یہ تھا، "میں میں ہوں"

یہ سبق بڑا سخت تھا اور بچے نے گھنٹوں اس پر صرف کر دیئے۔ وہ اس میں اتنا منہمک تھا کہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا کہ دن دوپہر سے ڈھل چکا ہے اور روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اپنا وہ عظیم الشان سبق یاد کرتا رہا جو اُسے خدا نے دیا تھا یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا اور وہ تھک کر چُور ہو گیا لیکن اب وہ چھوٹا بچہ نہ رہا تھا، کیونکہ دن بہت لمبا تھا، اور عمر کی وجہ سے

اُس کا جسم نحیف ہو کر جھک گیا تھا، اُس کے بال سفید ہو چکے تھے، اُس کے ماتھے پر جھرّیاں نمودار ہو گئی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا "میں بہت تھک گیا ہوں"۔

اور خدا نے مسکرا کر کہا،

"اب سو جا اور آرام کر"۔

انسان سو گیا اور پھر اٹھا؛ مگر اس دفعہ وہ ڈر نہیں رہا تھا، نہ اُسے اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش تھی۔ اُس نے اپنے اوپر نیلے آسمان کو دیکھا اور اُس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ کیوں؟ آہ، یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ کچھ سننے کا منتظر تھا!

اور خدا نے کہا،

دیکھ یہ تیرا دوسرا سبق ہے! اسے پڑھ اور جب شام ہو اور تُو تھک جائے تو یہاں آنا میں تجھ پر پھر نیند طاری کر دوں گا"

اور بچے نے خدا کے ہاتھ سے سبق لے لیا اور دنیا میں چلا گیا وہ دنیا کے درختوں اور پھولوں کو اور اُس کی زندہ مخلوقات کو دیکھتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنا سبق بھی یاد کرتا رہا کیونکہ یہ پہلے سبق سے زیادہ دشوار تھا۔

دوسرا سبق یہ تھا "تو تُو ہے"

اُس دن کے لمحے بھی تیزی کے ساتھ گزر گئے، کیونکہ جب اُس نے یہ سبق پڑھا تو اُسے آسمانی دنیاؤں کی موسیقی اور صبح کے ستاروں کے نغمے سنائی دینے لگے، اور جب اُس کے پاؤں نئی نئی دنیا کو چھوتے تھے اور جوں جوں وہ اپنے سبق کو دہراتا تھا تو شاید یہ عظیم الشان کائنات کے نغمے کی صدائے بازگشت تھی یا شاید اُس کے اپنے دل کی کہ وہ پھولوں اور سبزے میں سے موسیقی بن کر نکلتی تھی۔ اُس وقت وہ پہلی مرتبہ مسرت سے آشنا ہوا، اور خوشی اُس کے دل میں پیدا ہوئی۔ لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شام کے سائے اُس کے راستے میں پڑنے لگے، اور سورج غروب ہو گیا تب انسان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور مسکرا کر کہا،

"اے خدا، ہم بہت تھک گئے ہیں"۔

اور خدا نے کہا،

سو جا اور آرام کر، کل میں تجھے اَور سبق پڑھاؤں گا"۔

اور تیسرے دن بچہ جاگا، اُس نے انگڑائی لی اور اپنی آنکھیں ملیں، لیکن اُس نے اوپر کو نہ دیکھا نہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے۔ اُس نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی اور کہا،

"وہ کہاں ہے، میرا ساتھی؟"

پھر خدا نے اُسے تیسرا سبق دیا، اور آہ! یہ مشکل ترین سبق تھا۔ اور جب اُس نے اس کو دیکھا تو اُسے چند لمحوں کے لئے غش آگیا! پھر ایک عجیب لرزہ اُس کے بدن پر چھا گیا، اور اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ نکل کھڑا ہوا۔

تیسرا سبق تھا "یہ نہ کر۔ وہ نہ کر"

شام کے وقت جب سورج چھپ چکا تو وہ بہت پژمردہ، بہت افسردہ ہوگیا تھا، اور اُس کے بال برف جیسے سفید ہوگئے تھے۔ شاید یہ اُس کے بالوں کی سفیدی تھی یا شاید یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن تھی، مگر ایک روشنی تھی جو اُس کے ہونٹوں اور اُس کی بھوؤں پر کھیل رہی تھی۔ وہ سو گیا اور اپنی نیند میں ایک چھوٹے بچے کی طرح مسکراتا رہا۔

دن کے بعد دن گزرتا گیا اور جب صبح ہوتی اور بچہ جاگتا تو اُس کی آنکھ ایک نئی دنیا پر پڑتی، لیکن کبھی اُس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ اب اُسے خوف کیوں معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بھائی بندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا اور جواب میں وہ بھی مسکراتے رہے، لیکن انہیں کبھی خیال نہ آیا کہ کیوں۔

لیکن چند روز بچہ اپنے سبق سے غافل ہوگیا، خدا ہر روز اُسے سبق دیا کرتا تھا مگر چند دن وہ سبق لینا بھول گیا اور اپنی بھول میں وہ اُس سیدھے راستے سے بھٹک گیا جو روشنی جاوداں اور بابِ زریں کی طرف جاتا تھا، وہ مرغزاروں میں سنہری نیتریوں کے پیچھے بھاگتا رہا یا شہابہ کی چمک کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ پھر جب رات ہوئی تو وہ مسکرا نہ سکا۔ وہ سو گیا، اور جاگا، اور اُس نے پھر وہی سبق دہرانا شروع کر دیا۔

کچھ روز وہ اپنی راہ سے بھٹکا رہا پھر اُس نے الٹے پاؤں صعوبتوں اور تکلیفوں میں سے گزر کر راہ کو ڈھونڈھ لیا، کیونکہ انسان ہمیشہ آزاد تھا۔ کیا اُس نے اپنے پہلے ہی سبق میں پڑھا نہ تھا؟ "میں میں ہوں"

منصور احمد　　　　　　　　　　　　　　　　لل الین

ہمیشہ یہ سمجھو کہ اگر وہ کام جو تمہیں انجام دینا ہے، ممکن ہے تو آسان بھی ہے۔ اس صورت میں تمہیں اس کام پر ضرورت سے زیادہ قوت خرچ نہیں کرنی پڑے گی۔ اگر تم اسے مشکل سمجھتے رہے تو تم کو اس پر اس قوت سے دس گنی بیس گنی قوت خرچ کرنی پڑے گی جتنی اُس کے لئے درکار ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی قوت کو ضائع کرو گے۔ ــــــــ (رکوئے)

عبدالعزیز

"Dalecarlia"

چاندی کی کان

سویڈن کا بادشاہ گستاف سوئم ڈیلیکاریا کے علاقہ میں سفر کر رہا تھا، گھوڑے سرپٹ جا رہے تھے اور راستہ بجلی کی سرعت کے ساتھ طے ہو رہا تھا۔ سڑک پتھریلی ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کے پہیوں سے ایک عجیب آواز پیدا ہو رہی تھی مگر اس پر بھی اُس کی خواہش تھی کہ سفر اور تیزی سے کیا جائے۔ اِس لئے اُس نے کھڑکی سے سر نکال کر گاڑی بان سے کہا: "جلدی چلو، کیا تم سمجھتے ہو کہ سڑک پر انڈے بچھے ہوئے ہیں جو ٹوٹ جائیں گے .... ذرا اور تیزی سے ہانکو!

گاڑیاں ناہموار دیہاتی سڑکوں پر باد رفتاری سے جا رہی تھیں۔ اور یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ گاڑیاں اور گھوڑے صحیح سلامت تھے۔ آخر ایک ڈھلوان پہاڑی کے دامن میں شاہی گاڑی کا دھرا ٹوٹ گیا۔ بادشاہ نیچے اتر کر سڑک کے کنارے ایک بڑے سے ہموار پتھر پر بیٹھ گیا۔ مصاحبوں نے گاڑی بان کو کوسنا شروع کر دیا مگر اس سے کیا حاصل تھا؟ ظاہر تھا کہ جب گاڑی کی مرمت نہ ہوئے سفر جاری رہنے کا کوئی امکان نہیں۔

مصاحبوں نے اِدھر اُدھر کسی ایسی چیز کی تلاش شروع کی جس سے گاڑی کے درست ہونے تک بادشاہ کا دل بہل سکے۔ کچھ فاصلہ پر درختوں کے پیچھے انہیں ایک گرجا کا مخروطی مینار نظر آیا۔ انہوں نے بادشاہ کو صلاح دی کہ آپ کسی مصاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر گرجا کی طرف چلیں اور چونکہ اتوار کا دن ہے اس لئے وعظ میں شامل ہو کر یہ خالی وقت گزاریں۔

بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا، اور گرجا کی طرف چل پڑا۔ وہ کئی گھنٹوں سے گھنے تاریک جنگلوں میں سفر کر رہا تھا، اور افسوس کر رہا تھا کہ اُس کے ملک کا کس قدر حصہ غیر آباد پڑا ہے مگر یہ علاقہ خوب سرسبز و شاداب تھا اس علاقہ میں دلفریب مرغزاروں اور خوبصورت بستیوں کے علاوہ ڈال ندی جھاڑیوں کی گھنی قطاروں میں سے آہستہ آہستہ گنگناتی ہوئی بہتی تھی۔

لیکن وعظ کے بابرکت مجمع میں شامل ہونا بادشاہ کی قسمت میں نہ تھا کیونکہ جب وہ گرجا کے سامنے پہنچا تو گھنٹہ بجانے والے نے اختتام کا اعلان کر دیا اور لوگ باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ بادشاہ ایک پاؤں گاڑی میں اور دوسرا پائدان پر رکھے کھڑا تھا لوگ اُس کے پاس سے گذرنے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا اور انہیں غور سے دیکھتا

رہا۔ وہاں کے باشندے جوان اور خوبصورت تھے اُن کے قد غیر معمولی طور پر لمبے اور چہرے مسرور اور مطمئن تھے۔ عورتیں بھی حسین اور دراز قامت تھیں +

سارا دن بادشاہ اپنی سلطنت کے بنجر اور غیر آباد علاقوں کی کثرت پر افسوس کرتا رہا تھا۔ وہ بار بار مصاحبوں سے کہتا "مجھے یقین ہے کہ اس وقت میں اپنی سلطنت کے مفلس ترین حصہ میں سفر کر رہا ہوں!" لیکن اب جو اُس نے ان لوگوں کو دیکھا جو بہترین دیہاتی لباس پہنے ہوئے تھے تو اُسے ملک کی غربت کا خیال بھول گیا۔ اُس کا دل از سرِ نَو مسرت سے لبریز ہو گیا اُس نے اپنے دل میں کہا:۔ "سویڈن اتنا غریب نہیں جتنا اُس کے دشمن خیال کرتے ہیں۔ جب تک میری رعایا کی حالت ایسی اچھی ہے میں مذہب اور ملک دونوں کی بخوبی حفاظت کر سکتا ہوں"

اُس نے مصاحبوں کو حکم دیا کہ وہ لوگوں پر ظاہر کر دیں کہ یہ اجنبی جو اُن کے درمیان کھڑا ہے اُن کا بادشاہ ہے تاکہ وہ اُس کے گرد جمع ہو جائیں۔ اور جو کچھ اُسے کہنا ہے سن سکیں +

لوگ بادشاہ کا نام سن کر اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے گرجا کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ایک نہایت مؤثر تقریر کی جس میں اُس نے اُن افسوسناک حالات کا نقشہ کھینچا جن میں سلطنت مبتلا تھی۔ اُس نے بتایا کہ سویڈن کو اہلِ ہالینڈ اور روسی ڈرا دھمکا رہے ہیں، اور اس حالت کو فوج کے بعض افسروں کی غداری نے اور خطرناک بنا رکھا ہے۔ موجودہ فوج پر اس کو اعتبار نہیں رہا اور اس لئے وہ اب مجبور ہؤا ہے کہ خود دور و دراز کی آبادیوں میں جا کر اپنے ملک کے باشندوں سے دریافت کرے کہ کیا وہ مصیبت اور جنگ کے وقت میں اپنے بادشاہ کی مدد کریں گے، تاکہ مادرِ وطن دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے +

کسان بادشاہ کی باتوں کو نہایت سکون کے ساتھ سنتے رہے۔ مگر اُن پر کچھ اثر نہ ہؤا، کیونکہ جب اُس نے تقریر ختم کی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئے +

بادشاہ کا خیال تھا کہ اُس کی تقریر نہایت پُر اثر ہے کیونکہ بولتے وقت کئی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے لیکن جب کسان دیر تک کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو بادشاہ کا دل غم و غصہ سے لبریز ہو گیا۔

کسان اس حقیقت کو تاڑ گئے۔ اور آخر ایک شخص ہجوم میں سے باہر نکلا۔ اور بادشاہ کے سامنے آکر کہنے لگا:۔

"شہنشاہا! آپ کو معلوم ہے ہمیں آج گرجا میں شاہی سواری کی آمد کی توقع نہ تھی، اس لئے ہم آپ کو فوراً جواب دینے سے قاصر ہیں ہماری گزارش ہے کہ آپ گرجا میں جائیں اور ہمارے پادری سے ملیں۔ اس اثنا میں ہم اُس اہم معاملہ پر جو آپ نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے آپس میں مشورہ کرتے ہیں"

بادشاہ نے اپنے دل میں اس بات کی معقولیت کا اعتراف کرتے ہوئے سوچا کہ واقعی کسانوں کو سوچنے کا موقع دینا چاہئے۔ اور خود پادری کی ملاقات کے لئے گرجا کی طرف چل پڑا۔

جب وہ گرجا کے اندر داخل ہوا تو اُسے سوائے ایک آدمی کے جو ایک عام کسان معلوم ہوتا تھا اور کوئی نظر نہ آیا یہ شخص بلند قامت اور مضبوط ساخت کا تھا۔ اُس کے ہاتھ بڑے بڑے تھے جنہیں محنت اور مشقت نے سخت کر دیا تھا۔ اُس نے عام لوگوں کے مانند صرف ایک چمڑے کا پاجامہ اور لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔

جب بادشاہ داخل ہوا تو اس نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔

بادشاہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ پادری صاحب مجھے یہیں ملیں گے"

کسان کے چہرے پر سرخی کی ایک ہلکی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے سوچا کہ اب جب کہ اُسے غلطی سے ایک معمولی کسان سمجھ لیا گیا ہے مناسب نہیں کہ وہ بادشاہ پر ظاہر کرے کہ گرجا کا پادری وہی ہے۔ اس لئے اُس نے جواب دیا،

"ہاں آپ جب چاہیں پادری سے مل سکتے ہیں"۔

بادشاہ ایک آرام کرسی پر جو اس وقت پاس ہی پڑی تھی بیٹھ گیا۔ وہ کسانوں کی بہتری میں بہت دلچسپی لیتا تھا اس لئے اس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔ "کیا اس گرجا کا پادری اچھا آدمی ہے؟"

بادشاہ کے اس سوال پر پادری نے محسوس کیا کہ اُسے اپنی شخصیت ظاہر نہ کرنی چاہیئے، اور اپنے تئیں ایک معمولی کسان ہی ظاہر کرنا چاہیئے، اس لئے اُس نے جواب دیا کہ پادری کافی اچھا انسان ہے۔ عمدہ تعلیم دیتا ہے، اور جو کچھ کہتا ہے اس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بادشاہ بظاہر اس تعریف سے خوش ہوا۔ مگر ساتھ ہی کہنے لگا۔ "تمہاری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ تم پادری سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہو"

پادری نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر بعد میں بادشاہ کو معلوم ہو گیا کہ پادری میں ہوں تو وہ خیال کرے گا کہ پادری اپنی تعریف آپ ہی کر رہا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے میں نقص نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، وہ ذرا خود مختار سا ہے۔ یہاں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ پادری یہ چاہتا ہے کہ گاؤں میں اُس کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ ہو"۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "تو کیا اُس نے ہر موقع پر تمہاری صحیح رہنمائی کی ہے؟"

مگر بادشاہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسان اُس شخص کے خلاف کوئی شکایت کا لفظ اپنی زبان سے نکالے، جو مذہب

میں اُس سے اعلیٰ ہے۔ اس لئے اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے گفتگو کا رخ بدل کر کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیک عادات اور سادگی یہاں کے لوگوں کا دستور ہے!"

پادری نے کہا "ہاں لوگ اچھے ہیں، لیکن اُس وقت تک جب تک وہ افلاس اور تنگ دستی میں رہیں، جب دنیا کی لذتیں اُن کے قریب آجائیں تو بس پھر خدا ہی حافظ ہے"!

بادشاہ نے سر ہلا کر کہا۔ "لیکن یہاں تو اس بات کا کوئی خطرہ نہیں"۔

بادشاہ نہایت بیتابی سے کسانوں کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے خیال کیا یہ کسان اپنے بادشاہ کی مدد کے لئے تیار نہیں۔ بہتر ہو کہ گاڑی تیار ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں!"

پادری بھی دل ہی دل میں بحث کر رہا تھا کہ کس طرح اس اہم معاملہ کا فیصلہ کرے۔ وہ خوش تھا کہ اُس نے بادشاہ پر اپنی شخصیت ظاہر نہ کی تھی۔ کیونکہ اب وہ اُن معاملات پر بھی دل کھول کر گفتگو کر سکتا تھا جو ابھی پیش نہیں ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اس مہر سکوت کو توڑا اور بادشاہ سے پوچھا "کیا واقعی دشمن حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اور ملک خطرہ میں ہے؟"

اس کے جواب میں بادشاہ نے صرف یہ کیا کہ ایک نگاہ اس پر ڈالی اور چپکا ہو رہا۔

پادری نے پھر کہا "میں یہ صرف اس لئے پوچھتا ہوں کہ میں یہاں گرجا میں کھڑا تھا اور آپ کی تقریر کو اچھی طرح نہ سن سکتا تھا۔ لیکن اگر یہ بات درست ہے تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس جگہ کا پادری آپ کے لئے اس قدر دولت مہیا کر سکتا ہے جو شاید آپ کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہو"۔

"مگر تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ یہاں کے لوگ غریب ہیں؟"

پادری نے جواب دیا "ہاں یہ بالکل درست ہے، اور پادری کے پاس بھی دوسروں سے کچھ زیادہ نہیں لیکن اگر آپ ایک لمحہ کے لئے میری طرف متوجہ ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کس طرح پادری آپ کی مدد کر سکتا ہے"۔

بادشاہ نے کہا "اچھا کہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم الفاظ کو زبان سے نکالنے میں زیادہ مستعدی سے کام لیتے ہو۔ مگر تمہارے گاؤں والوں نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا"۔

"بادشاہ کو جواب دینا آسان کام نہیں، یہ بوجھ بھی بیچارے پادری ہی کو اٹھانا پڑے گا!"

بادشاہ نے ایک ٹانگ دوسری پر رکھ لی۔ اور سر کو ایک طرف جھکا کر کہا۔ "ہاں شروع کرو"

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس علاقہ کے پانچ آدمی ہرن کے شکار کے لئے نکلے۔ اُن میں سے ایک ہمارا پادری

تھا اور باقی چار میں سے دو سپاہی اولف اور ارک نامی تھے۔ چوتھا اس علاقہ کی سرائے کا مالک اور پانچواں اسرائیل ایک کسان تھا ———"

بادشاہ نے ذرا تندی سے کہا: "اتنے نام لینے کی زحمت نہ کرو"

"یہ پانچوں بہت عمدہ شکاری تھے اور قسمت ہمیشہ ان کے ہمرکاب رہتی تھی، مگر اُس دن وہ دیر تک شکار کی تلاش میں پھرتے رہے اور آخر ناکامی کی کوفت اور تھکن سے چُور ہو کر انہوں نے شکار کا ارادہ ترک کر دیا اور زمین پر بیٹھ کر سستانے اور باتیں کرنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تمام جنگل میں کوئی ایسی جگہ نہیں جو کھیتی باڑی کے کام آسکے، کیونکہ یہ تمام علاقہ یا تو پہاڑی ہے یا دلدل سے بھرا پڑا ہے۔

"اُن میں سے ایک نے کہا۔ 'خدا نے ہمیں ایسی بُری زمین دے کر انصاف نہیں کیا'۔

"دوسرے نے کہا۔ 'دوسرے مقامات کے لوگ خوش ہیں۔ صاحب دولت و ثروت ہیں، لیکن ہم ہیں کہ سارا دن محنت و مزدوری کرتے ہیں اور پھر بھی نانِ شبینہ کے محتاج ہیں'۔"

پادری ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ بادشاہ سو گیا ہے اور اُس کی بات نہیں سن رہا۔ لیکن بادشاہ نے اپنی انگلی ہلائی تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ جاگ رہا ہے۔

"وہ اس معاملہ پر بحث کر رہے تھے کہ پادری نے اپنی بندوق کے کندے سے ایک پتھر کے ساتھ جس پر کائی جمی ہوئی تھی کھیلنا شروع کر دیا۔ مگر پادری کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ بندوق کی ٹھوکروں سے کائی کے جھڑ جانے پر پتھر چمکنے لگ گیا ہے۔ اُس نے ایک اور پتھر کو اسی طرح ٹھوکریں لگائیں اور وہ بھی چمک اُٹھا۔

"اُس نے اپنے ساتھیوں کو وہ پتھر دکھاتے ہوئے کہا: 'ممکن ہے یہ سیسہ ہو'۔

"یہ دیکھ کر اُس کے ساتھی بھی اچھل پڑے اور پتھروں کو اپنی بندوقوں کی ٹھوکروں سے چھیلنے لگے۔ جلد ہی انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ سارے پہاڑ میں کچی دھات کی لکیریں موجود ہیں۔

"پادری نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: 'تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟'

"اس کے جواب میں وہ سب بول اُٹھے 'یہ ضرور سیسہ ہے! اور تمام پہاڑ اس سے بھرا پڑا ہے'!

"مگر سرائے کے مالک نے کہا۔ 'اگر سیسہ نہیں تو جست تو ضرور ہے'!"

جب پادری یہاں تک پہنچا تو بادشاہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اُس کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئیں۔ اُس نے پوچھا "کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ لوگ کچی دھات کے متعلق کچھ جانتے تھے؟"

"بالکل نہیں!"

بادشاہ کا سر جھک گیا اور دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔

"پادری اور اس کے ہمراہی بہت خوش ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ انہوں نے ایک ایسی چیز دریافت کر لی ہے جو انہیں اور اُن کی اولاد کو فکرِ معاش سے آزاد کر دے گی۔

"ایک نے کہا: اب مجھے زیادہ کام نہ کرنا پڑے گا"

"اور دوسرا بول اٹھا اب میں سارا ہفتہ کچھ نہ کیا کروں گا، اور اتوار کو سونے کی رتھ میں بیٹھ کر گرجا جایا کروں گا"۔

"ہر چند وہ عقلمند انسان تھے لیکن اس عظیم الشان دریافت نے اُن کا سر پھرا دیا تھا، وہ بچوں کی سی باتیں کر رہے تھے لیکن پھر بھی اُن میں اتنی عقل ضرور موجود تھی کہ جاتی دفعہ انہوں نے وہ پتھر مٹی تلے چھپا دیئے اور اس مقام کو بغور پہچان کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ جدا ہونے سے پیشتر قرار پایا کہ پادری اس دھات کے چند چند نمونے لے کر شہر فالن میں جائے اور کسی معدنیات کے ماہر سے دریافت کرے کہ دھات کس قسم کی ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو واپس آئے۔ اس کے بعد انہوں نے قسم کھائی کہ یہ راز کسی پر افشا نہ کریں گے کہ دھات کا مخزن کہاں ہے"

بادشاہ نے پھر سر اٹھا کر پادری کی طرف دیکھا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب اُسے کچھ کچھ یقین ہونے لگا ہے کہ یہ آدمی واقعی کوئی اہم بات کہنا چاہتا ہے۔

دوسرے ہی روز پادری دھات کے چند ٹکڑے جیب میں ڈال کر فالن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح امیر کبیر بننے کے خیال سے خوش تھا وہ گرجا کو جو اس وقت ایک غریب کسان کے جھونپڑے سے بہتر نہ تھا از سرِ نو تعمیر کرنے کے خیال سے مسرور ہو رہا تھا۔ کبھی وہ خیال کرتا کہ وہ بڑے پادری کی حسین لڑکی سے، جو اسے نہایت محبوب تھی شادی کرے گا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ غربت کی حالت میں شاید اُسے قیامت تک اس روزِ سعید کا انتظار کرنا پڑے۔

"پادری دو دن میں فالن پہنچ گیا۔ وہاں اسے دو دن اور انتظار کرنا پڑا کیونکہ معدنیات کا ماہر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو پادری نے اُسے پتھر کے وہ چمکدار ٹکڑے دکھلائے۔ اس نے اُن کو پہلے الٹ پلٹ کر اور پھر کچھ دیر تک خوردبین سے دیکھا۔" پادری نے اُسے ان ٹکڑوں کے ملنے کا حال بتانے کے بعد پوچھا "کیا یہ سیسہ ہے؟"

"نہیں یہ سیسہ نہیں ہے"

"تو پھر جست ہو گا؟"

"نہ نہیں یہ جست بھی نہیں"

"یہ سُن کر پادری کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ عمر بھر میں اتنا افسردہ کبھی نہ ہؤا تھا۔

"آخر ماہر نے اُس سے پوچھا" کیا اُس پہاڑ پر ایسے اور بھی بہت سے پتھر ہیں؟

"ایک پہاڑ کا پہاڑ ہے"

"ماہر پادری کے قریب آ گیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا" اگر یہ واقعی درست ہے تو میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، کیونکہ یہ چاندی ہے۔ مگر آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ آپ اسے محض نفس پروری میں نہیں بلکہ ملک اور قوم کے فائدہ کے لئے صرف کریں"

"پادری نے حیرت سے پوچھا" واقعی ـــــ کیا یہ واقعی چاندی ہے"؟

"ماہر نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح اس پہاڑ کے لئے کان کے حقوق حاصل کرے۔ اور اس کے علاوہ بہت سی عمدہ تجاویز بتائیں لیکن پادری نے جو بالکل ایک عالمِ بے خودی میں کھڑا تھا ایک بات بھی نہ سنی۔ وہ اسی خیال میں غرق تھا کہ اُس کے بنجر علاقہ میں چاندی کا ایک پہاڑ موجود ہے! ـــــ"

بادشاہ نے اس سرعت سے اپنا سر اٹھایا کہ پادری چُپ ہو گیا۔

بادشاہ نے کہا" اور جب پادری نے واپس آ کر کان کو چلایا تو اُسے معلوم ہو گیا کہ ماہر نے اُسے دھوکا دیا تھا"!

"نہیں ماہر ایک دیانت دار آدمی تھا، اور جو کچھ اُس نے کہا تھا حرف بحرف درست نکلا"!

اس پر بادشاہ نے کہا" ہاں تو کہتے جاؤ" اور خود زیادہ اچھی طرح سننے کے لئے کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

جب پادری گھر واپس پہنچا تو اُس نے خیال کیا کہ اس مژدہ کی سب سے پہلے اپنے رفیقوں کو اطلاع دینی چاہیے اور جب وہ سرائے والے کے مکان کے دروازہ میں داخل ہؤا تو اُس نے دیکھا کہ سب لوگ ماتمی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اُس نے ایک لڑکے سے جو کہ مکان کے کٹہرہ کے ساتھ کھڑا تھا پوچھا کہ وہاں کون فوت ہؤا ہے۔

"لڑکے نے جواب دیا" سرائے والا"! اور یہ کہہ کر اُس نے پادری کو تمام قصہ بتایا کہ کس طرح سرائے والے نے پچھلے ہفتہ میں شب و روز اس قدر شراب پی کہ تمام عمر میں بھی اتنی نہ پی ہوگی۔

"پادری نے حیرت سے پوچھا۔ مگر اس کی وجہ؟ سرائے والا اس قدر شرابی تو نہیں تھا"

"لڑکے نے کہا" آہ! وہ کہتا تھا کہ اُس نے ایک کان دریافت کی ہے، اور وہ بہت امیر کبیر ہو گیا ہے، اور اُسے سوائے پینے کے اور کوئی کام نہیں۔ کل رات وہ سیر کو باہر گیا، اُس کی گاڑی الٹ گئی اور وہ مر گیا،

"پادری یہ خبر سن کر بہت غمگین ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ آہ جب وہ قصبہ میں داخل ہوا تھا تو کس قدر خوش تھا اور اپنے دوستوں کو خبر سنانے کے لئے کس قدر بے قرار ہو رہا تھا! وہ چند ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ اُس نے اسرائیل کو آتے ہوئے دیکھا اس لئے پادری نے دل ہی دل میں کہا شکر ہے کہ دولت کا خبط اس کے سر میں نہیں سمایا۔ میں اُسے یہ خبر سنا کر مسرور کردوں گا کہ اب وہ ایک امیر کبیر ہے"

"اسرائیل پادری کو دیکھ کر لپکا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ کیا تم ابھی ابھی فالن سے آرہے ہو"

"پادری نے کہا۔ ہاں۔ اور تمہارے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ میرے سفر کا نتیجہ توقع سے بہت بڑھ چڑھ کر نکلا ہے۔ معدنیات کے ماہر نے بتایا ہے کہ جو دھات ہم نے دریافت کی ہے۔ کچی چاندی ہے!"

"یہ سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ اسرائیل کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ اُس نے نہایت بے قراری سے پوچھا۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا واقعی یہ چاندی ہے"

"پادری نے جواب دیا۔ ہاں۔ اب ہم سب امیر کبیر بن جائیں گے اور شریف آدمیوں کی سی زندگی بسر کریں گے!"

"اسرائیل نے نہایت حسرت بھری آواز میں ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ آہ یہ چاندی ہے! اور اُس کی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو بہ نکلے۔

"پادری نے کہا۔ ہاں، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چاندی ہے۔ تمہیں یہ خیال ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ مگر یہ تم رو کیوں رہے ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے!"

"اسرائیل نے کہا۔ خوش! میں کیا خوش ہوں؟ میرا خیال تھا کہ یہ صرف کسی معمولی چیز کی چمک تھی، اس لئے میں نے اپنا حصہ اولف کے پاس سو ڈالر میں بیچ دیا"

"جب پادری اُس سے جدا ہوا تو وہ سڑک کے کنارے کھڑا رو رہا تھا"

"پادری نے گھر پہنچ کر اولف اور اُس کے بھائی ارک کو بلا بھیجا تاکہ انہیں بتائے کہ جو دھات انہوں نے دریافت کی ہے چاندی ہے۔ اور چونکہ وہ اُن سے نئے گرجا کی تعمیر کے متعلق مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا اس لئے اُس نے یہی مناسب خیال کیا کہ انہیں اپنے پاس بلائے"

"شام کے وقت جب پادری اپنے مکان سے باہر تاریکی میں ایک ٹیلے پر تنہا کھڑا سوچ رہا تھا تو مسرت کا طوفان پھر اسے اپنی موجوں میں بہا کر لے گیا۔ وہ نئے گرجا کی تعمیر پر غور کرنے لگا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اُسے بڑے بڑے پادری کے گرجا کی مانند بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کرے۔ وہ بہت دیر تک وہاں کھڑا تصور جماتا رہا کہ کان سے بیش بہا دولت

برآمد ہوگی۔ اس لئے بیرونجات سے بے شمار لوگ یہاں آکر آباد ہو جائیں گے اور اسی طرح ایک دن کان کے گرد ایک بارونق شہر آباد ہو جائے گا۔ اور پھر وہ اپنے پرانے جھونپڑے کی جگہ ایک عالی شان محل تعمیر کرے گا۔ جس میں اُس کی دولت کا کافی حصہ صرف ہو جائے گا۔ وہ اس سے بھی مطمئن نہ تھا۔ بلکہ وہ خیال کر رہا تھا کہ جب اُس کا گرجا تیار ہو جائے گا تو بادشاہ اور لاٹ پادری اُس کے افتتاح کے لئے آئیں گے اور بادشاہ گرجا کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا! ــــــ"

عین اس وقت بادشاہ کا ایک مصاحب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور کہنے لگا۔ "عالی جاہ! شاہی گاڑی تیار ہوگئی ہے۔"

پہلے تو بادشاہ اٹھنے کے لئے تیار ہوا لیکن کسی خیال کے آتے ہی اُس نے ارادہ بدل دیا اور پادری سے کہنے لگا۔ "اپنا قصہ جلد ختم کرو، ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پادری نے کیسے کیسے ہوائی قلعے تعمیر کئے ہونگے۔ اور کیا کیا خواب دیکھے ہونگے!"

پادری نے کہا۔ "لیکن پادری انہیں خیالات میں محو تھا کہ پیغام آیا کہ اسرائیل نے خودکشی کرلی ہے۔ کان کے بیچ دینے سے جو صدمہ اُسے پہنچا وہ اُس سے جانبر نہ ہو سکا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ہرگز اُس دولت کو جسے وہ محض اپنی حماقت کی وجہ سے کھو بیٹھا تھا۔ دوسروں کے پاس دیکھ کر برداشت نہ کرسکے گا۔"

بادشاہ اَور سیدھا ہو بیٹھا۔ اُس نے دونوں آنکھیں کھول کر کہا۔ "اگر میں پادری ہوتا تو اس کان کا خیال ترک کردیتا!"

پادری نے جواب دیا۔ "بادشاہ بادشاہ ہے۔ اُس کے پاس دولت کی فراوانی ہے، مگر ایک غریب پادری کا معاملہ اَور ہے۔ اُس نے یہ دیکھ کر کہ اس مہم میں خدا کی برکات اُس کے شاملِ حال نہیں ارادہ کرلیا کہ وہ اس دولت سے ذاتی نفع اور شہرت حاصل نہیں کرے گا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس بے بہا دولت کو زمین ہی میں مدفون نہیں رہنے دے گا اُس نے غربا اور مساکین کی امداد کے لئے کان میں کام شروع کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اور اسی لئے وہ ایک دن اولف کے مکان کی طرف گیا، تاکہ اُس سے اور اُس کے بھائی سے دریافت کرے کہ انہیں کان کے متعلق کیا کارروائی کرنی چاہیئے جب وہ فوجیوں کی بارکوں کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ چند مسلح کسان ایک نوجوان کو جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں پابہ زنجیر لئے آرہے ہیں۔

"جب پادری اُن کے پاس پہنچا تو اُس نے پہچان لیا کہ مجرم اولف ہے وہ لوگوں کی منتیں کر رہا تھا کہ اُسے پادری سے چند باتیں کرلینے دیں۔

"پادری اور نزدیک ہوگیا۔ مجرم نے اس کی طرف متوجہ ہوکر کہا: اب صرف آپ ایک شخص ہیں جنہیں کان کے راز کا علم ہے"

"پادری نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اس نے کہا" جب سے ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ہم نے چاندی کی کان دریافت کی ہے میرے اور میرے بھائی کے تعلقات اچھے نہ رہے تھے۔ ہم متواتر جھگڑتے رہتے۔ کل ہم اس بحث میں پڑ گئے کہ ہم پانچوں میں سے کون تھا جس نے سب سے پہلے کان دریافت کی، اور آخر ہم دھینگا مشتی پر اتر آئے۔ اسی جھگڑے میں میں نے دولت کے نشہ سے اندھا ہوکر اپنے پیارے بھائی کو مار دیا۔ اب میں ضرور پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں گا اور پھر بس آپ ہی کو کان کا علم ہوگا اس لئے میری ایک آخری خواہش ہے جو امید ہے کہ آپ منظور فرمائیں گے۔

"پادری نے کہا" کہو تم جو کچھ کہو گے میں کروں گا"

"آپ جانتے ہیں کہ میں کئی ننھے ننھے بچے چھوڑ رہا ہوں"

"وا ہو تم اُن کا کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارا حصہ انہیں کو ملے گا!

"اولف نے کہا" نہیں نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں ہرگز ہرگز کوئی حصہ نہ دیں" اگر آپ نے میرے ساتھ اس بات کا پکا وعدہ نہ کیا تو میں چین سے جان نہ دوں گا"

"پادری نے کہا" ہاں میں وعدہ کرتا ہوں"

"لوگ قاتل کو کشاں کشاں لے گئے اور پادری وہیں سڑک پر خیالات میں غرق دیر تک اکیلا کھڑا رہا۔ گھر لوٹتے وقت اُس کے دل میں خیالات کا ہجوم تھا۔ کیا دولت اور گناہ لازم ملزوم ہیں! کیا یہ واقعی درست ہے کہ یہ لوگ دولت کی خوشی کو برداشت نہیں کر سکے؟ چار شخص جو قصبہ بھر میں باعزت اور خوش خلق خیال کئے جاتے تھے برباد ہو چکے ہیں۔ کیا باقی تمام باشندوں کے لئے بھی چاندی کی یہ کان یکے بعد دیگرے تباہی کا باعث بن جائے گی؟ اُس نے اپنے جی میں ٹھان لی کہ وہ اس کان کا خیال جو تمام گرد و نواح کی بربادی کا باعث بننے والی ہے بالکل ترک کر دے گا"

یکا یک بادشاہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تمہارے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور افتادہ بستی کا پادری واقعی ایک مرد ہے!"

پادری نے کہا" یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ کیونکہ جونہی کان کی خبر کسانوں میں پھیلی انہوں نے سب کام چھوڑ دیا اور بیکار بیٹھ گئے اور اُس وقت کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگے جب انہیں کان سے بیش بہا دولت ہاتھ لگے گی۔ انہوں

نے شراب نوشی شروع کر دی۔ ہر طرف بدکاری کا دور دورہ ہو گیا۔ بہت سے لوگ جنگل میں کان کی تلاش میں سرگردانی کرنے لگے۔ اور جس وقت پادری اپنے مکان سے باہر نکلتا لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے تاکہ معلوم کریں کہ وہ کہیں کان کی طرف تو نہیں جا رہا۔

"جب واقعات کی رفتار یہاں تک پہنچ گئی تو پادری نے ایک دن تمام کسانوں کو جمع کر کے انہیں وہ تمام منحوس واقعات سنائے جو اس کان کی دریافت سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ اُس نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ بھی اپنے تئیں برباد کرنا چاہتے ہیں؟ اُس نے انہیں صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اپنے روحانی پیشوا سے یہ امید ہرگز نہ رکھیں، کہ وہ اُن کی بربادی میں اُن کی کسی قسم کی مدد کرے گا۔ اور اب اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یہ راز کسی پر افشا نہ کرے گا پھر اُس نے اُن سے کہا کہ اگر وہ کان کی تلاش کو جاری رکھیں گے اور دولت کی ہوس میں گرفتار رہیں گے تو وہ کہیں دُور چلا جائے گا، تاکہ اُن کی تباہی و بربادی کی خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکے، لیکن اگر وہ یہ خیال ترک کر دیں گے اور پہلے کی طرح اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے تو وہ اُن کے ساتھ رہے گا۔ اور آخر میں اُس نے کہا۔ جو راستہ چاہو اختیار کر لو، لیکن یہ یاد رکھو کہ میرے منہ سے چاندی کی کان کے متعلق کبھی ایک لفظ بھی سننے نہ پاؤ گے!

بادشاہ نے کہا "خوب پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟"

"دہقین اپنے پیشوا کی خواہش کے مطابق! وہ سمجھ گئے تھے کہ اُس کا ارادہ نیک ہے، کیونکہ وہ خود بھی ان کی طرح غریب رہنا چاہتا تھا، اور پھر انہوں نے پادری کو صلاح دی کہ وہ دھات کی لکیروں کو سبزی یا مٹی سے ڈھانپ دے تاکہ وہ بھولے سے بھی اسے دریافت نہ کر سکیں!!"

بادشاہ نے پوچھا "اور اُس وقت سے پادری غریبانہ زندگی بسر کر رہا ہے"

"ہاں یہیں دوسرے لوگوں کی مانند رہتا ہے"

"کیا اُس نے شادی کی یا کوئی نیا مکان بنایا؟"

"نہیں اُس بیچارے میں شادی کرنے یا مکان بنانے کی طاقت کہاں تھی وہ اب تک اُسی پرانی جھونپڑی میں رہتا ہے"

بادشاہ نے چند لمحوں کے بعد کہا "بے شک تم نے ایک عمدہ کہانی سنائی ہے! کیا تم اس وقت اسی چاندی کی کان کے متعلق سوچ رہے تھے جب تم نے کہا تھا کہ پادری میرے لئے اتنی دولت مہیا کر سکتا ہے جو میری تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہو گی؟"

"ہاں"

"لیکن تم کس طرح خیال کر سکتے ہو کہ ایک شخص جس نے اپنے محبوب اور اپنی زندگی کی تمام آسائشوں کو تیاگ دیا ہو مجھے کان کا راستہ بتا دے گا؟"

"لیکن یہ معاملہ مختلف ہے ممکن ہے کہ مادرِ وطن کی ضرورت کو محسوس کر کے وہ اس بات پر آمادہ ہو جائے"۔

"کیا تمہیں پورا پورا یقین ہے؟"

"ہاں"

"لیکن کیا وہ اس بات کی بھی پروا نہیں کرے گا کہ اُس کے کسانوں کا کیا حشر ہو گا؟"

"یہ معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے!"

بادشاہ اُٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا اور لوگوں کے گروہ کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ مسکرانے لگا۔ اُس نے پادری سے کہا "تم میری طرف سے پادری کا شکریہ ادا کرنا اور کہہ دینا کہ سویڈن کے بادشاہ کو ان طاقتور نوجوانوں کے دیکھنے سے بڑھ کر اور کوئی خواہش نہیں"۔

اس کے بعد وہ کھڑکی سے پلٹا اور پادری کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا "کیا یہ واقعی سچ ہے کہ یہاں کا پادری اس قدر غریب ہے کہ وعظ کے بعد فوراً اپنا چغہ اتار لیتا ہے اور کسانوں کا سا لباس پہن لیتا ہے؟"

پادری نے کہا "ہاں وہ اتنا ہی غریب ہے" اور اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

بادشاہ اس وقت عجیب کشمکش کی حالت میں تھا آخر اُس نے کہا "تم اب اس کان کو یونہی رہنے دو"۔

پادری نے پوچھا "لیکن اگر سلطنت خطرہ میں ہو تو؟"

"سلطنت کی مدد دولت سے نہیں بلکہ آدمیوں سے ہو سکتی ہے"۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے پادری سے الوداع کہی اور گرجا سے باہر نکل گیا۔

لوگ باہر چپ چاپ کھڑے تھے۔ جب بادشاہ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو ایک کسان اُس کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "کیا آپ نے ہمارے پادری سے گفتگو کی ہے؟"

بادشاہ نے کہا "ہاں، ہم نے اُس سے گفتگو کی ہے"

"تو پھر بلاشبہ آپ کو ہمارا جواب مل گیا ہو گا۔ ہم نے اسی لئے کہا تھا کہ آپ ہمارے پادری سے گفتگو کر کے ہمارا جواب معلوم کر لیں"۔

بادشاہ نے کہا "ہاں مجھے جواب مل گیا ہے!"

سراج الدین احمد نظامی

طلسم حق

طلسم حق ہے اے جاں یہ محبت باہمی اپنی — نظر آئی اس آئینے میں ہم کو ہر کمی اپنی
ہماری کج روش تقدیر ہے تدبیر نیکی کی — عیاں ہے درد کی تنویر سے تصویر نیکی کی
گل امید مایوسی نے دل کو کردیا یکسر — تہی دستی نے خوشیوں کا خزانہ بھر دیا یکسر

طلسم حسن ہے اے جاں محبت کا چمن اپنا — گل و بلبل کے افسانوں کا مسکن ہے وطن اپنا
محبت کے لئے پیدا ہوئے ہیں میں بھی اور تو بھی — مروت کے لئے پیدا ہوئے ہیں میں بھی اور تو بھی
محبت کی کہانی آنکھوں میں تجھ سے تو مجھ سے — مسرت کی کہانی آنکھوں میں تجھ سے تو مجھ سے
مرے پیارے کریں خلوت میں آ مل کر دعا دونوں — ہمیشہ ہم رہیں یک جان و یک دل اے خدا دونوں

طلسم علم دولت ہے مری جاں یہ محبت بھی — فلک کی روشنی کا آشیاں ہے اس کی ظلمت بھی
محبت کی منفعت بھی ہے اک گلشن مسرت کا — ہمیشہ خوش ہے جادو چل گیا جس پر محبت کا
مروت جس کے دل میں ہے، اُسے غم میں بھی راحت ہے — محبت جس کے دل میں ہے اُسے دوزخ بھی جنت ہے

خدا کا شکر ہے جس نے دیا الفت کا غم ہم کو — یہ غم دے کر کیا ہے بے نیاز بیش و کم ہم کو
خدا کا شکر ہے الفت کو یوں زندہ کیا جس نے — چراغ عشق سے ظلمت کو تابندہ کیا جس نے
ہوس ہے موت دل کی اور محبت زندگانی ہے — محبت کی جھلک شمع حیات جاودانی ہے

محبت میں ہماری جان من نیکی ہو خدمت ہو — پیام صد مسرت ہم کو اوروں کی مسرت ہو
جفا کاروں کی دنیا میں وفا سے کام ہو ہم کو — تصور خالق الفت کا صبح و شام ہو ہم کو

فضا میں چار سُو رنگینیوں کا ابر چھا جائے
محبت کے چمن میں حق ہمیں جلوہ دکھا جائے

بہار

قدرتی اشکال میں خم

میرے نزدیک کسی شخص کو اس حقیقت سے انکار نہیں ہوگا کہ وہ تمام اشکال جن کا حسن و جمال مسلم ہے کلیتہً خطوطِ منحنی سے بنی ہوتی ہیں لیکن جو چیز اس جگہ خاص طور پر ثابت کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تمام قدرتی اشکال میں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں لطیف اور نازک خم ناگزیر طور پر موجود ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قلمیں اور بعض کوہستانی اشکال جو قوت، عظمت اور تضاد کا احساس پیدا کرنے کے لئے تصویریں شریک کی جاتی ہیں (جیسے ملبہ کی ڈھلوان سطح) روشنی کی کرنیں، ساکن پانی اور ہموار میدان کی سطح مستوی اور گنتی کے چند نامہاتی مظاہر اگر مستثنیٰ کر دیئے جائیں تو قدرت کا کوئی خط یا سطح ایسی نہیں جس میں انحناء ہو، اگرچہ بادلوں میں، علی الخصوص افق کے قریب ان کے زیریں خطوط میں، اور بڑے بڑے وسیع میدانوں میں اکثر خطوطِ مستقیم کا گمان ہوتا ہے، جو فی الحقیقت موجود نہیں ہوتے! ان کے بغیر وہ گھیرے اور خم جو متضاد کیفیت پیدا کرتے ہیں، ہمارے حواس کو صحیح طور پر متاثر نہ کر سکتے۔ چنانچہ ہماری نظر قدرتی اشکال میں اگرچہ زیادہ تر انحنا کی اُس پاکیزگی سے لطف اندوز ہوتی ہے جس کی نقل کسی صناع کا ہاتھ یا اوزار نہیں اتار سکتا لیکن وہ سطحیں جو محض تضاد پیدا کرنے کی خاطر استعمال کی جاتی ہیں، ان کو خوبصورت بنانے کے لئے دوسرے وسائل مہیا کئے جاتے ہیں جیسے پانی میں انحنائے سطح کی اُس کیفیت کو منعکس کر کے جس سے پانی خود عاری ہوتا ہے۔ نئی ہل چلی زمین میں جسے قدرت کو ابھی اپنے سانچے میں ڈھالنے کا موقع نہ ملا ہو، کانوں اور گڑھوں میں جن کی کھدائی سے قدرت کو کچھ سروکار نہیں ہوتا، غرض زمین کے تمام غیر طبعی صدمات اور اُن کے آثار میں اور عام طور پر بربادی اور مرض کی تمام صورتوں میں خم غائب ہو جاتے ہیں اور بے ہنگم بے جوڑ شکستہ اور بے معنی لکیریں اُن کی جگہ لے لیتی ہیں۔

جان رسکن

حمید احمد خاں

تلاشِ حق

تو نہاں ہے دلِ انساں میں پیدا اُس کی جاں میں ہے	تلاش و جستجو تیری مگر کون و مکاں میں ہے
چھپا کر تجھ کو سینے میں تری خاطر ہوں سرگرداں	عجب کچھ لطف میرے تُو کہاں اور میں کہاں میں ہے
ہجومِ غم میں ہے لاتقنطوا کا شور موجوں میں	مجھے کیا غم جو کشتی میری بحرِ بے کراں میں ہے

مٹا کر اپنی ہستی کاش تجھ میں جا کے مل جاؤں
بڑی مشکل جو ہے مجھ کو وہ عمرِ جاوداں میں ہے

الہ داد خاں وداد

محفلِ ادب

مالن کا گیت

یہ گیت سنسکرت کے ایک چھند "کرادنچ پدا" میں ہے۔ اس بحر میں ہندی اور بنگالی زبانوں میں بہت سے گیت ہیں مگر اردو میں شاید اب سے پہلے کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

جی دکھتا ہے کیسے توڑوں
چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پیاری پیاری کلیاں
لے کانٹے میں سچ سچ کہہ دوں
تیرے سارے پتے وتے میری ساری کلیاں
یا اللہ میں صبح کو پاؤں
ٹھنی ٹھنی اچھی اچھی بھاری بھاری کلیاں
گیت افسر کا ایسا گاؤں
جیسے میرے پودوں والی نیاری نیاری کلیاں

"پیامِ روح"

جاپانی شاعری

دنیا میں سب سے چھوٹی نظمیں اگر کسی زبان میں پائی جاتی ہیں تو وہ جاپانی ہے۔ جاپانی زبان میں کوئی نظم تین چار اشعار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر ان تین چار شعروں میں بہترین جواہر ریزے پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں جاپان کے مشہور شاعر اکیکو یوسانو کی چند بہترین نظموں کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے،

(۱) میرے دل تک پہنچنے کے لئے ہزاروں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرا عاشق ابھی تو شاید ایک یا دو سیڑھیاں ہی طے کر سکا ہے۔

(۲) میری عیادت کے لئے مصیبت کے وقت آنا کیونکہ تصدیقِ محبت کا یہی دن ہے۔

(۳) میں پھول گھر کا وہ تختہ نہیں ہوں جس پر ہمیشہ پھول کھلتے رہتے ہیں۔

(۴) میرے دل کے مانند جو تیرا منتظر ہے گلدستہ آج شب تک مرجھا جائے گا۔

(۵) میرے سوا ایک اور شخص ہے جس کے لئے تُو بے قرار ہے مگر جس کو دیکھ کر میں خونِ جگر پیتا ہوں۔

(۶) یہ عجیب بات ہے کہ محبت کرتے ہوئے دلوں کو تُو دو سمجھتا ہے جب کہ وہ ایک ہو چکے ہیں۔

(۷) عورت کی مصیبتیں دنیاوی مصیبتوں سے پہلے موجود تھیں۔

(۸) رات ہوگئی اور شبنم پڑ رہی ہے مگر آہ اس وقت یہ رونے کی آواز کہاں سے آنے لگی۔

(۹) آج شب کو ہوائیں تندی سے چل رہی ہیں اور میرے گیسوؤں سے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔

(۱۰) تم نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ رات کو کھیت میں ملو گے۔ جب میں اسی امید میں کھیت میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ماہِ کامل چمک رہا ہے۔

(۱۱) بہار نے یہ ممکن کر دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احوالِ دل سن سکیں۔

"نیرنگِ خیال"

یونانِ قدیم اور شاعری و موسیقی

قدیم اہلِ یونان کی زندگی میں شاعری کی اہمیت، اور اس کے ساتھ موسیقی اور دیگر فنون کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے افلاطون کا ایک اقتباس بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا۔

"جب بچہ معمولی نوشت و خواند سیکھ لے اور اس لائق ہو جائے کہ عبارت کو اس طرح سمجھنے لگے جس طرح وہ سننے سے سمجھ لیتا تھا تو اُس کے ہاتھ میں جلیل القدر شعرا کی تصانیف دی جاتی تھیں جن کو وہ مدرسے میں پڑھتا تھا۔ یہ تصانیف کئی ہدایتوں، کہانیوں، مشاہیرِ سلف کی مدح سرائی اور تعریفوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تاکہ وہ اُن کو پڑھے اور اکابر و مشاہیرِ سلف کا ہمسر یا اُن سے برتر بننے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد بربط نواز اساتذہ بھی حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اور اسی فکر میں لگے رہتے تھے کہ اپنے شاگردوں کو توازن اور اعتدال میں رکھیں اور غلط کاری و گمراہی کا شکار نہ ہونے دیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو بلند پایہ جذبات نگار مطرب شعرا کی لطیف نظموں سے روشناس کراتے، ان نظموں کو موسیقی کے سروں میں گاتے اور ان کے وزن و بحر سے بچوں کی روح کو آشنا کر دیتے تاکہ بچے زیادہ شریف، اعتدال پسند اور سنجیدہ مزاج ہو جائیں اور اس طرح ان کے قول و فعل میں بھی ایک توازن و توافق اور اعتدال پیدا ہو جائے اس لئے کہ انسانی زندگی کا ہر شعبہ توازن و اعتدال کا محتاج ہے۔"

"ریاست"

قدرت کی بھیا دوج

(بھیا دوج یعنی کاتک کا دوسرا دن - یہ ایک تہوار ہے جس میں بھائی اپنی بہنوں کو اپنی محبت کی نشانی کے طور پر تحفے دیتے ہیں -)

"بھیا دوج کا یہ پُرطرب تہوار تمام شہروں جنگلوں اور تمام روئے زمین پر منایا جا رہا ہے تمام بہن بھائی خوشی میں ڈوبے ہوئے ہیں -

دھرتی اس جشن کو منانے کے لئے گذشتہ چار ماہ سے تیاریاں کر رہی ہے اور بادلوں سے جو کچھ اُسے لینا تھا اب لے کر اس نے ایک رنگ برنگ کی نہایت زریں اور بھڑکیلی پوشاک پہنی ہے - اُس نے اُن خوبصورت پھولوں کا سنگار کیا ہے، جن کی تیاری کے لئے عناصر یعنی پانی روشنی اور ہوا نے لگاتار محنت کی ہے - اپنی خوشی کی ترنگ میں وہ کسی خاص سنگار کو ترجیح نہیں دیتی - قدرت کی اور دوسری ہستیاں اُس کے چھوٹے بھائی ہیں جن کو اُس نے اس تہوار کی خوشی منانے کے لئے بلایا ہے -

ندی اپنے بھائیوں - کنارے کے درختوں کو اپنی موجوں کے ہلکوروں سے آرتی لیتی ہے اور وہ اس کو دو ایک پھول نذر کرتے ہیں - ان میں سے بعض، جن کے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں، صرف اپنی شاخوں کو خوشی سے ہلا ہلا کر اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اس ہدیۂ محبت کو ندی ہنس کر قبول کرتی ہے کیونکہ یہ تہوار بے لوث محبت کا تہوار ہے، تحائف کے قیمتی نہ ہونے کی اس روز کچھ پروا نہیں کی جاتی -

لہریں اپنے چھوٹے بھائی جھاگ کو سروں پر بٹھا کر کھیلتی اور اُن کو پیار کرتی ہیں -

یہ بھیا دوج بہن بھائی کی محبت کا نمونہ ہے، اے بیل! مجھے بتا، تیرا پیارا بھائی کون ہے؟ کیا یہ خوش نصیب درخت تیرا بھائی ہے جسے اپنی گودی میں لئے ہوئے تو ہمیشہ نہال رہتی ہے؟ بیل نے کہا "یہ جو سنا کرتے تھے کہ شاعر دیوانے ہوتے ہیں، اس کا ثبوت آج ملا، کیا تم نے کسی نیک بخت عورت کو ہمیشہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے ہاں رہتے دیکھا ہے تم ایک شاعر ہو اس لئے شوہر اور بھائی میں تمیز نہیں کر سکتے" میں نے پوچھا "تو پھر بھونرا تیرا بھائی ہے" بیل نے منہ بنا کر کہا "ارے وہ تو صرف ایک بھکاری اور خوشامدی ہے، وہ مجھ سے بے لوث محبت رکھنے والا بھائی کیسے ہو سکتا ہے، اسی طرح سے سورج، ہوا، بادل یہ بھی میرے بھائی نہیں ہو سکتے - وہ تو خدا کے فرشتے ہیں اور میں رشیوں کی طرح اُن کی عزت کرتی ہوں میں نے کہا کہ آخر پھر تُو ہی بتا کہ تیرا بھائی کون ہے؟ بیل نے خوش ہو کر چند پھول مجھ پر برسائے اور کہا "مجھے گا گا کر کون سنایا کرتا ہے؟ وہ شاعر ہے اور وہی میرا بھائی ہے۔"

"زمان" کے پیچھے دن اور رات بھی اس تہوار کو مناتے ہیں۔ بھائی بہت محنتی ہے اور بہن انتہا درجے کی پُرسکون۔ بھائی اور بہن دن میں دو مرتبہ ملتے ہیں، انہوں نے اس تہوار کے منانے کی کیا تیاریاں کی ہیں؟ فیاض بھائی (دن) نے اپنا سب کچھ جو خصوصیت کے ساتھ اُس کا ہے اپنی بہن رات کو دے دیا، رات آتشبازی کے چھٹنے اور مکانوں کو روشن کرنے کی وجہ سے دن کے مانند روشن ہوگئی ہے۔ تمام رنگ رلیاں رات ہی کے لئے اٹھا رکھی جاتی ہیں۔ ایک بھائی اپنی بہن کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔

"اردو"

چینی زبان

چینی زبان خیالات کے اظہار کے لئے کافی صلاحیت نہیں رکھتی اس زبان میں جو حرفی الفاظ زیادہ ہیں۔ ہر لفظ کے لئے ایک جداگانہ علامت معین ہے جو شاید ابتداً میں کسی خیال کی عکاسی کے لئے ایجاد ہوئی تھی۔ ساتویں صدی کے آخر میں شاہی احکام کے بموجب ایک عظیم الشان چینی لغت تیار کی گئی تھی اس میں پنتالیس ہزار اسی طرح کے علامات لفظی جمع کئے گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تلفظ ایک ہی سا ہے۔ ایک دوسرے کے معانی کا فرق محض زبان کے مختلف لہجوں سے کیا جاتا ہے۔ خیالات اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ اس لغت میں اب بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن حقیقتاً چند ہزار ہی الفاظ ایسے ہیں جو عام طور پر زبان پر مشتمل ہیں۔ چینی عبارات تحریر کرنے میں علاماتِ لفظی اوپر سے نیچے کی جانب لکھے جاتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ ان علامات کی شناخت اور استعمال میں مہارت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر قومی زبان میں رسل و رسائل کے لئے کوئی دقت واقع نہیں ہوتی لیکن یہ طرزِ تحریر کانوں کی بہ نسبت آنکھوں کو زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

چونکہ لہجوں کے ذرا ذرا سے اختلاف سے لفظوں میں مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے لازمی طور پر لوگوں کی بول چال میں بڑا فرق ہے۔ یہاں تک کہ شمالی صوبوں کے باشندے جنوبی صوبوں کے باشندوں کی زبان اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اپنے مافی الضمیر کی توضیح تحریر میں صراحت کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں عدالتی زبان ہی عام طور پر مروج ہے۔ اس زبان میں معلومات و مہارت بہم پہنچانا بہت دشوار ہے۔ لیکن غیر ممالک کے لوگ جو چین میں رہتے ہیں یا تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں وہاں آتے جاتے ہیں دوسری زبانوں سے بگڑی ہوئی چینی استعمال کرتے ہیں۔ اکثر بندرگاہوں پر غیر ممالک کے تجار کی آمد و رفت و قیام سے ایک مخلوط زبان پیدا ہوگئی ہے۔ خصوصاً پرتگالی و انگریزی الفاظ بہت کثرت سے ملکی زبان میں شامل ہوگئے ہیں۔

"مبصّر"

تبصرہ

طبقات الامم مصنفہ قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی دنیا کی مختلف قوموں اور خصوصاً مسلمانوں کے علوم و فنون کی تاریخ ہے۔ قاضی ساعد اندلس کے اسلامی عہد کے قابل ترین علما میں سے گزرے ہیں اور یہ کتاب اُن کی ایک عظیم الشان علمی یادگار ہے۔ اس میں قرونِ وسطیٰ کے علوم و فنون کے حالات درج ہیں اور اقوامِ عالم کے متعلق بہت سی مفید اور کارآمد باتیں اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھی ہیں۔ اردو زبان میں اس کتاب کا ترجمہ قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی نے کیا ہے ترجمہ نہایت اچھا ہے۔ مترجم نے حواشی لکھ کر کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحات اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ مطبع معارف اعظم گڈھ سے طلب فرمائیے۔

خزائن الفتوح ۔حضرت امیر خسرو دہلوی نے نثر کی دو کتابیں لکھی ہیں۔ اعجازِ خسروی اور خزائن الفتوح۔ خزائن الفتوح سلطان علاؤالدین خلجی کی لڑائیوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی مختصر تاریخ ہے جو سلطان موصوف ہی کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی اور جسے ایک ایسے شخص نے لکھا جو خود فنِ سپہ گری کا ماہر تھا۔ اب تک صرف چند کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود تھے اور تاریخ کے طلبا عام طور پر اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے ہمیں سلطانیہ انجمنِ تاریخ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے برٹش میوزیم کے مسودۂ کتاب سے دو ایک مسودوں کا مقابلہ کر کے تصحیح کے خاص اہتمام کے ساتھ اُسے شائع کر دیا ہے۔ حجم دو سو صفحات سے زیادہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ، انجمن تاریخ جامعۂ اسلامیہ علی گڈھ

پیامِ روح جناب حامد اللہ صاحب افسر بی اے کے کلام کا مجموعہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے (۱) نغماتِ الصغر میں اوائلِ عمر کا کلام ہے۔ (۲) روحِ جذبات میں ۱۹۱۹ء سے لے کر اس وقت تک کی نظمیں ہیں اور (۳) پرتوِ افکار میں فلسفیانہ اور فکری شاعری ہے۔ کتاب کی طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ سرخ جدول سے مزین ہے کاغذ عمدہ اور دبیز ہے اور حجم اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ہے بعض نظموں کے ساتھ رنگین تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ چنانچہ ساری کتاب میں ہندوستانی مصوری کے چھ خوبصورت نمونے ہیں۔

جناب افسر نوجوان شعرا میں بہت اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ موسیقی، جدتِ خیال اور سلاستِ بیان ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں، حبِ وطن اخلاق اور روحانیت سے اُن کا کلام پُر ہے اور ان کے اشعار میں قناعت، غم اور یاس کے ساتھ ساتھ عمل، مسرت اور امید کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

نغمات الصغر کی بعض نظموں میں گو اتنی بلندی اور پختگی نہیں جتنی بعد کے کلام میں ہے لیکن اس میں بھی افسر کی طبیعت کا اصل جوہر موجود ہے۔ حمد میں پہاڑوں کی بلندی کے متعلق یہ کتنا انوکھا خیال ہے:

بلندی پہاڑوں کو دی اس قدر | کہ تھکتی ہے چوٹی پہ جا کر نظر

وطنیت کے جذبے کے علاوہ ان اشعار میں کتنی دلکشی ہے:

پیارے پھول اور پھل بھارت کے | پیارے سب جنگل بھارت کے
پیارے آج اور کل بھارت کے | پیارے جل اور تھل بھارت کے

بھارت پیارا بھارت پیارا

سوزِ جذبات میں دولت مند جوگی، سائل، شاعر، لوری، خضر کا کام اور تربینی بہت اچھی نظمیں ہیں خلقِ خدا کی محبت اور نیکی کی تڑپ ہر انسان کے دل میں ہونی چاہئے افسر نے اس جذبہ کو کس قدر موثر پیرایہ میں لکھا ہے۔

درد جس دل میں ہو اُس دل کی دوا بن جاؤں | کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دکھ میں جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں

اُف وہ آنکھیں کہ ہیں بینائی سے محروم کہیں | روشنی جن میں نہیں نور جن آنکھوں میں نہیں
میں اُن آنکھوں کے لئے نور و ضیا بن جاؤں

دور منزل سے اگر راہ میں تھک جائے کوئی | جب مسافر کسی رستے میں بھٹک جائے کہیں
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

پرتوِ افکار میں حکمت اور فلسفہ ہے لیکن اس خشک موضوع کو بھی افسر نے اکثر دلآویز انداز میں بیان کیا ہے مندرجہ ذیل اشعار اس کا ثبوت ہیں:

رہبر خود گمراہ ہوئے ہیں آج زمانہ ایسا ہے | ہر اک گام پہ منزل ہوگی وہ بھی زمانہ آئے گا
دولت ہے نیکی میں داخل آج زمانہ ایسا ہے | دولت جرم میں داخل ہوگی وہ بھی زمانہ آئے گا
آج اندھیرا ہے ہر گھر میں آج زمانہ ایسا ہے | جگ مگ جگ مگ محفل ہوگی وہ بھی زمانہ آئے گا

کتاب کی قیمت تین روپے مقرر کی گئی ہے۔ انڈین پریس الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

دلچسپ۔ ایک ماہوار رسالہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر لاہور سے پنڈت نند کشور صاحب شائق کی ادارت میں گزشتہ فروری سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے دو نمبر ہم دیکھ چکے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ رسالہ واقعی اسم با مسمیٰ ہے۔ فروری کے پرچے میں میاں حفظ الرحمٰن صاحب کا مختصر مقالہ ایثار ٹیکا، لالہ جسونت رام صاحب کا مضمون بچوں کی تربیت اور بابو شوبرت لال صاحب کا افسانہ سیدھے لال اور ٹیڑھے لال خوب ہیں اور مارچ کی اشاعت میں میرزا نعیم بیگ صاحب کا افسانہ محمدی بوا تاثیر سے بھرا ہوا اور دلچسپ ہے۔ کارپردازانِ رسالہ نے میرزا صاحب موصوف کے بلند پایہ مضامین حاصل کرنے کا خاص انتظام کیا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ معمولی ہے حجم ۸۰ صفحات اور قیمت دو روپے سالانہ ہے۔ پتہ منیجر رسالہ دلچسپ، اسچدیو بلڈنگ چوک متی لاہور۔

فہرست مضامین

جلد ۱۵ — نمبر ۵

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۹ء

تصویر: تعلیم، ایک سنگتراش کے تصور میں

پھولوں کے دن

پھولوں کے دن
جھولوں کے دن
کھیلوں کے دن
میلوں کے دن
یہ دن یہ راتیں کب تلک؟ میٹھی سی باتیں کب تلک؟
آئے گی آخر وہ گھڑی
ٹوٹے گی جاں کی جب لڑی
چھوٹے کا سب کا ساتھ جب
مل دیں گے خالی ہاتھ جب
یہ رنگ رلیاں پھر کہاں؟ یہ پھول کلیاں پھر کہاں؟

گیتوں کے دن
پریتوں کے دن
چاہت کے دن
راحت کے دن
مل کر یہ گانا کب تلک؟ ہنسنا ہنسانا کب تلک؟
یہ راحتیں ہیں چار دن
یہ چاہتیں ہیں چار دن
باہم یہ چاہت پھر کہاں؟ باہم یہ راحت پھر کہاں؟

اِک خواب سے جیسے کبھی
پیدا ہوئی تھی زندگی
اک خواب کے اندر کبھی
ویسے ہی پھر کھو جائے گی!

ب ا

وڈاؤسن

جہاں نما

چین میں مرد عورتوں سے کیوں زیادہ ہیں

یورپین محققین کے نزدیک چین کی آبادی کا یہ ایک حیرت انگیز پہلو ہے کہ اس میں بالغ مردوں کی تعداد بالغ عورتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ چین کے ہر پانچ نوجوانوں میں جو شادی کے قابل ہیں ایک شخص کو بیوی کے بغیر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور جب اس امر کو مد نظر رکھا جائے کہ چین کے بہت سے زراعت پیشہ خاندانوں کے پاس کاشت کے لئے کافی زمین نہیں ہوتی تو پھر یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ چینی مرد کیوں سپہ گری یا قزاقی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؟ اس وقت چین میں قریبًا بیس لاکھ ایسے آدمی ہیں جن کی نہ کوئی جورو ہے نہ کوئی گھر۔ چین کی فوجی جمعیت بھی آج قریب قریب اسی قدر ہے۔ چینی سپاہیوں کی رجمنٹ یا پلٹن کو توڑنے سے پہلے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کے لئے کسی جگہ آباد ہونے کے وسائل بہم پہنچائے۔ انہیں اپنے آبائی گھروں کی طرف بھیجنا بے فائدہ ہے کیونکہ وہاں بیوی نہیں جو اپنے خاوند کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کرے گی۔ نہ کوئی زمین کا ٹکڑا ہے جس میں وہ ہل چلا سکے گا۔ نہ کوئی تجارت ہے جس سے وہ نفع اٹھائے گا غرض کہ شہروں میں خدا کی اس مخلوق کے لئے کوئی دلبستگی، کوئی کشش نہیں۔ حکومت اپنی رعایا کے لاکھوں افراد کی بے کاری کے مسئلہ کو صرف اسی طریقہ سے حل کر سکتی ہے کہ اُن کے لئے ایک وسیع پیمانہ پر کام مہیا کرے۔

"چائنا جرنل" اس اہم مسئلہ کے متعلق لکھتا ہے: چین میں مردوں کی زائد تعداد کے لئے بیویوں کے بہم پہنچانے کا سوال ایسا نہیں ہے جو بہت جلد حل ہو سکے۔ درحقیقت اس مسئلہ کا تعلق چین کی تعلیمی ترقی اور دماغی نشو و نما سے ہے۔
عورتوں کی کمی کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ چین میں لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کو بہت حقیر خیال کیا جاتا ہے۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہے کہ بچپن میں لڑکیوں کی غور و پرداخت پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ جماعتوں میں قدیم الایام سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جاتے لیکن لڑکوں کے متعلق والدین کے سینوں میں یہ وحشیانہ اور قاتلانہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔ دختر کشی کی یہ قبیح اور ناپاک رسم بتدریج مٹ رہی ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ جو ننھی لڑکیاں بڑی ہو کر چینی فوج کے موجودہ نوجوان سپاہیوں کی بیویاں بننے والی تھیں وہ پیدا ہوتے ہی والدین کی جہالت اور وحشیانہ پن کا شکار ہو گئیں۔ عورتوں کی قلت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ لڑکیوں کو

بہت بُری حالت میں رکھا جاتا ہے۔ کسی چینی گاؤں میں آپ چلے جائیے وہاں آپ کو ایک والدین کے دو بچوں کی پرورش اور تربیت میں جن میں سے ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی یا ایک بھائی ہے اور دوسری بہن ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔ لڑکے کو بہترین خوراک دی جاتی ہے لیکن اس کی بدقسمت بہن کو بچے کھچے ٹکڑوں پر گذارہ کرنا پڑتا ہے لڑکے کی پرورش اور تربیت پر خاص توجہ کی جاتی ہے لیکن لڑکی اس توجہ کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ لڑکی اپنے والدین کے گھر میں مصیبت اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ جب وہ شادی کے بعد اپنے خاوند کے گھر جاتی ہے تو وہاں بھی اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ خاوند کے گھر میں اسے اپنی ساس کے جور وجفا کا تختۂ مشق بننا پڑتا ہے۔ وہ گھر کی مالک نہیں بلکہ لونڈی ہے جسے ہر قسم کی محنت و مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے چین کی مزدوری پیشہ جماعتوں میں اس امر کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ عورتوں کے حقوق کا احترام کیا جائے۔ جب چین کی نسوانی دنیا میں انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ اور چینی والدین اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو ویسا ہی ضروری سمجھیں گے جیسا کہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت کو تو پھر ایک نسل کے بعد چین کی آبادی میں عورتوں کی کمی کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اس وقت چین میں مردوں کی غیر معمولی زیادتی خود چین کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے لیکن اگر چینی سپاہی اُن برکتوں سے بہرہ اندوز ہو جو صرف گھر اور گھر والی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں تو یہ خطرہ خیر و برکت میں منتقل ہو سکتا ہے۔"

چین کی موجودہ نسوانی تحریک جو بڑے بڑے شہروں میں بسرعت تمام پھیل رہی ہے بہت امید افزا ہے۔ مغربی تہذیب اور زمانہ کے انقلابات نے چینی گھرانوں میں بیداری اور ترقی کی ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔ لوگ پرانی رسموں کو ترک کر رہے ہیں اور یورپین وضع اختیار کر رہے ہیں۔ عورتوں کے پاؤں اس قدر چھوٹے اور کمزور ہوتے تھے کہ وہ تیز قدم اٹھانے سے بالکل معذور تھیں۔ ان کے پیروں کی نشوونما کو ایک خاص طریقہ سے روک دیا جاتا تھا۔ مگر اب یہ وحشیانہ رسم حرفِ غلط کی طرح مٹ رہی ہے۔

جرمنی کے سائنس دانوں نے جنگ کے قیدیوں سے کیا کام لیا

جب اتحادیوں کے قیدی جرمنی میں پہنچے تو وہاں کے سائنس دانوں نے ہندوستانی قیدیوں کے اس اجتماع کو جو مختلف فرقوں اور جماعتوں پر مشتمل تھا اپنی علمی تحقیقات کے لئے غنیمت سمجھا۔ وہ اپنے معملوں سے نکل کر قیدیوں کے کیمپ میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے نہ صرف قیدیوں کی عکسی تصویریں اتاریں بلکہ ان کی زبان اور رسم و رواج

کے متعلق بھی پوری تحقیقات کی۔ انہوں نے ان کی بولی اور گیتوں کو فونوگراف کے ریکارڈوں میں بھر لیا، جو آج جامعۂ برلن کے شعبۂ علمِ تلفظ" کی نہایت قیمتی جائداد خیال کئے جاتے ہیں۔ جرمنی اپنے اس دعوے میں بالکل حق بجانب ہے کہ دنیا کی کسی قوم یا حکومت کے پاس ہندوستان کی ملکی زبانوں کا اس قدر مکمل ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ جرمنوں کی روشن خیالی اور علم دوستی کی یہ ایک روشن مثال ہے کہ انہوں نے جنگ کے ہندوستانی قیدیوں کی بدولت اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

انگریزی دیہات میں تعلیم

سر مائیکل سیڈلر نے جو تعلیم کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں رسالہ "انگلش ریویو" میں انگلستان کے دیہات کی تعلیمی ضروریات کے متعلق حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:-

وقت آگیا ہے کہ انگلستان کے بعض دیہات میں ساسٹن کے دیہاتی کالج کی طرح چھوٹے چھوٹے دیہاتی کالج قائم کئے جائیں۔ ساسٹن کے دیہاتی کالج کی تعمیر کا سہرا کیمبرج شائر ایجوکیشن کمیٹی کے سکرٹری مسٹر ہنری مارس کے سر ہے جنہوں نے جب اس کام کا بیڑا اٹھایا تو بہت سے روشن خیال اور فیاض آدمی اُن کا ہاتھ بٹانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انگلستان کے لوگوں میں موسیقی اور آرٹ سے بہرہ اندوز ہونے کی خواہش ان شعبوں میں ملک کی ترقی کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ معاشرتی تعلقات میں مسرت کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ دیہاتی علاقہ کے دلآویز مناظر اور شہروں میں فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونوں کے متعلق ان کی دلچسپی کو بڑھایا جائے تاکہ اُن کے دماغ روشن ہوں۔ تمدن اور تہذیب کا دائرہ زیادہ وسیع کیا جائے۔ دیہات میں ایسی عمارتوں کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے جلد عملی تدابیر اختیار کی جائیں جو اس جدید تہذیب کا مرکز اور گھر ہوں۔ ان عمارتوں میں موسیقی کے آلات، تصویریں، نقشے اور مجسمے ہوں۔ نفیس لیکن سادہ وضع کا سامانِ خانہ داری پارچات اور ظروف ہوں۔ کتابیں ہوں (جن میں فرضی قصے بھی شامل ہوں)۔ کتابوں کے انتخاب کے متعلق مشورہ کا انتظام ہو۔ باقاعدہ مطالعہ اور علم کی تحریص و ترغیب کے لئے جماعتیں قائم کی جائیں اور لیکچر ہوں۔ ہم ان تمام ضروریات کو پہلے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں، اور چونکہ ہمیں ان میں زیادہ مسرت معلوم ہوتی ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں یہ تمام چیزیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ہمارے خیال میں زندگی کا اور ان چیزوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے جس سے جماعتی اتحاد کا ایک نیا جذبہ مترشح ہوتا ہے اور جس سے صرف ہماری

انفرادی زندگی کی آرائش ہی مقصود نہیں ۔ بالغوں کی تعلیم کے لئے آلۂ نشر صوت کا استعمال، گراموفون، عمدہ کتابوں کے سستے ایڈیشن، دیہاتی علاقوں میں کتب خانوں کے لئے کارنیگی ٹرسٹ کا نظام، انگلستان کے مختلف حصوں میں موسیقی کی تقریبیں، برطانیہ کے نوجوان مصوروں اور نقاشوں کے کارناموں کی نمائش آرٹس لیگ آف سروس کی سرگرم کوششیں، تقریریں اور یونیورسٹیوں اور مزدوروں کی تعلیمی انجمن کی نمایندہ مشترکہ کمیٹی کے زیر اہتمام تعلیمی سرگرمیاں ۔۔ یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو رائے عامہ کے نزدیک ایک زبردست تحریک کی علامات ہیں"۔

"لاسلکی" اور موسم

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ موسم پر "لاسلکی" کا اثر ہوتا ہے درحقیقت بالکل بے بنیاد ہے ۔ موسم کے اختلاف کی وجوہ فضا میں "لاسلکی" کی موجودگی کے مقابلہ میں بے اندازہ طور پر طاقتور اور اہم ہیں ۔ مثال کے طور پر صرف بارش کے لئے جتنی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اُس کا تصور بھی ہم نہیں کرسکتے ۔ ایک مربع میل کے رقبے میں ۱/۲ انچ بارش کے لئے جتنی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس توانائی کے برابر ہے جو ایک کروڑ گھوڑوں کی طاقت والے انجن سے آدھے گھنٹے کے اندر پیدا ہو ۔ بمقابلہ اس کے وہ برقی مقناطیسی توانائی جو تمام دنیا کے مقامات انتشار سے پیدا ہوتی ہے محض بے حقیقت ہے ۔ ذرا تصوّر تو کیجئے کہ اگر ایک مربع میل کے رقبہ پر ۱/۲ انچ بارش کے لئے اس قدر توانائی کی ضرورت ہے تو اُن عالمگیر بارشوں پر کتنی توانائی صرف ہوتی ہوگی جن سے جل تھل ہو جاتے ہیں ۔

گلیلیو کی عمر پچیس سال کی تھی کہ وہ سائنس اور ہیئت کا فارغ التحصیل ہوگیا اور اُس کی مہارتِ فن کی اتنی شہرت بڑھی کہ فرڈی نینڈ ڈیوک آف ٹسکنی نے اس کو ۱۵۸۹ء میں پسہ کی یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے تحقیقات کی کہ کسی بلند مقام سے گرنے والی شے پہلے سیکنڈ میں ۱۶ فیٹ دوسرے سیکنڈ میں ۴۸ فیٹ اور تیسرے سیکنڈ میں ۸۰ فیٹ گرتی ہے۔ گویا اس طرح گرنے والی شے کی رفتار ہر سیکنڈ میں ایک خاص تناسب کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اس انکشاف نے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر ہوا نہ ہو اور ایک بھاری اور ایک ہلکی شے بلندی سے گرائی جائے تو زمین پر دونوں ایک ہی ساتھ پہنچیں گی۔

گلیلیو کی ایسی تحقیقات اور اس قسم کے خیالات نے لوگوں کو ناخوش کردیا اور وہ خواہ نخواہ اس سے بگڑ بیٹھے کیونکہ ان خیالات کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ انہوں نے گلیلیو کو تکلیف دینی شروع کی، اس کو ناراض کردیا۔ آخرکار ۱۵۹۲ء میں تنگ دل ہوکر اُس نے ترکِ وطن کا ارادہ کرلیا اور پیڈوا[۵۱] کو چل دیا۔ یہاں آکر اُس نے یہ تحقیقات کی کہ طاقت کی ایک مقدار اگر چار پونڈ وزن کو دو فیٹ اونچا اٹھا سکتی ہے تو وہی مقدار دو پونڈ وزن کو چار فیٹ بلند اٹھا سکتی ہے۔ گلیلیو نے یہ بھی دریافت کیا کہ آواز ہوا سے ٹکر کھانے والے جسم کی لرزش کا نتیجہ ہے لرزشیں جس قدر زیادہ ہوں گی آواز بھی اُتنی ہی اونچی ہوگی۔ اگر آواز اونچی نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ لرزشیں کم تھیں۔

اب سترھویں صدی شروع ہوگئی تھی اگر دیکھا جائے تو فنِ ہیئت میں اہلِ یورپ کی اصلی ترقی اسی صدی سے شروع ہوتی ہے اور گلیلیو کی دوربین کے ذریعے سے ثوابت و سیار کی عجیب عجیب کیفیات مشاہدہ کی جاتی ہیں۔ گلیلیو اپنے فن کا امام تھا۔ وہ جہاں جاتا ذی شعور لوگ اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اہلِ پیڈوا نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے ہاں کی یونیورسٹی میں ریاضی کی پروفیسری پر مقرر کردیا۔ یہاں رہ کر گلیلیو نے کوپرنیکس[۵۲] کے

---

۵۱ وینس سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر اٹلی کے جانب شمال ایک خوبصورت شہر ہے۔

۵۲ کوپرنیکس پولینڈ کے قصبۂ تھورن میں ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا۔ سائنس کا نہایت دلدادہ تھا ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ شہرِ روما میں ریاضی کا پروفیسر مقرر کیا گیا لیکن ۱۵۰۰ء میں واپس آیا پھر شہر فروینبرگ میں منسٹری کی خدمت قبول کرلی۔ اسی خدمتِ مذہبی کی انجام دہی کے زمانے میں اس نے بطلیموس کے قائم کردہ نظام کی تحقیق شروع کی جس میں زمین مرکزِ کائنات بتائی گئی ہے۔ لیکن اس کی تشفی نہ ہوتی تو فیثا غورث کے اصول پر گہری نظر ڈالی جو آفتاب کو مرکزِ کائنات اور تمام سیاروں کو اس کے اطراف گردش کرنے والا بتاتا ہے۔ یہ رائے اس کو قرینِ قیاس معلوم ہوئی۔ مزید اطمینان کے لئے اُس نے اپنے ایجاد کردہ آلہ ربع دائرہ سے کام لیا۔ جو زاویہ ناپنے کے کام آتا ہے۔ کوپرنیکس کو فیثا غورث کے اصول کی تحقیق میں اس آلے

(دیکھو صفحہ ۴۹۶)

اُس نظام کی تحقیقات شروع کی جو باتباعِ حکیم فیثاغورث[51] قائم کیا گیا تھا۔ فیثاغورث وہ حکیم ہے جس نے مسیح سے ساڑھے پانسو سال قبل اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ سیارے مع زمین فضائے غیر متناہی میں آفتاب کے اطراف گردش کر رہے ہیں لیکن فیثاغورث کا نظام بہت جلد ٹوٹ گیا اور اُس کی جگہ نظامِ بطلیموس[52] نے لے لی۔ بطلیموس کا خیال تھا کہ زمین مرکزِ کائنات ہے اور سورج اور دیگر سیارے اس کے گرد گردش میں ہیں۔ اگرچہ مسیح سے تین سو برس پہلے حکیم اسٹارخس[53]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۵) سے بڑی مدد ملی اور اُس نے کہا حق یہی ہے کہ آفتاب مرکزِ کائنات ہے۔ اُس نے اپنی کتاب حرکاتِ اجرامِ فلکی کے ذریعہ سے دورِ ارض اور مرکزِ شمس کی تعلیم دی لیکن ساٹھ سال تک جب تک کہ گلیلیو نے اپنے معلومات کو شائع نہیں کیا اس کی کتاب کی بڑی بے قدری رہی۔ کوپرنکس (۷۰) سال کی عمر پاکر ۱۵۴۳ء میں فوت ہوگیا۔

۵۱ فیثاغورث یونانی حکما میں نہایت نامور اور فاضل شخص گذرا ہے سنہ ۵۶۶ قبل مسیح پیدا ہوا اور سنہ ۴۷۰ قبل مسیح فوت ہوا ملک مصر میں بہت دنوں تک علومِ طبعیہ کی تعلیم پائی، پھر اطالیہ کے شہر مارنٹیم میں بود و باش اختیار کی دنیا میں سب سے پہلے اسی نے بتایا ہے کہ زمین ساکن نہیں بلکہ مثل اور سیاروں کے آفتاب کے گرد پھر رہی ہے علم الارض کی بہت سی باتیں تحقیق کیں۔ اسی نے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر بتایا کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد خشکی پر سمندر آجاتے ہیں اور سمندر کی جگہ خشکی لے لیتی ہے۔ اسی حکیم نے قدرتی انقلابوں کو نہایت تجسس اور باریک بینی کے ساتھ دیکھا اور یہی پہلا عالم و فاضل تھا جس کو فیلسوف کا خطاب دیا گیا۔ موسیقی میں سارنگی اسی کی ایجاد ہے۔

۵۲ بطلیموس کی تاریخ پیدائش و وفات کا صحیح حال معلوم نہیں ہوسکا بہرحال یہ حکیم سنہ ۱۵۰ء میں گزرا ہے۔ یہ ایک زبردست ہیئت دان تھا۔ اس نے اپنا ایک مستقل اور باقاعدہ نظام قائم کیا تھا جس کی تحقیقات اور اصول نہایت پیچیدہ ہیں۔ اس نے ایک کتاب مجسطی نامی لکھی جس میں آفتاب، اور ثوابت و سیار کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں اُس نے زمین کو ساکن اور مرکزِ کائنات تسلیم کیا ہے۔ اس کے اصول کچھ ایسے مدلل اور اطمینان بخش تھے کہ چودہ سو برس تک ہیئت دان اس کے قائل رہے، یہاں تک کہ کوپرنکس نے ثوابت و سیار کی اصلی اور صحیح حرکتیں دریافت کرکے اس کے مذہب کو باطل کردیا۔

اسی حکیم نے علمِ جغرافیہ پر ایک باوقعت کتاب لکھی تھی جو ڈیڑھ ہزار برس تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہی اُس نے اپنے زمانے کی دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا تھا اور عرض البلد و طول البلد بھی قائم کئے تھے۔ انگریز اس حکیم کو کلاڈیس بطلیمی کہتے ہیں۔

۵۳ اسٹارخس مسیح سے قریباً تین سو برس پہلے گزرا ہے۔ اس کا مولد شہر ساموس تھا۔ اس نے اسکندریہ میں تعلیم پائی۔ فیثاغورث کے مانند اس حکیم نے بھی دریافت کیا کہ زمین آفتاب کے اطراف گردش کر رہی ہے اور جب وہ اپنے مدار کا چوتھائی حصہ طے کرلیتی ہے اور قطبِ شمالی آفتاب کی طرف ہوتا ہے تو گرمیوں کا موسم ہوتا ہے اور جب قطبِ جنوبی (دیکھو صفحہ ۳۹۷)

نے بھی یہ تعلیم دی تھی کہ زمین آفتاب کے گرد ایک دائرے پر اس طرح حرکت کرتی ہے کہ اُس کا محور اُس پر عمود نہیں بلکہ جھکا ہوا رہتا ہے جس سے موسم بدلتے ہیں اور محوری گردش سے دن رات پیدا ہوتے ہیں لیکن فیثاغورث کی طرح لوگوں نے اسے بھی کافر ٹھہرایا اور یہی وجہ تھی کہ ان حکما کے معلومات سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے اور ان کے اصول کی تلقین ان کے خاص خاص احباب تک ہی محدود رہتی تھی۔ بہرحال بطلیموس کی کتاب مجسطی نے اپنا سکّہ جمایا اور تقریبًا پندرہ سو برس تک اُس کی رائے کی تقلید کی گئی اور اکثر ہیئت دان زمین کو مرکز کائنات سمجھتے رہے وہ شخص جس نے سب سے پہلے اس نظام کے خلاف آواز بلند کی اور فیثاغورث اور اسٹارخس کی تعلیم کو زندہ کیا وہ حکیم کوپرنیکس تھا جس نے دونوں فریقوں کی رائے اور اصول کا مطالعہ کیا اور بطلیموسی نظام کو مشاہدات و تجربات کے خلاف پا کر فیثاغورث کی رائے کو تسلیم کیا اور اپنی کتاب "حرکاتِ اجرامِ فلکی" میں لکھ دیا کہ زمین آفتاب کے گرد پھر رہی ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے خیالات بھی حقائقِ الہامی کے خلاف سمجھے گئے اور پاپائے پال ثالث نے اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۶) آفتاب کی طرف ہوتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے لیکن جب دوسرا چوتھائی حصہ طے کرتی ہے تو قطبِ جنوبی میں موسمِ بہار اور قطبِ شمالی میں موسمِ خزاں ہوتا ہے اور جب اپنے مدار کا تیسرا چوتھائی حصہ طے کرتی ہے تو قطبِ شمالی میں جاڑا اور قطب جنوبی میں گرمی ہوتی ہے اور جب اور چوتھائی حصہ طے کرتی ہے تو شمالی قطب میں موسمِ بہار اور جنوبی قطب میں موسمِ خزاں ہوتا ہے۔ اسی حکیم نے بتایا کہ یہ موسمی تبدیلیاں زمین کے اپنے محور پر آفتاب کے گرد ترچھی ہو کر گھومنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اس مسئلہ کی بھی اسی حکیم نے تحقیق کی کہ دن اور رات زمین کی محوری گردش سے پیدا ہوتے ہیں اور موسمی تبدیلیاں سالانہ گردش سے وقوع میں آتی ہیں۔

۵۱ یہ کتاب ۱۵۳۰ء میں لکھی گئی لیکن ۱۵۴۳ء میں شائع ہوئی کوپرنیکس نے ۳۶ سال تک اس کتاب کو اس خوف سے مخفی رکھا کہ شائع ہوتے ہی خدا جانے کیا آفت ٹوٹ پڑے لیکن اپنے دوست پادری شونبرگ کے اصرار پر اُس نے کتاب مطبع میں بھیجی افسوس کہ کتاب کا ایک نسخہ چھپ کر کوپرنیکس کے پاس اُس وقت پہنچا جب وہ بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ کتاب کا وہی حشر ہوا جس کا دھڑکا تھا یعنی شائع ہونے کے بعد کتاب ملحدانہ قرار دی گئی اور اُس کی نسبت کہا گیا کہ یہ باطل فیثاغورثی مذہب کتبِ مقدسہ کی ضد ہے۔

۵۲ اصلی نام ایلی سیانڈرو فارنسی تھا ۲۸ فروری ۱۴۶۸ء میں پیدا ہوا معزز خاندان کا شخص تھا لیکن نہایت آزاد اور عیاش طبیعت تھا۔ اس کی ترقی اور ناموری کا باعث اس کی معشوقہ تھی جو الگزنڈر ششم کی بہن تھی۔ پوپ کلیمینٹ ہفتم کی وفات کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۵۳۴ء میں اس نے اُس گروہ کی قوت کو شکست دی جو مذہبِ عیسوی کی (دیکھو صفحہ ۳۹۸)

کی تحقیقات کو ملحدانہ قرار دے کر اس کتاب کا پڑھنا داخلِ جرم بتایا، لیکن بادشاہت ہمیشہ سچائی نے کی ہے جب کوپرنیکس بسترِ مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا تو وہ کہہ رہا تھا کہ زمین آفتاب کے گرد پھر رہی ہے۔

گلیلیو پیدا ہوا اور علومِ طبیعیہ کے سچے اصول نے اہلِ مذہب کے غلط اور جابرانہ اصول کو شکست دی۔ اس نے دوربین کی ایجاد کی، زہرہ و عطارد کو ہلال و بدر کی صورت میں دکھایا اور تمام دنیا کو یقین دلا دیا کہ فیثاغورث استارخس اور کوپرنیکس کے سچے اصول کتنے صحیح تھے لیکن پادریوں کے طرزِ تعدی سے جس کا ذکر ہم آیندہ کرنے والے ہیں اُس نے بھی نجات نہ پائی۔

دوربین کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ زکیرس جانسن نامی اور ہنری لپرشی نامی دو چشم ساز رہتے تھے۔ جانسن کے بچے ایک دن دو شیشے کے ٹکڑوں سے کھیل رہے تھے۔ اور اُن کے گھر کے سامنے ایک گرجا تھا۔ انہوں نے ان دونوں ٹکڑوں کو پاس پاس رکھ کر جا کے مینار کو دیکھا تو وہ ان شیشوں سے بڑا اور نزدیک دکھائی دیا۔ بچوں کے لئے دلچسپی کا یہ ایک مشغلہ تھا جانسن کو خبر ہوئی اُس نے بھی یہ تجربہ کیا۔ چونکہ یہ ایک نئی بات تھی جانسن نے ان دونوں ٹکڑوں کو ایک نے میں سلیقہ کے ساتھ جوڑ کر ناسو کے شہزادے کے پاس بطور نذر گزرانا۔ ۱۹۰۶ء میں جانسن اور پرشی نے اسی طرح کے اور کھلونے بھی بنائے لیکن وہ کیا جانتے تھے کہ یہ کھلونے کس کام آنے والے ہیں اور اُن سے آسمان کی کیسی دلچسپ سیر ہوگی۔ کہتے ہیں کہ ایک کھلونا گلیلیو کے ہاتھ لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس سے وہ راز دریافت ہو سکتے ہیں جو آج تک نہیں معلوم ہو سکے۔ بہرحال گلیلیو نے بلّور کے دو بڑے بڑے ٹکڑوں کو ایک خاص طریقے سے جوڑ کر ایک آلہ بنایا جس سے دور کی چیزیں بڑی ہو کر نظر آنے لگیں۔ اسی ایجاد کا نام فلکی دوربین ہے۔

سب سے پہلی دوربین جو اُس نے بنائی اس میں اشیا تگنی ہو کر نظر آتی تھیں۔ اس کو گلیلیو نے اور بھی ترقی دی اور ایسی دوربین بنائی جس کے ذریعے سے اشیا اپنی اصلی حالت سے آٹھ گنی بڑی ہو جاتی تھیں اور سب سے آخر میں وہ دوربین جس کے ذریعہ سے اُس نے بڑے بڑے انکشافات کئے ایسی تھی جو کسی شے کے اصلی حجم سے تیس گنا بڑا بتاتی تھی۔

سب سے پہلے اُس نے چاند کا معائنہ کیا۔ اس کرے کی سطح پر اُس نے بڑے بڑے پہاڑ اور تاریک غار دیکھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۷) کمزوریوں کو دیکھ کر اصلاح کے درپے تھا۔ یہ سخت مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اپنے عہد میں کارِ نمایاں یہ کیا کہ سب سے پہلے وہ مذموم رسم بند کر دی جو اٹلی اور دوسرے ممالک میں غلاموں کی بیع و شرا کے متعلق رائج تھی۔ یہ سائنس کا بڑا ماہر گذرا ہے۔ شہرِ روم کی موجودہ تمام تزئین و آرائش اسی پوپ کے فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی لینے کا باعث ہے۔ ۱۸۲۹ء میں فوت ہوا۔

اور زمین کی طرح اُس پر وسیع وادیاں اور میدان پائے، لیکن ان وادیوں کو اُس نے سمندر خیال کیا۔ پہاڑوں کا سایہ بھی اُسے نظر آیا۔ اب گلیلیو نے اُس روشنی کی تحقیق کی جو ہلال یا تربیع کے وقت چاند کے تاریک حصّے میں دھندلی سی دکھائی دیتی ہے اور جس کو منعکس روشنی کہتے ہیں۔ اُس نے فوراً تاڑ لیا کہ یہ دھندلی روشنی بھی آفتاب کی وہ شعاعیں ہیں جو زمین پر آکر چاند پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ اگر مطلع صاف ہو اور چاند بصورت ہلال یا تربیع ہو تو ماہتاب کے تاریک حصّے میں روشنی کا ایک ہلکا سا خاکہ دکھائی دے گا جس سے یہ ثابت ہوگا کہ ہلال ایک گول اور تاریک جسم کا روشن حصّہ ہے۔

اس منعکس روشنی کی تحقیق کے بعد گلیلیو نے اپنی دوربین خوشۂ پروین کی طرف پھیر دی جس کو عرب ثریا کہتے ہیں اور ہندوستان کے بچے "بچوں والی مرغی" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ زمانۂ سابق سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس گچھے میں سات ستارے ہیں لیکن گلیلیو نے دوربین کے ذریعے سے اس میں چالیس ستارے دیکھے۔ اسی طرح جس طرف اس کی نظر اُٹھ جاتی تھی نئے نئے تارے نظر آتے تھے۔ اسی کو یہ کہنے کا فخر حاصل تھا کہ ان ثوابت کو سب سے پہلے میری آنکھوں نے دیکھا۔ اس غیر متوقع کامیابی سے جو مسرت اس کو حاصل ہوئی ہوگی وہ نہایت حوصلہ افزا ہوگی۔

اُس نے روشن کہکشاں کے مشہور و معروف پٹکے کی طرف بھی دوربین پھیر دی اور اُس کے بعض گچھوں کی رصد کی جس کے متعلق قدیم زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ یہ مختلف ستاروں کا مجموعہ ہوگا جس کے کواکب اپنی دوری اور چھوٹے پن کے سبب سے ہم کو جدا جدا نہیں نظر آتے بلکہ باہم مل کر ایک روشن بادل کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

گلیلیو نے اپنی دوربین کے ذریعے سے قدما کے اس خیال کو درجۂ یقین تک پہنچا دیا کہ اس کو کہکشاں میں بے انتہا ایسے چھوٹے تارے نظر آئے جو اُس کو روحانی سرور بخشتے تھے۔

اب کی بار گلیلیو نے سیارۂ مشتری کا امتحان کیا، ۷ جنوری ۱۶۱۰ء میں رات کو اسے ایک ستارہ مشتری کے مغربی جانب اور دو چھوٹے چھوٹے ستارے اُس کے مشرقی جانب دکھائی دیئے۔ دوسری رات کو بھی وہ تینوں اسی کے اطراف معلوم ہوئے لیکن جو ستارے پہلی رات میں مشرقی جانب دکھائی دیتے تھے اب وہ مغربی جانب نظر آ رہے تھے اور زیادہ قریب قریب پائے جاتے تھے۔ اسی طرح دو چار روز کی رصد نے اُسے یقین دلا دیا کہ وہ مشتری کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ چند روز کے بعد مشتری کے اطراف پھرنے والے تاروں میں ایک اور تارے کا اضافہ ہوا۔ اس طرح اُس نے ان چار چاندوں کو مشتری کے اطراف گھومتا ہوا دیکھا اور یہ معلوم کر لیا کہ یہ مشتری کے چار اقمار ہیں۔ گلیلیو کی اس تحقیق نے آسمانِ ہیئت کو چار چاند لگا دیئے۔

مشتری اور اس کے اطراف پھرنے والے چاندوں کی دریافت نظامِ کوپرنکیس کی سچائی کا ایک ثبوت تھا۔
اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے معلوم کیا کہ اب وہ اس قابل ہے کہ کوپرنکیس کی قابلِ قدر رائے کی صداقت
کو ظاہر کرے اور مخالفین کو آنکھ سے دکھادے کہ زمین بھی اسی طرح آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے۔ فیثاغورث اور
اُس کے دو ہزار برس بعد پیدا ہونے والے کوپرنکیس کا نظریہ آج سچا ثابت ہوا اور اُن لوگوں کو بھی جو آج تک زمین
کو کل کائنات کا مرکز قرار دے کر تمام سیار و ثوابت کو اس کے اطراف گھمارہے تھے زمین کو متحرک مان لینے کے
سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

گلیلیو کے تجربے نے جب یہ ثابت کر دیا کہ مشتری بھی ایک سیارہ ہے اور ایک جداگانہ نظام رکھتا ہے اور
اس کے چاند اس کو روشنی پہنچاتے ہیں تو وہ خیال کرنے لگا کہ زمین بھی گھومنے والے سیاروں میں سے ایک ہوگی
یہ وہ دن تھا جب کہ پندرہ سو برس تک بادشاہت کرنے کے بعد بطلیموسی نظام ٹوٹ گیا اور تمام دنیا کو فیثاغورث
کی مظلوم رائے کا تابع ہونا پڑا لیکن بطلیموس کا جادو اس قدر زوردار تھا کہ بعض نے ان چاندوں کو بذریعہ دوربین
دیکھنے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ وہ انہیں دکھائی دے جائیں گے اور انہیں لامحالہ سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

مذہبی دنیا میں ان خیالات نے بڑی ہل چل ڈال دی۔ پادریوں کا خیال تھا کہ چاند اور ستارے صرف اس
غرض سے آسمان پر بنائے گئے ہیں کہ وہ رات کے وقت انسان کو روشنی پہنچائیں۔ وہ کیا جانتے تھے کہ یہ بےشمار
ثوابت جو ذروں کے مانند آسمان پر پھیلے ہوئے ہیں ان سے خدا کی کچھ اور ہی غرض ہے۔ وہ اس سے واقف نہ تھے کہ
کروڑوں ستاروں میں سے ہر ستارے کے اطراف زمین جیسی کئی کئی زمینیں گردش کر رہی ہیں۔ مذہبی طور پر اُن کا عقیدہ
تھا کہ زمین ساکن ہے اور آفتاب اور دوسرے تمام سیارے محض اس کے خادم ہیں گلیلیو نے ان کے عقائد کو سخت
صدمہ پہنچایا اس لئے اُن کے مذہب کا خدا ہی حافظ تھا۔

کوپرنکیس نے کہہ دیا تھا کہ زہرہ و عطارد زمین کے اطراف اسی طرح گردش کر رہے ہیں جس طرح کہ آفتاب کے
اطراف گردش میں ہیں اور اُن کے مدار زمین کے مدار کے اندر واقع ہیں۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا کہ اگر وہ مدارِ
زمین کے اندر ہیں تو اُن کی شکلیں چاند کی طرح بڑھتی اور گھٹتی کیوں نہیں تو اُس نے گو جواب دیا لیکن اس کا معائنہ نہ
کرا سکا۔ اس الزام سے کوپرنکیس کو چھڑانے کے لئے گلیلیو نے اپنی دوربین زہرہ کی طرف پھیر دی اس نے دیکھا کہ
وہ گول نظر آرہا ہے۔ اس سیارے کی پھر ایک دن اُس نے رصد کی تو دیکھا کہ وہ اب ہلال کے مانند دکھائی دے رہا ہے۔
اسی طرح کئی راتیں مسلسل وہ امتحان کرتا رہا اور جب تک (۲۲۵) دن میں زہرہ کا آفتاب کے گرد ایک دورہ نہ ہو لیا

گلیلیو نے اُس کی رصد ختم نہیں کی۔

اسی رصد سے اُس نے یہ تحقیق کی کہ زہرہ میں بھی فی الحقیقت تمام تبدلات موجود ہیں اور چاند کی طرح زہرہ بھی بڑھتے بڑھتے بدر اور گھٹتے گھٹتے ہلال ہوجاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زہرہ کسی اور مرکز کے گرد نہیں بلکہ زمین کے مانند آفتاب کے گرد گردش کر رہا ہے۔

کوپرنکیس کا نظریہ سچا ثابت ہُوا اور مخالفین کو اُس کی رائے نے یہاں بھی شکست دی۔ اس فیلسوف کے ذہن رسا کا لوگوں نے اعتراف کیا اور اس کی عظمت دلوں میں بیٹھ گئی۔ اسی ضمن میں ایک اور امر کی بھی تحقیق ہوگئی یعنی کوپرنکیس کے زمانے سے پہلے یہ خیال تھا کہ سیاروں کی روشنی مکتسبہ نہیں ہے بلکہ بذاتِ خود منور ہیں لیکن عطارد وزہرہ کے مدارجِ تنویر نے ثابت کر دیا کہ ان کی چمک آفتاب کی روشنی کا عکس ہے وہ بذاتہٖ منیر نہیں بلکہ مستنیر ہیں۔ گلیلیو کی اس دوربین نے ایک اور خیالِ باطل کی بھی اصلاح کی۔ ارسطو اور اُس کے مقلدین کا خیال تھا کہ اجسامِ سماوی فساد پذیر نہیں۔ لیکن جب چاند میں پہاڑ اور وادیاں، سورج میں دھبے اور شعلے دیکھے گئے تو اس عقیدہ سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔

گلیلیو نے زحل کا بھی معاینہ کیا لیکن اس کی دوربین زیادہ طاقتور نہیں تھی، زحل کے دونوں جانب اس کو کوئی چیز متصل نظر آئی اُس نے خیال کیا کہ دو چھوٹے چھوٹے تارے ہونگے لیکن اصل میں وہ زحل کے حلقے تھے جو اس کی سطح کو ہزاروں میل کی بلندی پر گھیرے ہوئے ہیں گو اس رصد میں اُس کو ناکامی رہی تاہم آنے والی نسلوں کے لئے زحل کی رصد کو اُس نے خاص طور پر اہمیت دی اور اس سیارے کے معاینہ کو قابلِ توجہ امر بنادیا۔

گلیلیو ۱۶۱۱ء میں پیڈوا سے سفر کر کے روم پہنچا اور ایک باغ میں اپنی دوربین لگا کر اُس نے آفتاب کے سیاہ داغ دیکھے۔ اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ وہ ایک ہی شکل پر کبھی قائم نہیں رہتے بلکہ دو چار داغ مل کر ایک داغ بن جاتا ہے اور کبھی ایک داغ ٹوٹ کر اس کے کئی داغ بن جاتے ہیں۔ ان داغوں کی نسبت اگرچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آفتاب کا روشن مادہ کو بن کر نکلنے کے وقت سطحِ آب پر گہرے گڑھے کر دیتا ہے جو ہم کو سیاہ داغ کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں اور پھر وہ مادہ رفتہ رفتہ اپنی جگہ کو بھر لیتا ہے اور داغ مٹ جاتا ہے تاہم اس کی تحقیق اطمینان بخش نہیں ہے اور اہلِ ہیئت اب تک اس کا پورا حال نہیں بیان کر سکتے۔

گلیلیو نے دوربین کے ذریعے سے اس قدر بتایا کہ یہ داغ آفتاب کے چہرے پر ایک طرف گردش کرتے ہوئے دوسری طرف غائب ہوجاتے ہیں اور کچھ عرصے بعد دوسری طرف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دورہ اٹھائیس دن میں پورا ہوتا

ہے اس تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ آفتاب اپنے محور پر بھی گردش کر رہا ہے جو چھبیس دن آٹھ گھنٹے میں پوری ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ آج کل خیال کیا جا رہا ہے اگر آفتاب کا بھی مرکز ہو اور بایں تن و توش اس کو بھی پھرنا پڑتا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آفتاب میں دن ساڑھے بارہ روز اور رات ساڑھے بارہ روز کی ہوتی ہوگی۔ گلیلیو نے کیسی کیسی تحقیقات کیں۔ کیسے کیسے اکتشافات کئے۔ علمی دنیا میں اس نے مسائل ہیئت کا مشاہدہ کرا دیا اور فیثاغورثی نظام کی صحت کو پایۂ ثبوت پر پہنچا دیا۔

اگرچہ روم میں آ کر گلیلیو نے بڑی قدر و منزلت حاصل کی اور ہزار روپیہ ماہوار کی پنشن بھی پائی مگر مذہبی عدالت کے حکام اس سے ناخوش تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ گلیلیو کا عقیدہ کتبِ مقدسہ کے بالکل خلاف ہے وہ زمین کو تمام کائنات کا مرکز نہیں مانتا گویا خدا کی زمین کی اُس نے وقعت کھو دی ہے۔ وہ زمین کو چھوٹا سا سیارہ بنا کر آفتاب کے اطراف پھراتا ہے۔ مقدس گروہ کے خیالات میں گلیلیو نے سخت تشویش و اضطراب پھیلا دیا۔ جاہل بزرگانِ مذہب نے تو ان حقیقی اکتشافات کو مکر و فریب کا خطاب دیا۔

اس قابلِ قدر ہیئت دان پر اب سختی کی جانے لگی، ذاتی خیالات و اکتشافات کی بدولت اس پر الحاد و زندقہ کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ پس اس کے لئے ضروری ہوا کہ اپنی بے گناہی کا اظہار کرے۔ چنانچہ اُس نے پادری کیسٹیلی کے نام بدیں مضمون ایک خط لکھا کہ کتبِ مقدسہ کی تنزیل کا یہ منشا نہیں ہے کہ علمی مسائل میں ان سے استناد کیا جائے۔ وہ صرف انسان کی اخلاقی حالت کو درست کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ اس خط کو دیکھ کر مقدس محکمۂ احتسابِ عقائد اور بھی غضبناک ہو گیا۔ آخر کار ۱۶۱۶ء میں مذہبی عدالت میں اسے بلایا گیا اور سختی کے ساتھ فہمائش کی گئی کہ وہ ان ملحدانہ خیالات سے باز آئے، زمین کی حرکت کی تعلیم دینے سے زبان کو روک لے اور کوپرنیکس کے اصول کی تائید و تلقین کرنے سے توبہ کرے۔ گلیلیو نے مصلحتِ وقت کو دیکھ کر وعدہ کیا کہ وہ اِن ملحدانہ عقائد کو چھوڑ دے گا۔ سولہ سال تک گلیلیو کو اپنی زبان بند رکھنی پڑی اور کلیسا کو آرام ملا، لیکن ۱۶۳۲ء میں اُس نے ایک کتاب موسوم بہ "نظامِ عالم" شائع کی جو کوپرنیکس کی تائید میں تھی اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ مذہبی عدالت میں بحیثیت مجرم گرفتار ہو کر آیا۔ اس پر الزام قائم کیا گیا کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا دعوے کرتا ہے آخر کار اسے ایک توبہ کرنے والے شخص کا سا لباس پہنا کر اور گھٹنوں کے بل کھڑا کر کے انجیل اُس کے ہاتھ میں دی گئی اور اس سے کہلوایا گیا کہ زمین آفتاب کے گرد نہیں گھومتی۔ پھر یہ قسم لی گئی کہ وہ اس کفر کی اشاعت زبانی یا تحریری یا کسی اور طرح پر کبھی نہیں کرے گا اور فیصلہ صادر کیا گیا کہ بصورتِ خلاف ورزی اس کے لئے سخت سے سخت سزا تجویز

کی جائے گی۔

یہ عجیب عبرت ناک نظارہ تھا کہ ایک قابلِ تعظیم انسان جو اپنے فن میں بے نظیر ہے جس نے اکتشافات کے دریا بہا دائے جس کا نام نامی تا دورِ فلک لوگوں کی زبان پر رہے گا اور علمائے ہیئت کی گردنیں جس کی ہمیشہ زیر بارِ احسان رہیں گی اُس کو موت کی دھمکی دی جا رہی ہے اور اس بات پر اصرار کیا جا رہا ہے کہ اُن واقعات کا انکار کرے جن کی صحت کو وہ خود ہی تسلیم نہیں کر رہا بلکہ اُس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے بھی اپنے دل میں تسلیم کرتے ہیں۔

بہرحال گلیلیو نے وعدے کئے اور قسمیں کھائیں لیکن اس کے بعد ہی اُس نے اپنا عصا زمین پر مارا اور ایک دوست سے آہستہ کہہ دیا کہ "ہاں ہاں زمین گردش کر رہی ہے"۔ اس طرح اُس کی سرکشی ظاہر ہوتی رہی چنانچہ چند ہی روز کے بعد وہ اپنے وطن کو بھیج دیا گیا، جہاں سے بلا اجازت اُس کو کہیں جانے کی ممانعت تھی۔ زندگی کے باقی دس سال اس نے سختیوں اور عقوبتوں میں کاٹے تاہم اس نے اپنا مشغلہ جاری رکھا اور اکثر مفید اکتشافات کئے۔ ۱۶۳۷ء میں اس کی بینائی کم ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں قوتِ بصارت بالکل زائل ہو گئی۔ آخر کار اس نامور شخص نے زندگی کے اٹھتر سال گزار کر ۱۶۴۲ء میں اپنی شیریں جان، جاں آفریں کو سونپ دی لیکن مقدس گروہ گلیلیو کی طرف سے کچھ ایسا غار کھائے ہوئے تھا کہ اُس کی لاش مسیحی قبرستان میں بھی دفن نہ ہو سکی گو مذہبی دنیا نے اس شد و مد کے ساتھ اس پر سختی کی لیکن آخر کار سچائی کی فتح ہو کر رہی۔ تمام مہذب دنیا میں آج گلیلیو کا نام وقعت اور ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے اور مقدس گروہ استحقار او راستہزا کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

گلیلیو نے دوربین کی ایجاد سے نظامِ کوپرنکیس کو ایسی مسلمہ کامیابی بخشی کہ تھوڑے ہی دنوں بعد ہر ہیئت دان نے اُس کے نظریہ کو تسلیم کر لیا اور آفتاب کے مرکزِ عالم ہونے اور اُس کے گرد زمین کے گردش کرنے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

فیثاغورث کے نظام کو بطلیموس نے توڑ دیا تھا۔ اس کے ہزارہا سال بعد گلیلیو ہی وہ شخص پیدا ہوا ہے جس نے نظامِ بطلیموس کو درہم برہم کر دیا اور بتا دیا کہ سچائی کیونکر ظاہر ہوا کرتی ہے۔

عبدالرب کوکب

نکات

(۱)

جنت کی کھلی ہے راہ میرے دل میں
برسات ہے بیکس پناہ میرے دل میں
ہوتی نہیں جو برہنگی سے محسوس
پوشیدہ ہے وہ نگاہ میرے دل میں!!

(۲)

ہم راز ہے کون گلستاں کا اے دل
انداز نرالا ہے بیاں کا اے دل
کہتا ہے جو داغ قلب گل میں
در اصل تصور ہے خزاں کا اے دل!!

(۳)

جب رات کو چھوٹتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں چمکتے ہیں جگنو کے اجالے
قربان ترے اس وقت کی تاریکی میں
اے جسم سے دل کو چھونے والے!!

(۴)

گلشن میں کہاں سے پیار آتا ہے
تخیل کا یہ نقش ابھر آتا ہے
اودھم ہوا ہے بجلی سی ڈالی کوئی شوخ
جنبش پہ چنبیلی کی نظر آتا ہے!!

جوش
ملیح آبادی

اردو کے چند ہندو بنگالی شعرا

آج کل جب کہ لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ بعض زبانیں خاص خاص جماعتوں کا حصہ ہیں، اس مضمون کی سرخی ہی عجیب و غریب معلوم ہوگی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زبانِ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے کہ مسلمانوں ہی نے اس کے حصول میں امتیاز حاصل کیا ہے مگر اس خیال کی بنیاد غلط فہمی پر دال ہے۔ بجنسہ یہی حالت ہندی اور بنگالی زبانوں کی بھی ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ ان زبانوں کے استعمال کا حق محض ہندوؤں کو حاصل ہے اور صرف ہندوؤں کو ان میں شہرت و مہارت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اس کلیہ میں خامی نظر آتی ہے۔

کسی ملک کی زبان اور اُس کا لٹریچر، انسانی اکتساب اور محنت کا ماحصل ہوتا ہے۔ بلا امتیازِ شخصیت و جماعت کسی زبان پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے مگر اس کے اکتساب میں کافی توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنگالی اپنے قوائے ذہنی کے لئے ممتاز ہیں۔ جب مسلمان بنگال میں حکمران تھے تو عدالت کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے ہندو عمال کو اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے فارسی کی تعلیم حاصل کرنی پڑی اور چند بنگالیوں نے اس میں کمال بھی پیدا کر دکھایا۔ راجہ رام موہن رائے انہیں ممتاز ہستیوں میں سے ہیں۔ فارسی کی کتاب "تحفۂ موحدین" انہیں کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے۔ منشی مدن موہن زبانِ فارسی کے ماہر اور زبردست خوشنویس تھے مگر جب عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے انگریزوں کے ہاتھ میں آئی تو عدالت کا طرزِ تحریر بدل گیا اور زبان نے بھی کروٹ لی یعنی بنگال کی عدالتوں میں فارسی کی جگہ انگریزی زبان نے اپنا سکہ بٹھا دیا۔ زبانِ اردو گو کبھی عدالتی زبان نہ تھی تاہم چند ہندوؤں نے اس کے مطالعہ میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیا اور بعض نے ایسی مہارت حاصل کی کہ اردو میں شعر کہنے لگے جو اب تک چند تذکروں میں کمال احتیاط کے ساتھ محفوظ ہیں۔ (مثلاً سخن شعرا از نساخ، تذکرۂ شعرائے ہنود از دیبی پرشاد صاحب اور خمخانۂ جاوید از لالہ سری رام صاحب) لہٰذا بطورِ مثال بہت مختصر الفاظ میں چند بنگالی ہندوؤں کے حالات، جنہوں نے اردو شاعری کی خدمت کی ہے، ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں اور ساتھ ہی ان کے کلام کا نمونہ جتنا دستیاب ہو سکا پیش کیا جاتا ہے۔

ارمان راجہ جنم جے متر جو راجہ پیتمبر متر کے پوتے تھے اور جن کا مسکن کلکتہ کے قرب و جوار مقام سوزی میں تھا

۱؎ سخن شعرا از نساخ صفحہ ۲۱ اور تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۵۔

وہ حافظ اکرام احمد صاحب ضیغم کے شاگرد تھے اور حضرتِ ناسخ سے راہ و رسم رکھتے تھے۔ حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب کا جو ڈھاکہ کے رہنے والے ہیں، یہ خیال ہے کہ ارمان صاحب ایک تذکرہ کے مصنف تھے جو بہارِ دلکشا کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ۱۸۷۴ء میں اس دنیا سے اٹھ گئے۔ ان کے دو شعر زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جاں نکلا — تن سے جاں نکلی مگر دل کا نہ ارماں نکلا
رات بھر نالے کیا کرتا ہوں گریہ دن کو — پوچھتے کیا ہیں حقیقت مرے اوقات کی آپ

منشی[51] اتواری لال شہر کلکتہ کے باشندے تھے ان کا تخلص ذرّہ تھا۔ ناسخ ان کو اپنے دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ یہ ۱۲۸۱ء تک زندہ رہے ان کا محض ایک شعر سینہ بہ سینہ ہم لوگوں تک پہنچا ہے۔

دلدار کی خاطر سے دلِ زار بھی چھوڑا — الفت میں سمن رویوں کے گلزار بھی چھوڑا

راجہ[52] کشن راجہ نبکش بہادر کے لڑکے تھے جو شہر کلکتہ کے ایک بڑے ذی اثر مشہور و معروف آدمی تھے۔ یہ ایک ضخیم دیوان چھوڑ گئے جو اب نایاب ہے۔ صرف ایک شعر اب تک محفوظ ہے۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب — تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

بابو[53] کشن چند رگھوش کا تخلص کشن تھا۔ یہ شہر کلکتہ کے رہنے والے تھے اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

صدف اپنے گوہر کو بے آب سمجھے — یہ دنداں تمہارے دہن میں جو دیکھے

کنور[54] راجہ اپورا ب کشن بہادر راجہ راج کشن بہادر کے بیٹے تھے۔ یہ اپنے مشہور و معروف باپ کی طرح اردو کے شاعر تھے اور انہیں کے شاگرد بھی تھے ایک ضخیم دیوان چھوڑ گئے ہیں جو اب کمیاب ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

شیدا ہے عشق میں ترے دل شیخ و شاب کا — قالب تہی ہے یاد میں تیری حباب کا

---

۵۱ نساخ صفحہ ۱۶۵۔ خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۲۴۵۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۵۵۔

۵۲ نساخ صفحہ ۲۴۷۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۶۳۔ خمخانۂ جاوید جلد تیسری صفحہ ۲۹۸۔ لالہ سری رام فرماتے ہیں کہ راجہ صاحب مرزا جان طپش دہلوی کے شاگرد تھے۔

۵۳ نساخ صفحہ ۳۹۸۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۱۵

۵۴ نساخ صفحہ ۳۹۹۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۱۔

نہ پوچھو گذری ہے جو مجھ پہ بے قراری رات ‏ ‏ مثالِ شمع کٹی روتے روتے ساری رات

راجہ جادو کشن بہادر کا تخلص مشفق تھا۔ یہ بھی راجاؤں کے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ضخیم دیوان ان کی یادگار رہے جواب نایاب ہے یہ مولوی ظہور النبی محزوں (جو ایک زمانہ میں کلکتہ کے اعلیٰ طبقہ کے ایک مشہور شاعر تھے) کے شاگرد تھے فرماتے ہیں۔

خفتگانِ خاک ہیں قربان اس رفتار پر ‏ ‏ ہے قیامت کا گماں سب کو قدِ دلدار پر

نیند تو آتی نہیں جو خواب میں دیکھوں اُسے ‏ ‏ حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

بابو جگن ناتھ پرشاد ملک کا تخلص ملک تھا۔ یہ میر باسط علی محوی الہ آبادی کی ہمت افزائی سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ناسخ نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر اپنے دوستوں کے ضمن میں کیا ہے۔

دل پہ اک سانپ سا لہراتا ہے اُس وقت ملک ‏ ‏ زلفِ جاناں کی صبا سے کے جو بُو آتی ہے

موہن۔ بابو ہری موہن داس اردو کے ایک شاعر تھے جو ڈھاکہ کے جگن ناتھ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کا تخلص موہن تھا۔ ڈھاکہ کے قدیم باشندے تھے۔ بیس سال سے زیادہ ہوئے کہ انہوں نے انتقال کیا۔ ذیل کے چند اشعار سے اُن کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میرے شفیق منشی عالی خیال طپش ‏ ‏ شعر و سخن میں ہے انہیں سب طرح کا کمال

تقریر جو لکھی ہے یہ نو طرز و دل فریب ‏ ‏ ہے شاہدانِ باغِ سخن کا نیا جمال

ظاہر ہے خوبی اس کی نہیں حاجتِ بیاں ‏ ‏ تعریف اس کی میں جو کروں میری کیا مجال

تاریخ اس کی لکھتا ہوں موہن بشوقِ دل

ہے یہ نیا کھلا ہوا گلدستۂ خیال

سید محمد حفیظ

۱؎ ناسخ صفحہ ۴۳۸۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۱۔

۲؎ ناسخ صفحہ ۴۵۴۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۳۔

۳؎ ناسخ صفحہ ۴۶۴۔ تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۱۲۳۔

گوداوری

دریائے گوداوری دکن میں سب سے بڑا دریا ہے جو ضلع ناسک (احاطہ بمبئی) کے پہاڑوں سے نکل کر تقریباً (۹۰۰) میل کا فاصلہ پچھم سے پورب کی طرف طے کرکے بحرِ ہند سے جا ملا ہے۔ ہمارے ہندو بھائی اس دریا کو متبرک مانتے ہیں۔

اے دکن کی سندری، اے کوہِ ناسک کی پری — اللہ اللہ کیا تری آمد ہے اے گوداوری
ذوقِ فطرت جس کو ہے دیکھے وہی عالم ترا — کتنا دل آویز ہے اللہ پیچ و خم ترا
اک مقدس پاک دریا ہے ہمارے واسطے — تُو ہی گنگا تُو ہی جمنا ہے ہمارے واسطے
تیرا پانی سب کو پیارا تُو ہے ہر اک کو عزیز — تیرا رکنا روح پرور، تیرا بڑھنا لطف خیز
تیری موجیں فرحت افزا، تیری لہریں خوش نما — تیرا اُڑنا تیرا مڑنا، تیرا گرنا دل کشا
تھا ابھی کچھ رنگ اور عالم ابھی کچھ ہو گیا — انقلابِ دہر ہے یہ یا کہ جزر و مد ترا
جھٹ پٹے کے وقت کیا انداز ہے پیارا ترا — کس قدر وقتِ سحر دلکش ہے نظارا ترا
ہیں کہیں بگلے، کہیں سارس، کہیں مرغابیاں — ان کے قدموں میں بچھی ہے چادرِ آبِ رواں
کوئی جاتا ہے اُدھر آتا ہے کوئی اس طرف — اک سماں دلکش نظر آتا ہے دیکھو جس طرف
لہر سی اک دوڑتی ہے قلبِ پُر آلام میں — تیرے نغموں کو سنے کوئی سکوتِ شام میں
کیسی پیہم آ رہی ہے آبشاروں کی صدا — یا مگر یہ سازِ سرمد کے ہے تاروں کی صدا

اہلِ دل کو وجد ہے تیرے خرامِ ناز پر
دھن رہے ہیں اپنا سر عارف تری آواز پر

اپنے منبع کے قریں چھوٹی سی تُو اک نہر تھی — بڑھتے ہی راہِ طلب میں بڑھ گئی وسعت تری
جس طرح آ کر ملیں تجھ میں ہزاروں ندیاں — تو بھی ہے ذوقِ فنا میں رات دن یوں ہی رواں
شوق ایسا ہے کہیں دم بھر ٹھہر سکتی نہیں — صبح ہوتی ہے کسی جا، شام ہوتی ہے کہیں
گرمی و سردی ہو یا ہنگام ہو برسات کا — کم نہیں ہوتا مگر تیرا سفر دن رات کا
گاہ میداں میں کبھی جنگل میں سے ہے تیرا گزر — وادی و کہسار میں ہے تو کبھی گرمِ سفر

آنکھیں

بگڑ گئے آپ ہم سے اور بدلیں گو ہزار آنکھیں
مگر تیور یہ کہتے ہیں کہ آخر ہونگی چار آنکھیں

کوئی کیا جانے یکس داستاں کی شرح کرتی ہیں
تمہاری شرمسار آنکھیں ہماری اشکبار آنکھیں

بہت دیکھا ہے ہم نے خوبروؤں کو ان آنکھوں سے
تجھے جو دیکھ لیں وہ بھی تو دے پروردگار آنکھیں

دو آنکھوں سے مرا ذوقِ نگہ تسکیں نہیں پاتا
یہ رنگا رنگ جلوے مانگتے ہیں صد ہزار آنکھیں

یہ توبہ آپ کی توبہ نہیں ہے حضرتِ واعظ!
بدل جاتے ہیں پل کی پل میں رندِ میگسار آنکھیں

سکندر اور جم کی یادگاریں تو بہت ہونگی
مگر عاشق ترا چھوڑے گا اپنی یادگار آنکھیں

مصطفیٰ خاں

نواہائے راز

راہِ طلب میں ہمتِ مردانہ چاہیے
اظہارِ شوقِ دید کلیمانہ چاہیے

ہنگامِ نائے و نوش ہے یہ ساقیٔ بہار!
ہر شاخِ گل کے ہاتھ میں پیمانہ چاہیے

ہے کفر میرے پاس نہ ایمان، کیا کروں
پیرِ مغاں کے واسطے نذرانہ چاہیے

پھر ہو چلا خمارِ خودی پیرِ میکدہ!
پھر دستِ حق پرست سے پیمانہ چاہیے

اے اہلِ بزم رقص میں اک بادہ خوار ہے
اُٹھو، لحاظِ لغزشِ مستانہ چاہیے

اک سعیٔ مستقل پہ مدارِ حیات ہے
یعنی کہ دل میں جوشِ حریفانہ چاہیے

اب حسن میں وہ جذبۂ شورش ہے عشق میں
پھر ابتدا سے چھیڑنا افسانہ چاہیے

ابوالفاضل راز
چاندپوری

ایک انسان مطلوب ہے

انسان مطلوب ہیں! محض معقول و شاندار طور طریقے مطلوب نہیں، نہ ایمان و اعتقاد کے جدید نقطۂ نظر، نہ زر و دولت کے انبار جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر ہوں، نہ وہ طاقت جو مشین اور پُرجلال تبسم لئے ہوئے ہو حتیٰ کہ زبردست قلم بھی نہیں بلکہ صرف انسان مطلوب ہیں ـــــ انسان!

تمام دنیا چلا رہی ہے کہ وہ انسان کہاں ہے جو ہمیں نجات دلائے گا ہم ایک انسان کی جستجو میں ہیں! تم اس انسان کے لئے دور دور نگاہیں نہ دوڑاؤ کیونکہ وہ انسان تو تمہارے سامنے موجود ہے۔ یہ انسان تم ہو، میں ہوں، بلکہ ہم میں سے ہر ایک ہے!.....

کیا کوئی شخص انسان بن سکتا ہے؟ اور اگر وہ نہ بننا چاہے تو اس سے زیادہ کوئی چیز مشکل نہیں لیکن اگر کوئی انسان بننے کا عزم کرلے تو اس سے زیادہ آسان کوئی بات نہیں۔ (الگزنڈر ڈوماس)

قدیم ایتھنز کی گلیوں میں دن دہاڑے چراغ ہاتھ میں لے کر دیوجانس ایک کامل دیانت دار اور امین انسان کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا، مگر بے کار آخر کار وہ چوک میں آیا اور بلند آواز سے چلایا "او انسانو! میری سنو، میری طرف آؤ" بہت سے لوگ اُس کے اردگرد جمع ہوگئے تو اُس نے ملامت آمیز انداز سے کہا "میں نے تو انسانوں کو بلایا ہے ٹھنگنوں اور بونوں کو نہیں بلایا"

دنیا کے ہر ایک پیشے اور ہر ایک فن، ہر ایک موقعے اور ہر ایک دعوت کے دروازے پر یہی نہ مٹنے والا اعلان چسپاں ہے کہ "ایک انسان مطلوب ہے" مطلوب ہے وہ انسان جو کسی دعوت کسی مجمع میں بھی اپنی انفرادیت کھو نہ دے، وہ انسان جو اپنے یقین واثق کے ساتھ ساتھ جسارت اور جرأت بھی رکھتا ہو، جو اُس وقت "نہیں" کہتا ہوا خوف زدہ نہ ہو جب کہ ایک دنیا "بجا" و "درست" اور سرِ تسلیم خم کے نعرے لگا رہی ہو۔

وہ انسان مطلوب ہے جو اگرچہ ایک عظیم المرتبت مقصد کے لئے جد و جہد کر رہا ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس بات کا روادار نہ ہو کہ وہ مقصد اُس کی کسی ایک بڑی قابلیت و اہلیت کو ادنیٰ یا اپاہج کرکے اُس کی انسانیت کو عیب دار کر دے۔

مطلوب ہے، وہ انسان جو اپنے فن اور پیشہ میں نمایاں ہو۔ جو اپنے عہدے کو اُس وقت کم قیمت سمجھتا ہو جب اُس کا اندازہ صرف حصولِ زر کے مقصد کو سامنے رکھ کر لگایا جائے۔

مطلوب ہے، وہ انسان جو اپنے نشو و ارتقا، تعلیم و تربیت، باقاعدگی نظم اور شستہ چلن اور انسانیت کو اپنے عہدے میں مدِ نظر رکھے

ایک ایک مذہبی فرقے میں ہزاروں منبر خالی پڑے ہیں، درانحالیکہ ہزاروں واعظ ایک ایک چوک میں بیکار کھڑے مکھیاں مارتے ہیں، ادھر ہزاروں لوگوں نے چپہ چپہ بھر زمین کو انسانوں کی جستجو میں چھان مارا ہے کہ وہ آئیں اور ان خالی ممبروں کو آن کر زینت دیں، لیکن ڈھونڈنے والوں کی کوششیں بے کار جا رہی ہیں۔ یہ بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ زمانہ میں مواقع بہت ہیں اور انسانوں یا اچھے انسانوں کے لئے دنیا بے تاب ہے۔ اس لئے مطلوب ہے ایک باجرات و بسالت انسان جو اپنی فطرت کے کسی پہلو میں بھی بزدل نہ ہو۔

مطلوب ہے ایک انسان جس میں توازن و موزونیت اعلیٰ پیمانہ پر ہو جس پر کسی نقص یا کمزوری کی لعنت کا سایۂ بد نہ پڑا ہو وہ سایہ جس نے اس کی نفع رسانی کو ناقص بنا دیا ہو اور اس کی طاقتوں کو ایک طرف جمد کا دیا ہو۔ مطلوب ہے وہ انسان جو با قرینہ و باسلیقہ ہو، اپنی نشو و ارتقا میں یک رخہ نہ ہو جس نے اپنی ہستی کی تمام استعدادوں کو کسی ایک ہی تنگ اور مختصر امتیاز میں لگا کر اپنی زندگی کی دوسری تمام شاخوں کو چھوڑ نہ دیا ہو کہ پژمردہ اور افسردہ ہو جائیں۔

مطلوب ہے وہ انسان جو فراخ حوصلہ اور وسیع الخیال اور بلند نظر ہو، جو معاملات کا ایک ہی رخ نہ دیکھتا ہو، وہ انسان جو اپنے نظریات کے ساتھ ساتھ عام سوجھ بوجھ کو بھی ملاتا ہو جس نے دارالفنون کی تعلیم کو اپنی عملی اور روزانہ زندگی برباد نہ کرنے دی ہو، وہ انسان جو اپنی ہستی کو آپ منصۂ شہود پر لاتا ہو، اور جو اپنی نیک نامی کو اپنے لئے ایک بیش بہا خزانہ سمجھتا ہو۔

مطلوب ہے وہ انسان جو دنیا سے کھویا ہوا سا دھوا اور رہا تھا نہ ہو، بلکہ زندگی اور آگ سے پر انسان۔ اس کے جذبات ایسے سدھے ہوئے ہوں کہ بڑے سے بڑے مضبوط ارادے کا تعاقب کر سکیں جو پاک ضمیر کا خادم ہو، جو تمام محاسن کی پرستش کرنا جانتا ہو خواہ وہ محاسن فطرت کے ہوں یا فن و صنعت کے۔ وہ جو ہر قسم کی نابکاریوں سے متنفر ہو اور دوسروں کی اپنی ذات ہی کی طرح عزت کرتا ہو۔ دنیا اس انسان کی تلاش میں ہے جو ہر حیثیت میں تعلیم و تربیت یافتہ ہو، جس کے اعصاب کو دانائی کی قوت عطا کی گئی ہو، جس کا دماغ مہذب، طرار اور وسیع ہو جس کے ہاتھ کار آشنا ہوں، جس کی آنکھیں تیز معقول شناس اور خورد بین ہوں، جس کا قلب نرم، جوانمرد اور صادق ہو

تمام دنیا ایک ایسے ہی انسان کی جستجو میں ہے۔ اگرچہ لاکھوں انسان پڑے بے کار مارے مارے پھر رہے ہیں۔ تاہم یہ بات تقریباً ناممکن سی ہے کہ کسی شعبہ میں بھی ایک معقول و موزون انسان ڈھونڈ نکالا جائے۔ اور پھر طرفہ یہ ہے کہ ہم ہر جگہ یہ اعلان و اشتہار بھی دیکھ رہے ہیں کہ ایک انسان مطلوب ہے!

روسو اپنے اس مشہور و معروف مقالہ میں جو مسئلہ تعلیم پر ہے کہتا ہے "فطرت کے قانون کے مطابق سب انسان برابر ہیں، ان سب کو "فنِ انسانیت" کمانے کی ضرورت ہے، اور جس نے ایک انسان کا فرض ادا کرنا خوب اچھی طرح سیکھ لیا ہو وہ ان تمام

شعبوں اور صیغوں میں جو اُسے تفویض کئے جائیں اپنی جگہ بطریق احسن پُر کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ میرے لئے چنداں اہم نہیں کہ میرا شاگرد فوج میں جانے کی تیاری کر رہا ہے یا مذہبی منبر پر جگہ لینا چاہتا ہے یا قانون کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کے درپے ہے۔ کیونکہ جو مقام ہمارے لئے مقدر ہے وہ فطرت نے پہلے ہی سے ہمارے لئے تجویز کر رکھا ہے زندہ رہنا ایک فن ہے اور یہی فن میں اسے سکھاؤں گا۔ جب میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تو گو یہ سچ ہے کہ وہ نہ تو سپاہی ہوگا نہ قانون دان نہ مذہبی مگر ہاں آپ اسے پہلے انسان بن جانے دیجئے پھر قسمت جیسا چاہے گی اسے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں آپ سے آپ لے جائے گی، اور وہ ہمیشہ اپنے درجہ اور مقام پر پایا جائے گا۔"

ایمرسن کہتا ہے کہ ٹالیرینڈ کسی شخص کے متعلق کبھی یہ نہیں پوچھا کرتا تھا کہ کیا وہ دولت مند ہے؟ کیا وہ محترم ہے! کیا وہ نیک طینت ہے؟ کیا وہ فلاں فلاں قابلیت رکھتا ہے؟ کیا وہ فلاں خاندان میں سے ہے؟ بلکہ ان سوالات کی بجائے وہ یہ سوال کیا کرتا تھا کہ کیا وہ کچھ ہے بھی، کیا وہ کچھ کام کر بھی سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے تو اپنی قسم کا بہترین انسان ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ باتیں ہیں جو کسی شخص کے متعلق ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

جس وقت گارفیلڈ ابھی کم عمر لڑکا ہی تھا اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا ہونا چاہتا ہے؟ اُس نے جواب دیا سب سے پہلے میں اپنے آپ کو انسان بناؤں گا۔ اگر میں اس مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو پھر میں کسی مقصد میں بھی کامیاب نہ ہوں گا۔"

مانٹین کہتا ہے "ہمارا صرف یہ کام نہیں کہ ہم تنہا روحانی تربیت ہی کریں اور نہ صرف یہ کہ جسم کی تربیت ہی کی جائے بلکہ ہم ایک انسانی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔"

آج دنیا کو سب سے بڑی احتیاج ایسے مردوں اور عورتوں کی ہے جو "اچھے حیوانات" ہوں اور جو ہمارے ساکن و جامد تمدن کی سختیوں کو برداشت کر سکیں تاکہ آئندہ مردوں اور عورتوں کے جسم اعلیٰ درجہ کے ہوں اور اُن میں "حیوانی روح" کی بھی بہتات ہو۔

اُس عظیم الشان انسانیت سے بڑھ کر جس میں غیر معمولی صحت کی زندگی بخش تابشیں ہوں اور کون سی چیز جلیل القدر ہو سکتی ہے! لیکن یہ نظارہ کس قدر مایوس کن اور افسوسناک ہے کہ بڑے بڑے تعلیمی مراکز جن کا تنہا مقصد یہ تھا اور ہے کہ جوانمرد آزاد اور اپنی حمایت آپ کرنے والے انسان پیدا کریں ان میں سے ہر سال ایسے ہزاروں طالب علم منتہی اور فارغ التحصیل ہو ہو کر نکل رہے ہیں جو بجائے تناور شاہ بلوط ہونے کے معمولی پودے۔ بجائے اپنے مددگار آپ ہونے کے دوسروں کے محتاج۔ بجائے مضبوط ہونے کے کمزور و ناتوان، بجائے تیر کی طرح تنے ہوئے ہونے کے کمان کی طرح خمیدہ اور جھکے ہوئے ہیں۔ آہ ایسے ایسے امید بندھانے والے نوجوانوں میں سے ایک بھی مکمل انسان نہیں نکلتا! حالانکہ سیرت کی ہمدردیاں، بغیر سوچے سمجھے جسم کی

اعلیٰ بناوٹ ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک چڑچڑا، بڑبڑانے والا روگی انسان ایسی مضبوط سیرت کا مالک کبھی نہیں ہو سکتا جیسی ایک صحت ور قوی ہیکل اور شاداں و فرحاں انسان کے لئے ممکن ہے۔

جب مد کا وقت ہوتا ہے تو سمندر کی ایک موج ساحل پر اتنی آگے نکل جاتی ہے کہ اس سے پہلی امواج کی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی ہوتی۔ اس کے بعد وہ موج پیچھے ہٹ جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد تو یہ عالم ہوتا ہے کہ آخری موج کا قدم بھی پہلی موج کے بنائے ہوئے نشان تک پہنچ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کبھی کبھی ایک انسان اپنے ہمجنسوں میں نمایاں ہو کر آتا ہے، اور دکھا دیتا ہے کہ فطرت نے اپنے معیار اور اسوہ کو اس کی تکمیل میں فراموش نہیں کیا۔ اور پھر تو ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ ایک معمولی درجہ کا انسان بھی بحرِ انسانیت کی بلند ترین موج ہے جس کا ابھی تک دنیا کو انتظار تھا۔

اپیلیس اپنی مشہور و معروف حسین ترین و مکمل ترین عورت کی تصویر کے لئے برسوں تمام ملک یونان کی حسین عورتوں کے نکاتِ حسن کا مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں سے حسین آنکھ، وہاں سے جمیل ماتھا، ادھر سے نازک ستوان ناک اُدھر سے نسوانی شکوہ و جلال اور یہاں سے حسن کی ایک ادا اور وہاں سے دوسری شان لیتا پھرا۔ آخر انہی تخیلات اور مطالعۂ حسن نسوانی کے مجموعہ نے مکمل ہو کر دنیا کو مسحور کر لیا۔ اسی طرح یہ مطلوب انسان بھی بہت سے انسانوں کا مجموعہ ہوتا ہے یہ اپنے اندر دوسرے انسانوں کی کمزوریوں اور حماقتوں کی بجائے ان کی قوت اور نیکیاں جذب کرتا ہے وہ اپنا مرکز آپ اور اپنا آقا آپ ہوتا ہے۔ اُس کا فہم و فراست اور اصول خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے تباہ و برباد شدہ نہیں ہوتا۔

تعلیم و تربیت کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر انسان بننے کی استعداد پیدا کر دے جس طرح ایک ہرے بھرے پودے میں تناور درخت بننے کی استعداد ہوتی ہے اور پھر اُس کی لکڑی سے ہزاروں اعلیٰ درجہ کی اشیا بنائی جا سکتی ہیں اور اس پر عمدہ کھدائی کی جا سکتی ہے اسی طرح تربیت، تعلیم اور تجربہ کے ذریعہ سے طفولیت کا پوداشدید ذہنی اخلاقی اور جسمانی "انسانی چوب" بن جایا کرتا ہے۔

اگر کوئی نوجوان اس عزمِ صمیم کے ساتھ اپنی زندگی شروع کرے کہ ہر ایک بات جو اس کی زبان سے نکلے گی وہ صدقِ خالص اور ہر ایک وعدہ جو وہ کرے گا نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل ہوگا اور اُس کی طرف سے ہر ایک تعین و تقرر کو نہایت امانت اور سختی کے ساتھ دوسرے لوگوں کے وقت کا پورا احترام کرتے ہوئے نبھایا جائے گا اور اس طرح اگر وہ اپنی شہرت اور نیک نامی کی ایک بیش بہا خزانہ کی طرح حفاظت کرے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ دنیا کی نگاہیں اُس پر ہیں۔ اور جب لوگوں کو یہ یقین ہو گا کہ وہ بال برابر بھی صداقت و حقیقت سے انحراف نہیں کرتا یا نہیں کرے گا تو وہ ہر اُس شخص کا جو اسے جانتا ہے محلِ اعتماد ہو کر رہے گا محلات و قصور اور لاؤ لشکر کیا ہیں، اگر کوئی شخص کسی پورے بر اعظم کا مالک بھی ہو جائے یا ایک سمندر اُس کے تجارتی جہازوں سے

بھرا پڑا ہو تو بھی اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ ان تہمات کا مقابلہ ایک صادق ضمیر سے کیجئے اور اُس چہرے سے جو کسی الزام دینے والے کی آواز پر زرد نہیں پڑ جاتا اور ایک ایسے سینہ کے ساتھ جو راز فاش ہو جانے کے خوف سے نہیں دھڑکتا اور ایک ایسے دل کے ساتھ جو اگر چیر کر پہلو سے باہر نکالا جائے تو اُس کی عزت و وقار پر کوئی داغ دھبا نہ ہو۔

تم کسی انسان سے بری طرح پیش نہ آؤ کسی ایسے کاغذ پر دستخط نہ کرو جس کے لئے کوئی آسمان کا مقرب ترین فرشتہ گواہ اور مصدق نہ ہو۔ چلو پھرو اور رہو سہو ایسے طریق سے کہ کوئی نہ بہکا سکے۔ اور اُس چیز سے پرے رہو جو تمہاری ملک نہ ہو تمہاری خواہش اور تمہارے مقصد میں سوائے راستی اور قانون کے کوئی چیز حائل نہ ہونی چاہیئے۔ انسان عالم میں ایک بزرگ و برتر ہستی ہے۔

ایک حکومت کے فرائض جو وہ انجام دے کیا کیا ہیں؟ نہ تو اونچی اونچی مورچہ بندیاں، نہ چوڑی اور مضبوط فصیلیں، نہ اونچے مناروں والے دروازوں اور کلسوں والے بروج سے سجے ہوئے شہر، نہ کھاڑیاں، نہ ایسی وسیع اور مسلح بندرگاہیں جن میں متمول اور طاقت ور بیڑے کھڑے طوفان پر قہقہہ لگا رہے ہوں، نہ آراستہ و پیراستہ جگمگاتے ہوئے دفاتر کی بھرمار جہاں جھکی ہوئی کمینہ بھویں آدمی کو غرور و نخوت کی طرف لے جاتی ہیں، ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ انسان اور بلند حوصلہ وسیع قلب انسان مہیا کرنا حکومت کا فرض ہے۔ جن میں وہ طاقتیں ہوں جو کاہل حیوانوں کی طاقتوں سے بہت ارفع ہوں، ان حیوانوں سے جو صحراؤں جنگلوں اور کچھاروں میں رہتے ہیں جو ٹھنڈی چھاؤں اور جھاڑیوں میں رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ انسان جو اپنے فرائض ادا کریں۔ ہاں وہ انسان جو اپنے حقوق کو جانتے ہوں اُن میں جرأت ہو کہ اپنے حقوق کو قائم رکھ سکیں اور سمجھے بوجھے ہوئے حملوں کی روک تھام کر سکیں۔ اور ظالم کو کچل سکیں اور زنجیروں کو توڑ سکیں۔ (ولیم جونس)

اینن کا قول ہے کہ "خدایا ہمیں وہ انسان دے جو مضبوط قلب والے بڑے دل والے، راسخ الاعتقاد اور چلتے ہاتھ والے ہوں۔ وہ انسان جنہیں دفاتر کی خاک دھول ہلاک نہ کر سکے۔ وہ انسان جنہیں محکموں کی بالائی آمدنیاں خرید نہ سکیں۔ وہ انسان جو اپنی رائے اور ارادے کے آپ مالک ہوں وہ انسان جو جھوٹ نہ بولنے والے انسانوں کی عزت کریں وہ انسان جو بڑے سے بڑے نقاق و حرّاف کے مقابلے میں کھڑے رہ سکیں، اور اس کے فریب کارانہ بڑھاوے کی بغیر ذرہ برابر خوف کے مذمت کر سکیں۔ بلند قامت انسان جن کا تاج آفتاب ہو جو فرض منصبی ادا کرتے ہوئے سپہر رفعت پر قائم رہیں اور وہیں پر زندگی گذار دیں۔"

(مستفاد) مہر محمد خاں شہاب

پیغام

قیسِ اُلفت ہے تو یادِ رخِ لیلیٰ بھی نہ کر — تُو محبّت کے لئے ہے تو تمنا بھی نہ کر

ظلمتِ شامِ جدائی سے جو مانوس ہے تُو — ارتکابِ ہوسِ صبحِ نظارا بھی نہ کر

گر خدا کے لئے دنیا سے ہُوا ہے بیزار — تو خیالِ طلبِ راحتِ عقبےٰ بھی نہ کر

زینتِ دہر اک آرائشِ باطل ہی سہی — نگہِ شوق کو محرومِ تماشا بھی نہ کر

تُو اگر محرمِ اسرارِ عبودیت ہے! — امتیازِ حرم و دیر و کلیسا بھی نہ کر

موجِ آوارہ اگر ہے تو نہ تک ساحل کو — ڈوبنا ہے تو ابھرنے کی تمنّا بھی نہ کر

تُو اگر مستِ مئے عشرتِ امروز نہیں — دلِ خود دار اخیالِ غمِ فردا بھی نہ کر

محرمِ رازِ محبت ہے اگر دل تیرا — تو خدا کے لئے! اس راز کو رسوا بھی نہ کر

جس نے پیغامِ محبت سے نوازا ہے تجھے — اُس نگاہِ طرب انگیز کو رسوا بھی نہ کر

اگر آسودگیٔ روح کی حسرت ہے روشؔ
ساحلِ گنگ کو محدودِ نظارہ بھی نہ کر

روشؔ صدیقی

قاصدِ محبّت

وایولا (ایک لڑکے کے لباس میں) حسین خاتون، میرے مالک اور آقا کو تجھ سے محبت ہے!

ایسی محبت کہ اگر تیرے سر پر یکتائیِ حسن کا تاج بھی ہو تو وہ اُس کا معاوضہ ہوسکتی ہے!

اولیویا۔ اُس کی محبت کیسی ہے؟

وایولا۔ اُس کی محبت میں پرستش ہے۔ شاداب آنسو ہیں، اُس کے نالوں میں محبت کی بجلیاں گرجتی ہیں اور اُس کی آہوں سے آگ کے شعلے برستے ہیں۔

اولیویا۔ تمہارے آقا کو میرے دل کی بات کی خبر ہے، میں اُس سے محبت نہیں کرسکتی،

پھر بھی میں اُسے نیک سمجھتی ہوں، شریف جانتی ہوں، وہ بڑی جاگیر کا مالک ہے، اُس کی جوانی شگفتہ اور بے داغ ہے؛

وہ آزاد، عالم اور بہادر مشہور ہے اور اُس کی فطرت سراپا جود و کرم ہے!

مگر پھر بھی میں اُس سے محبت نہیں کرسکتی؛ میرا جواب وہ مدتوں پہلے سمجھ چکا ہوگا۔

وایولا۔ اگر میرے دل میں تمہاری محبت اُس طرح شعلہ زن ہوتی جس طرح میرے آقا کے دل میں ہے، وہی درد و کرب اگر مجھے بھی برداشت کرنا پڑتا، وہی موت آگیں زندگی اگر مجھے بھی بسر کرنی پڑتی تو میں بھی تمہارے انکار میں کوئی مفہوم نہ پاتا؛

میں اسے کبھی نہ سمجھتا۔

اولیویا۔ کیوں، تم کیا کرتے؟

وایولا۔ میں پھونس کی ایک کٹی تمہارے دروازے کے سامنے بناتا، اور میری روح تمہارے گھر میں آکر میری محبت کا تقاضا کرتی؛

میں اپنی حقیر محبت اور وفا کے نغمے لکھتا، اور آدھی آدھی رات کو بھی انہیں بلند آواز سے گاتا؛ گونجنے والی پہاڑیوں میں تمہارے نام کا شور پیدا کرتا اور ہوا کے باتونی لبوں سے کہلواتا کہ اولیویا ہوا اور زمین کے عناصر میں رہ کر تمہیں مجھ پر رحم کئے بغیر کیونکر قرار آسکتا ہے؟

شیکسپیئر

منصور احمد

افسانہ نگار

امریکہ یا انگلستان کا کوئی ٹام، ڈک یا ہیری دن بھر کھیتوں یا کارخانوں میں کام کرنے کے بعد شام کو آگ کے سامنے بیٹھ کر کسی اہم سیاسی معاملہ پر بحث مباحثہ یا کسی نئی کتاب پر دل کھول کر نکتہ چینی کرے تو کرے مگر ایک ہندوستانی کسان زید عمرو بکر کے لئے کم از کم بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں یہ رسم رائج نہیں۔ اس لئے یوسف کا اپنی قلیل آمدنی کا ہر قلیل پس انداز ماہوار ادبی رسائل کے خریدنے میں صرف کرنا اگر کوئی عجوبہ نہ تھا تو نئی بات ضرور تھی۔ اخبارات سے البتہ اسے دلچسپی نہ تھی۔ قومی لیڈروں کے آئے دن کے جھگڑے، کسی خاص پارٹی کے برسر اقتدار ہونے اور بڑھ کر پھر گھٹ جانے سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا، اور نہ اِن معاملات پر غور کرنے کی اُسے فرصت ہی تھی۔ ان معاملات میں وہ حافظِ شیراز کے فلسفۂ گوشہ نشینی کا قائل تھا۔

اُس شاداب پھول کے مانند جو بستی کے ہنگاموں سے دور کسی چشمہ کے کنارے یا جھاڑی کے آغوش میں آنکھیں کھولتا ہے اور اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے، گاؤں کی پُرسکون فضا میں یوسف بھی اپنے آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا۔ اُس کا کوئی ہم مذاق نہ تھا۔ وہ ادبی دلچسپیوں کا دلدادہ تھا اور اسی لئے کتنی ایک رسائل کا خریدار، مگر جن امنگوں سے وہ ہر نئے پرچہ کو کھولتا، جن ترسی ہوئی بھوکی نظروں سے وہ اُس کا ہر لفظ پڑھتا اور پھر جس ترش روئی سے پیشانی پر بل دے کر وہ اُسے پھینک دیتا، اُس سے صاف ظاہر تھا کہ جس بات کی تلاش اُسے ان پرچوں میں رہتی ہے وہ ان میں موجود نہیں ہوتی۔ بارہا اُسے خیال آتا کہ یوں بے دریغ ان فضولیات میں پیسے برباد کر کے وہ اپنے اہل و عیال پر ظلم کر رہا ہے مگر ایک امید پر کہ شاید کسی آئندہ پرچے میں کوئی کارآمد بات نکل آئے وہ اپنی دھن ترک نہ کر سکتا، مگر اُس کی یہ آرزو کبھی بر نہ آئی۔ ہر مطالعہ کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ مالکانِ رسائل رہزن ہیں گرہ کٹ ہیں اور وہ خس و خاشاک کے بدلے غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنی جیبیں گرم کرتے ہیں۔

"ادبِ لطیف" میں ایک اعلان شائع ہوا۔

ناظرین کرام کو مژدہ۔ جناب اختر الہ ابادی کی ممتاز شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ آسمانِ ادب کا وہ درخشاں ستارہ ہے جس نے اگر ایک طرف اپنی ضیا پاشی سے عروسِ ادب کے محلِ زیبا میں چار چاند لگا دیئے تو دوسری جانب جذباتِ لطیف کی ترجمانی میں بھی وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا آئندہ

نمبر میں جناب اختر کا ایک دل گداز افسانہ چھپنے والا ہے جس کی اشاعت دنیائے ادب میں تہلکہ ڈال دے گی ـــــ ناظرین انتظار کریں۔"

یوسف کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں "دل گداز افسانہ۔ دل گداز افسانہ" اُس نے یہ الفاظ بآوازِ بلند دہرائے "بس، بس ایک ماہ کا انتظار اَور ..... اور میرے تمام انتظار کا ثمرہ مل جائے گا۔ میری تمام قیمت وصول ہو جائے گی۔ جذبات لطیف .... دل گداز افسانہ .... بس انہی کے لئے اتنے دنوں تک صرفہ اور کفایت کی کلفت برداشت کی ہے، انہیں کے انتظار میں مہینوں آنکھیں پھوڑی ہیں۔

اُس کی خوشی ارشمیدس کی خوشی سے کہیں زیادہ تھی۔ پرچہ ہاتھ میں لے کر "دیکھو۔ دیکھو" چلّاتا ہوا وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ "دیکھو۔ تم مجھے رسالوں کی خریداری سے منع کیا کرتی ہو۔" اُس نے اعلان والا صفحہ کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اپنی خوشی میں اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس کی بیوی پڑھنا نہیں جانتی اور اعلان کے الفاظ اس کے لئے سفید کاغذ پر چند کالے داغوں کے اور کوئی معنی نہیں رکھتے۔

جس وقت "ادبِ لطیف" کا وہ پرچہ جس کے انتظار میں یوسف نے دن رات ایک کر دیئے تھے آیا، وہ ڈاکخانہ ہی میں موجود تھا۔ آہ اُس کی وہ عریاں بے تابی جو کسی شاعر کے جذبات کو بھڑکا دینے کے لئے کافی تھی! ایکدم اس کا ہاتھ پرچہ پر پڑا جیسے منڈلاتی ہوئی چیل کا پنجہ گوشت کے لوتھڑے پر پڑتا ہے۔

اُس نے پرچے کو اپنی جگہ جگہ ادھڑی ہوئی شیروانی کے نیچے چھپا لیا۔ ہاں یہ بے بہا خزانہ شیروانی ہی کی آغوش کے سپرد کیا جا سکتا تھا جو باوجود کامل بیس برساتیں دیکھنے کے آج بھی رسمِ مروت و رفاقت ادا کر رہی تھی۔

تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ مکان تک پہنچا۔ آنگن میں آکر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ شام ہو گئی تھی۔ چاندنی روشنی میں اُس نے پرچہ نکال کر مضامین کی فہرست دیکھی۔

جذباتِ دل	حضرتِ اختر الہ آبادی	۱۴

وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کا مالک تھا اور منزلِ مقصود اُس کے زیرِ قدم۔ "چراغ لاؤ۔ چراغ لاؤ" اُس نے زور سے کہا اور چاندنی کی خفیف سی روشنی میں صفحہ ۱۴ اُس کی بھوکی نظروں کو للچا رہا تھا۔

گھر والے اُس کا دیوانہ پن دیکھنے کے لئے اردگرد جمع ہو گئے۔ صفحہ پر نظریں گاڑ کر اُس نے پڑھنا شروع کیا لیکن جوں جوں اُس کی نظریں سطروں کے زینے کو طے کرتی گئیں، اُس کے چہرے کی بشاشت اور سرخی رُوپوش ہوتی گئی جس طرح ناٹک کا کوئی دلفریب منظر آہستہ آہستہ نظروں سے پنہاں ہو جاتا ہے، جس طرح ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں بڑھتی

ہوئی تاریکی کی وسعت میں گم ہوجاتی ہیں اسی طرح مضمون ختم ہوتے ہوتے اُس کی مسرت، امید ولولہ سب ہی رخصت ہو گئے۔ اُس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔

''افسوس۔ صد ہزار افسوس'' اُس نے دل ہی دل میں کہا ''یہ ہیں ہمارے زمانہ کے ادیب جلیل۔ یہ ہیں وہ جن پر دنیائے ادب ناز کرتی ہے'' اور ساتھ ہی اُس نے ''ادبِ لطیف'' کے پرچہ کو جھنجھلا کر دور پھینک دیا۔ ''لفاظی محض لفاظی'' اُس نے آسمان کی جانب آتش بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا ''جسم بغیر روح، لفظ بغیر خیال، پھول بغیر خوشبو دل بلا جذبہ۔ یہ سب مضمون نگار ترقی کی بجائے تنزل کے راستہ پر بھٹک گئے ہیں اور ذوقِ ادب رکھنے والے بھی ان کے ساتھ ساتھ بھیڑ چال چلے جارہے ہیں۔ سراب کے چشم فریب منظر نے اُن کی آنکھیں چندھیادی ہیں اور یہ حقیقت کے ابلتے ہوئے چشمے سے کوسوں دور ہیں۔ اصلیت کی عمیق گہرائیوں تک ان جذبات نویسوں کی پہنچ نہیں ہوسکتی سطح پر ہی جو سیپ گھونگے ہاتھ آگئے ہیں انہیں پر نازاں ہیں، اصلی موتیوں سے بے خبر .....''

اور اب وہ پھر خاموش ہوگیا۔ سامنے رکھا ہوا چراغ ٹمٹما ٹمٹما کر تاریکی سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کر رہا تھا اُس نے انگلی سے اس کا گل جھاڑا اور ایک عجیب اندازِ بے خیالی سے اس کی لَو کی جھلملاہٹ کو دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی نگاہیں اِس ارتعاش نور میں جذب ہوکر رہ گئی ہیں۔

بچوں نے عمر بھر میں یوسف کو اتنا غضبناک کبھی نہ دیکھا تھا۔ غریب سہم کر ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ سب سے چھوٹا بچہ ایک چیخ مار کر ماں سے چمٹ گیا۔ حمیدہ نے بلا حرکتِ ارادی اُسے سینہ سے لگا لیا مگر خاوند کے چہرے پر سے نظریں نہ اُٹھائیں۔ دفعتہً تیر کے مانند ایک خیال حمیدہ کے دل و جگر کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ کیا واقعی محلہ والوں کے قول کے مطابق یوسف پاگل ہوگیا ہے؟ اور بے ساختہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں ان آبدار موتیوں کو حمیدہ نے بچے کی نظریں بچاتے ہوئے مٹھی کی پشت پر لے لیا اور انتہائی ضبط و ہمت سے کام لے کر شوہر کے قریب گئی اور اُس کا شانہ ہلا کر کہنے لگی ''کھانا تو کھا لیتے''

حمیدہ کی التجا اُن کانوں سے ٹکرائی جن کی قوتِ سماعت جاچکی تھی۔ البتہ اُس کے ہاتھ کے مس سے وہ چونکا اور مجنونانہ حالت میں بولا۔

''میں ایک جاہل شخص ہوں۔ بے شک مجھے اس گاؤں کے ابتدائی مدرسہ کے علاوہ اور کوئی دوسری تعلیم نصیب نہیں ہوئی۔ مگر میں ایک دل رکھتا ہوں اور اُس میں جذبات، ایک سر رکھتا ہوں اور اُس میں سودا، ایک دماغ رکھتا ہوں اور اُس میں تخیل اور اِن خشک ادیبوں سے بدرجہا بہتر۔ کاش گویائی میرے پروازِ تخیل کا ساتھ دیتی، میرے جذبات

کی ترجمان ہوتی اور دل آویزی کے ساتھ انہیں صفحاتِ کاغذ پر ترتیب دے سکتی۔ اُس وقت میں جذباتِ دل لکھتا اور یقیناً دنیائے ادب میں کھلبلی ڈال دیتا۔ مگر میں مجبور ہوں فطرت کے اس عمیق راز سے، قدرت کی اس ستم ظریفی سے کہ جن کے دل جذبات سے معمور ہیں اُن کے لبوں پر خاموشی کی مُہر ثبت ہے، مگر جن کے دل و دماغ ظرفِ تہی کی طرح خالی ہیں اور جو فطرت کے اس گراں قدر عطیہ سے یکسر محروم ہیں۔ ان کی زبان میں گویائی ہے سلاست ہے روانی ہے اور وہ ایک دلکش اندازِ بیان پر قادر ہیں...... لغویات کو حسین لفظوں کا لباس پہنا دینا ان کے ادبی کمال کی انتہا ہے اور اسی روش پر خلق کا مدار ہے۔ لفظوں کی بھول بھلیاں میں پھنس کر دنیا اس حقیقت سے غافل ہو چلی ہے کہ دنیا میں کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے قابل ہیں...... ہاں ہاں تم شاہد رہو اس بات کی، کہ اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہوا جو دل کے جذبات کو لفظی شکنجوں میں گرفتار کرنے کے قابل ہو گیا تو اُس شخص کو ادبی دنیا میں حیاتِ دائمی نصیب ہو گی سو ہی قابلِ قدر ادیب ہو گا۔ شہرت کی دیوی اُس کے آگے سرِ نیاز خم کرے گی اور دنیا اُس کا لوہا مانے گی...... اور یہ...... یہ کیا ہے...... یہ اُس تعلیم یافتہ شخص کی جس کے پڑھنے کے لئے یہ مضامین لکھے گئے ہیں صریح توہین ہے۔ یہ فنا ہو جانے والی عبارتیں ہیں۔ یہ ادب نہیں ہے۔ ادب کی نقل ہے۔ دیکھو دیکھو تمہیں بتاتا کہ یہ مضمون اس قابل بھی ہے کہ اس کے لئے کوئی روز ڈاک گھر دوڑے ہ!اور اتنا کہتے کہتے اُس نے "ادب لطیف" کے پرچہ کو پھر اُٹھا لیا۔ تیرہواں صفحہ کھولنا چاہتا تھا مگر کھولا تو یوسف کی نظر ایک نئے ہی صفحہ پر پڑی۔

یہاں جلی قلم سے ایک دوسرا اعلان چھپا تھا۔ اُس کی توجہ فطرتاً اعلان کی طرف مائل ہو گئی اور بیوی کو مضمون سنانے کی خواہش جاتی رہی۔ وہ کچھ دیر تک غور سے اعلان کو دیکھتا رہا اور پھر ایک نفرت آمیز قہقہہ کے بعد جس میں غم و غصہ کا عنصر بھی شامل تھا، اُس نے کہا "یہ دیکھو!" اور پھر بلند آواز سے اعلان کو پڑھا۔

"پانچ سو روپے کا انعام، سب سے اچھے افسانے کے لئے"

"یہ دوسری ستم ظریفی ہے، پھر چند دنوں کے بعد کسی ژٹل نویس کو پانچ سو روپے کی گراں قدر رقم دے کر، اس کی شہرت کا ڈنکا پیٹ دیں گے اور شہر سے دور دیہات کے کسی خلوت نشین شائقِ ادب کے دل کو میری طرح پاش پاش کر دیں گے اور انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔ افسوس۔ افسوس!!" اور پھر اُس نے اپنی پیشانی پر زور زور سے ہاتھ مارا "کاش۔ کاش مجھ میں یہ قوت پیدا ہو جاتی۔ میں دنیا کو ایک بڑی ناامیدی سے بچا لیتا......"

وہ پھر خاموش ہو گیا اُس کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک رنگ جانے لگا۔ پیشانی پر گہری گہری جھریاں

پڑگئیں جن کی درزوں میں سے پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اور پھر اُس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں نہیں خواہ کچھ ہو، میں لکھوں گا۔ اس لیئے نہیں کہ مجھے انعام کا لالچ ہے، نہ اس لئے کہ میں شہرت کا بھوکا ہوں، بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ میں دنیا کو ایک بڑی غلط فہمی سے بچا لوں۔ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہتا ہوں کہ لفاظی اور چیز ہے اور جذبات کی مصوری اور چیز۔"
"میں جاہل ہوں، بلا سے۔ میری زبان شگفتہ نہیں، نہ ہو۔ بیان میں تسلسل نہیں، نہ سہی۔ قادرِ مطلق نے ہر کس و ناکس کے دل میں جذبات پیدا کئے ہیں۔ یہ صرف شہر والوں کی، اونچی حویلی کے مالکوں کی، بڑے بڑے عالموں فاضلوں کی میراث نہیں ہے۔ میں ان عالموں سے ان سکانِ شہر سے بہمہ وجوہ بہتر ہوں کہ میں نے علم پڑھ کر علم کو پامال نہیں کیا۔ میں دنیا والوں کی دلشکن ایجادات صرف و نحو، قیودِ انشا پردازی، ترتیبِ خیال، بندشِ الفاظ سے بالکل آزاد ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ قیود انسان کے دل کو مردہ کر دیتی ہیں۔ وہ جذبہ ہی کیا جو ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح غم آشنا آنکھوں کے آنسوؤں کی طرح آزادانہ طور پر ظاہر نہ ہو سکے۔ وہ خیالات ہی کیا جن کے لئے گوشۂ دماغ میں فرسودہ و غیر موزون الفاظ کی تلاش کی جائے۔ جن کے لئے لُغت کی ورق گردانی کرنی پڑے، جن کے لئے اور ایسی ایسی ناہموار وادیوں اور سنگلاخ میدانوں کی صحرانوردی کی جائے۔ میرا یقین ہے کہ ہر دلآویز خیال اپنی جداگانہ شکل و صورت رکھتا ہے اور اپنی ادا کے لیئے خاص اندازِ بیان، ورنہ یوں بظاہر شیریں لیکن غیر موزون ترکیبیں کانوں کو خوشگوار معلوم ہوں تو ہوں روح کو فرحت نہیں پہنچا سکتیں۔"

سالہا سال کے خفتہ آتش فشان دل کے اندر بھڑک اُٹھے، وہ آتش فشاں جن کے شعلے اُس کے دل و دماغ میں ایک زلزلہ برپا کئے رکھتے اگر وہ اُن کو نکالنے کی، اُنہیں ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں نہ کرتا۔ پس وہ تُل گیا، ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لئے، برسوں کی روحانی تشنگی کو دور کرنے کے لئے ——— اپنا افسانۂ دل لکھنے کے لئے وہ تُل گیا۔

اُس نے لکھنا شروع کیا۔ دل کے اندر ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ صدیوں کے بھولے بسرے واقعات جن میں اُس کی روح نے حصہ لیا تھا آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ دل کی نامعلوم گہرائیوں سے بخارات اٹھ اٹھ کر دماغ کی آخری سطح پر آ گئے اور نکل جانے کے لئے بیتاب ہو گئے جس طرح ابلتے ہوئے پانی کا ہر بلبلہ سطح پر آ کر پھوٹ جانے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ جذبات کا ہجوم اور اُن کی مصوری کے لئے ایک لرزتا ہوا ہاتھ! ایک جنگ تھی جس کا نظارہ صرف عالمِ تخیل میں ہو سکتا ہے!

گھنٹوں کی جان توڑ کاوش کے بعد وہ صرف چند سطریں لکھنے میں کامیاب ہو سکا مگر جس طرح کسی مشین کا انجن

کچھ دیر آہستہ آہستہ چلنے کے بعد تیز ہو جاتا ہے اسی طرح اُس کے قلم میں بھی روانی آ گئی۔ اُس کی داستانِ غم طلب کے نامعلوم چشمہ سے ابل ابل کر مترنم الفاظ کے دریا میں بہنے لگی ——— الفاظ جن میں شباب کی امنگیں تھیں، شراب کی مدہوشی تھی اور شعلوں لپٹ تھی + محبت زندگی کی سب سے زبردست قوت ہے عشق کے لطیف ترین جذبات جو ایک عالمِ خواب میں پڑے ہوئے تھے یک لخت جاگ اُٹھے اور ربابِ ہستی سے دلکش و شیریں نغموں کا ایک دریا چلنے لگا۔

رات آہستہ آہستہ ماضی کے بحرِ بے کراں میں ڈوب گئی، انجم کی فوج نے کئی رخ بدلے لیکن یوسف لکھتا گیا ——— خاموش اور خود فراموش اُس شمع کے مانند جو اُس کے جذباتِ دلی کی تنہا رازدان تھی۔ اُس کے قلم میں قلمِ ازلی کا زور تھا، جو لکھتی ہے اور لکھ کر بڑھتی چلی جاتی ہے اور جس کی عبارت کا ایک حرف بھی زاہدِ شب زندہ دار کی عبادت، یا خوفِ جزا سے رونے والی آنکھوں کے آنسوؤں سے نہیں مٹایا جا سکتا۔

صبح ہو گئی، سورج کی کرنوں کے پہلے سیلاب سے کمرہ دھل گیا۔ اُس وقت اُس کا لکھنا بند ہوا۔ اُس نے رات بھر محنت کی تھی مگر اُس کے جسم میں ذرہ برابر بھی تکان نہ تھی۔ اس کی رگ رگ میں ایک آسمانی پھرتی سرایت کئے ہوئے تھی، وہ اب بھی تازہ دم تھا!

اُس نے اپنے افسانے کی کوئی صاف کاپی نہ بنائی۔ اور نہ اُسے دوبارہ پڑھ کر دیکھا۔ بس جیسے کا تیسا لپیٹ کر ڈاک میں چھوڑ آیا۔

مشہور و معروف ادیب طلعت کمال جو اس فسانہ نگاری کے مقابلہ کے لئے منصف قرار دیئے گئے تھے دو چار روز سے نہایت پریشان تھے۔ کوئی ڈاک ایسی نہ ہوتی جس میں مختلف مقامات سے سو پچاس افسانوں کی رجسٹریاں نہ ہوتیں۔ رجسٹری شدہ پیکٹوں کے رسیدوں پر ہی دستخط کرتے کرتے وہ بیزار ہو گئے تھے، چہ جائے کہ ان بے شمار "ادبی جواہر ریزوں" کی جانچ پڑتال اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے۔ یہ ایک ایسا سخت مرحلہ تھا جس کے تصوّر سے اُن کی روح کانپ اٹھتی تھی اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے تھے

ما بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

آج جو کئی روز کے بعد ٹوٹے پھوٹے حرفوں میں ایک غیر رجسٹری شدہ پیکٹ ملا تو انہیں قدرے خوشی ہوئی۔ کوئی خانگی ڈاک سمجھ کر پہلے اسی کو کھولا۔ مگر یہ کیا! ٹیڑھے سیدھے حروف، پُر پیچ سطریں، بدنما روشنائی اور کاغذ پر بیسیوں جگہ داغ! آخر یہ ہے کیا بلا!

پڑھنے لگے تو مقابلہ والے افسانہ کی سرخی اور پہلے ہی لفظ کا املا غلط۔" اُفوہ آپ کو بھی مضمون نگاری کا شوق

چرایا اور پانچ سو روپیہ جیتنے کی ہوس ہوئی"۔ طلعت کمال نے افسانہ ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔

شام کو طلعت کمال صاحب کے ایک عزیز دوست اُن کے ہاں آئے اور کہنے لگے "کہو بھئی، اس انبار میں کوئی پڑھنے کے قابل چیز بھی ہے؟"

طلعت کو صبح والا مضمون یاد آگیا، فوراً ٹوکری سے نکال کر دوست کے حوالے کیا اور ازراہِ تمسخر بولے "ہاں ہاں کیوں نہیں، ملاحظہ فرمائیے مگر شرط یہ ہے کہ پورا پڑھئے"۔

دوست کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر انہوں نے مسکراتے ہوئے کاغذات طلعت سے لے لئے نظر پڑتے ہی اپنے دوست کے مزاحیہ جملے کا مطلب بخوبی سمجھ گئے مگر کہنے لگے،

"آخر اس بھلے آدمی نے لکھا کیا ہے یہ بھی تو دیکھوں"۔

اٹک اٹک کر دو ایک سطریں پڑھیں، طلعت کا دھیان دوسری طرف تھا، مگر جب چند فقرے ان کے کانوں میں پڑے تو وہ چونک کر بولے "کیا کیا؟ ذرا پھر پڑھئے نا؟"

اُن فقرات کو انہوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا، دونوں کی آنکھیں فرطِ انبساط سے چمک اٹھیں "اِس لکھت کے اندر ایسے الفاظ" انہوں نے جھک کر پرچے کو دیکھتے ہوئے کہا "ہاں ہاں اور آگے"۔

اور پھر یوسف کا ہر فقرہ ہر لفظ ہر حرف پڑھا گیا۔ آہ کیا الفاظ تھے اور ان کے اندر کیا کیا جذبات پوشیدہ تھے۔ ہر حرف ایک تیر تھا جگر دوز، ہر لفظ ایک شعلہ تھا دل افروز، وہ پُرکیف جملے اور اس پر اندازِ بیان کی سحر آفرینی! گودڑیوں کے اندر لعل، خس و خاشاک کے انبار میں موتیوں کا خزانہ" طلعت کمال نے نیم بےخودی کے عالم میں کہا، "یہ الہامی تحریر ہے ان الفاظ میں غیبی آواز کی گونج ہے جس کو انسانی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ..... مجھے اسے پھر پڑھ لینے دو۔ اس نے میری روح کو تڑپا دیا ہے، میرے جسم میں ایک نئی گرمی پیدا کر دی ہے ...."

ہر چھوٹے بڑے پرچہ میں یوسف کے الہامی افسانے کی دھوم مچ گئی، وہ ہر جگہ جلی قلم اور سنہری حروف میں چھاپا گیا۔ یوسف کے نام پانچ سو روپیہ کا انعام بھیجا گیا، مگر نہ تو ادبی دنیا میں وہ اپنی شہرت سن سکا، اور نہ اس گرانقدر رقم سے اپنے ہاتھ سینک سکا۔ دنیا نے ہمیشہ اپنے بہترین افراد کی ناقدر شناسی میں ناقابلِ معافی تاخیر سے کام لیا ہے پھر یوسف کیوں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوتا؟ فضائے ادب میں اُس کا نام مہر و ماہ بن کر چمکا مگر کب؟ اُس وقت جب خود اُس کی شمع حیات گل ہو چکی تھی۔ اُس کی شہرت کا چمن بہار کی شادابیوں سے ہم آغوش

ہوا۔ مگر آہ کس وقت ؟ اُس وقت جب کہ خود اُس کے گلزارِ ہستی کا پتہ پتہ تاراجِ خزاں ہو چکا تھا! اُس کی زندگی شہاب کی اُس نورانی کشتی کے مانند تھی جو تاریکی کے بسیط سمندر میں یکایک نمودار ہوتی ہے اور اپنی ظلمت افروز تجلّی سے فضائے عالم کو منور کرنے کے بعد آنِ واحد میں پھر تاریکی کی بے پایاں گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے یہ واقعہ ہے اور دل گداز حقیقت کہ یوسف، وہ یوسف کہ جس نے اپنی فوق الفطرت قابلیت سے دنیائے ادب میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا اپنے الہامی افسانے کی تحریر کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد اس معمورۂ آب و گل کو خیر باد کہہ چکا تھا۔

علمی حلقوں میں یہ دلخراش خبر آگ کی طرح پھیلی اور ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس مرگِ ناگہاں کی تاویلیں کیں۔ ڈاکٹروں نے اُس کے مرنے کا سبب یہ ظاہر کیا کہ اُس کے دل میں ناسور ہو گیا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔ چنانچہ اُس کی موت خون کے ضائع ہو جانے کے باعث واقع ہوئی۔

مگر خشک ڈاکٹروں کو کیا خبر تھی کہ اُس کے خون نے چمنستانِ ادب میں کیا کیا لالہ کاریاں کی تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اپنے خون کا ہر قطرہ اُس نے دنیا والوں کی آنکھیں کھولنے میں صرف کیا تھا، اُس نے اپنا دلگداز افسانہ خونِ دل سے لکھا تھا!

سیّد ممتاز اشرف قادری

میری بیڑیاں کٹ گئیں۔ میرے قرض ادا ہو گئے میرا دروازہ کھل گیا۔ اب میں ہر جگہ جاتا ہوں،
وہ اپنے کونے میں دبک کر بیٹھے ہیں اور اپنی زرد ساعتوں کا جال بُنے جاتے ہیں۔ وہ خاک پر بیٹھے ہوئے اپنے سکے گنتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ واپس آ جا،
لیکن میری تلوار تیز ہو چکی ہے میں نے اپنی زرہ پہن لی ہے اور میرا گھوڑا گرم جولاں ہونے کا تمنائی ہے
بس اب میں اپنی سلطنت کو جیت لوں گا،

گلچیں

شامِ شباب کے چند آنسو

دُور سے دردِ محبت میں نہ تڑپاؤ مجھے
پاس آ کر کسی تدبیر سے سمجھاؤ مجھے

مجھ کو اس حال کی ایک ایک گھڑی ہے بھاری
تم کو اس رنج میں لازم ہے مری دلداری

فرصتِ پرسشِ احوال نہیں اب بھی اگر
یہی کہہ دو کہ ہے مجھ کو تری حالت کی خبر

اک طرف درد کا طاری ہے دل و جاں پہ سرور
اک طرف فطرتِ انساں ہے مہیّا بہ قصور

تم جو چاہو تو بڑھا دو ابھی ہمت میری
موت کو ضد ہے کہ مٹ جائے یہ لذت میری

مار کر تم نے کیا تھا کرمِ خاص عیاں
اب جِلا لو تو یہ ہے اُس سے گراں تر احساں

دولتِ یاس بہم کی ہے بڑی مشکل سے
اِس بھرے گھر کو میں لٹواؤں بھلا کس دل سے

وہ بھی دن تھے کہ مجھے موت کی خواہش تھی مدام
اب تمنا ہے کہ اس زیست کو حاصل ہو دوام

کچھ تو ساماں پئے بیمارِ الم فرماؤ
اذن دے دو مرے جینے کا کرم فرماؤ

میں نے مانا کہ مسرت تو ہے اک وہمِ حیات
لذتِ غم کو تو بخشو مری دنیا میں ثبات

بارِ ہستی تھا غمِ آغازِ محبت میں مگر ق
مجھ کو اے کاش اُسی عہد میں ہوتی یہ خبر

کہ جو آغازِ محبت ہے وہی ہے انجام
اور اسی بار کا ہے راحتِ جاں بھی اک نام

آہ کس وقت کیا تم نے حقیقت سے دوچار
سازِ تدبیر کا جب ٹوٹ چکا ہے ہر تار

ہائے کب مجھ پہ کھلے معنیِ عنوانِ حیات
جب کہ بجھنے کو ہوئی مشعلِ سوزانِ حیات

اے محبت ترے انداز و ادا پر قرباں
ترے اس غمکدۂ دل پہ ہیں کیا کیا احساں

مخمورؔ اکبر آبادی

ہیرو

جب میں میڈیکل کالج کلکتہ سے ڈاکٹری کا آخری امتحان پاس کرکے اپنے گاؤں نرسنگھ پور میں آیا تو اس وقت میری عمر بائیس سال کی تھی۔ چونکہ موروثی جائداد بہت کافی تھی اس لئے نوکری کی مجھے ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ میں نے ارادہ کیا کہ اپنے گاؤں ہی میں ایک چھوٹا سا مطب کھول کر غریبوں کا مفت علاج کیا کروں تاکہ میری طبیعت بہل جائے۔

ڈاکٹر بننے کا مجھے کوئی خاص شوق نہ تھا ہاں اس کے بجائے میری دلی خواہش تھی کہ میں ایک "ناول کا ہیرو" بن جاؤں۔ لڑکپن ہی سے ناول پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا اور شاید یہ اسی کا اثر تھا کہ ہیرو بننے کے لئے میں ہمیشہ بے تاب رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی میں اپنی شکل دیکھتا تو میرا دل گواہی دیتا کہ مجھ میں ہیرو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مگر خدا کی شان مجھے ہیرو بننے کا بہت جلد موقع مل گیا۔

مطب کے لئے دوائیں خریدنے کلکتہ گیا اور وہاں اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہرا۔ خیال تھا کہ دو چار دن کے بعد گھر واپس ہو جاؤں گا۔ صبح کے وقت اشنان کرنا میرا معمول تھا۔ چنانچہ کلکتہ میں بھی علی الصباح اٹھتا اور کندھے پر انگوچھا اور دھوتی ڈال کر گنگا نہانے چلا جاتا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ جب میں نہا کر گھاٹ سے واپس ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک بابو صاحب نے میرے قریب آکر پوچھا "کیا تم مہاراج ہو"؟

میرے برہمن ہونے میں تو کوئی شک نہ تھا لیکن اس سے پیشتر مہاراج کے خطاب سے مخاطب کئے جانے کا مجھے کبھی فخر حاصل نہ ہوا تھا۔ میں نے سوچا شاید بابو صاحب نے غلطی سے مجھے مخاطب کیا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر بابو صاحب نے پھر کہا "عجیب آدمی ہو، جواب کیوں نہیں دیتے، کیا تم مہاراج نہیں ہو؟"

اب مجھے خیال آیا کہ شاید میری صورت "ہیرو" کی بجائے کسی "رسوئیا" سے ملتی جلتی ہے اور بابو صاحب "رسوئیا" کی تلاش میں ہیں۔ میری زبان سے نکل گیا ——— "جی ہاں"

"کہیں نوکر ہو"؟

"جی نہیں"

"نوکری کروگے؟"

"بڑی خوشی سے۔"

"کھانا پکانا اچھی طرح جانتے ہو؟"

"جی ہاں یہ تو میری ذات کا پیشہ ہے اس کو بھلا میں نہ جانوں گا۔"

"گھر کہاں ہے؟"

"جبلپور"

"نام؟"

"ہری دھن لکھوا دیجیے۔"

"کتنے دنوں سے کلکتہ میں ہو؟"

"مجھے یہاں آئے چار پانچ دن ہوئے ہیں۔"

"نوکری کی تلاش میں آئے ہو گے؟"

"اور نہیں تو کیا ناٹک دیکھنے آیا ہوں۔"

بابو صاحب کچھ بگڑ کر بولے "تم کو تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ بڑے گستاخ معلوم ہوتے ہو بھلے آدمیوں سے کیا اسی طرح باتیں کی جاتی ہیں؟"

میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا میں نے سوچا ہیرو بننے کا یہی موقع ہے رسوئیا بن کر ان کے گھر دو چار روز کام کروں گا تو کچھ نہ کچھ تجربہ ہو جائے گا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "حضور دیہات کا رہنے والا ہوں کچھ جانتا نہیں معاف کیجیے گا۔"

بابو صاحب نرم ہو گئے اور بولے "تو کیا تم سچ مچ برہمن ہو یا یوں ہی خواہ مخواہ بن گئے ہو۔ آج کل گلے میں جنیئو ڈال کر بہت سے لوگ برہمن بن رہے ہیں۔"

میں نے سوچا "ہائے کیا میری صورت سے لوگوں کو بھنگی یا چمار ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا "حضور میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا"

اس کے بعد بابو صاحب نے مجھ سے گائتری منتر پوچھا اتفاق سے مجھے یہ منتر بخوبی یاد تھا۔ اس سے بابو صاحب کا اطمینان ہو گیا اور وہ بولے "کیا تنخواہ لو گے؟"

میرے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو برہمن کھانا پکاتا تھا وہ پانچ روپے ماہوار اور خوراک پر نوکر تھا۔ میں

نے وہی کہہ دیا۔ بابو صاحب نے کہا۔ "میرے یہاں تو چار روپے اور خوراک ملے گی۔ اس کے علاوہ سال میں دو دھوتیاں اور دو کرتے بھی دیا کروں گا۔ کہو منظور ہے"

میں نے سر کھجلا کر کہا۔ مالک چار روپے میں کیسے گذر ہو گا۔ بہت بڑا کنبہ ہے ان کو کیسے کھلاؤں گا۔"

"تمہارے کنبہ میں کتنے لوگ ہیں؟"

"ماں باپ اور بھائی ——"

بابو صاحب نے قطع کلام کر کے کہا۔ "رسوئیا کی نوکری کر کے ماں باپ اور بھائی کو کیسے کھلاؤ گے؟ میں سو روپے ماہوار پاتا ہوں لیکن بڑی مشکل سے گذر ہوتا ہے —— میرے خیال میں تو ایک روپیہ تم اپنے پاس رکھنا اور تین روپے اپنی استری کو بھیج دینا۔"

"مالک میرا بیاہ ابھی نہیں ہوا۔"

"اب تک کیوں نہیں ہوا؟ کیا کوئی 'دوش' (نقص) ہے؟"

"دوش —— غریبی کا دوش ہے۔ ایسے غریب کو اپنی لڑکی کون دے گا؟"

"تم نے بہت عقلمندی کی جو اب تک بیاہ نہیں کیا۔ صاحب لوگ بھی جب تک خوب کمانے نہیں لگتے بیاہ نہیں کرتے۔ افسوس ہے کہ تم انگریزی نہیں جانتے۔ ورنہ کتابوں میں ان کا حال پڑھتے۔ میرے دفتر ہی میں ایک صاحب ہیں جن کی چالیس برس کی عمر ہو گی، ایک ہزار تنخواہ پاتے ہیں، لیکن انہوں نے اب تک بیاہ نہیں کیا۔"

میں چار روپے پر راضی ہو گیا۔ بابو جی نے کہا اگر تم کام اچھا کرو گے تو سال بھر کے بعد تنخواہ بڑھا دوں گا اسی وقت میرے گھر پر چل کر بھوجن تیار کرو، میرا رسوئیا بھاگ گیا ہے، گھر والی بیمار ہے سخت تکلیف کا سامنا ہے۔"

۲

اس طرح سے رسوئیا بن کر ایک بابو کے ہمراہ چل پڑا۔ سوچنے لگا کہ "بڑی مشکل سے قسمت آزمائی کا موقع ملا ہے، دیکھوں کیا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔"

بابو جی کا نام کالی کانت لحائے تھا۔ بالی گنج میں رہا کرتے تھے ان کے گھر میں جا کر دیکھا تو چھوٹے سے آنگن میں آم کی گٹھلیاں، بھات، ترکاری اور پتلون کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ایک کونے میں پانی کا نل لگا تھا جس میں بانس کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا کپڑے سے بندھا تھا اور اس سے پانی بہ کر ایک چھوٹے سے حوض میں گر رہا تھا

بابو صاحب نے آنگن میں کھڑے ہو کر پکارا۔ "پری یہاں آ"

آواز سن کر کوٹھے کے چھجے پر ایک لڑکی آکر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ "بابا! چلاؤ نہیں، ماں سو رہی ہیں۔"

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا ـــــ رومیو اور جولیٹ کا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا ـــــ بکھرے ہوئے بالوں والی خوبصورت جولیٹ نے کوٹھے پر سے دیکھا کہ کندھے پر انگوچھا ڈالے اور ہاتھ میں بھیگی دھوتی لئے حسن نصیب رومیو رسوئیا کا بھیس بدلے کھڑا ہے ـــــ جولیٹ کی عمر چودہ برس کی تھی، میری جولیٹ کی بھی اتنی ہی عمر ہوگی کالی کانت بابو نے اس کو دیکھ کر پھر کہا۔ "پری نیچے آجا"

"پری" "پریتما" یا "پری بلا" ایک ہیروئن کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی نام نہیں ہو سکتا۔

پاؤں کے گھنگھروؤں سے ایک عجیب پیاری صدا نکلی اور وہ چھم چھم کرتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ بابو صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ "رسوئیا آگیا ہے اس کو سب کام سمجھادو"

لڑکی میرے وہم و خیال سے بھی زیادہ خوبصورت تھی میں سوچنے لگا "کیا اس کے نازک دل میں ایک رسوئیا جگہ پا سکے گا؟"

میرے خیالات کا سلسلہ بابو جی نے یہ کہہ کر منقطع کر دیا۔ آٹھ بج چکے ہیں، مجھے ۹½ بجے دفتر جانا ہے کیا اس سے پہلے کھانا پکا لوگے؟"

میں نے کہا "مالک کوشش کروں گا۔"

بابو جی نے کہا "تھوڑا سا بھات اور دال پکا لینا۔ میں بازار سے مچھلی لینے جا رہا ہوں گھر میں ترکاری موجود ہے۔"

بابو جی کے جانے کے بعد پری نے مجھے رسوئی گھر میں پہنچا دیا۔ میں نے اندر جا کر دیکھا تو اس وقت تک آگ بھی نہ جلی تھی میں نے کہا "مصرانی کہاں ہے ذرا چولہے میں آگ جلادے؟"

پری نے جواب دیا۔ "مصرانی ہمارے یہاں نہیں ہے ایک نوکرانی تھی وہ بھی ایک مہینہ ہوا کام چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اب نوکرانی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ہی سب کام کرتی ہوں۔ لاؤ آگ جلا دوں"

"نہیں، نہیں، تم تکلیف نہ کرو، میں خود آگ جلاتے لیتا ہوں" یہ کہہ کر میں اس تھوڑے سے کوئلے سے جو چولہے کے پاس پڑا تھا آگ سلگانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کام کتنا مشکل ہے یہ مجھے پہلے سے معلوم نہ تھا۔ پری کھڑی میری حالت پر مسکراتی رہی، آخر مجبور ہو کر اس نے کہا "کہیں اس طرح سے کوئلے میں آگ لگ سکتی ہے؟"

میں نے بڑی حسرت سے کہا "تو اچھا تمہیں بتادو کہ میں کیا ترکیب کروں؟"

"اچھا ہٹو، میں خود آگ جلاؤں گی۔ تم مچھلی میں ڈالنے کے لئے آلو کاٹ ڈالو۔"
پری کو اس تکلیف دہ کام میں لگانا مجھے بہت شاق گذرا لیکن مجبور تھا کیونکہ یہ فکر بھی تھا کہ ۹½ بجے تک کھانا تیار ہو جانا چاہئے ورنہ بابوجی ناراض ہو نگے۔ پری آگ سلگانے میں لگ گئی اور میں آلو کاٹنے لگا۔
چولہا سلگا کر پری میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور گالوں پر ہاتھ رکھ کر بولی ــــــ "واہ! خوب! یہ کیا؟"
میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"
"کیا تم مچھلی میں ڈالنے کے لئے آلو کاٹ رہے ہو؟"
"جی ہاں"
"تم تو گول گول آلو کاٹ رہے ہو اس طرح تو ساگ اور ترکاری میں ڈالے جاتے ہیں مچھلی میں ڈالنے کے لئے آلو کے چار ٹکڑے کرنے چاہئیں۔"
میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "اوہو! بڑی غلطی ہوئی۔"
پری نے کہا۔ "لاؤ میں کاٹوں" میں سرک گیا اور چولہے کی سلگتی آگ پر پنکھا جھلنے لگا۔
پری نے مسکرا کر پوچھا۔ "کھانا پکانا جانتے ہو یا وہ بھی اسی طرح ــــــ"
میں نے کلیجہ تھام کر جواب دیا۔ "بس اسی طرح"
"اسی طرح ــــــ معلوم ہوتا ہے تم نے کبھی اس کام کو نہیں کیا۔"
"جی ہاں"
"پھر نوکری کیوں کی"
میں نے نوکری کیوں کی ــــــ یہ راز کھول دوں تو ابھی سب معاملہ خراب ہو جائے۔ میں خاموش تھا پری نے میری خاموشی کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا اُس کا چہرہ اداس ہو گیا وہ ہمدردانہ لہجہ میں بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت غریب ہو۔"
میں نے نیچی نظر کر کے سر جھکا لیا اور غمگین آواز میں جواب دیا ــــــ "میں تو کچھ نہیں جانتا۔ بابوجی کو جب یہ معلوم ہوگا تو وہ مجھے ضرور نکال دیں گے۔"
ڈھارس دے کر پری نے کہا۔ "میں یہ بات کسی سے نہ کہوں گی، بلکہ تم کو آہستہ آہستہ سب کام سکھا دوں گی۔ تم ... ہار معلوم ہوتے ہو، جلد سیکھ جاؤ گے۔"

"کیا تمہاری ماں کو نہ معلوم ہو جائے گا؟"

"میری ماں دائم المرض ہیں۔ کسی دن سر میں تو کسی دن کہیں اَور درد ہی ہوا کرتا ہے، بڑا چڑچڑا مزاج ہے ہروقت بکتی جھکتی رہتی ہیں، لیکن کوٹھے سے نیچے نہیں اترتیں کیونکہ ان کا دم پھولنے لگتا ہے۔"

"شاید ان کے بکنے جھکنے سے ہی یہاں کوئی رسوئیا نہیں ٹکتا؟"

اس بات سے پرتیما کچھ شرمندہ سی ہوگئی میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا "تمہارا پورا نام کیا ہے"؟

"پرتیما"

"پرتیما! بڑا پیارا نام ہے۔"

پرتیما نے لاج سے سر نیچا کر لیا۔

"تمہارے کتنے بھائی ہیں؟"

"حقیقی بھائی تو صرف ایک ہے، اس ماں سے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔"

اب میں نے سمجھ لیا کہ گھر والی پرتیما کی سوتیلی ماں ہے ---- نوکرانی کیوں نہیں رکھی گئی یہ بھی معلوم ہوگیا۔ پرتیما کے لئے میرے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس عرصہ میں بابو صاحب مچھلی لے کر آ گئے اور باہر ہی سے پوچھا "کھانا پکنے میں کیا دیر ہے"؟

میں نے کہا "مالک اب کچھ دیر نہیں ہے"

"ہاں ہاں جلدی ہی ہونی چاہئے۔ سمجھ گئے کہ نہیں؟ زیادہ پھیلاؤ کی ضرورت نہیں۔ میں اس وقت صرف دال بھات ہی کھاؤں گا۔ جب میں دفتر چلا جاؤں گا تو پھر اطمینان سے مچھلی بنانا" یہ کہہ کر باوجی اوپر چلے گئے۔

۲

پہلے سوچا تھا کہ دو چار دن رسوئیا کا کام کر کے گھر بھاگ جاؤں گا لیکن ایک مہینہ ہوگیا اور باوجی کے یہاں سے میرا جانا نہ ہوسکا پرتیما کی محبت کی زنجیر میرے پاؤں میں پڑ گئی۔ پرتیما گو مجھے رسوئیا ہی سمجھتی تھی لیکن میرے ساتھ اس کا برتاؤ بہت شریفانہ تھا۔ پرتیما کچھ لکھ پڑھ بھی سکتی تھی۔ میں نے اسے کئی اچھی اچھی کتابیں لا کر دیں۔ جہاں وہ نہ سمجھتی میں سمجھا دیتا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "تم تو بہت تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو رسوئیا کے بجائے اگر تم کسی اسکول کے ماسٹر ہوتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

میں نے کہا "ماسٹری کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں یہ نوکری چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا"

پریتما کی اب تک کہیں شادی نہ ہوئی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بابوجی سستا بر ڈھونڈتے تھے اور اس میں ان کو اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی۔ مجھے جب سے یہ معلوم ہوا تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دن بابوجی پر اپنا حال ظاہر کرکے شادی کی درخواست کروں گا"

پریتما کے ساتھ میری محبت بڑھتی جاتی تھی۔ بھادوں کے مہینہ میں ہمارے یہاں بیاہ نہیں ہوتا سوچ رکھا تھا کہ کوآر میں بابوجی سے کہوں گا اور پریتما کو بیاہ کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر بابوجی نے میری درخواست نامنظور کردی تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔

بابوجی کے مکان کے قریب ہی میں نے ایک اچھا سا مکان لے رکھا تھا لیکن بابوجی کو یہ حال نہ معلوم تھا۔ رات کو میں اسی مکان میں رہتا تھا ایک دن علی الصباح جب میں اپنے کام پر آیا تو پریتما کو کمبل اوڑھے دیکھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رات کو جاڑے سے بخار ہو گیا تھا اور اب بھی سردی لگ رہی ہے۔ دوسرے دن بھی اس کا یہی حال ہوا۔ پریتما کو بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ برتن مانجنا، کپڑے دھونا، بچوں کو کھلانا، بغرض کہ اسی طرح کے اس کو بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ بخار میں آرام نہ ملا تو اس سے اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ایک دن میں نے بابوجی سے کہا "پری کا جی اچھا نہیں ہے اوپر کے کام کے لئے اگر ایک نوکرانی مل جائے تو اچھا ہو"

بابوجی نے منہ بنا کر جواب دیا، "تم تو یہ کہہ کر فرصت پا گئے لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ تھوڑے دن کے لئے یہاں نوکرانی نہیں مل سکتی"

مجھے رنج کے ساتھ ہی بہت غصہ معلوم ہوا میں نے کہا، "اگر آپ حکم دیں تو میں تلاش کروں"

با دلِ ناخواستہ بابوجی نے "ہاں" کہا اور اوپر چلے گئے۔ میں نے اس دن نوکرانی کی بہت تلاش کی لیکن بدقسمتی سے مجھے کہیں نہ ملی۔

ایک مصیبت اور آئی پری سے روٹی نہیں کھائی جاتی تھی، میں نے جب اس سے پوچھا کہ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے تو اس نے جواب دیا "انار اور انگور" میں نے بابوجی سے کہا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا "انار اور انگور بخار میں نقصان کرتے ہیں میں ایسی چیزیں ہرگز نہ منگاؤں گا" میں خاموش ہو گیا لیکن یہ خیال کرکے بہت رنج ہوا کہ کچھ دن ہوئے بابوجی کے چھوٹے بچے کو بخار آیا تھا تو انہوں نے انار اور انگور کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ دل میں ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو آج شام کو پری کے لئے میں خود کوئی چیز لاؤں گا چنانچہ جب میں شام کو اپنے کام پر آیا تو اپنے ساتھ ایک پٹاری انگور کی کچھ انار اور بسکٹ لیتا آیا۔ لیکن اس دن پری کوٹھے سے نیچے نہ اتری۔ اس کے حقیقی بھائی سوشل چندر

سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت زور کا بخار چڑھا ہے۔ کام کر کے جب گھر واپس ہوا تو ساری رات میں نے تڑپ تڑپ کر گذار دی۔ دوسرے دن میں نے سوشل سے پوچھا "اب تمہاری دیدی کی طبیعت کیسی ہے ؟"

دیدی ساری رات پانی پانی چلاتی رہیں، رات بھر نہیں سوئیں، بدن بہت گرم ہے، اس وقت کچھ نیند آگئی ہے۔"

"رات کو اُن کے پاس کون رہا"

"میرے سوا کوئی بھی ان کے پاس نہ تھا۔ میں دیدی کے پاس ہی سویا کرتا ہوں۔"

"تمہاری ماں اور بابوجی دیدی کو دیکھنے نہیں آتے ؟"

"بابا شام کو ایک دفعہ دیکھنے آئے تھے۔ بہت رات تک جب دیدی ماں! ماں! کہہ کر چلاتی رہیں تو ماں بھی ایک دفعہ اُٹھ کر آئیں لیکن کمرہ کے باہر سے ہی کھڑی ہو کر بولیں "اتنا شور کیوں مچا رہی ہے، سونے کیوں نہیں دیتی، منہ جلی چپ چاپ پڑی رہ۔" ماں کی ڈانٹ سن کر دیدی چپ ہوگئیں اور ڈر کے مارے پھر رات بھر پانی نہیں مانگا میں اوپر کبھی نہیں گیا تھا۔ کوئی کہاں رہتا ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ گھر کی "مالکن" کا کھانا اوپر ہی جاتا تھا لیکن یہ کام پرتیما کرتی تھی۔ صرف کل شام کو بابوجی کھانا لے گئے تھے۔

میں نے سوشل سے پوچھا "تمہاری دیدی کہاں سوتی ہے ؟"

"سیڑھی کے قریب ہی اُس کا کمرہ ہے۔"

میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ آج جب کام سے فرصت پاؤں گا تو پرتیما کو ضرور دیکھنے جاؤں گا سوشل سے کہا "آج تم اسکول نہ جانا۔ تمہاری دیدی بیمار ہیں انہیں کے پاس رہنا۔"

جب تک پرتیما بیٹھے بیٹھے کام کر سکی کرتی رہی، اُس وقت تک کوئی نوکرانی نہ ملی، لیکن آج نوکرانی مل گئی۔ اگر یہ انتظام پہلے سے ہو جاتا تو پرتیما کی طبیعت اتنی خراب نہ ہوتی۔ میرے دل میں بابوجی کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی میں نے سوچا "کیا دوسری شادی کرنے سے انسان اپنی اولاد سے اتنا غافل ہو جاتا ہے ؟ پرتیما بیمار ہے لیکن اس کا کوئی علاج کرنے والا نہیں۔ اگر اُس کی ماں زندہ ہوتی تو کیا بابوجی اتنی بے رخی سے کام لے سکتے تھے۔" میں نے سوچا کہ آج اوپر جا کر پرتیما سے ضرور ملوں گا۔ میں خود ڈاکٹر ہوں اُس کا خوب جی لگا کر علاج کروں گا۔"

اپنے وقت پر بابوجی دفتر چلے گئے تو میں "مالکن" کا کھانا اوپر رکھ آیا اور جب سب کاموں سے فرصت ہوگئی تو میں نے سوشل سے کہا۔ "چلو تمہاری دیدی کو دیکھ آؤں۔"

سوشل کے ساتھ اوپر گیا اور پریتما کے کمرہ میں داخل ہوا۔ ایک میلا پھٹا پرانا بستر فرش پر پڑا تھا اور اسی پر پریتما لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ میں پاس جاکر زمین پر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ تھام کر پوچھا "پری کیسی طبیعت ہے؟"

پری نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولی "مہاراج میرا سر پھٹا جارہا ہے کیا کروں"

میں نے نبض پر ہاتھ رکھا تو بہت زور کا بخار معلوم ہوا۔ میں یہ کہہ کر "گھبراؤ نہیں میں دوا لینے جارہا ہوں" کوٹھے سے اترا اور دوڑتا ہوا ایک ڈاکٹر کی دوکان سے چار خوراک "ایسپرن" کی لایا اور فوراً ایک خوراک پریتما کو کھلادی اور اُس کا سر دابنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا "اب طبیعت کیسی ہے"

پری نے محبت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مہاراج اب تو درد میں کچھ کمی ہوگئی ہے"

اس کے بعد میں نے پری کو اچھی طرح سے دیکھ کر نسخہ لکھا اور بازار سے دوا لاکر اُس کو پلادی۔ اُس دن اس کی طبیعت بہت اچھی رہی اور رفتہ رفتہ وہ روبصحت ہونے لگی۔ میں نے پہلے دن سوچا تھا کہ مجھ کو دوا وغیرہ لاتے دیکھ کر بابو جی ضرور خفا ہونگے لیکن ایسا نہ ہوا۔ پری مرے یا جیے اس کی ان کو کچھ پروا نہ تھی۔

۴

پری کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ روک ٹوک نہ ہونے سے میرا دوپہر کا سارا وقت اُسی کے پاس گذرنے لگا بھادوں کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا گرمی بہت تھی۔ پری کی پیشانی پسینہ سے تر دیکھ کر میں آہستہ آہستہ اُسے پنکھا جھلنے لگا۔ پری کو نیند آگئی۔ بہت دنوں سے سر میں تیل نہ لگنے سے اُس کے نازک بال چپک گئے تھے۔ میں کچھ دیر تک اُس کی موہنی صورت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اور پھر محبت کے جوش میں میں نے اُس کی روشن پیشانی کو چوم لیا ــــــ سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک عورت کمرے سے باہر کھڑی مجھے گھور رہی تھی لیکن نظر ملتے ہی وہ ہٹ گئی میں نے سمجھ لیا کہ "مالکن" ہیں۔ اسی دن کا ذکر ہے کہ جب میں کھانا پکا رہا تھا تو بابو جی نے زور سے مجھے آواز دی۔ میں سمجھ گیا کہ میری طلبی کیوں ہوئی ہے۔ دل ہی دل میں ہنستا ہوا اُن کے پاس پہنچا۔ ان کے کمرہ میں میرے اور بابو جی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بابو جی لال پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گرجے ــــــ "یہ تم نے کیا کیا ــــــ"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا"

تم نے کچھ نہیں کیا؟ خوب، مجھے بیوقوف بناتے ہو، میں نے تو تم کو نیک چلن سمجھ کر بیماری کے دنوں میں

پریتما کی سیوا کرنے پر کوئی اعتراض نہ کیا اور نرم نے ــــــــ "بابوجی اسی طرح بہت دیر تک معموں میں گفتگو کرتے رہے اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ اخیر میں انہوں نے صاف صاف کہہ دیا "مہاراج اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم پری کے ساتھ بیاہ کرلو۔"

یہ تو میں پہلے ہی سے سمجھتا تھا کہ پری کو بابوجی گھر سے کسی نہ کسی بہانے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کی نئی بیوی کا دلی منشا تھا کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو سوت کی لڑکی کسی غریب برہمن کو سونپ دی جاتے۔ میں نے دکھانے کو پہلے تو بہت انکار کیا، اپنی غریبی کا رونا رویا، لیکن آخر اپنی منظوری دے دی۔

بابوجی بولے "بہت اچھا ہوا کہ تم نے مان لیا ورنہ میں تم کو پولیس کے حوالے کر دیتا اب میں درگا پوجا میں چھٹی لے کر مادھو پور یا دیوگھر گھومنے کے بہانے سے چلوں گا، تم بھی میرے ساتھ ہوگے، کہیں نہ کہیں کسی پروہت کو بلا کر بیاہ کردوں گا۔"

"اتنی دُور ے جانے کی کیا ضرورت ہے یہ کام تو کلکتہ ہی میں ہو سکتا ہے۔"

رسوئیا کے ساتھ اپنی لڑکی کا بیاہ کر کے میں اپنا منہ برادری میں کیسے دکھا سکتا ہوں۔ نہیں نہیں کلکتہ میں رہ کر ایسی جرات ہرگز نہیں کرسکتا۔ دُور ے جا کر بیاہ کرنے سے کسی کو اصلیت کا پتہ نہ چلے گا۔ یہاں واپس آکر مشہور کردوں گا کہ ایک اچھا لڑکا مل گیا تھا، بیاہ کر آیا ہوں۔"

آہ کیا دنیا میں ہر باپ اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

۵

درگا پوجا کی چھٹی ہوئی۔ بابوجی نے اپنے بال بچوں کو اور مجھے ہمراہ لے کر "دیوگھر" کی یاترا کی۔ اب تک پریتما کو اس کی کچھ خبر نہ تھی، کیونکہ اُس کے ماں باپ نے یہ تمام کارروائی اُس سے پوشیدہ رکھی تھی۔

"دیوگھر" پہنچ کر بابوجی نے پریتما کے ساتھ میرا بیاہ کر دیا۔ میں نے اسی دن اپنے ایک دوست کو جو مادھو پور میں وکیل تھے اور جن کو میں کلکتہ سے بھی اکثر خط لکھا کرتا تھا اطلاع دی کہ میں مادھو پور آرہا ہوں ایک اچھے مکان کا انتظام کرلینا اور خود پریتما کو ساتھ لے کر "دیوگھر" سے روانہ ہوا۔ میرے خسر نے بڑی مہربانی سے دو تھرڈ کلاس کے ٹکٹ "دیوگھر" سے "مادھوپور" تک کے دلا دیئے۔ مادھو پور میں پہنچ کر میں نے پریتما سے اصلی حال کہہ دیا، خیال تھا کہ وہ بہت متعجب ہوگی لیکن بخلاف اس کے اُس نے بڑی متانت سے کہا "یہ تو مجھے پہلے

ہی سے معلوم تھا۔"

"تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"صرف مجھ کو نہیں بلکہ پتاجی کو بھی معلوم تھا اور انہوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے تمہارے خاندان کا حال بھی معلوم کر لیا تھا۔ تم نے میرے پتاجی کو سمجھا کیا ہے؟"

میں نے بڑی حیرت سے کہا "یہ سب کیسے ہوا صاف صاف بتاؤ؟"

تم نے میری بیماری میں ٹیگور بابو کی ایک کتاب مجھے پڑھنے کو دی تھی، یاد ہے؟

"خوب یاد ہے۔"

"اسی کتاب میں بابوجی کو اتفاق سے تمہارے کسی دوست یا عزیز کا ایک خط مل گیا اس میں لکھا تھا "یہ تمہارا کیسا پاگل پن ہے۔ زمیندار کے لڑکے ہو کر ـــــ ڈاکٹری پاس کر کے رسوئیا کا کام کرتے ہو" اسی طرح کی اور بھی باتیں لکھی تھیں۔

اب مجھے یاد آگیا کہ یہ خط مادھوپور والے وکیل صاحب کا تھا انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مالک کی لڑکی سے پریم ہو گیا ہے تو فوراً اپنا حال ظاہر کر کے بیاہ کر لو۔ رسوئیا بن کر بیاہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔

میں دھوکا کھا گیا۔ سمجھ رہا تھا کہ میں نے بابو کالی کانت کو بے وقوف بنایا ہے لیکن اب میں خود بیوقوف بن رہا تھا۔ انہوں نے اتنے دنوں تک رسوئیا کا کام بھی کرایا اور بغیر "کنیاوان" دیئے پرتیما کے ساتھ بیاہ بھی کر دیا یہ خوب ہوئی۔ میں نے پرتیما سے کہا ـــــ "اُس خط میں اَور کیا تھا؟"

پرتیما نے لجا کر اپنا سر نیچا کر لیا اور کہا "جاؤ ـــــ میں نہ بتاؤں گی۔"

میں نے اس کو بہت تنگ کیا پھر بھی اُس نے نہ بتایا آخر کار میں نے خود کہا "مجھے تم سے محبت ہے یہ بات تم کو اس خط سے معلوم ہو گئی ہوگی۔"

پرتیما آنکھیں نیچے کئے ہوئے مسکرانے لگی۔ میں نے کہا "تم نے بڑی بے انصافی کی۔"

"وہ کیسے"

"غیر کا خط پڑھ لیا۔"

"میں تم کو غیر نہیں سمجھتی تھی۔"

"اُس وقت تک تو بیاہ نہیں ہوا تھا، یہ بھی تم کو معلوم نہ تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ایسی حالت میں

کیا میں غیر نہیں تھا۔"

پریتما نے کہا" ہم نے جب سے جنم لیا تھا اُسی وقت سے بھگوان نے بیاہ ہونا قسمت میں لکھ دیا تھا۔ یہ بات جب میں نے تم کو پہلی بار دیکھا تھا اُسی وقت مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ تم کہو گے کس طرح؟ میرے دل نے بتا دیا تھا ۔۔۔"

مادھوپور سے ہیرو بنا ہوا اپنی ہیروئن کے ساتھ جب میں اپنے گھر پہنچا تو میری ماں نے کہا" کلکتہ سے دوا لے آئے؟"

میں نے پریتما کو ماں کے چرنوں پر گرا کر جواب دیا" کلکتہ پہنچ کر مجھے دل کی بیماری ہوگئی تھی اسی کی آج دوا لایا ہوں ۔۔۔ کیوں ماں! کیا اس سے بڑھ کر بھی دنیا میں اَور کوئی دوا ہو سکتی ہے؟"

میری ماں ہنسنے لگی پریتما نے لجا کر سر نیچا کر لیا اور میری طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی ۔۔۔ "تم بڑے شریر ہو"

(ماخوذ از پربھات کمار) **اعظم کریوی**

تُو میرے دل کے مرکز میں تھا اس لئے جب میرا دل اِدھر اُدھر گھومتا رہا تو تُو اسے نہ مل سکا۔ تُو نے اپنے تئیں میری محبتوں اور میری امیدوں سے چھپائے رکھا کیونکہ تُو ہمیشہ ان کے اندر ہی موجود تھا +

تُو میرے شباب کے کھیل کی درونی خوشی تھا اور جب میں کھیل میں زیادہ ہی مشغول ہو جاتا تھا تو یہ خوشی مجھے بھول جاتی تھی +

تُو زندگی کی نشاط و انبساط میں میرے لئے گاتا رہا لیکن آہ! میں تیرے لئے گانا بھول گیا۔

جب تُو اپنا چراغ آسمان پر تھامے ہوتا ہے تو اُس کی روشنی میرے چہرے پر آ پڑتی ہے اور اُس کا سایہ تجھ پر ہوتا ہے۔

جب میں محبت کا چراغ اپنے دل میں تھامے ہوتا ہوں تو اُس کی روشنی تیرے چہرے پر جا پڑتی ہے اور میں پیچھے سائے میں کھڑا رہ جاتا ہوں!

گلچیں

تنِ تنہا ہوں

تنِ تنہا ہوں تنہا دونوں ہو جائیں گے آ تُو بھی
تصوّر میں ترا چہرہ ہے آ چہرہ دکھا تُو بھی

تنِ تنہا ہوں تنہائی سے آ کر لطف اُٹھا تُو بھی
مجھے بھی دیکھ اور اپنا چاند سا مکھڑا دکھا تُو بھی

کہوں جب تجھ سے میں اے جاں مجھے الفت تجھی سے ہے
مجھے بھی پیار ہے تجھ سے فقط مجھ کو بتا تُو بھی

مرے دل میں تو کر دی ہے بپا تُو نے قیامت سی
اُٹھا ہے تیرے دل میں بھی جو محشر وہ دکھا تُو بھی

غرض کی دُھن میں سب اپنی خوشی کا راگ گاتے ہیں
مری جاں! راگنی اپنی مروّت کی سنا تُو بھی

وفا کا باغ ہے اور پھول ہیں تیری محبّت کے
ہو منظورِ نظر آنکھوں کو نا منظر یہ آ تُو بھی

وہ کیسا حسن ہے جس میں محبّت کی نہ ہو خوشبو
چمن میں ناز سے پھولوں کو حُسن اپنا دکھا تُو بھی

کہیں تیرے تصوّر میں کوئی محوِ ترنّم ہے
کسی کی آرزو میں راگ اک الفت کا گا تُو بھی

گلِ نیکی سے حسن و عشق کی خلوت کو مہکا دے
ہماری بزم میں شامل ہو اے میرے خدا تُو بھی

بہار آیا ہے گلشن میں ترے تیرے نظارے کو
کبھی آیا کر اُس کے دشت میں اے باوفا تُو بھی

بہار

ویرے کی رُوح

چوک والی سرائے کی لڑکی نے مجھ سے پوچھا "کیا تم نے اُس لڑکے کو دیکھا ہے جو ہر وقت اپنے راگ کی دھن میں محو گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے؟" میں اُس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ تین روز سے میں ویرے میں مقیم تھا مگر اب تک اس وضع کا کوئی شخص مجھے وہاں نظر نہ آیا تھا۔ "میرے اللہ!" میں نے اپنے دل میں کہا "کیا ویرے میں کوئی ایسا احمق بھی ہے جو اس جنون میں مبتلا ہے؟ موسیقی کو یہاں کون سنتا ہے؟ اکثر گھروں کے دروازے بند ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی بوڑھا یا کوئی بڑھیا یا کوئی خوبصورت لڑکی اُس افتادہ وضع کی ٹوپی پہنے جس کے دونوں رخوں پر جھومر لٹکتے ہیں کسی کھڑکی میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اُس کے نغموں کو کون سنتا ہوگا! ویرے کے اس عجیب و غریب چھوٹے سے گاؤں میں یہ سب لوگ ممیوں کی طرح نظر آتے ہیں جو اپنے سبز اور نیلے شیشوں میں نمائش کے لئے رکھی گئی ہوں۔"

یہ ہے میرا خیال اس جگہ کے متعلق۔ اگر میں اتفاقاً اُس لڑکے سے کہیں ملتا تو میں اپنی انگلی کو اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اسے متنبہ کرتا کہ دیکھو وہ سکوت جو ان گھروں کے کونے کونے پر محیط ہے تمہارے راگ کی آواز سے ٹوٹ جائے گا! آفتاب خود یہاں محو خواب رہتا ہے۔ اُس کی دھوپ سونے کی ٹکلیوں کی طرح سنسان گلیوں میں بکھری رہتی ہے۔ وہ اس بستی کو جگا جگا کر تھک گیا ہے جو کبھی زندہ تھی اور اب ایک گہری نیند میں پڑی سوتی ہے۔ اُس کی روشنی مکانوں کی دہلیزوں پر اُس سائل کے قدموں کے نشانوں کی طرح ماند پڑ جاتی ہے جو ہر روز صبح آکر ایک ایسے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے جسے کوئی نہیں کھولتا۔ ان گھروں کے دروازوں کو اندرونی ظلمت نے زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔

اگر میں سو سال بھی زندہ رہوں تو میں ویرے کی اس گلی کو اور اُن چھوٹے چھوٹے مکانوں کو نہ بھولوں گا جو سڑک پر اس طرح باہر کو نکلے ہوتے ہیں جیسے کوئی ہاتھ جوڑ کر دعا مانگ رہا ہو۔ زندگی اس مقام سے اتنی دور ہے کہ بعض اوقات انسان خود اپنی ہستی پر شک کرنے لگتا ہے۔ اس کے آگے آگے ایک دھندلا سا سایہ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ یہ اسے کہاں لے جائے گا، مگر یہ گرجا کی طرف لے جاتا ہے جہاں اور سب لوگ جا چکے ہیں۔ اس سے آگے فصیل کے پار سمندر موجیں لے رہا ہے اور جہاں کھڑے ہیں۔ آسمان کا گنبد بادلوں کے بوجھ سے سمندر کی وسعت پر جھکا پڑتا ہے۔ اس مقام پر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں خود بخود مر رہا ہوں، جیسے میرا کمزور دل ٹھیرا جا رہا ہے، مگر میری انگلیاں سورج کی طرف ایک نامعلوم سا اشارہ کرتی تھیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا، "یا تو یہ شریر لڑکی میری سادگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور یا اُس نے کسی ایسی بات کا تذکرہ کیا ہے جسے واقع ہوتے مدتیں گزر چکی ہیں۔ جب ابھی یہاں سب زندہ تھے!"

اسی وقت گھنٹے کی دھیمی اور سریلی آواز میرے کان میں پڑی۔ یہ آواز نہایت سست رفتار کے ساتھ گھنٹہ گھر سے نیچے اترا تر کر مجھے محزون و مغموم کئے دیتی تھی۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں نے یکایک ایک ایسا راگ سن لیا ہے جو ویرے کی آخری گھڑیوں کے کرب و اضطراب کی کہانی سنا رہا تھا۔

چوک ہی میں ایوانِ بلدیہ کی خوبصورت عمارت تھی، جسے نایاب موتیوں کی ڈبیا کی طرح سجایا گیا تھا۔ خوبصورت طاقوں میں بادشاہوں اور اولیا و صلحا کے بلند قامت مجسمے رکھے تھے میں سمجھتا ہوں ــــ لیکن اب ویرے کی تاریخ کون جانتا ہے!۔ مجھے یقین ہوگیا کہ شاید یہی گھنٹہ ہوگا جس کی نسبت اس عجیب و غریب آنکھوں والی لڑکی نے مجھ سے کہا تھا۔ اور میرے دل میں اُن قدیم مجسموں کی نسبت نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے جو یوں بے باکانہ ہر وقت سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے رہتے تھے۔ انہیں یہاں کھڑے صدیاں ہوگئی تھیں اور وہ اپنی اکڑی ہوئی گردنیں اٹھائے ہوئے کسی اُس واقعہ کے منتظر تھے جو کبھی وقوع میں نہ آیا تھا۔ شاید ان کی اندھیری آنکھیں جو پتھر کو نراش کر بنائی گئی تھیں، اُن بیڑوں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں جنہوں نے مدتیں ہوئیں ایک دن اس بندرگاہ سے لنگر اٹھایا تھا۔ چوک کے قریب ہی ایک قدیم گرجا کا مینار تھا جس کی کنجیوں کو سمندر کی تہ میں سوتے ہوئے زمانے گزر گئے تھے۔

زمانے کی نیرنگی پر میں ذرا مسکرایا۔ اس بستی کو سب چھوڑ گئے تھے، اور شہر پناہ کے باہر سمندر کے کنارے کنارے جا بسے تھے۔ صرف چند لوگ پیچھے رہ گئے تھے ــــ وہ عمر رسیدہ لوگ جن کی ناکوں کے نیچے اس قسم کی میل نمایاں تھی جیسے موت کی پھپھوندی لگی ہو لیکن پتھر کے بت ہاتھوں میں تلواریں اور بادشاہی عصا تھامے ہوئے کھڑے تھے جیسے وہ اب بھی لوگوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

میں گرجا کے دروازے پر گیا اور اُسے تین دفعہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ میں نے یہ حرکت محض سبیل تمسخر کی تھی ورنہ میں جانتا تھا کہ خدا کے اس قدیم گھر میں میری دستک کو سننے والا کوئی نہیں۔ میں حیران رہ گیا جب یکایک دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک عجیب و غریب آنکھوں والا البیلا نوجوان نمودار ہوا۔ اُس نے چاندی کے تکموں والی مخمل کی ایک چھوٹی سی جاکٹ پہن رکھی تھی جیسی عام طور پر زی لینڈ کے لوگ پہنتے ہیں۔ اُس کے پاس ایک بربط تھا جیسا عموماً بندرگاہ کی دکانوں میں فروخت ہوتا ہے اور جسے جہازی ملاح بجاتے ہیں، اور شام کی تیرہ فامی کو اُس کے سیمیں سروں سے روشن کر دیتے ہیں۔ کبھی اس میں سے ایک تھرتھراتا ہوا نغمہ پیدا کرتے ہیں اور کبھی ایک ہی لمبی تان سے سننے والوں کو مست کر دیتے ہیں۔ نوجوان کی صورت سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے گہری نیند سے زبردستی بیدار کر دیا گیا ہے۔ متعجب ہو کر میں نے خیال کیا، کیا یہی وہ لڑکا ہے جس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے راگ کی دھن میں محو گلیوں میں پھرتا رہتا ہے؟

میری طرف دیکھے بغیر وہ میرے ساتھ ہولیا اور ہم ویرے کی عمارتوں کی گلابی دیواروں، پرانے شیشے کی لمبی لمبی کھڑکیوں اور گوبی اور پیاز کے چھوٹے چھوٹے باغوں کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ چپ چاپ وہ چوک سے آگے نکل آیا۔ اسی وقت ایک مرتبہ پھر

جرس کی بلوریں آواز ویرے کے آخری کرب و اضطراب کا اداس گیت گاتی ہوئی سنائی دی۔ ہوا نہایت نرمی سے اس نغمے کو منتشر کرتی ہوئی سمندر کی جانب مکانوں کی چھتوں پر اڑاتی پھری۔ انوکھے نوجوان نے بربط کو اپنے کندھے کا سہارا دے لیا اور اُس کی انگلیاں بربط کے تاروں پر رقص کرنے لگیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نغمے کے معنی صرف اُس کے لئے ہیں اور کسی کے لئے نہیں۔ اُس نے اپنے سر کو جھکا کر بربط کے قریب کرلیا اور کچھ اس انداز سے مسکرایا کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اب اُس کو اس دنیا کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح کے عمیق عمیق میں کوئی کہہ رہا ہے کہ اس لڑکے کی عقل و ہوش پر کسی نامعلوم صدمہ کا اثر ہے، اور ویرے کے گاؤں کا راز بھی اس سے کچھ تعلق رکھتا ہے لیکن یہ احساس مجھ پر ناقابلِ بیان طور پر طاری تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ نوجوان نے نظر اُٹھائی اور اُن عظماء و ابطال کی طرف دیکھا جو اپنی بلند کرسیوں پر کھڑے تھے اور پھر ایک نگاہ سمندر کی دوریوں پر ڈالی۔ اُس کی آنکھیں اس طرح روشن تھیں جیسے ان میں کسی اور دنیا کی روشنی چمک رہی ہے۔ بربط زیادہ تیزی اور تندی سے بجنے لگا، اُس کی آواز میں دیوانگی سرایت کر گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے بستی کی قدیم روح اس نوجوان کی چاتر انگلیوں کے نیچے یکایک مرتعش ہو کر رہ گئی ہے وہ ایک جہازی ملاح کی بین کی طرح اپنے ساز کو ایک عجیب رقص کے ساتھ بجاتا ہوا گلیوں سے گزرتا گیا۔ وہ زمین کو اپنے پاؤں کے پیچھے اپنی ایڑیوں سے دہلاتا تھا، اپنے بربط کو سر سے اونچا اٹھا کر گھماتا ہوا اس تیزی سے نیچے لاتا تھا کہ وہ زمین کو چھونے لگتا تھا اور پھر یکایک شاندار متانت کے ساتھ ایک جگہ کھڑے ہو کر آنکھیں بند کرکے چہرے پر ایک پُر تکلف تبسم پیدا کرتا تھا، جو ہمیشہ اُس کے اُس پُرسوز رقص و سرود کا ہم آہنگ ہوتا تھا جس میں ایک قاتل یا عاشق کا شوقِ تباہ تڑپ رہا ہوتا۔

پھر اُن چھوٹے چھوٹے گھروں میں بتدریج جان پڑنے لگی اور زندگی جو بند دروازوں کے اوجھل مدتوں سے سوئی پڑی تھی از سرِ نو بیدار ہونے لگی جیسے وہ صرف اس زرد رو بربط نواز نوجوان کے لئے چشم براہ تھی۔ کھڑکیوں میں اُن نوجوان لڑکیوں کے ہنسی سے کھِلے ہوئے چہرے نظر آنے لگے جن کے سروں کے لباس پر زیبائش کے لئے عجیب قسم کی پُرپیچ دھاریاں بنی تھیں جیسے ہرن کے سینگ ہوں۔ ویرے کی تمام حسین لڑکیاں ڈوریدار پردوں کے پیچھے منہ کھولے ہوئے یوں آ کھڑی ہوئیں جیسے گلاب کے پھول شہد کی مکھیوں کے دل بادل میں سے نظر آ رہے ہوں۔ انہیں یوں تر و تازہ چہروں کے ساتھ موت کی گہری تاریکیوں میں سے نکل کر کھڑکیوں کے پاس آتے ہوئے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ گھر درحقیقت گڑیوں کے مکان ہیں جن میں سحر کے ذریعہ سے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ـــــ ویرے کی اُن گڑیوں کے گھر جن کی باہیں حسین و ملیح ہیں۔ جن کے بڑے بڑے ابھرے ہوئے لانگے ہیں، جن کے رنگین سر اور سمندر کی سی نیلی آنکھیں ہیں۔

نوجوان سازندہ یوں ہی گلیوں میں پھرتا رہا، اپنے وحشی راگ کی مغموم و محزون گتیں بجاتا ہوا جن کو سن کر آنکھوں میں آنسو بھر آئیں۔ کیا یہ ویرے کی روح تھی جو اپنی کھوئی ہوئی محبت پر خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی اور اُن لڑکیوں کے لئے تاسف انگیز آہیں بھر رہی تھی جو اب اپنی قبروں میں سو رہی تھیں اور اُن نوجوان مردوں کے لئے جنہوں نے اپنے جہاز سمندر میں ڈالے اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے؟ آخر بربط کی یہ آواز دور سمندر کے ریتلے ساحل میں جاکر جذب ہو گئی۔

جب میں واپس ہوٹل میں آیا تو میں نے اس لڑکی سے کہا "تم نے درست کہا تھا یہاں ایک لڑکا ہے جو اپنے راگ کی دُھن میں محو گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ بے شک وہ ایک روح ہے عذاب میں مبتلا۔ کیا یہاں کوئی جانتا ہے کہ اس پر کیا مصیبت پڑی ہے؟" اس گربہ چشم شریر لڑکی نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔

"اُس سے پوچھو" اُس نے کہا "وہ مجھ سے بہتر طریق پر تمہیں بتا سکے گا۔"

کہانی بالکل معمولی تھی ایک دن یہ لڑکا اُن گڑیا سی لڑکیوں میں سے ایک کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا جو آپ آ کر کھڑکیوں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک شام کا ذکر ہے کہ یہ اپنا بربط لئے ہوئے ناچنے گانے کے لئے اُس لڑکی کے گھر آیا۔ اور لڑکے بھی اس گھر میں آیا کرتے تھے اور اُن کو بھی اس لڑکی سے انس تھا۔ لیکن اُس کو یہ ناگوار تھا اس لئے جب وہ رشکِ رقابت سے رونے لگا تو لڑکی نے کہا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ مجھے تم سے محبت ہے مگر مجھے اُس سے بھی محبت ——— اُس لڑکے سے جس کے گھر کا دروازہ ہمارے دروازے کے ساتھ ہے، اور مجھے اُس لڑکے سے بھی محبت ہے جو تمہارے جانے کے بعد یہاں آتا ہے ...... مجھے یہ سب اچھے لگتے ہیں!" ایک دفعہ ایک جھاڑی کے پیچھے سے اُس نے دیکھا کہ وہ اُس نوجوان کی آغوش میں ہے جو اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہے۔ اُس نے جھٹ چاقو نکالا اور دونوں کو مار ڈالا

"اور اُس دن سے اب تک وہ گلیوں میں اپنا بربط بجاتا پھرتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا بچے اس پر پتھر پھینکتے ہیں اور لڑکیاں ہنستی ہیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھتا تک نہیں" اُس شخص نے کہا جو کہانی سنا رہا تھا۔

لیکن مجھے اس بیان پر پوری طرح یقین نہ آیا۔ اشیا کا ظاہر ہی حقیقی معلوم ہوتا ہے ورنہ بڑے بڑے حقائق کے پردے میں بھی کچھ پوشیدہ معانی ہوتے ہیں۔ انہیں کی جستجو کرنی چاہئے، کیونکہ یہ ظاہر سے زیادہ خوبصورت ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ لڑکا ویرے کی روح ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کیوں گرجا کے دروازے سے نمودار ہوا۔ تو اے ویرے کی بستی اور یہ نیم مجنون لڑکا ایک ہی جنونِ خاموش کا شکار ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی ہواؤں نے تمہارے سر پھیر دیئے ہیں تم کسی ایسی چیز کو کھو چکے ہو جو اب کبھی تمہیں نہ مل سکے گی، وہ چیز جس کے نوحے تمہارا جرس گاتا ہے اور جس کی زاریاں اِس بربط کی ہچکیوں میں ہم سنتے ہیں ویرے میں ایک نوجوان شخص ہے جو عموماً ساحل کے ریتلے ٹیلوں کی طرف جاتا ہے اور سمندر کی غیر متناہی وسعتوں کے نظارے میں محو ہو جاتا ہے۔

منصور احمد

دلی مونیر]

محفلِ ادب

اُلفت کا اظہار

(ایک گیت)

میرے دل کا باغ

پیاری میرے دل کا باغ

مَیں ہوں دل کے باغ کا مالی — لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

نازک نازک پھول ہیں جیسے اُجلے اور بے داغ — ایسا ہی بے داغ ہے پیاری میرے دل کا باغ

پیاری میرے دل کا باغ

میں ہوں دل کے باغ کا مالی — لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

اُلفت کا احساس

پیاری اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا — خوشبوؤں میں رہنا سہنا

مدھم ہلکی، بھینی بھینی ان پھولوں کی باس — میٹھا میٹھا درد ہو جیسے اُلفت کا احساس

پیاری اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا — خوشبوؤں میں رہنا سہنا

اُلفت کا اظہار

پیاری اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں — تیری یہ حیران نگاہیں

ان پھولوں کی ہر ڈالی ہے اک گلشن بے خار — ان پھولوں کی رنگت جیسے اُلفت کا اظہار

پیاری الفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں تیری یہ حیران نگاہیں

حفیظ "مخزن"

شعرِ عرب کی قدامت

عربوں کی شاعری قدیم ہے کیونکہ اقوام سامیہ (سام بن نوح کی اولاد) میں عرب سب سے زیادہ عالم خیال سے دلچسپی رکھتے تھے اور اسی لئے اعتقادِ توحید اور غیر محسوس اشیا پر ایمان لانے والوں میں وہ سب سے مقدم تھے۔ امم سامیہ کا سب سے قدیم شاعرانہ اثر تورات کے متعدد ابواب سے ظاہر ہے۔

لامک نے اپنی بی بی عادہ اور صلہ سے جو گفتگو کی تھی وہ بھی نظم کا ایک ٹکڑا ہے اور عبرانی شعر کی یہ نہایت قدیم مثال ہے۔ (تکوین ۴-۲۳) سفر ایوب، سفر اشعیا اور مزامیر داؤد میں بھی تصورِ شعری کی مثالیں موجود ہیں۔

"علی گڈھ میگزین"

محبوبۂ نصرت

محبوبہ نے مسکراتے ہوئے کہا قسم ہے تم کو میری محبت کی تم ہتھیاروں سے سجے ہوئے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہو، تمہارا مردانہ حسن اس وقت پورے شباب پر ہے۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میں تمہارے لبِ نازک کو اپنے لبوں سے مس کروں یا تمہاری خوبصورت تلوار کو بوسہ دوں لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ تم اس وقت اس درجہ حسین ہو کہ میں نے تمہیں اتنا حسین کبھی نہیں دیکھا۔ کیسا دلکش اور نظر فریب وہ وقت ہوگا جب تم میدانِ جنگ سے فتح حاصل کرکے واپس آرہے ہوگے تمہارے زخموں سے میری محبت کا رس بہ رہا ہوگا۔ اس وقت میں تمہیں اپنے زانو پر لٹاؤں گی اور تمہارے لئے ایک ادنیٰ نرس بن جاؤں گی۔

عاشق نے محبوبہ کی دلفریب داستان سنی اور اُس نے کہا کہ پیاری تم حسین ہو اور بلا کی حسین ہو۔ لیکن میدان جنگ میں جب میں سینہ سپر ہو کر بڑھتا ہوں تو فتح کی دیوی تم سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے میں اس کے رنگ روپ میں تمہیں دیکھتا ہوں۔ اور تم مجھے اس کے رنگ روپ میں دکھائی دیتی ہو جب میں گولیوں کی بوچھاڑ میں بے باکانہ بڑھتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوں کیونکہ میرے نزدیک محبوبہ اور فتح دو چیزیں نہیں ہیں میں جاتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں مبارک ہے تمہارا خیال جو میدان جنگ میں میری رگوں میں جرأت کی روح دوڑا دیتا ہے۔

(ترکی ڈراما)

"دین و دنیا"

فہرستِ مضامین

جلد ۱۵

بابت ماہِ جون ۱۹۲۹ء نمبر ۶

تصاویر:- ۱- مادام لابراں - ۲ - مادام لابراں اور اُس کی بیٹی

شاعری اور زندگی

آج میں مضمحل ہوں! کس لئے؟ ——— میں نہیں جانتا کس لئے لیکن آج میں مضمحل ہوں اور ساری دنیا میرے ساتھ مضمحل ہو رہی ہے! پہاڑ کا مقام ہے اور شملہ کا شہر، میدانی گرمی سے محفوظ ہوں، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، سورج کی نرم و نازک کرنیں چلی آتی ہیں، ہر طرح کا آرام میسر ہے، ہر طرح کا سامان مہیا ہے لیکن اس پر بھی طبیعت میں اک اضمحلال دل میں اک اضطراب! کتاب اٹھاتا ہوں تو جی نہیں لگتا بلکہ سر سے کتاب ہی نہیں اٹھائی جاتی اور اٹھائی کیونکر جائے کتابوں کی قطاریں سے جو میری الماری پر سجی ہیں کوئی کتاب چنی تک نہیں جاتی اور چنی کیا جائے دماغ میں خیال پراگندہ دل میں جذبات پریشاں! ——— بہار کا سماں بے لطف امیری کے سامان بے مزہ ہر شے سے شکوہ ہر شخص سے کنارہ ملاقات سے پرہیز کام کو دور سے سلام ——— اچھا یہی سہی کام نہ کروں آرام ہی کروں لیکن اس پر بھی اطمینان تو ہو کچھ اسی سے جی ٹھکانے لگے — لیکن نہیں! اچھا یہی اپنے سے پوچھوں کہ یہ اضمحلال کیوں ہے یہ بے تابی کس لئے ہے مزاج کیوں حاضر نہیں؟

میں جو دوسروں کو لکھ دینے گھر سے نکلا ہوں ذرا گھر ہی میں اپنا حال بھی تو دیکھوں کچھ کر تو لوں پھر ذرا کچھ کہہ بھی سکوں مگر سچ یہ ہے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی قلم سے فقرہ تک نہیں لکھا جاتا کہ دل ہی خود ڈھلمل یقین ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں سے جب سے یہاں آیا ہوں اپنا یہی انداز دیکھتا ہوں کہ کمرہ کمرہ پھرتا ہوں کتاب کتاب کو دیکھتا ہوں باہر باغ میں پھول ہی پھول ہیں ان میں ٹہلتا ہوں بچوں کو گود میں لیتا ہوں اور ان سے غوں غاں کرتا ہوں مہمانوں کی خاطر مدارات بھی کرنے لگ جاتا ہوں اور ادھر ادھر کی بے معنی باتوں میں مصروف ہو کر گویا ہوش میں آجاتا ہوں لیکن تھوڑی دیر گذری اور پھر میرا وہی حال ہوا ——— کچھ تھکن سی کچھ بیزاری سی اور وہی کچھ دل کی کس مپرسی کی حالت!

آخر یہ سب کچھ کس لئے؟ ——— میں نہیں جانتا کس لئے! نہیں جانتا تو نہ جانوں یہ دل کچھ ہے ہی ایسی چیز کہ اس سے زیادہ لاڈ کیا تو یہ الٹا اپنے ہی گلے کا ہار ہوا۔ چھوڑوں یہ سوچنے کا دھندا ورنہ یہ دماغ میرے سر چڑھ جائیگا ——— گھر میں سچ کسی نے کہا تھا کچھ دن ہوئے کہ شاعر کے ساتھ رہنا آسان کام نہیں جب خود شاعر بھی بعض دفعہ اپنے آپ سے یوں تنگ آجاتا ہے تو خدا جانے بیچارے دوسروں کا کیا حال ہوتا ہوگا!

"شاعر"

حادثات میں زخمی ہوئے ۱۰۰۰۰۰۰

صنعت و حرفت کے کارخانوں میں حادثات بتدریج کم ہو رہے ہیں لیکن پچھلے سال کے نقصانات حسب ذیل ہیں:-

اموات ۲۳۰۰۰

زخمی ۳۰۰۰۰۰۰

ان حادثات کی وجہ سے مال کا بھی بہت نقصان ہؤا۔ کل نقصان کا اندازہ ۱۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ کیا جاتا ہے۔ لیکن صریح نقصان کا تخمینہ یہ ہے:-

مزدوری جو زخمی ہونے کی وجہ سے ضائع ہوئی ۱۶۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ

علاج کا خرچ ۳۷۴۰۰۰۰۰ پونڈ

ان حادثات کی ذمہ داری زیادہ تر موٹر کار پر عائد ہوتی ہے، خصوصاً بچوں کے معاملہ میں۔ گزشتہ سال ریاستہائے متحدہ میں مدرسہ کی عمر کے بیس ہزار بچے حادثات سے مر گئے۔

یورپ میں بدھ مذہب کی تحریک

مسٹر اے ایچ۔ پرکنس نے برطانیہ اور آئرلینڈ کی سٹوڈنٹس بدھسٹ ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر پر "یورپ میں بدھ مذہب کی تحریک" کے عنوان سے جو سبق آموز تقریر کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں اس تحریک کو جاری ہوئے کوئی تیس یا چالیس سال کا زمانہ گذر چکا ہے جب سر ایڈون آرنلڈ نے "لائیٹ آف ایشیا" کے نام سے ایک قابل قدر کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب نے پہلے پہل اہلِ مغرب کو بدھ مت کی حقیقت اور اُس کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ اسی کتاب کی بدولت مغرب کے بہت سے آدمیوں نے بدھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ کے ساتھ اپنی دلی ارادت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ ۱۸۹۶ء میں عظمت مآب انگاریکا دھرم پال شکاگو سے جہاں مذاہب کی کانگریس منعقد ہوئی تھی انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ نے بھکوا انند ایبٹا کیلئے مشن کا راستہ صاف کر دیا جنہوں نے ۱۹۰۹ء میں اپنے وطن میں پہنچ کر بدھسٹ سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ" قائم کی۔ مسٹر فرانسس جے پین اس سوسائٹی کے ایک نہایت مستعد اور سرگرم کارکن ہیں، جنہوں نے مغرب میں بدھ مت کے عقائد کی اشاعت میں اس قدر حصہ لیا ہے کہ اور کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا

مسٹر پین کے بعد مسٹر جے ایف میک کچاٹن کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے انہوں نے ادبی پہلو سے مغرب میں بدھ مذہب کی تحریک کو فروغ دیا ہے۔ انہوں نے اس مذہب کی خوبیوں کے متعلق کوئی بیس کتابیں لکھی ہیں۔ اور بدھ مذہب کے مقدس صحیفوں کے بعض حصوں کا چوپالی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر پین نے ڈاکٹر ڈھالکے آنجہانی کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈھالکے نے جرمنی میں بدھ مذہب کی اشاعت میں تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے نمایاں حصہ لیا ہے۔ جرمنی کے علمی حلقوں نے ڈاکٹر موصوف کے انتقال پر رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت برطانیہ میں بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے تین انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ بدھسٹ لاج، مہا بدھی سوسائٹی اور سٹوڈنٹ بدھسٹ ایسوسی ایشن۔ ان میں آخرالذکر انجمن سب سے چھوٹی ہے۔ لیکن سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود یہ اپنے تبلیغی فرائض کو سرگرمی سے انجام دے رہی ہے۔

تصحیح

مئی کے ہمایوں میں میاں بشیر احمد صاحب کی ایک نظم "پھولوں کے دن" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس نظم کے دوسرے بند کا ایک شعر شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ یہ شعر اور اس کے پہلے اور بعد کا ایک ایک شعر یہاں درج کیا جا رہا ہے ناظرین تصحیح فرمالیں۔

یہ راحتیں ہیں چار دن
یہ چاہتیں ہیں چار دن
اک دن بلائے جائیں گے
آخر بھلائے جائیں گے
باہم یہ چاہت پھر کہاں — باہم یہ راحت پھر کہاں

مادام لابراں

مادام لابراں ملکِ فرانس کی ایک حسین اور باکمال مصورہ تھی۔ اپنی تصاویر بنانے میں اسے خاص شغف تھا مقابل کی [illegible] اس کے اپنے موقلم کے دو نقوش ہیں جو دنیائے مصوری میں بڑی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

مادام لابراں

مادام لابراں اور اُس کی بیٹی

CALCUTTA
ART PG. WORKS
LAHORE

رابرٹ لوئی سٹیون سن

قمیصیں گریبانوں سے پھٹی ہوئی تھیں، چہروں پر سیاہی چھارہی تھی اور بال جھلسے ہوئے تھے لیکن جنگل میں یہ مختصر سی دلیر جماعت اپنے اُس بے رحم اور خطرناک دشمن (آگ) کے ساتھ برسرِپیکار تھی جس سے کیلیفورنیا کی خوش گوار سرزمین کے رہنے والوں کو اکثر سابقہ پڑتا تھا۔

آگ کے آخری شعلے ابھی بھڑک رہے تھے کہ کسی کے خشک گلے کی بیٹھی ہوئی آواز آئی "دیکھو! اُدھر اور آگ لگ گئی"۔ جہاں وہ کھڑے تھے اُس جگہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر آسمان دھوئیں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ ایک ہی نظر کافی تھی اور پھر اس مختصر سی فوج نے اپنی کلہاڑیاں اٹھائیں اور اپنے تھکے ہارے اعضا کو ایک نئی مہم پر آمادہ کرتے ہوئے اس طرف دوڑ پڑے۔ تباہی و بربادی کے اس منظر کے قریب پہنچ کر اُن کی حیرت زدہ آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ دو درختوں سے شعلے نکل رہے تھے اور مخمل کی جاکٹ پہنے ایک بلند قامت شخص مجنونانہ انداز سے سلگتی ہوئی گھاس پر اپنی سوٹی مار رہا تھا۔ آگ کے ساتھ جنگ کرنے والے گروہ نے فوراً آگے بڑھ کر دونوں درختوں کو کاٹ ڈالا اور شعلوں پر جلد ہی قابو پالیا گیا۔

پھر وہ اس بلند قامت مخمل پوش شخص کی طرف بڑھے تاکہ دریافت کریں کہ آگ کیونکر شروع ہوئی اور وہ وہاں کیوں کھڑا ہے۔ اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ ایک ہی پُرخطر لمحے میں انہیں اپنے تمام سوالات کا جواب مل گیا۔ بلند قامت اجنبی کے پاؤں میں آدھی کھلی ہوئی دیاسلائی کی ایک ڈبیا پڑی تھی اور کچھ تیلیاں اِدھر اُدھر بکھر رہی تھیں۔ یہ اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ اجنبی نے جان بوجھ کر درختوں کو آگ لگائی ہے۔ یہ خیال ایک بجلی کی طرح لوگوں کے دماغوں میں پھر گیا۔ وہ اندھا دھند اس پر ٹوٹ پڑے اور نہایت وحشیانہ طور سے انہوں نے اپنے پنجے اُس پر جمالئے۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب دنیا اپنے اُس عظیم ترین ادیب کو کھو دینے کے قریب پہنچ گئی تھی جس کی تحریروں نے چھوٹوں بڑوں کو ہمیشہ یکساں طور پر خوش کیا ہے۔ ابدیت کی سرحد پار کرنے میں ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ خوش قسمتی سے لوگوں نے اُس کا بیان سن لیا۔ اور اُس کی جان لینے سے رک گئے۔

معلوم ہوا کہ سٹیون سن جو کچھ دنوں کے لئے کیلی فورنیا آیا ہوا تھا یہاں کے جنگلوں میں آگ کے سرعت کے ساتھ پھیل جانے کی وجوہ پر غور و فکر کر رہا تھا آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ آگ کو بڑھنے میں وہ کاہی مدد دیتی ہے جو کثرت

کے ساتھ درختوں کے تنوں سے لپٹی رہتی ہے۔اس سے خالی الذہن ہوکر کہ اگر یہ نظریہ صحیح نکلا تو اس کے نتائج و عواقب کیا ہونگے خوبصورت خوابوں اور خیالوں میں محو رہنے والے شاعر نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور بھڑک اُٹھنے والی کاہی کو دکھادی۔

اس عظیم الشان انسان کی زندگی کا یہ واقعہ خوب ظاہر کررہا ہے کہ وہ اپنے تخیلات کی رَو میں کس آسانی سے بہ جایا کرتا تھا کہ زندگی کی حقیقتیں اور ذمہ داریاں اس کے سامنے ہیچ ہوکر رہ جاتی تھیں۔

رابرٹ لوئی سٹیون سن اڈنبرا میں ۱۸۵۰ء کے زبون ترین مہینے کی منحوس ترین تاریخ تیرھویں نومبر کو پیدا ہوا۔لیکن وہ تمام روشنی اور گرمی جو اُس کے سالگرہ کے دن سے دریغ رکھی گئی تھی اُس کے قلب کو عطا ہوئی۔ سٹیون سن کی رگوں میں سکاتی خون دوڑتا تھا۔ اپنی محبوب ماں سے اسے ایک کریمانہ طبیعت ملی تھی اور باپ سے وہ رومانی اور شاعرانہ تخیل ورثہ میں پہنچا تھا جس نے بعد میں اس نوجوان کو انجنیری چھڑا کر قلم کاری کا فن اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔

سٹیون سن کی پیدائش کے دو سال بعد تین افراد کے اس چھوٹے سے کنبے نے اپنا مکان بدل لیا لیکن اس تبدیلی کا اثر بچے کی صحت پر کچھ اچھا نہ پڑا جو اپنی دوسری سالگرہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک خطرناک قسم کی کھانسی میں مبتلا ہوکر سخت کمزور ہوگیا۔اس مرض نے اور بھی بہت امراض کے لئے راستہ کھول دیا۔اگلے برس میں نمونیا، پھیپھڑے کی سوجن، سردی کے بخار اور اسی طرح کے کتنے ہی امراض کے پے درپے اُس پر حملے ہوتے۔

ان ابتلاآت میں بھی اُس نے اپنی طبیعت کی شگفتگی کو نہ کھویا۔بلکہ بستر میں لیٹے ہی لیٹے وہ نئے نئے کھیل اختراع کیا کرتا۔آخر یہ مکان اُس کی صحت کے لئے خطرناک سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور اب وہ جس مکان میں آئے وہاں تیرہ سال تک اُن کا رہنا مقدر ہوچکا تھا۔

لوئی کی زندگی پر اُس اخلاقی تعلیم کا بڑا اثر تھا جو اُسے اپنے ماں باپ اور اپنی کھلائی الیسن کننگھم یا لوئی کی اپنی زبان میں "کمی" سے حاصل ہوئی۔کمی کتنی محتاط تھی کہ بچے کے اثر پذیر دل پر سوائے روح کو بلند کرنے والی اور جلا دینے والی چیزوں کے کسی دوسری چیز کا اثر نہ ہو یہ سٹیون سن کے اُن الفاظ سے ظاہر ہوگا جو اُس نے اس امر کے متعلق لکھے ہیں:-

"میری تربیت کا سلسلہ "فیملی پیپر" کی کہانیوں سے ہوئی تھی، لیکن وہ خاتون جس کی مروت مجھے یہ کہانیاں سنواتی تھی بڑے حساس ضمیر کی مالک تھی۔"فیملی پیپر" پر اسے اعتماد تھا کیونکہ اُس کی کہانیاں گھرانوں کی کہانیاں ہوتی تھیں۔ناول نہیں ہوتی تھیں۔لیکن اس کے باوجود پڑھتے پڑھتے اُس کی نفیس اور حساس طبیعت عموماً

رک جاتی تھی اور وہ یہ بے بنیاد خوف ظاہر کر دیا کرتی تھی کہ اب آگے یہ کہانی ناول کی وضع کی ہوتی جا رہی ہے" اور "فیملی پیپر" میری معصوم منظوری سے بند کر دیا جاتا تھا۔ تاہم نہ وہ اور نہ میں خشک زاہد تھے، اور جب ہفتہ کا دن ہوتا تو ہم کتابوں والی دوکان پر جاتے اور آیندہ اشاعتوں میں سے چھپ چھپا کر اپنے پسندیدہ افسانوں کے بقیہ واقعات پڑھ لیا کرتے۔"

۱۸۵۶ء کے اختتام کے قریب پہلی دفعہ لوئی کے دل میں مصنف بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے چچا ڈیوڈ سٹیون سن نے اپنے بچوں اور بھتیجوں سے حضرت موسیٰ کی بہترین کہانی لکھنے والے کو انعام دینے کا وعدہ کیا لوئی خود تو بہ آسانی نہ لکھ سکتا تھا، اسے اجازت دی گئی کہ وہ اپنی کہانی اپنی والدہ سے لکھوائے۔ اس کاوش اور محنت کے لئے جو اُس نے اس کام کو انجام دینے میں صرف کی اُسے ایک خاص انعام دیا گیا۔ اُسی دن سے لڑکے کے دل میں مصنف بننے کا شوق پیدا ہو گیا۔

لوئی کی مکتب کی زندگی مزاحمتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اُس کی صحت اسے باقاعدہ حاضری سے روکتی تھی۔ ایک دن اگر اُسے ذرا سی سردی لگ جاتی تو دوسرے دن وہ زکام بن جاتا۔

ایک مدتِ معینہ کے لئے جب اُس کی ماں گھر میں موجود نہ تھی اسے آئیل ورتھ کے ایک اقامتی مدرسہ میں بھیج دیا گیا، لیکن ۱۸۶۷ء میں اُسے اڈنبرا کے ایک اور مدرسے میں تبدیل کر دیا گیا جہاں اُس کی حاضری ایک حد تک باقاعدہ رہی، یہاں تک کہ وہ تین سال کے بعد اڈنبرا یونیورسٹی میں داخل ہونے کے قابل ہو گیا۔

اوائلِ عمری میں سٹیون سن کو ادبیات سے ایک گہرا شغف تھا۔ خواہ وہ مدرسے میں ہوتا خواہ گھر میں مختلف قسم کے رسائل اس کے ہاتھ میں رہتے۔

وہ افسانے جن میں اُس کا نوآموز ہاتھ صاف پہچانا جا سکتا ہے ایک ایسے قلم سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں جو اُس وقت بھی جرات و مردانگی کے واقعات کو ادا کرنے میں نکھری اور سنسنی پیدا کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا۔ ایک افسانہ کا نام "ریکر" تھا۔ ریکر اُس شخص کو کہتے ہیں جو تباہ شدہ جہاز کا مال لوٹے۔ اس میں دو آدمیوں کا ذکر ہے جو نارتھ برو ک کے ساحل پر کھڑے ہیں:۔

"دونوں میں سے قوت اور عمر میں بڑھا ہوا ایک لمبا تڑنگا بدنما سا شخص تھا جس کے بال خاکستری رنگ کے تھے اور ناک سرخ تھی۔ وہ ایک ماند اور بے رونق سا سنہری فیتے والا نیلا کوٹ، ایک سرخ واسکٹ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا کوئی ماہی گیر معلوم ہوتا تھا گو اس کی جاکٹ کی ہر جیب میں سے ایک پستول باہر نکلا ہوا تھا۔ یہ اپنے

دوسرے ساتھی سے زیادہ شریر اور مفسد پرداز نظر آتا تھا۔ پہلے نے کہا "ڈین، وہ مستول سی کیا چیز لٹک رہی ہے؟"
دوسرے نے جواب دیا "میرا خیال ہے یہ کوئی ملاح ہے بہتر ہو کہ اسے جا کر پکڑ لو"
اس کے بعد دل میں ہیجان برپا کرنے والے اور بدن میں تھرتھری پیدا کرنے والے واقعات شروع ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر بہت سے لڑکے ڈرتے ڈرتے اپنے بستروں میں لیٹے ہونگے۔

جب لوئی سولہ سال کا ہوا تو اُسے اپنی چند تحریریں مطبوعہ صورت میں دیکھنے کا مسرت انگیز موقع پیش آیا۔ پینٹ لینڈ کی بغاوت پر اُس نے ایک ناول لکھا۔ یہ ۱۸۶۶ء میں شائع تو ہوگیا لیکن اس صورت میں کہ حجم گھٹ کر ایک مختصر سا رسالہ بن چکا تھا جس کا نام ناشر نے "۱۶۶۶ء کی تاریخ کا ایک ورق" رکھا۔ اس کی بہت سی جلدیں خود اس کے باپ نے خریدیں۔

جب مدرسے سے سٹیون سن کے فارغ ہونے کا وقت آیا تو اُس کے باپ کے دل میں فطرۃً یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی ایک ایسا ہی مشہور و معروف انجنیر بنے گا جیسا کہ میں خود ہوں۔ اسی لئے بعد کے ساڑھے تین برس اُس کے آئندہ پیشے کے لئے تیاری میں صرف کر دیئے گئے۔

سند کے حصول کے لئے جامعہ اڈنبرا میں داخل ہونے کے علاوہ سٹیون سن نے ساحلی کارخانوں میں ایک عملی نصاب بھی لے لیا۔ ۱۸۷۱ء میں سٹیون سن نے رائل سکاٹش سوسائٹی آف آرٹس کے سامنے اپنے فن کے متعلق پہلا اور آخری خطبہ پڑھا۔ اس کے بارہ دن بعد اُس کے جادۂ حیات کا رخ بالکل تبدیل ہوگیا۔ اُس نے اپنے باپ کو بتایا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اب میں اُس فن کے مطالعہ کو جاری نہ رکھ سکوں گا۔ جواب تک بظاہر میرا مطمحِ نظر رہا ہے۔ میرا دل تصنیف کے کام کو چاہتا ہے۔ باپ کو اس سے یقیناً بہت بڑا صدمہ ہوا ہوگا کیونکہ اُن کا گھرانہ کئی پشتوں سے انجنیری کے فن میں کمال پیدا کر رہا تھا، لیکن اُس نے سوچا کہ بیٹے کو ایسا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا جو اُس کے مذاق کے خلاف ہے تباہ کن ثابت ہوگا اس لئے اُس کی خواہش کو منظور کر لیا گیا۔ اُس نے انجنیرنگ چھوڑ کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیا کیونکہ اُس کے باپ نے اُسے بتایا کہ اگر تم ایک "ناکام مصنف" ثابت ہوئے تو یہ تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔

قانون کے ابتدائی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سٹیون سن نے ایک وکیل کے دفتر میں کام کرنا شروع کیا، لیکن اُس ڈائری سے جو ان دنوں میں وہ لکھا کرتا تھا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دفتر کی بے کیف زندگی سے اُس کی روح کتنی بیزار تھی اور آزادی اور کھلی فضا کے لئے اُس کا دل کتنا بے قرار تھا۔

تعطیل کے کچھ دن اُس نے جرمنی میں گزارے اور بلیک فارسٹ کے ایک پیدل سفر نے اُس کے سیاحت کے شوق کو اور زیادہ کر دیا۔ انہیں سفروں کا ایک قابلِ ذکر نتیجہ اُس کی کتاب "ٹریولز وِد اے ڈنکی" ہے۔

جب وہ تیئیس برس کا ہؤا تو اسے دو ایسے دوست ہاتھ لگے جو شہرت کے بلند مقام تک پہنچنے کے لیئے اُس کے واسطے بہت بڑی مدد ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک مسز سِٹ ویل تھی جس کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہؤا اور دوسرا سر سڈنی کالون جو جامعہ میں فنونِ لطیفہ کا پروفیسر مقرر ہؤا اور جس نے بعد میں اول الذکر سے شادی کر لی۔ سٹیون سن اب دوستوں سے گھرا ہؤا تھا اور یہ ایک ایسی صورتِ حالات تھی جس کی ہمیشہ اُس کو خواہش رہی۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے دل کی سب سے بڑی خواہشات کو قلمبند کیا۔ وہ یہ تھیں: اچھی صحت (۲) تھوڑی سی فراغت اور (۳) دوست!

ایک طبیب کے کہنے پر کہ اُسے جنوبی فرانس میں جانا چاہیئے وہ اپنی زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہؤا جس میں اسے بہت سی آوارہ گردی کرنی پڑی "آرڈرڈ سوتھ" میں اُن جذبات کا اظہار ہے جو اُس کے دل میں اپنا محبوب وطن بادلِ نخواستہ چھوڑنے پر پیدا ہوئے۔

۱۸۷۸ء تک کے زمانہ کا اکثر حصہ اُس نے فرانس، لنڈن اور اڈنبرا میں گزارا، اور آہستہ آہستہ افسانے لکھنے شروع کیئے۔ اٹھائیس سال کی عمر میں اُس کی پہلی تصنیف "اِن لینڈ وائج" شائع ہوئی اور پھر اُس کی مسلسل تصنیفات "نیو اریبین نائیٹس" اور "پکچرسک نوٹس آن اڈنبرا" نکلنی شروع ہوئیں۔ بہت جلد ایک خوش انداز مصنف کی حیثیت سے اس کی شہرت ہونے لگی اور اُس نے بھی اس کے حصول کے لیئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ ادبی دنیا میں بہت جلد اُس نے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی

اگست ۱۸۷۹ء میں سٹیون سن لنڈن سے نیویارک کے لیئے جہاز میں سوار ہوا اور وہاں سے کیلیفورنیا پہنچا۔ یہاں وہ مسز اوسبورن سے ملا جسے اُس کی زندگی کے کھیل میں بہت بڑا حصہ لینا تھا۔ آنے والے سال میں اُس نے اس سے شادی کر لی اور یوں اپنے لئے ایک ہمدرد اور غمگسار مددگار حاصل کر لیا۔

سٹیون سن کو اُس کی کمزور چھاتی اور سل کا خوف ایلپس، ریویرا، بورن موتھ اور ریاستہائے متحدہ میں لیئے لیئے پھرا۔ آخر کار اُس نے جنوبی سمندروں کی آب وہوا کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور جون ۱۸۸۸ء میں وہ بحر جنوبی کے جزائر کے سفر کے لئے چل کھڑا ہؤا جو تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ سٹیون سن اُپالُو کی دلفریبی سے خاص طور پر متاثر ہؤا، جو ساموئی جزائر میں سے ایک جزیرہ ہے۔ یہاں شہر اپیا سے تین میل دور کی پہاڑیوں پر سٹیون سن

نے اپنا گھر بنایا اور اُس کا نام "ویلما" رکھا جس کے معنی ساموئی زبان میں پانچ پانیوں کے ہیں۔ یہ نام اس مقام کی جائے وقوع کی مناسبت سے رکھا گیا۔ مکان سراسر لکڑی کا بنا ہوا تھا جس میں آرائش و آسائش کا تمام ضروری سامان موجود تھا اور نصف درجن ملکی ملازمین خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ سٹیون سن نے اپنے گھر کو ایک قبیلہ وارانہ حکومت کی طرح چلانا چاہا اور خدمت گاروں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ گھر کے انتظام و انصرام میں فخر محسوس کریں۔

شام کے وقت بڑے کمرے میں کھانا چنا جاتا تھا اور اُس کھانے میں تمام ملازمین شامل ہوتے تھے۔ یہاں مختلف تجاویز پر بحث ہوتی تھی یا سٹیون سن سب کو کچھ پڑھ کر یا بانسری بجا کر سناتا تھا۔ بانسری کا وہ بہت مشتاق تھا۔

تمام دیسی لوگ سٹیون سن کو "داستان گو" کہتے تھے۔ وہ اُس کی بڑی عزت کرتے تھے، اور وہ اُن کی عزت کا مستحق بھی تھا۔ اُس مصیبت کے وقت میں جب بحر جنوبی کے جزائر کی حکومت مسئول بن رہی تھی اور دیسیوں میں بے چینی زور شور سے پھیلی ہوئی تھی سٹیون سن نے ساموئی قوم کا معاملہ دنیا کے سامنے پیش کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں۔ وہ ایک اولوالعزم انسان تھا اور دیسیوں نے اُس کی مہربانیوں کو کبھی فراموش نہ کیا۔ انہوں نے اس کی اتنی عزت کی جتنی اُن کے تصور میں آ سکتی تھی۔ انہوں نے نشیب و فراز کو ہموار کر کے اُس کے گھر تک ایک سڑک بنا دی اور اُس کا نام "محبت کرنے والے دل کی راہ" رکھا۔

سالگرہ کی وہ دعوت جو نومبر ۱۸۹۴ء میں اُس کے اعزاز میں منعقد ہوئی آخری ثابت ہوئی۔ تیسری دسمبر کو سٹیون سن نے اپنی صحت کو بہتر محسوس کیا اور لیکچر دینے کی غرض سے امریکا کے سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا پھر وہ شام کے کھانے کی تیاری میں اپنی بیوی کو مدد دینے کے لئے برآمدہ میں آیا۔ یکایک اُس کے منہ سے نکلا "وُہ کیا ہے؟" اور اُس نے اپنے سر کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ "کیا میں عجیب سا نظر آ رہا ہوں؟" اُس نے پوچھا۔ ایک لمحہ بعد وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ چند گھنٹوں میں "داستان گو" کو سکون مل چکا تھا اور اُس کی خانہ بدوشی ختم ہو چکی تھی۔

ر۔ ف۔ ل　　　　　　　　　　منصور احمد

لاہور کی ایک شام

شامِ عید

(۱)

میری نظروں میں ہے وہ انجمنِ برہمِ حسن
وہ جنونِ تپشِ عشق وہ خوئے رمِ حسن

بزمِ ہستی پہ ہی چھایا ہوا اک عالمِ حسن
ذرہ ذرہ نظر آتا ہے مجھے محرمِ حسن

ایک مہتابِ لطافت کی جھلک دیکھی ہے
حسن دیکھا ہے کہ پھولوں کی مہک دیکھی ہے

اُس کی آنکھوں سے ہی ہے مستیٔ صہبائے بہار
اُس کے جلووں سے ہی رنگینیٔ گلہائے بہار

روحِ تنویر ہے وہ انجمن آرائے بہار
سامنے اُس کے اگر آئے تو شرمائے بہار

اُس کی باتوں سے محبت کا فسانہ رنگیں
اُس کی اِک برقِ تبسم سے زمانہ رنگیں

عشقِ پامال کہاں حسنِ سرافراز کہاں
دامنِ عرش پہ ہو خاک کی پرواز کہاں

میری تقدیر ہیں وہ انجمنِ ناز کہاں
اتفاقات یہ ہوتے ہیں خدا ساز کہاں

فلکِ حسن کے تارے سے محبت ہے مجھے
اپنی تقدیر کی رفعت سے شکایت ہے مجھے

(۲)

نہ کر سکوں گا نہ ہو سکے گا بیاں ترے حسنِ دل نشیں کا
نظر ہی یا بیخودی کا ساغر جبیں ہی یا چاند چودھویں کا

عرق عرق ہو گیا ہی چہرہ تمام گلہائے نازنیں کا
نسیم گلشن سنا رہی ہی فسانہ گیسوئے عنبریں کا

فلک پہ تارے چمک رہے ہیں کہ تو نے افشاں چنی ہوئی ہی
زمیں پہ تاروں کا نور ہے یہ کہ تیری آرائشِ جبیں کا

وہ آنکھ سے آنکھ کیا ملائیں وہ جلوۂ ناز کیا دکھائیں
کہ نوجوانی کی شوخیوں پر نقاب ہے چشمِ شرمگیں کا

چراغ ہیں آفتاب و مہتاب آپکی چشمِ دلبری کے
بہشت اک نقشِ رنگ پرور ہی آپکے روئے آتشیں کا

فروغِ تنویرِ صبح ہے یا جبیں کسی شوخِ ماہرو کی
بہارِ لیلائے شام ہی یا سیاہ آنچل کسی حسیں کا

نثار ہیں مہر و ماہ و انجم تمہارے دامانِ گوہریں پر
ضیا فروزِ نظر ہے عالم تمہارے دامانِ گوہریں کا

لگائے ہیں چار چاند تو نے دیارِ لاہور کی زمیں کو
کہ ذرہ ذرہ چمک رہا ہے دیارِ لاہور کی زمیں کا

عابد

کلیاں

میں ایک چھوٹی بچی سے ملی۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سے پھول تھے بعض پھولوں کے ساتھ تیز تیز کانٹے بھی تھے۔ اور اُس کے ہاتھ زخمی اور لہولہان ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر آنسوؤں کے ہلکے ہلکے نشان بھی ہیں جیسے وہ ابھی ابھی رو کر چُپ ہوئی ہے۔ بچے روتے ہیں اور رو کر انہیں سکون مل جاتا ہے لیکن بڑے خون کے آنسو روتے ہیں اور اُن کا ہر آنسو جو گرتا ہے پارہ ہائے دل کو اپنے ہمراہ لاتا ہے۔

میں نے کہا "ننھی بچی! کیا میں تیرے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں، کچھ نہیں، کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "میری جان مجھے بتا دے کہ تجھے کیا دکھ ہے شاید میں تیری مدد کر سکوں۔"

اُس نے کہا "میری چھوٹی بہن پچھلے ہفتے مر گئی تھی اور یہ پھول لے کر میں اُس کی قبر پر جا رہی ہوں۔" اور آنسو اُس کی آنکھوں سے پھر بہنے لگے۔

میں نے کہا "پھر تو ننھی بہن خوش ہو جائے گی، کیونکہ وہ انہیں اپنے جنت کے گھر سے دیکھے گی اور اب وہ تم سے بڑا پیار کرتی ہے۔"

"جاؤ جاؤ" بچی نے کہا "تم میری بات نہیں سمجھیں۔ آخری مرتبہ جب میں نے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا تو اُس نے مجھ سے میری گڑیا پیار کرنے کو مانگی تھی مگر میں نے انکار کر دیا ـــــ آہ، تم اب بھی نہیں سمجھیں! میں اب اس کو اپنی گڑیا کبھی نہیں دے سکوں گی۔

قریب قریب اندھیرا ہو چکا تھا اور میرا راستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا ـــــ خدا کی چپ چاپ دنیا میں سے ہو کر + ایک فوری جذبہ نے مجھے عام راستے سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا اور وہاں قبروں کے پیچھے میں نے ایک آدمی کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ زرد اور ملول تھا اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"کیا تم بیمار ہو؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا، کیونکہ اُس کے خاموش رنج اور یاس میں کچھ ایسا اثر تھا جس نے میرے دل کو پگھلا دیا تھا۔

اُس نے کہا "میرا جسم تندرست ہے لیکن میرا دل بیمار اور میری روح علیل ہے، کیونکہ مٹی کے اس سرسبز ڈھیر کے نیچے وہ عورت سوتی ہے جسے میں اپنی جان کی طرح عزیز رکھتا تھا مگر —— میں نے اُسے یہ کبھی نہ بتایا"۔

میں نے اپنا سر خاموش دلسوزی میں جھکا لیا اور اپنے راستے پر چل دی۔ میں کیا کہہ سکتی تھی؟ کیوں، آہ کیوں، میری بہنو اور میرے بھائیو، ہم اپنے جذبات کو اپنے سینوں میں دباتے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ جن کے ساتھ یہ وابستہ ہوتے ہیں اس دنیا سے چل بستے ہیں؟ کیوں ہم اپنی محبت کو اُس وقت تک چھپائے رکھتے ہیں جب اس کے اظہار کا وقت گزر چکتا ہے؟ کیوں؟ آہ کیوں؟

للی ایلن عبدالعزیز خاں

دردِ جانکاہ تھا جب تار درست ہو رہے تھے میرے آقا!

اب اپنا راگ چھیڑ اور مجھے اُس درد کو بھول جانے دے۔

اب جو کچھ اُن بے رحم دنوں میں تیرے دل میں مستور تھا مجھے حسن میں محسوس کر لینے دے +

کم ہوتی ہوئی روشنی میرے دروازے پر آ کھڑی ہے۔ اُسے گیتوں میں رخصت ہونے دے۔

اپنا دل میری زندگی کے تار تار میں بھر دے میرے آقا! میرے ہر تار کو ایسی راگنیوں سے بھر دے جو تیرے تاروں سے نازل ہوا کرتی ہیں!

وہ دن جو میرے تیرے درمیان حائل ہے اپنی رخصت کا آخری آداب بجا لاتا ہے۔

رات اپنے چہرے پر اپنا نقاب ڈال لیتی ہے اور اُس ایک چراغ کو جو میرے کمرے میں جل رہا ہے چھپا دیتی ہے

تیرا تاریک خادم دبے پاؤں آتا ہے اور عروسی قالین بچھا دیتا ہے کہ وہاں اُس ہُو کی خاموشی میں تو میرے ساتھ تنہا بیٹھے یہاں تک کہ رات تمام ہو جائے!

گلچیں

رجائیت اور صحت

رجائی فلسفی رلیف والڈو ٹرائین اپنی ایک کتاب کا آغاز ان عجیب الفاظ سے کرتا ہے:-

"ایک رجائی دس منزلہ مکان سے گرا، جو ہر منزل پر بلند آواز سے یہ کہتا سنائی دیا کہ اب تک تو بخیر ہوں"

ٹرائین اتنا لکھ کر پوچھتا ہے، "کیا وہ گرنے والا دیوانہ تھا؟" پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ "وہ ہوشیار تھا اور دانش مند تھا۔ ہاں وہ رجائی تھا۔ رجائین کا شیوہ صبر و سکون ہوتا ہے، چاہے وہ آماجگاہِ بلیات ہی کیوں نہ بن جائیں"۔

رجائی کون ہے۔ دنیا نے رجائیت کا مفہوم غلط سمجھ رکھا ہے۔ رجائی قطعاً اُس شخص کو نہیں کہتے جو دنیا کے نشیب و فراز اور رموزِ حیات سے ناآشنا اور نابلد ہو۔ اس قطع و قماش کے لوگوں کو تو غافل اور بیوقوف کہا جاتا ہے۔ رجائیت کا مفہوم بہت ارفع اور بلند ہے۔ رجائی اپنی زندگی کا ثبوت ہمیشہ عمل ہی سے دیتا ہے۔ خارزارِ زندگی کے وہ تمام خوفناک مصائب و نوائب جن کا سامنا ہر ایک انسان کو کرنا پڑتا ہے ایک رجائی کے لئے ہمت شکن اور ہراس انگیز نہیں ہوتے۔

اول تو وہ تدبیر ہی سے سنگِ حوادثِ روزگار کا جواب دیتا ہے، اگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو اُس کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے لیکن وہ اس کشمکشِ حیات میں رونا تو درکنار کڑھنا بھی گناہ سمجھتا ہے اور ہمیشہ خنداں پیشانی رہتا ہے"۔

یہ ہے رجائیت کا مفہوم جو کرل ہارٹ نے رسالہ "صحت اور تندرستی" میں ظاہر کیا ہے۔ رجائیت کا اصل الاصول دنیا میں خوش رہنا ہی ہے۔ اس حقیقت با بہرہ سے ہر ایک ذی عقل آشنا ہے کہ جو مرض مزمن ہو اس کے درد و کرب کو طوعاً و کرہاً برداشت کرنا پڑتا ہے پھر اس سے کیا فائدہ کہ مریض افسردہ خاطر اور پژمردہ دل بن کر رہے اور اُس کی پیشانی پر غم و الم کے نشان نمایاں رہیں۔

تاثراتِ غم واقعی انسان کے لئے سمِ قاتل کا کام کرتے ہیں لیکن خوش رہنا تریاق ہے اور خوش طبعی سو دواؤں سے بہتر دوا ہے۔

زہرِ غم۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ موسمِ خزاں میں درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر جاڑے کی سرد ہوا درختوں کی چھال ہی پر اثر انداز ہوتی ہے اور درختوں میں جو ہرِ حیات باقی رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح شجرِ زندگی کا معاملہ ہے۔

سبیلِ حوادث کے ریلوں میں اُس کی صوری حالت تو بہت کچھ بدل جاتی ہے لیکن نشوونما میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، ہاں اگر دیمک لگ جائے تو درخت بھی گر جاتے ہیں اور شجرِ زندگی بھی کوئی دن میں زمین پر بچھ جاتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ شجرِ زندگی کے لئے دیمک کیا چیز ہے۔

سنو! —— غمِ روزگار میں خوف و یاس کا پیدا ہونا قاطعِ حیات ہے۔ شیکسپئر غمِ روزگار کو حیاتِ انسانی کے لئے سب سے بڑی مضرت سمجھتا ہے، اسی طرح بعض دوسرے مشاہیر کا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے غمِ روزگار کی مضرت سے انکار نہیں لیکن یہ دقیق راز ایک عربی روایت میں پنہاں ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک سیاح "طاعون" سے ملا اور اُس سے پوچھا کہ "کہاں جا رہے ہو؟" طاعون نے جواب دیا "بغداد میں پانچ ہزار اشخاص کی جانیں لینی ہیں وہاں جا رہا ہوں۔" اتفاق سے سیاح اور "طاعون" کا پھر واپسی پر ملنا ہوا۔ سیاح نے تنک کر کہا: "ظالم! شاید جھوٹ بولنا بھی تمہاری سرشت میں ہے۔ پانچ ہزار جانوں کے بجائے پچاس ہزار جانیں لے لیں؟" طاعون نے متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا "مجھے واقعی پانچ ہزار اشخاص کی جانیں لینی تھیں لیکن پینتالیس ہزار جانیں خوف و یاس نے موت کے گھاٹ اُتار دیں۔"

قلب کی قوت۔ قلبِ انسان میں وہ وہ زبردست قوتیں اور محیر العقول طاقتیں پوشیدہ ہیں کہ اُن سے کام لیا جائے تو تقدیریں بدل سکتی ہیں۔ مسٹر کوئے نے قلبِ انسان کی ان قوتوں اور طاقتوں کا صحیح طور پر اندازہ کر کے ہر ایک بیماری کی علت دل ہی کو بتایا ہے۔ واقعات اور تجربات شاہد ہیں کہ آئے دن اُس کے شفاخانہ میں اعجاز کے کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں۔

مدت ہوئی کہ لورپول کے ایک پادری نے جس کو بے خوابی کے مرض نے ستا رکھا تھا کسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ ابھی اُس نے ملازمت کا جائزہ نہ لیا تھا کہ اُس کے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ میں اس موذی مرض کے سبب اپنے فرائض تندہی سے سرانجام نہ دے سکوں گا۔ آخر وہ سوچ سوچ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملازمت کا خیال ہی دل سے نکال دیا جاتے۔ قریب تھا کہ وہ استعفےٰ دے دیتا لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس گیا اور اُس سے مشورہ لیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ چند دن ٹھیر کر میرا علاج کرو، میں ایک مجرب سفوف دیتا ہوں اس کے استعمال سے امید ہے کہ تمہارا مرض جاتا رہے گا۔

یہ سُن کر پادری کے دل میں خیال گزرا کہ ایک مزمن مرض کے لئے صرف سفوف کا استعمال کیا فائدہ دے گا۔

اسی اثنا میں ڈاکٹر نے سفوف کی شیشی اُٹھا کر پادری کو دینی چاہی لیکن اُس کی ہیجر مجر سے ڈاکٹر نے تیور بھانپ لئے اور وہ سفوف دینے سے انکار کر دیا۔ پادری نے سفوف کے حصول کے لئے بے حد اصرار کیا لیکن ڈاکٹر نے اس کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا۔ آخر پادری کبیدہ خاطر ہو کر چلا گیا۔ جب ڈاکٹر سے اس کی کج ادائی کے متعلق پوچھا گیا تو اُس نے مسکرا کر کہا کہ پادری کے دل پر یہ نقش ہو چکا ہے کہ میں ایک مزمن مرض میں مبتلا ہوں، اس حال میں مَیں نے اُسے سفوف دینا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ یہ فوری علاج اُسے کچھ بھی فائدہ نہ دیتا، اور وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہو جاتا۔ قلبِ انسان کی قوتیں نہ صرف جسدِ انسانی پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ اُس کے تمامتر حسّیات اور جذبات بھی اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب سائنس دانوں نے ایک مجرم کے عرقِ انفعال کے قطروں کا اور معمولی پسینے کے قطروں کا کیمیائی طور پر تجزیہ کیا تو دونوں میں بین فرق نکلا۔ تم نے قے تو کئی بار کی ہوگی لیکن کبھی اس کی وجہ بھی سمجھی ہے، قے عموماً اشتعالِ جذبہ کے ماتحت کی جاتی ہے۔ یرقان شدّتِ غیض و غضب اور خوف و خطر کے سبب ہوتا ہے۔ تم نے سمجھ لیا کہ جسدِ انسانی ہر ایک جذبہ کے ماتحت جدا جدا طور پر متاثر ہوتا ہے۔ گویا تاثرات اور جذبات ہی قصرِ حیات کی تعمیر و تخریب کے ذمہ دار ہیں۔

رجائیین کا مسلک ۔ رجائیین کے قلوب میں ہمیشہ فرحت و انبساط کے خیالات، محبت و شفقت اور بردباری کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ہر حال میں خوش رہنا رجائیت کا اصولِ اساسی ہے۔

تم نے دیکھ لیا کہ رجائیت کیا ہے اور رجائی کسے کہتے ہیں؟ پھر سنو! ——— رجائی وہ ہے جس کو خیالات اور خواہشات پر قابو ہو، ورنہ تخیل کی بے راہ روی اور خیال کی بغاوت قصرِ حیات کو ڈھا دیتی ہے۔ رجائیین کا مسلک یہ ہے کہ جب وہ حادثاتِ دہر اور بلیاتِ آسمانی کا شکار ہوں تو ہیں نہ بول دیں بلکہ اُن کا بخندہ پیشانی مقابلہ کریں۔ جو شخص غم و الم کی گھڑیاں ہنس کر گزار دے اُس کی صحت ہمیشہ اچھی رہتی ہے

صادق ایوبی

شکوۂ بیداد

اے کاش! یہ اچانک مجھ پر ستم نہ ڈھاتے — اے کاش! تم یکایک مجھ کو نہ بھول جاتے
اے کاش! شب کے نالے یُوں رائگاں نہ جاتے — اے کاش! دل کی آہیں یوں بے اثر نہ رہتیں
اتنا نہیں ستاتے، اتنا نہیں جلاتے — سابق کرم کا صدقہ، اتنا تو سوچتے گا
مانا، مری خطا تھی لیکن مجھے جتاتے — لاعلمِ جرم رکھ کر تعزیر کب روا ہے
تحقیقِ جرم کر کے کچھ فیصلہ سناتے — قبل از ثبوتِ کافی حکمِ سزا نہ دیتے
انصاف کو پہنچ کر توفیقِ خیر پاتے — الزام کو سمجھ کر انصاف کو پہنچتے
ارمان تو یہی تھا، تم مجھ پہ رحم کھاتے — احسان تو یہی تھا تم مجھ کو بخش دیتے
اظہارِ وجہ کر کے دل کی خلش مٹاتے — لیکن اگر سراسر ظلموں کی ٹھان لی تھی
کشتی ڈبو کے بھی تو باعث نہیں بتاتے — تم خضر سے بھی بڑھ کر بیداد کوش نکلے

آزادِ بے گنہ پر ناحق ستم کہاں تک
بندہ نواز! یوں تو بندہ نہیں بناتے

حکیم آزاد انصاری

بیزاری

نہ دے شکستہ دلوں کو فریبِ آزادی
دکھا نہ عشرتِ فردا کا خواب، رہنے دے
نہ پھونک عشق نوازی کا روحِ پُر افسوں
نہ چھیڑ دل کا شکستہ رباب، رہنے دے
اب التفاتِ فراواں کی مجھ پہ چال نہ چل
دکھا یہ اور کسی کو سراب، رہنے دے

نہیں ہے دل کو محبت کی تاب، رہنے دے
یہ لطف، یہ کرمِ بے حساب رہنے دے

جو مجھ پہ گذری ہے اب پوچھنے سے کیا حاصل؟
فضول ہیں یہ سوال و جواب، رہنے دے
ستم جو تُو نے کیئے اُن کا اعتراف نہ کر
نہ لے وفاؤں کا میری حساب، رہنے دے

جھنجھوڑ کر نہ جگا فتنہ ہائے خوابیدہ
مرے نصیب کو مصروفِ خواب رہنے دے

اسیرِ عشق کو یوں ہی خراب رہنے دے
نہ کر جفاؤں سے اب اجتناب رہنے دے

بُھلا چکا ہُوں جو پچھلا سبق، نہ یاد دلا
نہ کھول درسِ وفا کی کتاب، رہنے دے
بہت ہے بادۂ حرماں الم نصیبوں کو
لگا نہ لب سے خوشی کی شراب، رہنے دے
تجھے قسم ہے جوانی کے عہدِ رنگیں کی
مری حیات کو ناکامیاب رہنے دے!

نشانۂ ستم بے حساب رہنے دے
خرابِ حالِ وفا کو خراب رہنے دے

ذوقی

پچیس[25] اور تیس[30]

ان دو میں یوں تو صرف پانچ سال کا فرق ہوتا ہے مگر مجھ سے پوچھو جو تیس[30] ہوں! مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیس منفی پچیس پانچ نہیں پچاس ہیں۔ ان کمبخت پانچ سالوں نے کیا کچھ نہ بدلا۔ یوں تو اب بھی خوشی کے وقت ایک کی بجائے دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر خواب گاہ کی طرف لپکتا ہوں مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔

(او سچ! خدا کرے تو مر جائے خدا کرے تیرا جنازہ نکلے!) قدرے قلیل ہانپتا ہوا پچیس میں ہانپنا کہاں تھا؟ ہائے پچیس! ہائے وہ دن کہ شیطان علیہ اللعنۃ ہانپتا ہوا پیچھے اور ہیں کوسوں آگے!! مگر اب تو ایک نہیں دو بچے ہیں اور اُف غضب کہ جب بیگم بہت کس کر ساڑھی باندھے تو کچھ پہلی سی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر اس غریب کا کیا قصور؟ خود میری پچیس والی پتلون مجھے۔۔۔۔ نہیں مگر سچ جائے جہنم میں یہ بات نہ لکھوں گا۔ ہاں مگر میرے لندن والے درزی کی وہ تاسف آمیز نگاہ مجھے نہ بھولے گی جب اس سال اُس نے مجھے کمر کے گرد ناپا اور کمبخت نے یہ بھی کہہ دیا کہ "جناب اب تو آپ مضبوط ہو رہے ہیں"! ہائے اس کمبخت انگریزی زبان کی وسعت تو دیکھو کہ بھدّے کو مضبوط کس خوبصورتی سے کہا!

جی میں آتا ہے کہ کسی طرح وقت کو الٹا پھاند جاؤں۔ کاش کہ ۲۵ کے آگے ۲۴ ہوتا اور پھر ۲۳ اور اس طرح اب میں ۲۰ کے لگ بھگ ہوتا مگر اس کمبخت ملک میں ماں باپ کی خوشی کے لئے باپ بننا ضروری ہے۔ خدا جانے ماں باپ کو بچوں سے اس قدر نفرت کیوں ہے کہ بچے یا بچی کو ماں یا باپ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ اللہ میاں کاش تیری کمر موٹی ہوتی اور تجھے وہ سوگ ہوتا جو مجھے ہے! پھر تو تو ہندوستان کے اماں باوا کی آنکھیں کھولتا کہ بچوں کو اور سو طرح سے مارو مگر شادی سے حلال نہ کرو۔ مگر اللہ میاں کو کوسنے سے کیا ہوتا ہے! وہ ہندوستان میں ہے ہی کہاں؟ یہاں تو مسٹر گاندھی ہیں یا ببّ والے اور ان کمبختوں کو کسی کے دکھ درد سے کیا مطلب؟ ان کا تو اوڑھنا بچھونا انگریزی حکومت ہے۔ انگریزی حکومت نہ ہو تو خدا جانے یہ کہاں کی مکھیاں ماریں۔

تیس! تیس!! ارے کہاں کے تیس؟ آج کمبخت سال گرہ ہے۔ سچ پوچھو تو تیس بھی محض خواب و خیال ہے۔ کیا اب حسین لڑکیاں کبھی میری نکٹائی جرابیں نہ دیکھیں گی؟ یہ سالگرہ کیا جھریوں کا پیش خیمہ ہے؟

ہاں خوب یاد آیا! اُس کمبخت بڈھے کو تو دیکھو! خدا جانے کئی سو پشت مجھ سے بڑا ہے مگر کل مسکرا کر کہہ رہا

تھا کہ ۲۲ سال کی پرانی پتلون پہنے ہوں اور میری بھولی بیگم کس قدر تعجب سے مسکرا کر اسے کہہ رہی تھی کہ جھوٹ کے تو آپ نپولین ہیں۔ بائیس سال پہلے تو زمیں آپ کا منہ دھلاتی ہوگی" وہ داڑھی مونچھ منڈا بڈھا اس تعریف سے پھولا نہ سمایا۔ چالیا کہیں کا؟ ایسے فقرے اسے یاد ہیں کہ سچ بولتا ہے اور کوئی اسے باور نہیں کرتا۔ مجھ سے لڑکوں میں لڑکا بنا رہتا ہے۔ مگر میں کیا اب لڑکا ہوں؟ ملے او خانہ خراب گذشتہ تیس! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کیا اب جھریاں آئیں گی؟ مگر اس بڈھے کے چہرے پر تو ایک بھی جھری نہیں۔ ممکن ہے آج سے بیس سال بعد میری بھی وہی حالت ہو۔ کس طرح اس چالیے کا مرید بن جاؤں اور اس سے لازوال شباب کا نسخہ حاصل کر لوں۔ جب سنو یہی سنو کہ وہ بڈھا اُس لیڈی کے ساتھ سیر کو گیا اُس مس کے ساتھ تھئیٹر گیا فلاں حسینہ میم کے ساتھ ٹینس کھیلا فلاں بزم کا وہ روح رواں تھا۔ خدا جانے اس کے پاس کیا جادو ہے؟ جب کوئی لڑکی پاس نہ ہو تو خود میرا دل اس کی طرف کھچا جاتا ہے۔ ضرور اس کا مرید بنوں گا۔

مگر آخر سوچوں تو سہی کہ اس میں بات کیا ہے؟ یونہی میں اُس سے جلتا ہوں یا کوئی بات بھی ہے؟ گمان ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات ہے تو صرف یہ کہ اُس نے چالاکی سے پچیس سال کی عمر میں عہد کر لیا ہوگا کہ مس مسجد کی بجائے مس کلیسا کا دم بھرے۔ ہو نہ ہو بات یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مسجد میں علاوہ درازئ ریش کے ضعفِ پیری بھی ہے اور اس کے برعکس مس کلیسا شہید شباب ہے۔ اللہ میاں کاش ہماری مس مسجد بھی مس کلیسا کی طرح پوڈر کریم اور لپ سٹک (Lipstick) کو شرمندۂ احسان کرے۔ پھر تو شاید ہم بھی کبھی بوڑھے نہ ہوں۔ کس مزے سے ہفتے میں ایک دفعہ بھول کر تیری عبادت کریں۔ پھر تو ہماری زندگی سے بھی یہ سالگرہ کی ڈائن شاید دور ہو۔ مگر بچے! بچے!!! پچیس اور ایک نہیں بلکہ ہم خود بچے اور تیس اور دو بچے!!! اللہ میاں یہ کیا ستم ہے؟ خدا کے لئے تو بھی اپنی عادت بدل ڈال۔ مجھ پر اور میری اس غریب نیک بخت پر رحم کر! کیا تجھے انگریزی حکومت نظر نہیں آتی؟ ساری دنیا پوچھتی ہے کہ مسلمانوں کو کس نے پیسا؟ کوئی کہتا ہے مولویوں نے کوئی کہتا ہے ہنبوں نے۔ ایسے عقل کے اندھے ہیں کہ اس سیدھے سے سوال کا جواب نہیں سوجھتا۔ مسلمانوں کو کس نے پیسا؟ بچوں نے! جسے باور نہ ہو امان اللہ سے پوچھ لے۔ ایک بچہ سقاؤ نے۔

تیس بلکہ اکتیس! اے میرے دادا نانا کے خدا! کیا تو مسلمان نہیں؟ اور اگر تو ہے تو تجھے کیوں حساب آتا ہے؟ اب اکتیس شروع ہے؟ میں مسلمان ہوں، زبان سے، دل سے۔ مجھے گھاٹے کا بیع منظور ہے۔ اپنے تیس لے لے میرے پچیس مجھے دے دے۔ جو یہ منظور نہیں تو کچھ اور کم کر دے۔ میرے باوا کو وہ اُس کا ہونہار الڑھ سا بچہ دے دے۔

فلک پیما

رنگِ بہار

پھر بہار آئی بیاباں گلستاں ہونے لگے
پھر گلستاں رو کشِ رنگِ جناں ہونے لگے

محفلِ انجم میں سازِ سرمدی بجنے لگا
محوِ رقصِ بے خودی پھر آسماں ہونے لگے

کوہ و صحرا کی فضائیں عطر میں بسنے لگیں
رشکِ نافِ تار و ختن سب بوستاں ہونے لگے

عارضِ حورِ سحر خلدِ نظر ہونے لگا
گیسوئے لیلائے شب عنبر فشاں ہونے لگے

دامنِ صحرا بھی رنگیں ہے کہ گلہائے بہار
جلوہ فرما کارواں در کارواں ہونے لگے

بزمِ ہستی پھر غریقِ بیخودی ہونے لگی
پھر شرابِ حسن کے دریا رواں ہونے لگے

میکشوں پر رازہائے دو جہاں کھلنے لگے
جلوہ ہائے عالمِ بالا عیاں ہونے لگے

عشق پھر گرنے لگا، سجدوں میں پھر گرنے لگا
پھر حسیں ہونے لگے دامن کشاں ہونے لگے

حسن کے مضراب نے چھیڑا ربابِ عاشقی
نغمہائے عاشقی پھر جاوداں ہونے لگے

چومتا پھرتا ہوں پھر گلہائے رنگا رنگ کو
آپ کے جلوے گلوں میں پھر عیاں ہونے لگے

پھر دلِ مہجور سے اک ہوک سی اُٹھنے لگی
داغہائے سینہ پھر آتش فشاں ہونے لگے

اے بہارِ روح جب تو ہی نہیں آغوش میں
جلوہ ہائے فصلِ گل آزارِ جاں ہونے لگے

اثر صہبائی

مسرّت

وہ نوجوان نازک بدن اور خوبصورت تھا۔

کون سی چیز تھی جو اُسے حاصل نہ تھی؟

...... مسرت ......

ہمیشہ، ہروقت، ہرجگہ تمنا ایک سایہ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے رہتی تھی ..... بے تاب تمنا۔ دن بھر اُس کا لگاتار چلنے والا دل اُس کی گرفت میں رہتا تھا اور اُس کی تمنا سے بھری ہوئی نگاہیں فضا میں نامعلوم سرزمینوں کے لئے آوارہ رہتی تھیں۔

اور وہ کیا چاہتا تھا؟

... کچھ ... سب کچھ!

بلبل کلی کو سینے سے لگاکر پُردرد گیت گانے لگی اور اُس کی ایک ایک ٹکڑی صبح کی ہلکی نسیم کی طرح دور دور پہنچنے لگی۔

ہر چیز خاموش ہوگئی، تمام سننے والوں نے اپنی سانس روک لی۔ اور آسمان اور تارے اور چاند تک مسحور ہوکر یہ نغمہ سننے لگے۔

وہ سن رہے تھے اور کیف اور محبت کے جوش سے بے خود ہو رہے تھے۔

کبھی کبھی جب بلبل ذرا ٹھہر جاتی تھی تو کیف اور پُرشوق آرزو کی ایک آہ کائنات میں گونج جاتی تھی۔

"آہ!" زمین کے منہ سے نکلا۔ اور یہ آہ درختوں تک، گھاس تک، ستاروں تک اور چاند تک پہنچ گئی، اور دور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس کی ایک دھیمی سی گونج سنائی دی۔

ہر چیز اس خوابِ سحر میں مدہوش آہیں بھر رہی تھی، اور ان آہوں میں محبت زدہ تمنا چھپی ہوئی تھی۔

بلبل گاتی رہی ... چھٹکی ہوئی پُرکیف چاندنی نے گلاب کی جھاڑیوں کو اور بلبل کو اپنی نرم نرم آغوش میں لے رکھا تھا۔ اور ستارے محبت کے راگ کو سن رہے تھے اور ایک نازک تبسم اُن کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا اور وہ کہتے تھے "گائے جا، پیاری بلبل، گائے جا!"

بلبل اپنے لطیف نغموں میں ڈوبی ہوئی محبت کے سوز میں مگن تھی۔ اور گلاب کی کلی کو اپنے سینے سے لگا لگا کر کہہ رہی تھی: "کھل اے محبوب! مجھے بس ایک دفعہ اپنی اچھوتی خوشبو سے اپنا مشامِ جان معطر کر لینے دے! بس ایک مرتبہ میرا سر اپنی سرخ سرخ پنکھڑیوں میں بس جانے دے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یوں ہی بلبل منتیں اور التجائیں کرتی رہی اور گاتی رہی یہاں تک کہ بہت سی رات گزر گئی۔ اور پھر اس کے گنگناتے ہوئے نغمے دھیمے پڑنے شروع ہوئے۔ اُس کی بلند سے بلند تر ہونے والی آواز میں ناسکون پذیر تمنا سسکیاں بھرنے لگی یہاں تک کہ آخر یہ مغنیہ ایک لمبی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

اور اس آہ میں سے جو دیر تک گلاب کے پودوں کے اوپر منڈلاتی رہی آرزو، ناکام آرزو کے آنسو ٹپکتے رہے۔

نوجوان دیر تک بلبل کا گانا سنتا رہا۔ بلبل خاموش ہو گئی مگر وہ وہاں سے نہ ہلا۔ بے خواب رات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے وہ کھڑا رہا۔

آرزو کا کھوکھلا کر دینے والا گھن اُس کی روح کی گہرائیوں میں اترتا جاتا تھا اور اُس کے قلب میں اپنی گرفت مضبوط کرتا جاتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جنگل کے قدیم درختوں کے سائے میں سبز سبز گھاس کے اوپر وہ دن رات پڑا رہا۔ اُس کی نظریں صاف آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔

کہیں سے نسیم کا ایک جھونکا آیا، ابھی وہ باغ کے پتوں سے پوری طرح چھوا بھی نہ ہوگا کہ گھاس کی ننھی ننھی کونپلوں کو ہلکی ہلکی گدگدی کر کے گزر گیا۔

بڑے بڑے درخت اور موٹی موٹی ٹہنیاں بے حس و حرکت کھڑی رہیں۔ اُن کے تنفس کے ساتھ قدیم نیند باہر نکلتی تھی کیونکہ وہ گہری نیند سو رہے تھے اور اُن کے سرمدی خواب میں عظیم الشان اسرار پوشیدہ تھے۔ سبک رَو نسیم چلتی تھی تو وہ بھی اُن کے پتوں کو تھپکاتی ہوئی گزر جاتی تھی کہ کہیں ان کے سکونِ استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔

مگر یہ مُردوں کی سی گہری نیند ان پر کیوں طاری تھی؟

شاید اس لئے کہ اُن کے خوابِ مسحور میں اس نوجوان کو اپنی آرزو کا حل تلاش کرنا تھا؟

وہ پہاڑی ندی کے سرود کو سنتا رہا۔

ندی پہاڑوں کی اُن چوٹیوں پر سے نیچے اتر رہی تھی جہاں برف کے تودے کبھی نہیں گلتے۔ یہ عزاتی شور

ایک تماشا گاہ کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی سے اُس نے اندر کی طرف جھانکا۔ حاضرین نے ایک نوجوان حسن کار کے کام پر ایک نا مختتم جوش کے ساتھ تحسین و آفرین کا ایسا شور برپا کر رکھا تھا جیسے یہ اُن کی کوئی دیوی تھی۔ اور وہ بھی کچھ عجیب کریمانہ انداز سے جھکی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی مسکراہٹ میں سے مسرت کی کرنیں نکل رہی ہیں۔

لیکن چند لمحوں کے بعد ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک کسل مند انداز سے اُس نے اپنے آپ کو ایک کرسی میں گرا دیا، مایوسانہ طریق سے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بجایا اور ملول ہو کر رونا شروع کر دیا۔

نوجوان نے اس شاندار شہر کو خیرباد کہی اور اُس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

ننھے فقیر کی غم انگیز سسکیاں اور تماشائیوں کی ممدوح دیوی کا مایوسانہ گریہ اُسے آگے ہی آگے لئے جاتا تھا مدتوں وہ آوارہ و سرگرداں رہا۔ آخر وہ ایک تنگ سے پہاڑی درے میں آ کر کھڑا ہو گیا جہاں کچھ دشوار گزار ٹیلوں کے درمیان ایک گہرے غار کے اندر ایک قدیم جوگی رہتا تھا۔ لوگوں سے دور اور خدا کے قریب . . . .

اُس نے غار کے اندر جا کر نہایت نرمی کے ساتھ بوڑھے حکیم سے پوچھا "بابا کیا تمہیں معلوم ہے مسرت کہاں رہتی ہے؟"

بوڑھا اپنے آس پاس قدیم تاریخی تحریروں کے ڈھیر لگائے ہوئے قرنوں اور صدیوں کی دانش و حکمت کے موتی رول رہا تھا۔ مدتیں ہو گئیں وہ زمین پر بسنے والے اِس نوجوان کے بے حاصل اور عبث سوال کا جواب دے چکا تھا۔ اُس نے اپنا سفید سر اوپر اٹھا کر اپنی بے نور سی آنکھیں نوجوان کی آنکھوں میں ڈال دیں اور ایک تلخ تبسّم اُس کے اترے ہوئے چہرے پر نمودار ہوا۔

کیا اُسے اپنی گذری ہوئی جوانی کا خیال آ رہا تھا؟

"مسرت؟ تمہارے لئے؟" پیرِ دانا نے پوچھا اور شک اُس لہجے میں لرز رہا تھا۔

پھر وہ بحرِ خیال میں غرق ہو گیا . . . . .

جب اُس نے اپنا سر اُٹھایا اُس کے لہجے میں درشتی پیدا ہو چکی تھی۔

"دھوکا، آہ دھوکا! . . . مسرت کہیں بھی نہیں ہے! سب ایک خواب ہے!"

نوجوان رونے لگا۔

"پھر مجھے زندگی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ مصائب و آلام میں کس لئے برداشت کر رہا ہوں؟ میرے اس اتنے

طویل سفر کا حاصل کیا ہے؟"

بوڑھے حکیم کا دل نرم ہوگیا۔ اُسے نوجوان خیال پرست پر رحم آگیا۔

مُنت رو، جس راہ کی تجھے تلاش ہے وہ یہ ہے! جا! تُو ابھی جوان ہے! اس راہ سے اب تک کوئی واپس نہیں آیا۔ اگر تُو واپس آگیا تو دنیا میں تُو مسرت لے کر آئے گا!"

اور نوجوان چلا گیا۔ اس کے طویل سفر کی سب کلفت دور ہوگئی، کیونکہ اُس کے دل میں امید پیدا ہوگئی اور ہر روز آرزو کے ساتھ ساتھ بڑھنے اور پرورش پانے لگی۔

وہ دشوار گزار راستوں سے بلندیوں پر چڑھتا گیا . . . . اُس کے آس پاس کی بھوری چٹانیں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں عجب منحوس انداز سے چمک رہی تھیں۔ بلندیوں پر موت منڈلا رہی تھی اور اپنے سانس سے ہواہیں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ زندگی یا جوانی کا یہاں ذکر تک نہ تھا۔ ہر چیز پر ایک بھیانک خاموشی طاری تھی جیسے لعنتِ ابدی کا بادل مسلط ہو رہا ہو۔

نوجوان کی راہ میں جلد ہی ایک قعرِ عمیق آگیا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلہ پر رک گیا اور اُس کے دل پر تحیر اور خوف کی ایک پُر احترام کیفیت طاری ہوگئی۔

قعر پہاڑ کے اندر ایک بہت بڑی درز کی وجہ سے بنا تھا جس کی گہرائی پہاڑ کی چوٹی سے لے کر اُس کی جڑ تک پہنچتی تھی۔ یہ کچھ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ ایک کنارے سے دوسرے تک پھاندنے کے لئے صرف ذرا سی کوشش درکار تھی۔

اس کے عمق میں سے ایک دھندسی اٹھتی تھی اور تحت الارض نہروں اور ندیوں کا شور وغل اپنی گونج کے ساتھ الجھ کر اُس کی تہ سے اوپر آتا تھا جس سے ہوا پُر ہیبت اور خوف انگیز ہو جاتی تھی۔

اور غار کے منہ پر کھڑا ہونے والا سنتا تھا کہ کس طرح پردۂ ظلمت کے نیچے عناصر اپنی دہشت انگیز دیوانگی میں ابلتے اور جوش کھاتے ہیں۔

مگر ان میں سے کوئی بات بھی نوجوان کو ڈرا نہ سکی۔

دوسرے کنارے ایک کائی سے ڈھنپی ہوئی بھوری چٹان پر اپنے بازو کے سہارے ایک جنگلی پری لیٹی ہوئی تھی۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں میں اُس کے سنہری بال چوکھے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ نوجوان نے

دیکھا کہ اُس کے بلورین جسم میں سے خون کی روانی صاف نظر آرہی ہے، اُس کی چھاتیوں میں ایک نہایت متوازن و متناسب تموج برپا ہے اور اُس کی نیم وا آنکھوں میں سے پُراسرار اور مسحور کن نگاہوں کے تیر چھوٹ رہے ہیں۔

نوجوان کے پاؤں اسی جگہ گڑ گئے۔ اُس نے بے قراری سے اپنے ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے۔ دفعتہً اس پر منکشف ہوا کہ بلبل کیوں گاتی ہے، پہاڑی ندیاں اس تیزی سے کدھر جاتی ہیں، قدیم اشجار پر پُراسرار خاموشی کیوں چھائی رہتی ہے اور چرواہے کی بانسری کی راگنیاں کہاں کی دعوت دیتی ہیں۔

وہ ملتجیانہ انداز میں اس کے سامنے جھکا ہوا تھا اور اُس کی مسحور آنکھیں اُس کے رخ سے نہ ہٹتی تھیں ——— اس مسرتِ ارضی کے رخ سے!

جنگل کی اس دیوی کی اوٹ میں موت بیٹھی ہوئی تھی۔ بداندیشانہ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے ہولناک دانت نکال نکال کر منہ چڑاتی تھی اور اپنے تیز خنجر کو قعر کے اُوپر گھماتی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں اس کی چمکتی ہوئی دھار پر پڑتی تھیں اور اُن کا ہلکا سا پرتو اُس گہرے بادل پر باقی رہ جاتا تھا جو قعر میں سے اٹھ رہا تھا۔

بن دیوی وہیں لیٹی ہوئی ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلاتی تھی، آنکھوں سے اُسے مسحور کرتی تھی اور اپنے اچھوتے حسن سے اسے مسرور و مدہوش بناتی تھی۔

خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے موت ہنستی تھی . . . . اور خنجر کی آب ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔

. . . . احمق! . . . . کدھر جاتا ہے؟

نوجوان نے جو اتنی مدت تک مسرت کی جستجو میں مصائب برداشت کرتا رہا تھا اُس کے حسن سے مسحور ہو کر، ایک نظر میں قعر کی پہنائی کا اندازہ کیا اور کود پڑا . . . . . مسرت کی آغوش میں نہیں بلکہ موت کے خنجر کی دھار پر۔

اُس دن سے لوگ اس قعر کو قعرِ مسرت کہنے لگے۔

(ماخوذ) منصور احمد

خمارِ دوشین

مآلِ شب سے طلوعِ سحر کا ہے آغاز — ستارہ صبح کا رقصاں ہے والہانہ ہنوز

اسیرِ خوابِ شبستاں میں تھی کوئی شہناز — گلوں کی سیج میں تھا جذبِ ساحرانہ ہنوز

طلسمِ خواب میں آسودہ چشمِ افسوں ساز — ہوئی تھی صبح کی آہٹ سے نیم وا نہ ہنوز

خموشیوں کے حجابوں میں تشنۂ آواز — چھُپا ہُوا تھا کہیں صبح کا ترانہ ہنوز

ذرا سی جنبشِ مژگاں سے تھی وہ نرگسِ باز — تلاش کرتی ہے جو نیند کا بہانہ ہنوز

اُس انکھڑی میں جو ہے کیفِ خواب کی غمّاز — جھلک رہی ہے وہی مستیِ شبانہ ہنوز

جبینِ ناز پہ بکھری ہوئی ہے زلفِ دراز — اِس انتشار کو ہے انتظارِ شانہ ہنوز

برنگِ زلفِ پریشاں خرام کا انداز

خمارِ خواب سے ہے لااُبالیانہ ہنوز

لطیفی

مارواڑی گیت

گیت کسی زبان کے ہوں اپنے اندر ایک خاص اثر رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا مشہور ہندی رسالہ "سرسُتی" میں ایک مارواڑی گیت شائع ہوا تھا اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

کاٹھیاواڑ میں دستور ہے کہ چاندنی راتوں میں وہاں کی عورتیں ایک پُرفضا میدان یا باغ میں جمع ہو کر حلقہ بناتی ہیں اور تالیاں بجا بجا کر اک عجیب انداز سے گیت گاتی ہیں اور ان گیتوں میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ مندرجہ ذیل گیت کاٹھیاواڑ میں بہت مشہور ہے۔

اعظم کریوی

(۱) عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے "پریتم پیارے! تم نے جو بیل لگایا تھا وہ اب خوب سایہ دار ہو گیا ہے جب اس کے سایہ میں بیٹھنے کا وقت آیا تو تم پردیس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اے میری نیک اولاد والی ساس کے لختِ جگر! تم کمانے کے لئے پُورب نہ جاؤ۔

(۲) تم نے جس سندری سے بیاہ کیا تھا وہ نشۂ شباب سے متوالی ہو رہی ہے جب عیش و آرام کا وقت آیا تو تم پردیس جا رہے ہو۔ اے میری پیاری نند کے بھائی کمانے کے لئے پورب نہ جاؤ۔

(۳) اے میرے مالک، میرے سرتاج! تمہارا گھوڑا کس نے کس دیا، اس پر زین کس نے رکھی، تم کس کی اجازت سے پردیس جا رہے ہو۔ اے میرے ہردیشور (جانِ من) تم کمانے کے لئے پردیس نہ جاؤ"

(۴) شوہر نے جواب دیا "میرے بھائی نے گھوڑا کسا اور سائیسوں نے اس پر زین رکھی۔ میں پتاجی کی اجازت سے کمانے جا رہا ہوں"

(۵) عورت نے پھر کہا "اے میرے پریتم پیارے! میں تمہارے لئے روپے بن جاؤں گی۔ میں تمہارے لئے پیلی پیلی اشرفیاں بن جاؤں گی (اپنی محنت مزدوری سے روپے اور اشرفیوں کا ڈھیر لگا دوں گی) اے میرے پران دھن! جب ضرورت پڑے تم اسے کام میں لانا۔ اے میری سیج کی زینت پریتم! تم اپنی پیاری کو بھی پردیس لے چلو"

اتنی خوشامد پر بھی شوہر پردیس چلا گیا اور عرصہ تک اُس کی کوئی خیریت نہ معلوم ہوئی اس پر برہ کی ماری مہجور الم عورت اپنے شوہر کو خط لکھتی ہے:۔

(۶) "اے میرے سوامی تم نہ تو میرے لئے مٹھائی ہی لائے اور نہ کبھی مجھے کھلایا ہی۔ تم نے تو کبھی میرے دل

کی بات ہی نہیں پوچھی۔ اے میری چنچل نند کے بھائی تمہارے بغیر تمہاری گوری کو ایک پل بھی چین نہیں پڑتا۔

(۷) نہ تم کبھی ستلی لائے اور نہ تم نے کبھی پلنگ بنا جس پر ہم دونوں بیٹھ کر پریم کی باتیں کرتے۔ پریتم اب جلدی گھر آؤ تمہاری پیاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

(۸) تمہارے پتاجی کو تو بہت دولت چاہیئے اور تمہاری ماں کپڑے کی لالچی ہے لیکن تمہاری گوری سیج کی زینت چاہتی ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم کو بلانے کے لئے وہ کوا اڑا کرتی ہے۔ تمہاری کمائی سے میں باز آئی تم جلدی گھر آؤ"

(۹) شوہر نے اس خط کا یوں جواب دیا "پریتم پیاری! اس مرتبہ مٹھائی لاکر تمہیں پیار سے کھلاؤں گا۔ گھر واپس آکر تمہارے دل کی باتیں بھی سنوں گا۔

(۱۰) اب کی میں ستلی بھی لاؤں گا۔ پلنگ خود بنوں گا اور اس پر ہم دونوں بیٹھ کر محبت کی کہانی سنائیں گے"

(۱۱) عورت پھر لکھتی ہے۔ "ہردیشور۔ میری طرح مستِ شباب اہم ایک خوبصورت چرخا، ایک رنگین پیڑا اور اچھے لوہے کا تکوا خریدلیں گے اور بیکانیر سے روئی کی پونی لاکر کاتیں گے۔

(۱۲) اے میرے سرتاج! میں چرخا کات کر روپے اور اشرفیاں جمع کروں گی تم میرے کاتے ہوئے سوت سے کپڑے بننا یہی کاروبار ہم کریں گے۔ اے میری شوخ نند کے بھائی جلدی گھر آؤ مجھے اب کسی وقت چین نہیں ملتا"

(۱۳) شوہر نے اس خط کا یہ جواب دیا "عورت کی کمائی کوئی کاہل اور نکما آدمی یا کوئی عطرفروش یا منہاری کھائے گا۔ میں تو ساہوکار کا بیٹا ہوں۔ اے میری پران پیاری! عورت کی کمائی سے کام نہیں چلے گا"

(۱۴) عورت نے لکھا "ساون میں تم نے کھیت بوئے اور بھادوں میں ان کو نہرایا اب کاٹنے کا وقت آگیا اور تم پردیس میں ہو۔ اے میرے مست کمانے والے راجا اب تو گھر آجاؤ تمہاری پیاری کو کسی طرح چین نہیں پڑتا۔

(۱۵) میرے پریتم! گاؤں اجڑ کر پھر بس جاتا ہے۔ غریب امیر ہو سکتا ہے لیکن گئی ہوئی جوانی پھر واپس نہیں آتی۔ اے میرے پران پیارے میں تم کو بار بار کہتی ہوں آؤ! آؤ! جلدی گھر واپس آجاؤ تمہاری پیاری اکیلی ہے۔

(۱۶) ہردیشور! جوانی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی یہ بادل کے سایہ کی طرح ہے وقت پر بویا ہوا کھیت موتی اگلتا ہے۔ میرے دل کے سندر کے دیوتا! تمہاری پیاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جلدی گھر آؤ"

یہاں پر گیت ختم ہو جاتا ہے۔ عورت کا یہ لکھنا کہ میں چرخا کات کر روپیہ جمع کروں گی اور اس پر شوہر کا یہ جواب کہ نکما آدمی ہی عورت کی کمائی کھانے کو تیار ہوگا۔ کتنا سبق آموز ہے۔

اعظم کریوی

دلاور خان

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد عبور کرنے کے بعد افغانوں کے نیم آزاد علاقہ میں داخل ہوں تو زمین کی سطح یکایک بلند ہونی شروع ہوگی۔ پھر چند گھنٹوں کا تکلیف دہ راستہ طے کرنے کے بعد آپ جنگئی پہنچ جائیں گے۔ جنگئی آزاد علاقہ کے ان گڈریوں کا مسکن ہے جو انگریزی حکام کی انصاف پسند طبیعتوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ یہاں اس امر کی توضیح کردینا ضروری ہے کہ اس علاقہ کے کسان اپنے کھیتوں میں کھاد ڈالنے کی تکلیف سے بچنے کے لئے اپنے حصہ کے جنگل میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اگر آگ ضرورت سے زیادہ پھیل جائے تو اُس کی قسمت، مگر یہ امر یقینی ہے کہ ان درختوں کی راکھ سے اُن کی زمین ضرور زرخیز ہوجاتی ہے اور آئندہ فصل بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہاں کا کسان صرف دانوں کے خوشے اتار لیتا ہے اور باقی پودے کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے کاٹنے پر محنت کرنا بے فائدہ ہے۔ آئندہ برسات میں انہیں پودوں سے لمبی لمبی شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور چند ہی سالوں میں سات آٹھ فٹ بلند جھاڑیوں کا ایک گھنا جنگل بن جاتا ہے۔ یہی گھنا جنگل جنگئی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں بیسیوں قسم کے درخت اور جھاڑیاں ہوتی ہیں جن کی شاخیں ایک دوسری میں گندھی ہوئی ہوتی ہیں اور سوائے کلہاڑی سے راستہ صاف کرنے کے اس میں گذرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور بعض جگہ تو جنگلی بھیڑیں بھی اس جنگئی میں سے نہیں گذر سکتیں۔

اگر آپ نے کوئی خون کیا ہے۔ تو آزاد علاقہ کی جنگئی تک پہنچ جائیے ایک اچھی قسم کی بندوق اور بہت سا بارود اور گولیاں اگر آپ کے پاس ہیں تو آپ امن سے اپنی زندگی بسر کرسکتے ہیں ایک خاکی چغہ بھی ضروری ہے جو پہننے کے علاوہ آپ کے بچھونے کا کام بھی دے گا۔ نیک دل گڈریے آپ کی تواضع جنگلی پھل، دودھ اور پنیر سے کریں گے انصاف کے آہنی پنجوں اور مقتول کے رشتہ داروں سے اُس وقت تک آپ بالکل امن میں ہونگے جب تک کہ بارود کی تھیلی دوبارہ پُر کرنے کے لئے آپ کا شہر میں آنا لابدی ہوگا۔

۱۹۲۰ء میں جب کہ میں اس علاقہ میں مقیم تھا دلاور خاں کا مکان جنگئی سے نصف منزل کے فاصلہ پر تھا۔ وہ اپنے علاقہ کے معیار کے مطابق امیرانہ اور شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا یعنی ہر قسم کی محنت سے آزاد تھا۔ اُس کی آمدنی کا ذریعہ بھیڑوں بکریوں کے وہ ریوڑ تھے جنہیں اُس کے ملازم اردگرد کی پہاڑیوں پر چراتے پھرتے تھے ذیل میں جو واقعہ

میں بیان کرنے والا ہوں اس کے دو سال بعد میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ پچاس یا اس سے کچھ زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ آپ خود اس شخص کا تصور کریں۔ قد چھوٹا لیکن خوب مضبوط، گھرے سیاہ گھونگر یالے بال، عقابی ناک، باریک ہونٹ، موٹی موٹی بے قرار سی آنکھیں اور کھلی تیز دھوپ سا جلا ہوا چہرے کا رنگ۔ اُس کی بے خطا نشانہ بازی اس کے اپنے علاقے میں بھی ضرب المثل تھی جہاں اعلیٰ درجہ کے نشانہ بازوں کی کمی نہیں ہے مثلاً دلاور خاں نے جنگلی بھیڑ کو کبھی چھروں سے نہیں مارا، بلکہ ایک سو بیس قدم کے فاصلہ سے صرف ایک گولی اُس کے سر یا کندھے میں جہاں اُس کا دل چاہے مار کر گرا لیا کرتا تھا۔ وہ اندھیری رات میں بھی ایسی صحت کے ساتھ نشانہ کر سکتا تھا جیسا کہ دن کے وقت۔ مجھے اسی قسم کا ایک واقعہ سنایا گیا جو شاید ان لوگوں کو جنہیں اس علاقہ میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا ناممکن سا معلوم ہو۔ ایک جلتی ہوئی موم بتی اسّی قدم کے فاصلہ پر رکھی گئی اور اُس کے آگے ایک گول کاغذ کا ٹکڑا ایک چھوٹی طشتری کے برابر رکھ دیا گیا۔ دلاور خاں نے پہلے نشانہ میں موم بتی کو بجھا دیا اور پھر مکمل تاریکی میں چار گولیاں سر کیں جن میں سے تین کاغذ کو چھیدتی ہوئی نکل گئیں۔

انہیں غیر معمولی اوصاف نے اسے تمام علاقہ میں مشہور کر رکھا تھا۔ وہ دوستوں کے لئے بہترین دوست اور دشمنوں کے لئے خونخوار ترین دشمن تھا۔ وہ مہمان نواز اور مخیر تھا اور اپنے اردگرد کی آزاد دنیا کا ایک امن پسند باشندہ لیکن مہمندوں میں جہاں اُس نے شادی کی تھی اُس کا ایک رقیب تھا جو لڑائی اور محبت میں یکساں خوفناک سمجھا جاتا تھا۔ ایک روز جب کہ وہ اپنے مکان میں کھڑکی کے ساتھ ایک چھوٹا سا آئینہ لٹکائے حجامت بنا رہا تھا۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی معلوم نہیں کہاں سے آئی اور کھڑکی اور آئینہ کو چھیدتی ہوئی اُس کا کام تمام کر گئی۔ اس واقعہ کو دلاور خاں سے منسوب کیا گیا، لیکن جلد ہی یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور دلاور خاں کی شادی ہو گئی۔ اس بیوی کے بطن سے یکے بعد دیگرے اس کی تین لڑکیاں ہوئیں جن کی پیدائش نے اسے غم و غصہ سے دیوانہ کر دیا۔ اور آخر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خوشحال خاں رکھا۔ اسی لڑکے سے اس کے تمام خاندان کی امیدیں وابستہ تھیں۔ اور یہی بڑا ہو کر اپنے باپ کے اوصاف کا جائز وارث ہونے والا تھا۔ لڑکیاں اچھی اچھی جگہ بیاہی گئیں اور دلاور خاں کو یقین تھا کہ وہ ضرورت کے وقت اپنے دامادوں کی تلواروں اور بندوقوں پر کامل بھروسا کر سکتا ہے۔ بیٹا اگرچہ ابھی دس سال ہی کا تھا لیکن ابھی سے اُس کے بہادرانہ اوصاف ظاہر ہو رہے تھے۔

موسم خزاں کے ایک دن کا ذکر ہے کہ دلاور خاں صبح سویرے ہی بیوی کی معیت میں اپنے ایک ریوڑ کی دیکھ

بمال کے لئے چلا گیا۔ ننھے خوشحال نے بھی جانا چاہا لیکن وہ جگہ جہاں جنگی کاٹ کر ریوڑ کے لئے جگہ بنائی گئی تھی بہت دور تھی اور یہ ضروری تھا کہ گھر کی خبر گیری کے لئے کوئی نہ کوئی ٹھہرے۔ اس لئے باپ نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ اور شاید اس انکار کی وجہ سے بعد میں اُسے پچتانا پڑا۔

دلاور خاں کو گئے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ ننھا خوشحال نہایت آرام سے دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نظریں دور نیلی نیلی پہاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں اس مسرت انگیز خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ آئندہ جمعہ کے روز اُسے کوہاٹ شہر میں اپنے حولدار چچا کے گھر جانا ہے۔ وہ انہیں خیالات میں محو تھا کہ یکایک کسی بندوق کے سر ہونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اُس نے اُٹھ کر اُس طرف نظریں دوڑائیں جس سمت سے آواز آئی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ آواز آئی اور ہر مرتبہ یہ آواز نزدیک تر ہوتی گئی۔ آخر اُس راستہ پر جو میدان کی طرف سے دلاور خاں کے گھر کو آتا تھا ایک پہاڑی شخص نمودار ہوا۔ اُس کا چہرہ ڈاڑھی سے ڈھنپا ہوا تھا اور جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ وہ نہایت مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اپنی بندوق کا سہارا لئے چلا آتا تھا ابھی ابھی ایک گولی اُس کی ران میں لگی تھی۔

یہ شخص ایک مفرور قاتل تھا جو رات کے وقت شہر سے بارود لینے گیا تھا لیکن بدقسمتی سے پولیس والوں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ نہایت ہمت سے مقابلہ کرتا ہوا پسپا ہو رہا تھا۔ ہر ٹیلے پر ٹھہر کر وہ اپنے دشمنوں پر گولیاں سر کرتا۔ لیکن اب سپاہی اُس کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اور اُس کی ران کا زخم اسے گرفتاری سے قبل جنگل تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔ آخر وہ خوشحال خاں تک پہنچ گیا اور پوچھا "تم دلاور خاں کے بیٹے ہو؟"

"ہاں"

"میں اکبر خاں ہوں۔ سرخ پگڑی والے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ مجھے کہیں چھپا دو کیونکہ اب مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔"

"اور میرا باپ کیا کہے گا اگر میں نے تمہیں اس کی اجازت کے بغیر چھپا دیا؟"

"وہ کہے گا کہ تم نے بہت اچھا کام کیا؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے جلد چھپاؤ کیونکہ وہ پہنچا ہی چاہتے ہیں۔"

"میرے باپ کے گھر آنے تک انتظار کرو"

بدبخت لڑکے میں کس طرح انتظار کرسکتا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے جلد چھپاؤ ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"

خوشحال نے نہایت اطمینان سے جواب دیا " تمہاری بندوق خالی ہے اور تمہاری پیٹی میں ایک بھی کارتوس نہیں"

"میری پیش قبض میرے پاس ہے"

"لیکن کیا تم میرے جیسا تیز دوڑ سکو گے؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک ہی چھلانگ میں اُس کی زد سے باہر ہوگیا

"تو دلاور خاں کا بیٹا نہیں ہے۔ کیا تو اپنے گھر کے سامنے مجھے گرفتار ہوجانے دے گا؟"

بچے کا دل کچھ پسیجا۔ اور نزدیک آتے ہوئے بولا" اچھا اگر میں تمہیں چھپا دوں تو تم مجھے کیا صلہ دوگے؟

باغی نے اپنے چمڑے کے بٹوے کو ٹٹولا جو اُس کی پیٹی سے لٹک رہا تھا اور ایک اٹھنی نکالی جو اُس نے بارود خریدتے وقت بچالی تھی۔ خوشحال چاندی کے سکے کو دیکھ کر ہنسا اور اُس کے ہاتھ سے سکہ اچک لیا۔

"اب کسی بات کا فکر نہ کرو"

آناً فاناً اُس نے گھاس کے اُس بڑے ڈھیر میں گڑھا کردیا جو گھر کے نزدیک ہی پڑا تھا۔ اکبر خاں اُس میں بیٹھ گیا۔ لڑکے نے اس خوبی سے اُسے ڈھک دیا کہ وہ بغیر تکلیف کے سانس لے سکتا تھا۔ اور دیکھنے والے کو شبہ تک نہ ہوسکتا تھا کہ اس میں کوئی انسان چھپا بیٹھا ہے۔ لڑکے نے کچھ دیر اور سوچا اور جلدی سے ایک بلی اور اُس کے بچے لاکر ڈھیر پر بٹھا دیئے تاکہ ظاہر ہو کہ گھاس دیر سے نہیں ہلایا گیا۔ پھر اُس نے خون کے دھبوں کو جو اُس کے گھر کے نزدیک زمین پر تھے مٹی سے ڈھک دیا۔ اور پہلے کی طرح مطمئن ہوکر دھوپ میں آرام سے لیٹ گیا۔

چند ہی ساعت بعد پولیس کے چھ سپاہی اور ایک افسر دلاور خاں کے دروازے پر کھڑے تھے۔ یہ افسر دلاور خاں کا ایک دور کا رشتہ دار شیر اللہ خاں تھا۔ اس کی مستعدی اور بہادری نے یہاں کے باغیوں کے دلوں کو مرعوب کردیا تھا۔ بیسیوں کو یہ اب تک گرفتار کرچکا تھا۔

"السلام علیکم ننھے بھائی! ماشاءاللہ اب تو تم جوان ہوگئے ہو۔ تم نے ابھی ابھی کوئی آدمی ادھر سے گذرتا دیکھا ہے؟"

"وعلیکم السلام۔ لیکن بھائی جان ابھی میں آپ جیسا جوان نہیں ہوا" لڑکے نے نہایت بے پروائی

سے جواب دیا۔

"تم جلدی ہی جوان ہو جاؤ گے۔ اچھا یہ بتاؤ کوئی آدمی ادھر سے گذرتا ہوا دیکھا ہے"

"اگر دیکھا ہو تو؟"

"ہاں ہاں ایک آدمی جس کے سر پر سیاہ سی ٹوپی تھی اور ایک کامدار واسکٹ پہنے ہوئے تھا"

"سیاہ ٹوپی اور کامدار واسکٹ؟"

"ہاں ہاں۔ جلد بتاؤ۔ میرے سوالوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں"

"آج صبح مولوی صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرے تھے۔ انہوں نے میرے باپ کی خیریت پوچھی اور میں نے کہا ــــــ"

"خبیث بچے تم مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ جلد بتاؤ اکبر کس طرف گیا ہے۔ ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اسی گھر کی طرف آیا ہے"

"کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے معلوم ہے۔ اور اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اسے دیکھا ہے"

"کیا نیند میں انسان گذرنے والوں کو دیکھ سکتا ہے؟"

"بدمعاش بچے، تم نیند میں ہرگز نہ تھے۔ بندوقوں کی آواز نے تمہیں جگا دیا تھا"

"خوب! تو تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تمہاری بندوقیں بہت شور مچاتی ہیں۔ اس لحاظ سے میرے باپ کی بندوق کو ان پر تفوق حاصل ہے"

لعنتی لڑکے تمہیں شیطان لے جائے مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے اکبر کو دیکھا ہے اور شاید تمہیں نے اسے چھپایا ہے۔ آؤ دوستو! اس گھر میں داخل ہو جاؤ اور اپنی اسامی کو نکال لاؤ۔ وہ صرف ایک پاؤں پر چل سکتا تھا اور بدمعاش میں اتنی سمجھ ضرور ہے کہ اس حالت میں جنگل تک پہنچنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ نیز خون کے نشان یہیں ختم ہو جاتے ہیں"

خوشحال نے حقارت سے کہا "اور میرا باپ کیا کہے گا۔ میرا باپ کیا کہے گا جب اُسے معلوم ہو گا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے؟

افسر نے خوشحال کو کان سے پکڑ لیا اور کہا "نابکار لڑکے میں تیری گفتگو کا لہجہ بدل سکتا ہوں۔ شاید میں ہی

کوڑے کھا کر تم سیدھے ہو جاؤ گے۔

خوشحال نے اسی حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا "میرا باپ دلاور خان ہے۔"

"ننھے شیطان تم خوب سمجھ لو کہ میں تمہیں زبردستی کوہاٹ لے جاؤں گا۔ میں تمہیں پھوس کے بستر پر قید خانہ میں بند کر دوں گا، تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دوں گا۔ اور اگر پھر بھی تم نے نہ بتایا تو تمہیں پھانسی بھی دے دوں گا۔"

بچہ ان تمام دھمکیوں کو سُن کر ہنس دیا اور کہا "میرا باپ دلاور خان ہے"

ایک سپاہی آہستہ سے افسر کے پاس آیا اور کہا "آقا ہمیں دلاور سے خواہ مخواہ جھگڑا مول نہ لینا چاہئیے"

افسر شش و پنج میں پڑ گیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ ان سپاہیوں سے گفتگو کی جو گھر کے اندر دیکھ آئے تھے۔ انہیں کچھ دیر نہ لگی تھی کیونکہ گھر صرف ایک کمرے ایک برآمدے اور صحن پر مشتمل تھا۔

اس اثنا میں خوشحال نہایت اطمینان سے بیٹھا اپنی بلی کو تھپکیاں دیتا رہا۔ اور پولیس والوں کی پریشانی پر خوش ہوتا رہا۔

ایک سپاہی گھاس کے تودے کے پاس آیا۔ بلی کو دیکھا اور اپنی سنگین گھاس میں چبھو دی۔ گھاس میں کوئی حرکت نہ ہوئی سپاہی اپنی بے وقوفانہ احتیاط پر ہنسا اور چلا گیا۔ بچے کے چہرہ پر ذراسی گھبراہٹ بھی ظاہر نہ ہوتی۔

افسر اور اُس کے سپاہی اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔ اور واپسی کے خیال سے میدان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معًا افسر نے سوچا کہ دلاور خاں کے بیٹے پر اگر دھمکیاں اثر نہ کر سکیں تو پیار اور تحفے ضرور اثر کریں گے۔

"ننھے بھائی۔ تم ضرورت سے زیادہ روشن دماغ ہو۔ تم دنیا میں ضرور کامیاب ہو گے۔ لیکن میرے ساتھ اس وقت تم ایک بہت بُرا کھیل کھیل رہے ہو۔ اگر مجھے اپنے بھائی دلاور کا خیال نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں تمہیں ضرور گرفتار کر کے لے جاتا۔"

"خوب!"

"لیکن جب دلاور آئے گا تو تمام قصہ اس سے کہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مارے چابکوں کے تمہاری چمڑی ادھیڑ دے گا۔"

"اچھا؟"

"تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ لیکن تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ ٹھہرو۔ میں تمہیں کچھ انعام دیتا ہوں۔"
بھائی جان میں آپ کو نیک مشورہ دیتا ہوں۔ اگر تم زیادہ دیر تک اسی جھگڑے میں پڑے رہے تو اکبر جنگل تک پہنچ جائے گا اور پھر اسے پکڑنے کے لئے تم سے زیادہ پھرتیلے آدمی کی ضرورت ہوگی"
افسر نے اپنی جیب سے ایک قیمتی چاندی کی گھڑی نکالی۔ اور یہ دیکھ کر کہ خوشحال کی آنکھیں اُس کے نظارے سے چمک اٹھی ہیں گھڑی کو زنجیر سے لٹکاتے ہوئے کہا "بے وقوف، کیا تم نہیں چاہتے کہ یہ خوبصورت گھڑی تمہارے گلے کی زینت ہو اور تم نہایت شان سے کوہاٹ کی گلیوں میں پھرو۔ اور لوگ تم سے وقت پوچھیں گے۔
"جب میں بڑا ہونگا تو میرا حوالدار چچا مجھے گھڑی خرید دے گا"
"لیکن تمہارے چچا کے بیٹے کے پاس ابھی سے ایک گھڑی موجود ہے۔ اگرچہ عمر میں وہ تم سے چھوٹا ہے"
لڑکے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"ننھے بھائی، لو یہ گھڑی تمہاری ہے"
خوشحال گھڑی کی طرف کنکھیوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی بلی کو سالم مرغی دے دی جائے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے اور اسے پنجے مارنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ بار بار پنجے اور ہونٹ چاٹتی ہوئی نظریں پھیر لیتی ہے کہ اُس کا دل للچا نہ جائے۔ اور اپنے مالک کو یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کیا ستم ظریفی ہے
لیکن پولیس افسر نہایت سنجیدگی سے اپنا تحفہ پیش کر رہا تھا۔ خوشحال نے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا لیکن زہر خندہ کر کے بولا "تم مذاق کرتے ہو"
"واللہ میں مذاق نہیں کرتا۔ صرف اتنا بتا دو کہ اکبر کہاں ہے اور گھڑی کو اپنا سمجھو"
خوشحال ہنس پڑا۔ اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں افسر کی آنکھوں میں ڈال دیں جیسے اُس کا دلی منشا پڑھ لینا چاہتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ اُس کی آنکھیں بھی اُس کے الفاظ کی تائید کرتی ہیں یا نہیں۔
افسر نے کہا "لڑکے میرے ساتھی اس وعدہ کے گواہ ہیں۔ ان کی موجودگی میں اپنے وعدہ سے پھر نہیں سکتا" یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ گھڑی کو بچے کی طرف بڑھاتا گیا یہاں تک کہ گھڑی بچے کے چہرے سے چھونے لگی۔ بچے کے چہرہ کی زردی صاف بتا رہی تھی کہ اُس کے سینہ میں لالچ اور مہمان نوازی کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ اندرونی جذبات کے اثر سے اُس کا سینہ ابھر رہا تھا اور سانس رکا جاتا تھا۔ اس اثنا میں

گھڑی اس کے رخساروں کے پاس ہل رہی تھی اور بعض اوقات اس کے گالوں سے چھو جاتی تھی۔ آخرکار اُس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا۔ انگلیوں کے سرے گھڑی سے جا لگے اور پھر تمام گھڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن افسر نے ابھی تک زنجیر کو نہ چھوڑا تھا۔ گھڑی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہی تھی اور دھوپ میں اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔

تحریص زبردست تھی خوشحال نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنے کندھے پر سے تودے کی طرف اشارا کردیا۔ افسر فوراً سمجھ گیا۔ اُس نے زنجیر چھوڑ دی اور خوشحال گھڑی کا واحد مالک بن گیا۔ وہ ہرن کی سی چستی کے ساتھ اُٹھا اور گھاس کے تودے سے دس قدم کے فاصلہ پر جا کھڑا ہوا جیسے سپاہی اب الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

گھاس میں حرکت ہوئی اور خون میں لت پت ایک انسان ہاتھ میں خنجر لئے ظاہر ہو گیا۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُس کی اکڑی ہوئی ٹانگ نے بوجھ نہ سنبھالا اور وہ گر پڑا۔ افسر نے ایک ہی جست میں اُسے جا دبوچا اور اُس کا خنجر چھین لیا۔ باوجود شدید مدافعت کے لحظہ بھر میں اُس کی مشکیں کس لی گئیں۔

اکبر نے جو لکڑیوں کے گٹھے کی طرح بندھا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ اپنا منہ خوشحال کی طرف پھیر کر کہا "— کے بچے" ان الفاظ میں غصہ کے بجائے نفرت اور حقارت تھی۔

خوشحال نے چاندی کا سکہ اُس کی طرف پھینک دیا۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ اس کا حق دار نہیں ہے۔ اکبر نے اس حرکت پر قطعاً کوئی توجہ نہ کی اور افسر سے مخاطب ہو کر بولا "شیر اسد خاں! اب میں اپنے پاؤں پر چل نہیں سکتا۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ مجھے اٹھا کر شہر میں لے چلو"۔

"ابھی ابھی تو تم گھوڑے سے بھی تیز بھاگ رہے تھے لیکن خاطر جمع رکھو میں تمہاری گرفتاری سے اس قدر خوش ہوا ہوں کہ تمہیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر دس میل تک لے جا سکتا ہوں۔ دوستو! اس کے چغنے میں دو ڈنڈے لگا کر ڈولی بنالو اور پھر ہم نزدیک ترین چوکی سے گھوڑے لے لیں گے"۔

قیدی نے کہا "میں ممنون ہوں لیکن اس قدر اور نوازش کرنا کہ ڈولی میں تھوڑی سی گھاس رکھ لینا تاکہ میں زیادہ آرام سے سفر طے کرسکوں۔"

بعض سپاہی اکبر کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے اور بعض ڈولی بنانے کے اہتمام میں تھے کہ جنگل سے آنے والے راستے میں ایک موڑ پر دلاور خاں اور اُس کی بیوی نمودار ہوتے۔ عورت جنگلی ناشپاتیوں کا ایک بھاری بوجھ اُٹھائے بمشکل چل رہی تھی اور دلاور خاں ایک بندوق ہاتھ میں اور دوسری کندھے سے لٹکائے ٹہلتا ہوا

چلا آرہا تھا۔

سپاہیوں کو دیکھتے ہی دلاور خاں ٹھٹکا اور سمجھا کہ شاید مجھ ہی کو گرفتار کرنے آتے ہیں۔ پھر سوچا کہ میں نے کونسا جرم کیا ہے۔ انگریزی حکام کے ساتھ میری کوئی پرخاش نہیں۔ اور میری امن پسندانہ زندگی کا انہیں پورا پورا علم ہے۔ تاہم وہ ایک آزاد علاقے کا باشندہ تھا اور اُس کی رگوں میں بہادر اسلاف کا خون موجزن تھا۔ آزاد علاقے میں بہت کم ایسے انسان ہونگے جو اگر اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو انہیں بندوق کے ایک دو انسانی ہدف یا خنجر کا کوئی وار یا ایسی ہی کوئی معمولی سی بات یاد نہ آجائے۔ لیکن دلاور خاں کا ضمیر بالکل صاف تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے دس سال کے عرصہ میں اُس نے کبھی اپنی بندوق کا رخ کسی انسان کی طرف نہیں کیا۔ لیکن وہ ہمیشہ محتاط تھا۔ اس نے فوراً ایسا انتظام کرلیا کہ اگر موقع آن پڑے تو وہ اپنی حفاظت بوجہ احسن کرسکے "بیوی، اپنا بوجھ نیچے رکھ دو اور تیار رہو"۔

عورت نے فوراً تعمیل کی اور کندھے والی بندوق تھام لی۔ دلاور نے ہاتھ والی بندوق کا گھوڑا چڑھا لیا۔ اور سڑک کے کنارے کے درختوں کی پناہ لیتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف روانہ ہولیا۔ تاکہ دشمن کی طرف سے خفیف سے خفیف مخالفانہ حرکت پر بھی وہ اپنے آپ کو بہترین کمین گاہ میں پائے اور پوری طرح مقابلہ کرسکے اُس کی بیوی فالتو بندوق اور کارتوسوں کا ڈبہ لئے اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ نیک بیوی کا یہ فرض ہے کہ لڑائی کے موقع پر اپنے شوہر کی بندوق بھر کر اسے دیتی جائے۔

دوسری طرف پولیس افسر دلاور خاں کو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بندوق کی نالی کو سیدھا کئے اور انگلی کو لبلبی پر رکھے دیکھ کر سخت پریشان ہو رہا تھا۔

اُس نے سوچا کہ اگر اکبر خدانخواستہ دلاور خاں کا دوست نکلا اور دلاور نے اسے بچانا چاہا تو اُس کی دونوں بندوقوں کی گولیوں کا ہمارے جسم میں اترنا ایسا ہی یقینی ہے جیسا چٹھی کا لیٹر بکس میں پڑنا۔ اس وقت وہ میری رشتہ داری کو بھی بالائے طاق رکھ دے گا۔

اس پریشانی میں اُس نے اس بے باکانہ تجویز پر عمل کیا کہ معاملہ کو صاف کرنے کے لئے وہ اکیلا دلاور خاں کی طرف چل پڑا۔ لیکن تھوڑا سا فاصلہ جو اُن کے درمیان تھا شیر اللہ خاں کو کاٹنا مشکل ہوگیا۔

"بھائی دلاور خاں مزاج تو اچھے ہیں۔ میں تمہارا بھائی شیر اللہ ہوں"۔

دلاور خاں بغیر کچھ جواب دیئے ٹھہر گیا۔ اور آہستہ آہستہ بندوق کی نالی بلند کرتا گیا یہاں تک کہ جب

شیر اللہ اس کے پاس پہنچا تو بندوق کا رخ اُس کے سر سے بلند تھا۔

شیر اللہ نے کہا "السلام علیکم۔ بھائی بڑی مدت کے بعد ملاقات نصیب ہوئی"

"وعلیکم السلام بھائی صاحب"

"میں راہ جاتے ہوئے تمہاری اور بچے کی مزاج پرسی کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ آج ہمارے پیش نظر بہت لمبا سفر تھا۔ لیکن اب شکایت کی کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ آج ہم نے ایک مشہور مجرم کو گرفتار کیا ہے۔ یعنی اکبر خان کو"

"الحمد للہ۔ بہت اچھا ہوا۔ کمبخت پچھلے ہفتہ ہماری ایک بکری چرا کر لے گیا تھا"

ان الفاظ سے شیر اللہ کو کچھ اطمینان ہوا۔

دلاور نے کہا "کم بخت اُس روز بہت بھوکا تھا"

"بدمعاش شیر کی طرح لڑا۔ میرا ایک سپاہی مار دیا اور اس پر ہی قناعت نہ کی بلکہ ہیڈ حوالدار رتن چند کا بازو بھی توڑ دیا۔ اور پھر شیطان ایسی طرح چھپا کہ اگر میرا بھتیجا خوشحال اس موقع پر مدد نہ کرتا تو میں ہرگز اس کے پانے میں کامیاب نہ ہوتا"

"خوشحال"؟ دلاور خاں نے کہا

"خوشحال"؟ دلاور خاں کی بیوی نے کہا

"ہاں ہاں۔ اکبر سامنے والے گھاس کے تودہ میں چھپ گیا تھا۔ لیکن خوشحال نے اُس کی چالاکی سے مجھے خبردار کر دیا۔ میں اس کے چچا سے ضرور سفارش کروں گا کہ اسے کوئی اچھا سا تحفہ بطور انعام بھیجے۔ ہاں آپ کا اور خوشحال کا نام ابتدائی رپورٹ میں کپتان صاحب کے پیش کر دیا جائیگا"

"لعنت!" دلاور نے زیرلب کہا۔

وہ اب سپاہیوں کے گروہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اکبر ڈولی میں پڑا ہوا تھا۔ جب اُس نے دلاور اور شیر اللہ کو اکٹھے دیکھا تو ایک عجیب مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر ظاہر ہوئی۔ اپنا منہ دلاور کے گھر کی طرف پھیر کر اُس نے دہلیز پر تھوک دیا اور کہا "غدار کا گھر"

دلاور خاں کے سامنے ان الفاظ کے ادا کرنے کی جرات صرف وہی شخص کر سکتا تھا جس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہو۔ اس تحقیر کا جواب خنجر کا صرف ایک وار ہو سکتا تھا جس کے دہرانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی

لیکن دلاور خاں نے سوائے اس کے حرکت تک نہ کی کہ اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا، جیسے کوئی چندھیا گیا ہو۔ خوشحال باپ کی آمد پر گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ لیکن اب وہ ایک دودھ کا پیالہ لئے ہوئے نکلا اور آنکھیں جھکائے ہوئے اکبر کو دینے لگا۔

"میری نظروں سے دور ہوجاؤ" اکبر نے چلّا کر کہا اور سپاہیوں کی طرف پھر کر کہا "دوستو مجھے پانی پلاؤ"

ایک سپاہی نے اپنی پانی کی بوتل اُس کے ہاتھوں میں دے دی اور اکبر نے اُس شخص کے ہاتھ سے پانی پیا جس کے ساتھ چند منٹ پہلے وہ گولیوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ اور پھر استدعا کی کہ اُس کے ہاتھ بجائے پیٹھ کی طرف باندھنے کے سینہ پر باندھے جائیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ آرام سے لیٹا رہوں"

سپاہیوں نے اُس کی اس خواہش کو بھی فوراً پورا کر دیا۔ اور پھر افسر نے روانگی کا حکم دے کر دلاور کو سلام کیا لیکن وہ بغیر جواب دیئے میدان کی طرف چلا گیا۔

قریباً دس منٹ کے بعد دلاور کی زبان کھلی۔ لڑکا اپنی بے قرار آنکھوں سے کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی باپ کی طرف جو بندوق کا سہارا لئے اپنے تمام غصہ کو ایک ہی نقطہ پر مرکوز کئے کھڑا تھا۔

"تمہاری اٹھان اچھی ہے" دلاور نے نہایت دھیمی اور پُرسکون آواز میں کہا۔ لیکن جو لوگ اُس کی طبیعت سے واقف نہ تھے جانتے تھے کہ اس میں کس قدر قہر و غضب پنہاں ہے۔

لڑکا روتا ہوا باپ کے پاؤں پر گر پڑا لیکن دلاور نے غضب ناک ہو کر کہا "دور ہو جاؤ"

لڑکا سسکیاں بھرتا ہوا باپ سے چند قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموش تھا۔

دلاور کی بیوی نے خوشحال کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹکتی ہوئی دیکھی اور نزدیک آکر نہایت سختی سے پوچھا "یہ گھڑی تم نے کہاں سے لی ہے؟"

"شیر اللہ نے دی ہے"

دلاور نے گھڑی چھین کر ایک چٹان پر اس زور سے دے ماری کہ اُس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔

"بیوی۔ کیا یہ لڑکا میرا ہے؟"

بیوی کے رخسار شرم سے سرخ ہو گئے "تم کیا کہہ رہے ہو، خاوند تمہیں معلوم ہے تم کس سے گفتگو کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا لیکن ہماری نسل میں یہ پہلا غدار پیدا ہوا ہے۔"

خوشحال باپ کی خوفناک نظروں تلے پسا جاتا تھا۔ آخر دلاور نے اپنی بندوق سے زمین کو ٹھکرایا اور پھر اسے کندھے پر رکھ کر خوشحال کو پیچھے آنے کے لئے کہا اور جنگل کی طرف چل دیا۔ اُس کی بیوی نے دوڑ کر دلاور کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا "یہ تمہارا بیٹا ہے" اُس کی آواز کانپ رہی تھی اُس نے اپنی خوبصورت سیاہ آنکھیں اپنے خاوند کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"عورت! میری بات میں دخل نہ دے۔ میں اس کا باپ ہوں"

عورت نے بیٹے کو زور سے گلے لگایا اور روتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔ اُس نے اپنے آپ کو قبلہ رخ سجدہ میں گرادیا اور نہایت خضوع وخشوع سے دعا مانگنے لگی۔ اسی اثنا میں دلاور تقریباً دوسو گز راستہ پر چلا گیا۔ پھر ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر اپنی سنگین سے زمین کو ذرا سا کھودا اور اسے حسب منشا نرم پاکر مطمئن ہوگیا۔

"خوشحال! اس بڑے ٹیلے کے نزدیک چلے جاؤ"

لڑکے نے حکم کی تعمیل کی اور وہاں کھڑے ہوکر سر جھکا دیا۔

"دعا مانگ لو"

"باپ! باپ!! خدا کے لئے مجھے نہ مارو"

لڑکا ابھی بول رہا تھا کہ دلاور نے بندوق سیدھی کی اور نشانہ لیتے ہوئے کہا "خدا تجھے معاف کرے"
لڑکے نے ایک آخری کوشش کی کہ دوڑ کر اپنے باپ کے گھٹنوں سے چمٹ جائے۔ لیکن وقت گذر
چکا تھا۔ دلاور نے بندوق داغ دی اور خوشحال کی لاش گر پڑی۔

دلاور خاں بغیر نعش کی طرف دیکھے کدال لینے کے لئے گھر کو پلٹا تاکہ اپنے بیٹے کی لاش کو دفن کر دے
راستہ میں بیوی اس سے ملی، جو بندوق کی آواز سن کر گھبرائی ہوئی دوڑی آئی تھی۔

"تم نے کیا کیا ہے؟"

"انصاف!"

"میرا بچہ کہاں ہے؟"

"باہر ٹیلے کے پاس ہیں اسے دفن کرنے لگا ہوں۔ الحمدللہ کہ وہ مسلمان مرا ہے۔ اُس پر جنازہ کی نماز
پڑھی جائے گی۔ اپنے داماد گل خاں کو بلا بھیجو۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

گفتگوئے نیم شب

میں نہ بھولوں گا کبھی وہ گفتگوئے نیم شب
وہ محبت وہ وفا وہ آرزوئے نیم شب

اشکِ عصمت کی تری آنکھوں میں وہ ننھی جھلک
وہ تری نیکی میں گویا آبروئے نیم شب

زندگی میری تری اک پھول بن کر کھل گئی
وہ مسرت کا چمن وہ رنگ بوئے نیم شب

بارگاہِ حق میں وہ معصوم الفت کی دعا
وہ خلوصِ قلب وہ تیرا وضوئے نیم شب

زندگی کے دشت میں راہِ حقیقت کی تلاش
نورِ فطرت کے لئے وہ جستجوئے نیم شب

مجھ کو ہے روحِ رواں اے جانِ من تیرا خیال
گام زن رہتی ہے میری زیست سوئے نیم شب

شورشیں ہوتی ہیں سب دنیا کی مدہوش و خموش
چھیڑتا ہے راگنی جب خوش گلوئے نیم شب

پتیاں ہیں کس گلِ رعنا کی اس پر منتشر
بہ رہی ہے آسماں پر آبجوئے نیم شب

زندگی کے روئے دلکش کا طلسمِ حسن ہے
گیسوئے شب میں جو ہے مستور موئے نیم شب

ہو گئے ہیں گیت اُس سے میرے جذباتِ بہار
بھول سکتا ہوں میں کب وہ گفتگوئے نیم شب

بہار

دو آنسو

افق کے سنہرے اور رنگین کنارے جب دن کو الوداعی پیغام دے رہے تھے اور دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب اپنے گوشۂ عافیت میں سکون پذیر ہو چکا تھا، مسرور اور فرخندہ رُو زائرین نے مغرب کی نماز ادا کی۔ فضائے بسیط میں دھندلکا طاری ہو چکا تھا۔ جہاز کی روشنیاں سمندر کی موجوں میں نہایت بے پروائی سے کھیلنے لگی تھیں۔ زائرین لمبی لمبی قباؤں اور عمدہ عمدہ ملبوسات میں آراستہ پُرکیف شام کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے نہایت بے چینی سے اب تک غروبِ آفتاب کا انتظار کیا تھا۔

اب رات ہو چکی تھی۔

اس وقت کا خاموش سماں، تنہا جہاز، سمندر کی پُرشور موجیں اور تاروں بھرا آسمان اُن کے لئے ایک لامتناہی فرحت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خالقِ عالم کو ان پُرسکون مگر معنی خیز مناظر میں جلوہ فگن پا رہے تھے ۔۔۔۔ جلوہ فگن اور اس قدر روشن جیسے کسی کا چہرہ آئینہ میں صاف نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک نے جوشِ مسرت سے کہا "سبحان اللہ، کیا دلکش منظر ہے!" اور اس کے بعد وہ اپنے حجرے کی طرف چلا گیا۔ دوسرے زائرین نے بھی یکے بعد دیگرے اپنے اپنے کمروں کا راستہ لیا۔

۲

اس وقت تمام فضا موت کی سی نیند میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تمام جہاز پر بلا کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔ رات کی اس وحشتناک اور بھیانک تاریکی میں ایک انسانی سایہ جہاز کے ایک گوشۂ عزلت سے نمودار ہوا اور اُس کمزور بچے کی طرف بڑھا جو اپنی ماں کی آغوش سے لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے پر معصومیت کی ایک مسکراہٹ چمکنے لگی۔

"کتنا اچھا بچہ ہے!"

اُس شخص نے کہا اور اُس کے نورانی چہرے پر اب ایک تبسم مستلط ہو گیا ۔۔۔۔ ایک معصوم تبسم جس میں محبت تھی، جس میں درد تھا، جس میں ہمدردی تھی۔ اُس نے بچے کو اپنی بلورین انگلیوں سے مس کیا ۔۔۔۔ "سرد" نہیں۔ اُسے یقین نہ آیا اُس نے سمجھا کہ اس کے اپنے ہاتھ ٹھنڈے ہیں۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کو ملا۔ کچھ حرارت محسوس

ہوئی تو اُس نے پھر بچے کو ہاتھ لگایا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا۔ اُس نے مضطربانہ اُس کی نبض دیکھی، اس میں کوئی حرکت نہ تھی۔ اُس نے زیادہ گھبرا کر اُس کے قلبِ معصوم پر ہاتھ رکھا مگر وہ بھی آسمان کی طرح چپ تھا ـــــ چپ اور بالکل غیر متحرک۔

بچے کی روح پرواز کر چکی تھی اور وہ اب ہمیشہ کے لئے خاموش تھا۔

اب وہ نہایت بے چین اور بے قرار کھڑا تھا۔ اس کے چہرہ سے پریشانی اور بدحواسی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے ـــــ ظاہر ہو رہے تھے اور اس طرح نمایاں تھے جیسے پانی برسنے سے پہلے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں وہ ایک کشمکشِ لاینحل میں گرفتار ہوگیا، اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی، اُس کا دماغ کوئی تدبیر نہ بتا سکتا تھا۔ کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے۔ کیا وہ اس معصوم کی ماں کو اس کے خوابِ غفلت سے بیدار کردے اور اُس سے اِس واقعہ کا اظہار کردے؟ اُس نے سب سے پہلے یہ سوچا۔

۳

وہ ایک زائر تھا ـــــ وہ ایک زائرہ تھی ـــــ نیک اور پاک باطن ـــــ جوان اور ناتجربہ کار۔ جو حجِ بیت اللہ کی غرض سے حجازِ مقدس کا سفر کر رہی تھی ـــــ تنہا اور غم نصیب۔ اثنائے سفر میں بچہ بیمار ہوگیا۔ زائرہ کی اس مصیبتناک کیفیت نے اس نیک دل زائر کو اس کی ہمدردی کے لئے مجبور کر دیا تھا ـــــ اور وہ ہر طرح اپنی اس زائرہ بہن کی خدمت کے لئے تیار ہوگیا تھا۔

"وہ تنہا کیوں تھی؟"

وہ اس دنیا میں اکیلی اور بے مونس و غمخوار تھی۔ اُس کا شوہر اس عالمِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ وہ ایک غریب مگر ایماندار، مذہب پرست اور نمازی کسان تھا۔ وہ کھیتی باڑی کرتا تھا اور دن کو کھیت کے ایک گوشۂ سکوں میں جو اُس نے اسی غرض سے بنا لیا تھا نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ جب مغرب کا وقت آتا تو وہ ہل اور بیل لے کر اپنے گھر آ جاتا اس کے کپڑوں اور ڈاڑھی پر گرد پڑی ہوتی اور وہ بہت تھکا ہوا ہوتا۔ کھانا کھانے اور عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ اکثر اپنی نیک سیرت، پاک باطن، وفاشعار خدمت گذار بیوی سے رسولِ کریمؐ کے عہدِ فرخندہ صفات کے واقعات اور قصے بیان کیا کرتا۔ امام حسینؑ کی قابلِ احترام و بے مثل قربانیوں کا ذکر کیا کرتا جو انھوں نے مذہب کے لئے کی تھیں، یہاں تک کہ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

ایک دن اُس نے اپنی بیوی پر اپنا ایک راز افشا کیا ـــــ ایک پُرجوش اور محبت آگین راز جو عرصۂ دراز

سے اُس کے زہد آمیز اور مذہب پرست سینے کی زرخیز کھیتی میں نشو و نما پا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نورانی تجلیاں موجیں لے رہی تھیں۔ اس کے اعضا اور چہرے پر انتہائی سنجیدگی موجود تھی اور اُس کی آواز میں ایک جوش پنہاں تھا ـــــ ایک ایسا جوش جسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا ـــــ جوش میں احترامِ مذہب مخفی تھا اور وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

"میری زندگی کی ایک اور آخری آرزو یہ ہے"، اُس نے اپنی منور آنکھیں اٹھا کر اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا، "کہ میں حج کروں تم آج مجھ سے وعدہ کرو اور قسم کھاؤ کہ ہم دونوں اس فرض کو ادا کرنے میں حتی الامکان کوشش کریں گے اور خواہ کیسی ہی مصیبت اور ضرورت کیوں نہ درپیش ہو، اس اہم کام کی تکمیل ضرور انشا اللہ کریں گے ـــــ آہ مجھے پیغمبر صاحب کے سبز گنبد کو دیکھنے کی کتنی تمنا ہے! ـــــ ہم چل کر مدینہ کے کھجوروں کے درختوں کے سایہ میں بیٹھیں گے اور قرآنِ پاک کی تلاوت کریں گے ـــــ جہاں پیغمبر صاحب نے مراقبے کئے اور نمازیں ادا کیں اُن مقدس مقامات پر خدا کی عبادت کرنا جن گلیوں اور راستوں کو پیغمبر صاحب کے قدم مبارک چومنے کا شرف حاصل ہوا اُن گلیوں میں پھرنا دنیا میں ہمارے لئے ایک جنت سے کم نہ ہوگا" اُس کی آواز رک گئی۔ ان خیالات سے وہ بے حد متاثر ہوگیا۔

"میری عزیز بیوی، مجھ سے وعدہ کرو اور قسم کھاؤ ـــــ کہ اگر میں مر جاؤں تو تم میرے اس معصوم بچے کو وہاں لیجاؤ گی۔ اور اس طرح میری اس آخری آرزو کی تکمیل کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو گی" ـــــ

"اگر میں مرجاؤں"، اُس نے ان غمناک اور جگر خراش الفاظ کو اپنے خیال میں دھرایا اور بہت مضطرب ہوگئی اُس کی سرمئی اور روفا نواز آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس طرح گرنے لگے جیسے آسمان سے موتیوں کی بارش ہو رہی ہو اُس نے باقلبِ مضطرب وعدہ کرلیا اور قسم بھی کھالی۔

۴

... اُس کے شوہر کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی اور اُس کا انتقال ہوگیا۔ بیوی کو اپنے وعدے کے ایفا کا خیال دن رات بے چین رکھنے لگا ـــــ بے چین اور متفکر بھی۔ اس وقت اس کے پاس صرف دو سو روپے تھے یہ اُس کی تمام زندگی کا سرمایہ تھا جو اُس نے کفایت شعاری سے پس انداز کیا تھا۔ اُس نے اپنے تمام کھیت اور زمین فروخت کردی۔ اور اس طرح اُس کو دو ہزار روپے سے کچھ زیادہ رقم وصول ہوگئی جسے لے کر وہ اس دور دراز سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ اُسے اب اپنے وطن واپس آنے کی خواہش نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ مدینہ ہی میں سود و سوا کے

زمین لے کر اس کی آمدنی سے اپنی زندگی کے باقی دن پورے کرے گی۔ وہاں کھجور کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ قرآن پاک کی تلاوت کرے گی اور اپنے شوہر کی روح کو ثواب پہنچائے گی جس کی ایک اور آخری آرزو یہی تھی کہ وہ خود بھی وہاں تک پہنچ جائے۔

۵

اُس نے اپنی زندگی کی یہ ساری داستان اپنے ساتھی اور ہمدرد بھائی زائر سے بیان کر دی تھی۔ اس وقت وہ وہاں بطور ایک ناظر کے تھا جس نے اس المیہ کو سب سے پہلے دیکھا جب کہ حقیقی ایکٹر اس حادثۂ جانکاہ سے بالکل ناواقف تھا ـــــ ناواقف جیسے ملاّح طوفان کی آمد سے ناواقف ہوتے ہیں وہ گم سم کھڑا تھا۔ روشنی اس کے تمام جسم پر پڑ رہی تھی۔ نائرہ، غم زدہ اور دل شکستہ زائرہ کی درد انگیز اور اضطراب زا زندگی اُس کی آنکھوں میں ایک کتاب کی عبارت کی طرح گردش کر رہی تھی۔

بچے کو مدینہ لے جانے کی قسم اور وعدہ ـــــ حج ادا کرنے کا وعدہ جو اُس نے اپنے شوہر سے کیا تھا، اب اپنے مرکز سے بعید اور بعید تر ہو گیا تھا۔ گرہ کھل گئی تھی اور اجزا منتشر ہو کر خاک کے ذروں اور ہوا کے جھونکوں میں مل چکے تھے!

اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ ـــــ "خدا جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے" اُس نے اپنے آپ سے کہا اور نہایت مجبوری اور بے دلی سے اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے بازوؤں پر رکھ کر انہیں ہلایا۔ یک لخت وہ چونک پڑی اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر مستفسرانہ انداز سے اُس نے زائر کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی "بہن" اُس نے کہا "بچہ" ـــــ "یہ بچہ" اُس کی آواز قائم نہ رہ سکی اور فرطِ غم سے بھرا گئی۔

اُس نے گھبرا کر بچے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سرد تھا، اولے کی طرح ٹھنڈا۔

موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔

بچہ، جس کی نورانی مسکراہٹ اور جس کے گلابی رخسار ایک کائناتِ ارمان تھے، جن رخساروں کو فرشتے بوسے دیا کرتے تھے۔ جنہیں وہ خود چومتی تھی جنہیں اس کا باپ اپنے دل سے لگایا کرتا تھا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ وہی بچہ دنیا کو اس قدر جلد خیرباد کہہ چکا ہے ـــــ نہیں اُسے ہرگز یقین نہ آیا۔ اُس نے بچے کو اُس کا نام لے کر پکارا ـــــ پکارا ـــــ پکارا ـــــ پکارتی چلی گئی۔ متعدد بار اور طرح طرح کے پیارے پیارے ناموں سے، لیکن وہ سب ہوا کی بے باکیوں کی آماجگاہ بن کر ناپید ہوتے گئے۔ اس نے بچے کی درخشاں اور سرد پیشانی پر اپنے دونوں گرم ہونٹ رکھ

دیئے۔ اس کے مرتعش اور کمزور اعضا میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کا ـــــــ خون آلود آنسوؤں کا ایک ابر سا چھا گیا اس سے ضبط نہ ہو سکا اس کے ہوش و حواس رخصت ہو گئے قلب کی زوردار دھڑکن خاموش فضا کو متلاطم کر رہی تھی وہ خود بے ہوش ہو چکی تھی۔

۶

چند لمحوں میں قدموں کی چاپ زور زور سے سنائی دینے لگی۔ زائرین آکر بچے کو لے گئے اور تجہیز و تکفین کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے بچے کو ایک تختے پر لٹا دیا وہ تختے کو جہاز کے نیچے لٹکانے والے تھے کہ زائرہ ـــــــ حسرت نصیب زائرہ اپنے سکونِ غم سے بیدار ہوئی اور آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا کی طرح وہاں جا پہنچی ـــــــ وہاں جہاں ایک معصوم کی نعش، مادرِ آب کی بے قرار گود کے سپرد ہو جانے والی تھی وہ جا پہنچی ـــــــ جہاں ایک الم زدہ ماں کی تمام آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ابدی نیند سلایا جانے والا تھا ـــــــ وہ جا پہنچی ـــــــ اُس قربان گاہ پر ـــــــ جہاں ایک ماں کے سینے پر غم اور رنج کے خونی تیر چلنے والے تھے ـــــــ وہ جا پہنچی ـــــــ جہاں ایک لال کو اُس کی عشرت گاہ سے زبردستی جدا کر کے، نہ دیکھ سکنے والی آنکھوں کے سامنے بے روک ٹوک اُس بے رحم ہستی کے ہاتھوں میں دے دیا جانے والا تھا جس پر کسی آدمی کا قابو نہیں، جس سے کوئی اسے چھڑا نہیں سکے گا ـــــــ وہ جا پہنچی ـــــــ جہاں ایک دکھیاری ماں کے سینے سے اُس کا دل نکال کر اُسے ویران کر دیا جانے والا تھا ـــــــ وہ جا پہنچی ـــــــ اُس کا چہرہ زرد تھا اور فرطِ غم سے مغموم ـــــــ تاہم وہ ضبط سے کام لے رہی تھی اُسے اپنے جذبات پر کامل دسترس حاصل تھی۔

اب تک خاموشی تھی ـــــــ اب طوفان آنے والا تھا۔

تختے کی رسیاں رفتہ رفتہ ڈھیلی کی جانے لگیں اور تختہ آہستہ آہستہ اپنے مرکزِ مقصود سے قریب اور قریب تر ہونے لگا۔

"تختہ سمندر کی سطح سے مس کرنے لگا۔ چاند کا چہرہ غبارِ الم سے دھندلا اور بے رنگ ہو گیا۔ ستارے اپنی حسین آنکھوں سے معصوم کی جدائی پر اشک بہانے لگے" تختہ پانی میں غائب ہو گیا ـــــــ ایک زوردار لہر آئی اور پھر کچھ بھی نہ تھا ـــــــ فضا خاموش تھی اور ساری کائنات ساکن "معصوم کے آبی مزار پر ماں کے دو گرم گرم آنسو ٹپک پڑے"

محشر عابدی

محفلِ ادب

یورپ کا فرض

جو لوگ یورپ کو مذہب اور روح کا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کے لئے روس اور امریکہ بھی اسی طرح 'یورپ' ہیں جیسے خود یورپ، وہ جرمنی کے مشہور فلسفی کاونٹ کیزرلنگ کی نئی کتاب 'یورپ' کو بڑی حیرت آمیز دلچسپی سے پڑھیں گے۔ وہ اس کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے۔ "آج یورپ کے ذمہ جو فرض عاید ہوتا ہے اس سے بڑا فرض اس پر کبھی عاید نہیں ہوا تھا۔ روح کی جو تاریک اور طولانی رات اس وقت انسانیت کے سامنے نظر آتی ہے اس میں روح کے مقدس شعلہ کی حفاظت کرنا اور اُسے بجھنے سے بچانا یورپ کے اور صرف یورپ کے سپرد کیا گیا ہے۔" جدید یورپ کے اہلِ نظر میں اس وقت دو متضاد مذاہب کا پتہ چلتا ہے، ایک وہ ہیں جو وضاحت اور عقلیت پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے وہ جو انسان کے وجدانِ ابتدائی پر مصر ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل کو جبلت و وجدان کے تاریک لیکن صحت بخش اور روح پرور چشمۂ حیات کے پانی سے بپتسمہ دیں۔

جرمن مورخ اشپنگلر بتا چکا ہے کہ بربریت سے چل کر انحطاطِ تمدن تک کا چکر جو ہر تمدنی زندگی کو پورا کرنا ہوتا ہے وہ یورپ کے لئے قریب الختم ہے اور اب کیزرلنگ بتاتا ہے کہ بالشوزم ایک نئے دور کا بربری آغاز ہے جس کا پہلا کام یہ ہے کہ مشرق کے انسانوں کو مادی تہذیب کی بلند تر سطح پر پہنچا دے۔ امریکہ میں بھی اسے یہی چیز دکھائی دیتی ہے یعنی تمام تر توجہ کا مادی اور جماعتی مقاصد پر مرکوز ہونا اور شخصیت و امارت کی طرف سے ہٹا ہونا۔ اس طرح امریکہ بھی اُس کے نزدیک ایک نئے دورِ تہذیب کا بربری آغاز ہے اور یورپ ان دو عظیم الشان رقیبوں کے درمیان آپھنسا ہے جن میں صدیوں تک روحانی مقاصد اور قدریں نظرانداز کی جائیں گی۔ بعض جدید ماہرینِ نفسیات کا خصوصاً آڈلر کا ذکر کر کے کیزرلنگ کہتا ہے کہ اس نئے فلسفہ اور اس نئی امریکی حقیقت دونوں کا مطمحِ نظر در اصل وہی ہے جو روسی اشتراکیت کا ہے یعنی "انسان اپنی انفرادی شخصیت کو جماعت میں پھر گم کر دے۔"

لیکن اگر امریکہ اور روس اس مقدس شعلہ کے صحیح وارث بننا چاہیں اور ایک نئی اور عظیم الشان تہذیب پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو اُن کے لئے لازمی ہو کہ وہ ابھی جماعتی جذبہ اور مادی تنظیم ہی پر توجہ کریں اور اس عرصہ میں قول

کیزرلنگ یورپ پراس مقدس شعلہ کی حفاظت کا فرض عاید ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اگر اس شعلہ کے بجھنے کا اندیشہ اس وجہ سے ہے کہ کہیں یورپ بھی محض مادی قدروں کا بندہ نہ ہوجائے تو اُس کا خطرہ یوں بھی ہے کہ کہیں یورپ اپنی خشک عقلیت اور ذہن پرستی سے اپنے کو تباہ نہ کرے۔ عقل و عشق تخلیق کے لئے دونوں لازمی ہیں کوئی چیز جس میں ان دو متضاد عناصر کا صحیح توازن نہ ہو موثر نہیں ہوسکتی۔ لہذا یورپ کا کام یہی نہیں ہے کہ اس شعلہ کو جذبات اور مادیت کے سیلاب سے نہ بجھنے دے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس شعلہ کو عقلیت کے صحرا میں جل کر خاکسترِ مردہ نہ بن جانے دے۔

اگر یورپ ان جدید بربری قدروں کی مخالفت میں اپنی منطق اور عقلیت ہی پر زور دیتا رہا تو روح کا شعلہ یورپ میں بھی افسردہ ہوجائے گا اور روس اور امریکہ میں بھی روشن نہ ہونے پائے گا۔ یورپ والوں کو بھی ضرورت ہے کہ وہ اس زمین سے تعلق پیدا کریں اور جبلت و جذبات کے حیات بخش چشمہ سے سیراب ہوں جب وہ ان دونوں میں توازن پیدا کرلیں تب ہی اس مقدس شعلہ کے محافظ بن سکتے ہیں۔

"جامعہ"

سکائی لارک[1]

آزاد سب افکار سے آزاد ہے ہستی تری | وہ اُڑنا اور آکاس میں نظروں سے چھپ جانا ترا
کیا چیز ہے مستی تری | وہ دور کا شانہ ترا
دنیا کی شورش گاہ سے ہے دور تر بستی تری | گاتے ہوئے اڑنا ترا اُڑتے ہوئے گانا ترا

تیری نوائے شوق سے سارا جہاں معمور ہے | جاتی ہے جب تو عرش پر اپنے حریم ناز سے
اور آسماں معمور ہے | آراستہ ہر ساز سے
کیا جانے کن اسرار سے تیری فغاں معمور ہے | گرتے ہیں نغمے فرش پر تیرے پر پرواز سے

---

[1] سکائی لارک انگلستان کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔

تو اک مجسم شعر ہے جذبات کا فوارہ ہے یا زندگی کی نیند میں کوئی پریشاں خواب ہے
اور عشق کا گہوارہ ہے

یا آب و گل کی شکل میں کوئی صدا آوارہ ہے اک نغمۂ سیال ہے یا روحِ آزادی ہے تو
ننھی سی شہزادی ہے تو

ہے لیلیٰ محمل نشیں اور تیرا بن ہے آسماں جنگل میں منگل تجھ سے ہے صحرا کی آبادی ہے تو
دشتِ کہن ہے آسماں

او بادلوں کی نازنیں! تیرا وطن ہے آسماں اڑکر زمیں سے چرخ پر تو صورتِ شبنم گئی
رستے میں لیکن تھم گئی

تو اس کی دلدادہ ہوئی وہ چاہنے والا ترا گویا لہو کی بوند تھی جاکر فضا میں جم گئی
ہے چاند منوالا ترا

یہ کہکشاں کیا چیز ہے اک منجمد نالہ ترا تو رفعتِ پرواز سے سوتے زمیں تکتی نہیں
اڑتی ہوئی تھکتی نہیں

اک تیر ہے تو وقت کی ٹیڑھی کماں کے درمیاں اور اس بلندی تک نظر میری پہنچ سکتی نہیں
جسم اور جاں کے درمیاں

یا ایک نقطہ ہے زمین و آسماں کے درمیاں کیا آسماں اور کیا زمیں یہ گردشِ ایام کیا
زنجیرِ صبح و شام کیا

یا سازِ موجودات میں اک نغمۂ بے تاب ہے تیری نظر میں ہیچ ہے آغاز کیا انجام کیا
یا قطرۂ سیماب ہے

"ادبی دنیا"

دنیا کے پھول

اے دنیا میں نے تیرا پھول توڑلیا۔ اور اپنے سینہ سے لگایا۔ لیکن کانٹا چبھ گیا۔

دن رخصت ہوا اور رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ پھول مرجھا چکا تھا۔ مگر کانٹے کی چبھن ابھی تک باقی تھی۔

اے دنیا بہت سے نکہت بدامان پھول تیرے پاس آئیں گے۔ مگر میری گل چینی کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اندھیری رات میں میں اپنے گلاب کے پھول سے جدا ہوں۔ صرف چبھن باقی ہے

"نیرنگ خیال"

ہری

مَیں ہری کی تعریف میں رطب اللساں ہوں۔ جب اُس نے کرۂ زمین کو اوپر کی طرف اُٹھایا تو سات سمندر کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر اس پر یورش کرنے لگیں جو بمشکل تمام اس کے عظیم الشان پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن تک پہنچ سکیں۔ اور تینوں عالم پانی کے ایک قطرہ کی طرح اس کی جھونپڑی میں سما گئے۔ یہ جھونپڑی اُس کے دانت کا صرف ایک گوشہ تھی۔ اے سری ہر تمیا مرے حال پر لطف و کرم کی نظر کر۔ تو ان شہد کی مکھیوں کا نشیمن ہے جو یاسمین کے عطر بیز غنچوں کی کشش سے کھنچی ہوئی تیرے پاس چلی آتی ہیں۔ خدا کرے سرسوتی علم کی دیوی مرے دل میں آ بسے جس کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ وہ دودھ کی دھاروں سے ہمیں بلند مدارج پر پہنچاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرچشمۂ علم سرسوتی چاند کے نور سے گوندھی ہوتی ہے یا ہلکے ہلکے صندلی رنگ کا ایک نازک مجسمہ ہے۔

"مخزن"

علم و عمل

سننے یا پڑھنے سے انسان کا علم ترقی کرتا ہے اور مشاہدے سے بھی علم بڑھتا ہے لیکن جو علم پڑھنے سننے یا مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک اس پر غور نہ کیا جاوے وہ کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ جب انسان غور کر کے معقول اور نامعقول یا حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔ اور پھر اپنے علم کے موافق عمل کرتا ہے۔ تب وہ علم اس کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ عمل کے بغیر علم سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ نیک و بد کی تمیز سے انسان کو کیا حاصل ہے جب تک وہ بدی سے قطعی بچنے اور نیکی کرنے کی ہمت نہ کرے۔ عمل سے خالی علم یقین اور خیال سے کچھ سود نہیں پہنچتا۔ عالم باش و عامل باش کے مسئلے پر عمل کرنا چاہئے +

"رفیق التعلیم"

مطبُوعاتِ جدیدہ

ناٹک کتھا - مولفہ نور الٰہی و محمد عمر صاحبان - اس کتاب میں آٹھ افسانے ہیں جن میں سے چھ قدیم ڈراموں سے ماخوذ ہیں اور ایک طبعزاد تاریخی واقعہ ہے ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ اور پنڈت کیفی کے نقاد قلم کی ایک تقریب ہے۔ کہانیاں کالی داس، بھوابھوتی، بھوسا، شودرک، ہرش دیوا اور ویساکھ دت جیسے بلند پایہ مصنفین کی ہیں اور اُن کو قابل مولفین نے اس خوبی سے اخذ کیا ہے کہ قدیم رنگ بھی قائم ہے اور دلچسپی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا - زبان پاکیزہ ہے اور اس میں کہیں کہیں ہندی الفاظ نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے - اس کتاب کو پڑھ کر تعجب ہوتا کہ قدیم ہندوستانیوں نے ڈراما کے فن میں کتنی ترقی کی تھی - کتاب ہر طرح سے اچھی چھپی ہے - حجم ۱۰۴ صفحات اور قیمت آٹھ آنے ہے - پتہ، محمود برادرس، تاجران کتب جموں -

گڑیا کا گھر - مشہور ڈراما نویس ہنرک ابسن کے "ڈالس ہوس" کا ترجمہ ہے - اردو میں اسے جناب عبد الشکور صاحب ایم اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علی گڈھ نے منتقل کیا ہے اور ساتھ ہی افراد ڈرامہ کے نام بھی بدل دیئے ہیں - اس افسانہ میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لئے ایثار دکھایا گیا ہے اور کتاب کا مقصد اس امر کی تحقیق ہے کہ ازدواجی زندگی میں تعلقات کے قیام اور بقا کے لئے کون کون سی باتیں ضروری ہیں - گڑیا کا گھر ایک دلچسپ اور قابل غور کتاب ہے - حجم دو سو صفحات کے قریب ہے، قیمت درج نہیں - مجالس ادبیہ، انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے طلب فرمایئے

آنند متھ - بنگال کے مایۂ ناز ادیب بابو بنکم چندر چٹرجی کے اسی نام کے بنگالی ناول کا اردو ترجمہ ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے، پی ایچ ڈی نے کیا ہے - یہ ناول بابو بنکم چندر کے بہترین ناولوں میں سے ہے اور اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کا قومی گیت "بندے ماترم" اسی سے ماخوذ ہے - سارا افسانہ وطن کی محبت اور قومی جوش سے بھرا ہوا ہے اور حقیقت و صداقت کے بہت سے عقدے حل کرتا ہے - کاغذ اور چھپائی معمولی ہے حجم ۲۱۶ صفحات اور قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے - گیان پرکاش مندر ماچھرہ ضلع میرٹھ سے منگائیے -

اردو کویوں کی نیتی کویتائیں - ۴۰ صفحات کی اس کتاب میں اردو شعرا کے منتخب اخلاقی و روحانی اشعار ہندی رسم الخط میں مختلف عنوانات کے تحت درج کئے گئے ہیں - انتخاب بہت اچھا ہے اور عموماً انہیں شعرا کے کلام سے ہے جن کی شہرت دنیائے ادب میں مسلمہ ہے - مثلاً آتش، ناسخ، ذوق، غالب، ظفر، داغ، امیر، اکبر وغیرہ - کاغذ اور چھپائی

عمدہ ہے قیمت ۸ ر مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ۔ گیان پرکاش مندر، ماچھرہ ضلع میرٹھ۔

گائے بیل۔ اس کتاب کے ناشر جناب محمد نصیر صاحب ہمایوں، مالک قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ہیں۔ اس میں گائے اور بیل کی پہچان، ان کی پرورش، بیماریاں اور اُن کا علاج۔ غرض کہ تمام معلومات کو بڑی وضاحت سے اور آسان پیرایہ میں لکھا ہے، اور ان سب باتوں کو تصویروں کے ذریعہ سے بھی ظاہر کیا ہے جن لوگوں کے پاس مویشی ہیں انہیں یہ کتاب ضرور خریدنی چاہیئے سولہ تصویروں کے علاوہ ۱۶ صفحات کا مضمون ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے قیمت سات آنے ہے۔

پیکرِ ماتم۔ میرزا فہیم بیگ صاحب فہیم چغتائی کی دل گداز نظم ہے جو انہوں نے ایک بیوہ عزیزہ کی تصویر دیکھ کر لکھی۔ نظم میں تصویر صورتِ حال سے اپنا دکھڑا روتی ہے۔ زبان اچھی ہے اور بیان پُر اثر ہے۔ حجم ۲۴ صفحے آرٹ کا سرورق اور قیمت دو آنے ہے مینیجر کتب خانہ، لاہور سے طلب فرمائیے۔

آتنک نگرہ البم۔ تقریباً پچاس برس ہوتے ہیں جام نگر میں وید شاستری منی شنکر گووندجی نے آتنک نگرہ فارمیسی کے نام سے ایک دواخانہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایسی محنت دیانت داری اور قابلیت سے اپنے کام کو انجام دیا کہ اُن کے کارخانے کی شاخیں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اور بیرون ہند میں قائم ہوگئیں یہ البم اُن کی شاخوں کے دفاتر اور کارپردازوں کی تصاویر پر مشتمل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی قابلِ رشک ترقی کی ہے۔ اپنی کارگزاری پر انہیں جس قدر ناز ہو بجا ہے۔

"ادبی دنیا" اس نام کا ایک رسالہ اس مہینے لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے سر عبدالقادر اس کے نگران ہیں اور مولانا تاجور نجیب آبادی اور جناب حنیف ہاشمی مدیر۔ رسالہ بڑی تقطیع کے تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں سات تصویریں ہیں سالانہ چندہ تین روپے اور محصول بارہ آنے مقرر کیا گیا ہے۔ اردو زبان کی تہذیب و اصلاح اور ترقی یافتہ مشرقی و مغربی زبانوں کے تراجم شائع کرنا اس کے مقاصد ہیں۔ زیر نظر پرچے کے لئے مضامین انتخاب کرنے میں اور اُن کو ترتیب دینے میں کافی محنت کی گئی ہے، لیکن زبان کے اعتبار سے بعض مضامین میں خامیاں بھی موجود ہیں۔ "پامال انجام"، "فاؤسٹ"، "عناصر تیاتر"، اور "پیرلوتی" مفید مضامین ہیں اور سکائی لارک بہت اچھی نظم ہے۔ دنیائے ادب کے عنوان کے تحت کئی ایک مشرقی اور مغربی زبانوں کے ادب لطیف کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ غرض کہ رسالہ ہر حیثیت سے اچھا ہے اور بہت سستا ہے۔ مینیجر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ لاہور سے طلب فرمائیے۔

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ نمونہ ۶/

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۳۲- لارنس روڈ- لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا